جلد نمبر ا (۵۲۰) مارچ ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

جلد ۱۰۷ - ماہ محرم الحرام ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۱ء - عدد ۳

مضامین

مقالات

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تم
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و ا
لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے
کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہ
اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسا
میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب اخل ہیں۔ اور حیوانات کے حقوق، ا
سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اور
علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے

……((مرتبہ))……

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ۳۲۰ صفحے   قیمت :- ؎

بنا دیا تھا، وہ بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان میں وہ سارے اوصاف پیدا کر دیے تھے جس کا لازمی نتیجہ دین و دنیا دونوں میں سربلندی ہے، وہ دین و ملت کے لیے اپنا سارا خانماں لٹا دیتے تھے، ان کے نوجوان خود بڑھ کر اپنے کو جہاد کے لیے پیش کرتے تھے، بوڑھی مائیں اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو بلا تکلف میدان جنگ میں بھیجدیتی تھیں اور ان کی شہادت پر خوش ہوتی تھیں کہ ان کا بیٹا اور شوہر دین و ملت کی راہ میں کام آیا، ان میں ایسی وحدت و اخوت تھی کہ پوری ملت اسلامیہ ایک جسم بن گئی تھی، اگر ایک مسلمان کو کوئی تکلیف ہوتی تھی تو دوسرا مسلمان اسکا درد محسوس کرتا تھا، انصار نے مہاجرین میں سگے بھائیوں کی طرح اپنی املاک تقسیم کر دی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی تھی، انھوں نے جس طرف بھی رخ کر دیا بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ایک صدی کے اندر ایسی عظیم الشان حکومت قائم کر دی جس کا ایک سرا سندھ سے ملتا تھا اور دوسرا چین اور فرانس سے، انھوں نے محض کشورکشائی نہیں کی بلکہ اسی کے ساتھ ساری دنیا کو خدا شناسی، اخلاق و روحانیت، علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا سبق پڑھایا اور اسمیں وہ اقوام عالم کے معلم و امام بن گئے اور ان کی روشنی سے ساری دنیا کو منور کیا اور ان ہی کی ڈالی ہوئی بنیاد پر موجودہ علوم کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا۔

اس کے مقابلہ میں آج کے مسلمانوں کا قومی مزاج ہی بگڑ گیا ہے، وہ نہ صرف ایمانی قوت بلکہ دنیا میں سربلندی کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان سے بھی محروم ہیں، دین و ملت کے لیے جانی و مالی قربانی تو بڑی چیز ہے، ادنی زحمت و تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے، لغو بے نتیجہ بلکہ مضر و مہلک تفریحی مشاغل پر جتنا روپیہ برباد کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی قوم و ملت کی راہ میں صرف نہیں کر سکتے جس سے ملت اسلامیہ کی تمام

شذرات

دنیا اور آخرت دونوں میں سرخ روئی اور سربلندی حاصل کرنے کی دو ہی طاقتیں ہیں، ایمانی قوت اور مادی وسائل، بلکہ اصل قوت ایمانی ہے، وہی دنیاوی وسائل بھی پیدا کرتی ہے، ایمان اور ایمانی قوت ایک مذہبی اصطلاح ہے، مگر اس کے اصلی معنی ہیں کسی حقیقت و صداقت اور کسی مقصد و نصب العین پر یقین واثق اور اسکے حصول کے لیے ایثار و قربانی کا ایسا جذبہ کہ اگر اسکی راہ میں جان دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اسکو بھی بلا تامل نثار کر دیا جائے، یہ مقصد دینی بھی ہوتا ہے اور دنیاوی بھی، ان میں سے جس کے لیے بھی قربانی کیجائیگی وہ ضرور حاصل ہوگا، مگر ان دونوں میں نتائج کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، مادی نصب العین کے فوائد اسی دنیا تک محدود ہوتے ہیں اور وہ اخلاقی قوانین کا پابند نہیں ہوتا، اس لیے مادی فوائد کے ساتھ اسکے نقصانات اور مضرتیں بھی کم نہیں جس پر مغربی قوموں کی مادی ترقی کے نتائج شاہد ہیں، جو نہ صرف دنیا کیلیے ہلاکت و بربادی کا سامان بن گئے ہیں بلکہ خود ان قوموں کو اخلاقی اور روحانی حیثیت سے اتنا تہی دامن کر دیا ہے کہ انکی تہذیب خطرہ میں پڑ گئی ہے اور ان کے بڑے بڑے مفکرین اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، اس کے مقابلہ میں دینی و اخلاقی نصب العین کے فوائد دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہیں، اور وہ ہر قدم پر اخلاقی قوانین کا پابند ہوتا ہے اس لیے عالم انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہے۔

مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں طاقتوں میں سے انکو کونسی طاقت حاصل ہے جس کے ذریعہ وہ آخرت میں نہ سہی دنیا ہی میں عزت و وقار کے مستحق بن سکیں، بیشک وہ کہنے کے لیے مسلمان ہیں اور ایک درجہ میں ہیں بھی لیکن ان میں وہ قوت ایمانی کہاں ہے جس نے ان کو خدا کے سوا ساری دنیا سے بے خوف

مقالات

مُستدرک حاکم اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

از مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۴)

آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں :۔

"حاکم کے اندر تشیع کیجانب میلان کا جو ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب اقتضاء سے بڑھکر بھی رہا ہو جب بھی یہ اس حد و انتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخین رض کی مذمت و تنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علی رض کو ان سے بڑھکر مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو بھی بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمان رض پر حضرت علی رض کو فوقیت دیتے رہے ہوں، کیونکہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت و تفضیل پر گذرا ہے، اس میں انھوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے اسی طرح مستدرک میں انھوں نے حضرت علی رض سے پہلے حضرت عثمان رض کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہ رض کی یہ روایت نقل کی ہے کہ

اول حجر حمله النبی صلی الله علیه وآله وسلم لبناء المسجد ثم حمل ابو بکر حجرا آخر ثم حمل عمر ثم حمل عثمان حجرا آخر فقلت یا رسول الله	مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا، پھر دوسرا حضرت ابو بکر رض نے تیسرا حضرت عمر رض نے اور چوتھا پھر حضرت عثمان رض نے رکھا۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول دیکھیے

ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، ان میں وحدت وتنظیم کے بجائے اختلاف اور جماعت بندی ہے، دین وملت کے مشترکہ مسائل میں بھی اتحاد نہیں، ہر جماعت کو اپنی قیادت کی فکر ہے، اشخاص اس سے مستثنیٰ نکل آئیں گے لیکن قومیں چند افراد سے نہیں بلکہ ان کی اکثریت سے بنتی ہیں "

قریب قریب پوری دنیائے اسلام کا یہی حال ہے، باہمی اختلاف کی وجہ سے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، عرب جو اسلام کے سب سے بڑے حامل تھے، ان کا حال سب سے برا ہے۔ جن ملکوں میں دولت آگئی ہے، وہ مغربی تہذیب اور عیش وتنعم میں غرق ہیں، ان کی زبانوں پر اسلامی وحدت واخوت کے بجائے قومیت و وطنیت اور سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے ہیں، ان کے اختلافات نے ان کی قوت پارہ پارہ کر دی ہے، اور وہ مغربی قوموں کے سہارے زندہ ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند لاکھ یہودیوں کروروں عربوں کو انکی سرزمین سے محروم کر دیا ہے، اور وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، پاکستان اسلامی نظریہ پر قائم ہوا تھا، اسلام کا سوال الگ رہا، آج وہاں ملکی وطنی وحدت کا بھی فقدان ہے، اور اس کے ہر حصہ میں صوبائی نسلی اور لسانی اختلاف برپا ہے جس سے پاکستان کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے، ہندوستان کے مہاجرین جن کی قربانیوں سے پاکستان قائم ہوا تھا، اجنبی سمجھے جاتے ہیں، خصوصاً مشرقی پاکستان میں تو ان کے ساتھ معاندانہ سلوک ہے، ان حالات میں اگر مسلمان نکبت وادبار میں مبتلا ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، یہ تو ان کے اعمال اور قانون قدرت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو ہدایت دے اور انکے حال پر رحم فرمائے۔

اس میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک واعتراض کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عمرو بنؓ عاص وغیرہ کے فضائل ومناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو واغراق سے کام نہیں لیتے تھے، جو بدعت یا دوسرے صحابہ کے سب وشتم کا باعث ہو........"[۱]

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارہ میں غالی ومفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابلِ اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے، کیونکہ

(۱) انھوں نے خلفائے اربعہ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے، جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلثہ کا اور انکے بعد حضرت علیؓ کا تذکرہ ہے،

ایک جگہ معرفت علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:۔

النوع السابع من هذا العلم	اس علم وفن کی ساتویں نوع صحابۂ کرام
معرفة الصحابة على مراتبهم	کے مراتب کے لحاظ سے ان کی معرفت ہو

اس نوع میں انھوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ[۲] طبقوں کا ذکر کیا ہے پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں:۔

فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل	اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں
ابي بكر وعمر وعثمان وعلي وغيرهم	اسلام لائے جیسے ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ
رضي الله عنهم[۵]	وعلیؓ وغیرہ

الا تری الی هٰؤلاء کیف یساعدونک	کس طرح یہ لوگ آپ کی معاونت کر رہے ہیں
فقال یا عائشۃ هٰؤلاء الخلفاء	آپ نے فرمایا اے عائشہ یہی لوگ میرے بعد
من بعدی	میرے خلفاء اور جانشین ہوں گے۔

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبی وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پرواہ کیے بغیر ایسی حدیث کی تخریج کر سکتا ہے جو خلفائے ثلثہ کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارہ میں رفض و تشیع کا گمان بھی کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ

عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ	حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے
عنھما قال بینا نحن فی بیت ابن	کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے جن میں
حشفۃ فی نفر من المھاجرین منھم	حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبد الرحمٰن
ابوبکر وعمر وعثمان وعلی وطلحۃ	ابن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے
والزبیر وعبد الرحمٰن بن عوف	ساتھ ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع پر)
وسعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور
لینھض کل رجل منکم الی کفوہ	آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو کر
فنھض النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی	ان سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا
عثمان فاعتنقہ وقال انت ولیّ	و آخرت دونوں میں ولی ہو۔

فی ... [illegible]

بالصلوٰۃ بالناس وھو حی[۱]　　　　خوب معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

جہاں تک شیخینؓ کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے انکے متعلق کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمانؓ کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے، حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنیؓ کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے، اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:۔

قتل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ صبراً[۲]　　　　حضرت عثمانؓ مظلوم قتل کیے گئے تھے۔

خلافت میں حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں، وہ مستدرک میں بھی ہیں، علامہ ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں، یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:۔

"حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ رات ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہؐ سے اور ان سے حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ سے حضرت عثمانؓ جڑ گئے، راوی (حضرت جابرؓ) کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صالح آدمی سے خود رسول اللہ صلعم مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپکے امور کے ذمہ دار ہونگے"[۳]

دوسری حدیث حضرت انسؓ بن مالک کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"بنی مصطلق کے لوگوں نے مجھکو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپکے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کو، ان لوگوں

۱؎ المستدرک ج ۳ ص ۶۶ و ۶۷　۲؎ معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۳　۳؎ مستدرک ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انھوں نے خلفائے ثلثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سنہ وفات تحریر کیا ہے۔[۵]

(۲) عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفۂ برحق سمجھتے تھے اور اپنی تصنیفات میں خلفاء کی حیثیت سے اُن کا ذکر بھی کیا ہے۔

(۳) ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کئے ہیں ان سے بھی ان کی وہی فضیلت و عظمت اور ان کا وہی درجہ و مرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا ہے یعنی حضرت ابوبکرؓ جو متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ و برتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث و آثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا سب سے فائق و برتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں جناب امیرؓ کی تاخیر اور آپ کی آزردگی کا مسئلہ آجتک امت کے درمیان بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے، لیکن حاکم جناب امیرؓ ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال علی والزبیر ما غضبنا الا	حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو
لانا قد اخرنا عن المشاورة	غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم لوگوں کو مشورہ
وانا نری ابابکر احق الناس بها	میں نظر انداز کیا گیا تھا ورنہ ہم لوگ بھی
بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت
انه لصاحب الغار وثانی اثنین	ابوبکرؓ ہی کو سب سے زیادہ خلافت کا مستحق
وانا لنعلم لبشرفه وکبره ولقد	سمجھتے تھے، وہ غار میں آپکے ساتھی اور دو
امره رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں کے دوسرے تھے، ہم کو ان کا فضل و شرف

[۵] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۲ و ۲۰۳

نے معجم میں، ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ میں اسکی تخریج کی ہے، گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے، اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث، وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" وہ سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جابجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی باب یعنی فضائل علیؓ کی متعدد ضعیف و واہی حدیثوں پر تنبیہ کی ہے جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ بہت تیز و تند ہو گیا ہے، مثلاً

العجب من الحاکم وجرأته فی تصحیح هذا وامثاله من البواطیل[1]	حاکم پر اور انکی اسی اور اس جیسی حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت حیرت ہے۔

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انھوں نے کوئی کلام نہیں کیا ہے[2]، اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح اور موضوع حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارہ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

واما حدیث من کنت مولاہ الخ فله طرق جیدة وقد افردت ذالك[3]	رہی حدیث من کنت مولاہ الخ تو اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس کے لیے علیحدہ رسالہ لکھا ہے۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں حاکم کی ساقط روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ضعاف و موضوعات میں جو

---

[1] تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۶ [2] ایضاً ص ۱۱۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵

نے کہا جا کر پھر پوچھو کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد کس کو دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا، تیسری دفعہ پھر بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا[1]"

اسی طرح حاکم نے حضرت علیؓ کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں، ان سے خلفائے ثلٰثہ اور عام صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابۂ کرام کی عدالت میں طعن اور انکی تنقیص کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت کے بیان میں لکھتے ہیں:

"علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ ابو اسرائیل ملائی کا پایہ حدیث میں بلند نہیں تھا، کیونکہ وہ حضرت عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے"

اسی طرح علی بن حسین سے روایت کی ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ شیخین کو سب و شتم کرتے تھے[2]۔

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہ کے معاملہ میں جادۂ حق اور مسلک اعتدال سے منحرف نہیں تھے، جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انھوں نے بھی اس کے ثبوت میں کوئی واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں روایتیں جو صاحب مستدرک کے بغض و تشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کی حاکم نے تین طرق سے تخریج کی ہو اور سب کی تصحیح و تصویب کی ہے[3]، ان کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں اور امام احمدؒ نے مسند میں اس حدیث کی تخریج کی ہے، ان کے علاوہ طبرانی

---

[1] مستدرک ج ۳ ص ۷۷، [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۷، [3] ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۰۹ و ۱۱۰

کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟ پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمہ کیار نے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض و تشیع سے متہم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعی قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اگر اس حدیث کی حجت یقینی اور مسلم بھی مان لیجائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض و شیعیت کی کوئی تائید نہیں ہوتی، عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے۔ یہاں مولی اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے، ملا علی قاری کا بیان ہے کہ "من کنت مولاہ الخ من کنت اتولاہ کے مفہوم میں ہے، یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں، دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی بھی محبت کرتے ہیں[1]" پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے جن میں حضرت علیؓ سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض و نفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے،

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابۂ کرام کے بارہ میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں، خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے، جو پہلے گذر چکی ہے کہ آپ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا و آخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علیؓ کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں۔

تیسرے بریدہ اسلمی اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورہ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے، جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزردہ ہو کر

---

[1] تحفۃ الاحوذی مع جامع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۹

کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے[1] البتہ امام ترمذیؒ نے اس کو غریب بتایا ہے، مگر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ لکھتے ہیں:

"امام ترمذی کا یہ قول کہ "یہ حدیث حسن غریب ہے" محل نظر ہے کیونکہ امام احمد، نسائی اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ سے اور انھوں نے اور ابن ماجہ نے براء بن عازبؓ سے، اور امام ابن ماجہ نے سعد بن ابی وقاص سے اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں"[2]

اور علامہ اسمٰعیل بن محمد عجلونی م ۱۱۶۲ھ نے تو اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ

"حدیث من کنت مولاہ کی ترمذی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں زید بن ارقم، حضرت علیؓ اور تیس صحابہ سے اس لفظ "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" کے ساتھ تخریج کی ہے پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے"[3]

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے، علامہ ذہبی نے اس کے ضعیف ہونے کی اسباب النزول میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف و موضوع، مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعی قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور نا انصافی ہے، جب مستدرک میں اور بھی ضعیف و موضوع حدیثیں موجود ہیں، اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ و مسلک کے بارہ میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہاں تک کہ خود خلفائے ثلثہ اور دیگر صحابہ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی محبت میں غلو و افراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے، اس لیے اسی روایت کو ان کے عقیدہ و مسلک کی بنیاد اور حضرت علیؓ کی محبت میں بیجا افراط و غلو کی دلیل

---

[1] الجامع الصغیر ج ۲ ص ۵۵۵ [2] جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۳۲۶ و ۳۲۷ [3] کشف الخفاء ومزیل الالباس ج ۲ ص ۲۷۴

طير فقال اللهم ائتنى باحب خلقك اليك ياكل معى هذا الطير فجاء على فاكل معه

آپنے فرمایا کہ اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس بھیجدے جو تیرے نزدیک تیری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو، تاکہ وہ میرے ساتھ یہ چڑیا کھائے، چنانچہ حضرت علیؓ تشریف لائے اور انھوں نے آپکے ساتھ اسکو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگران لوگوں کو باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب حضرت علیؓ تشریف لائے تو آپنے انکو اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ماحصل یہ ہے کہ آنحضورؐ کی دعا" اللهم ائتنى الخ" سنکر حضرت انسؓ نے دعا کی کہ اے اللہ یہ محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علیؓ ہی تشریف لائے تو حضرت انسؓ نے یہ کہکر انکو واپس کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علیؓ ہی آئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا ان کو لوٹا آؤ، تم ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے،

امام ترمذی نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ

هذا حديث غريب لا نعرفه من حديث السدى الا من هذا الوجه وقد روى هذا الحديث من غير وجه عن انس

یہ حدیث غریب ہے سدی سے صرف اسی وجہ اور طریق سے ان کی حدیث کا ہم کو علم ہے، حالانکہ یہ حضرت انسؓ سے متعدد وجوہ و طرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص میں حدیث طیر کے پہلے طریق کے بارہ میں لکھتے ہیں

رسول اللہ صلعم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ علیؓ سے بغض و نفرت کا اظہار کر کے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو، کیونکہ جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں،

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہی دوسری حدیث تو اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کر کے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت علیؓ، ابوسعید خدریؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے[1]۔ "حدیث طیر" کا معرفۃ علوم الحدیث میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے، لیکن وہاں اس کی صحت و سقم کے بارہ میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے،

"حدیث طیر" کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع[2] میں اور امام نسائی نے خصائص علی[3] میں نقل کیا ہے۔

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی و نسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، ناظرین کی واقفیت کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کیجاتی ہے:۔

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ	حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ
کان عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چڑیا تھی

---

[1] ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ [2] تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۸ [3] یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے، لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب نے جو نواب رامپور کے مصاحب خاص و واعظ دربار تھے، خصائص مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو محلہ جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا متن اور اردو ترجمہ موجود ہے، ملاحظہ ہو خصائص مرتضوی ص ۴

بارہ میں شرح صدر نہیں تھا، اور امام ترمذی نے اگرچہ اس کو غریب بتایا ہے، تاہم انھوں نے اس کے کثرتِ طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علماء نے حدیث طیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے، جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"حدیث طیر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی علائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، ذہبی نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ و معروف بتایا ہے، لیکن میری نظر سے انکی جرح یا توثیق کے بارہ میں کوئی قول نہیں گذرا ہے[۱]۔"

علامہ زیلعی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کیجائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:-

"حاکم نے حدیث طیر کو صحیح بتایا ہے، لیکن ابن طاہر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول راویوں کے واسطہ سے اس کو حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے[۲]۔"

---

[۱] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۷۰، [۲] منتظم ج ۷ ص ۲۷۵

ابن عیاض لا اعرفه ولقد کنت زمانا طویلا اظن ان حدیث الطیر لم یجسر الحاکم ان یودعه فی مستدرکه فلما علقت هذا الکتاب رأیت الهول من الموضوعات التی فیه فاذا حدیث الطیر بالنسبة الیها سماء قال وقد رواه عن انس جماعة اکثر من ثلاثین نفسا ثم صحت الروایة عن علی وابی سعید وسفینة[۱]

ابن عیاض کے بارہ میں مجھکو واقفیت نہیں ہے، میرا ایک زمانہ تک خیال تھا کہ حاکم نے حدیث طیر کو مستدرک میں نقل کرنے کی جسارت نہ کی ہوگی لیکن جب میں نے یہ تعلیق لکھی تو مجھکو ایسی ہولناک موضوع حدیثیں اس میں ملیں جن کے مقابلہ میں حدیث طیر بلند پایہ ہے کیونکہ اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ اشخاص نے بیان کیا ہے، اس کے علاوہ یہ حضرت علیؓ، ابو سعیدؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے۔

اور دوسرے طریق کے[۲] ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے،[۳]

تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہوگیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

واما حدیث الطیر فله طرق کثیرة جدا افردتها بمصنف ومجموعها یوجب ان یکون الحدیث له اصل[۴]

رہی حدیث طیر تو یہ بکثرت طرق سے مروی ہے، میں نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کیا ہے، ان سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بے اصل نہیں ہے۔

نتیجہ ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طیر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے

---

[۱] تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱ [۲] ایضاً ص ۱۳۲ [۳] تذکرة الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵

امام دارقطنی کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار نکیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھکر مستدرک سے خارج کر دیا تھا، ابو محمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ "حاکم کو حدیث طیر کے متعلق جب امام دارقطنی کی نکیر و ملامت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا۔"[1]

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"حاکم کے شاگرد ابو عبدالرحمٰن شادیاجی کہتے ہیں کہ سید ابوالحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارہ میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہؐ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؓ سے افضل نہ ہوگا"۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی، اور انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا تھا۔"[2]

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۸ [2] دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حاکم نے اس حدیث کو مستدرک سے خارج کر دیا تھا تو وہ کس طرح اس میں باقی رہ گئی ہے، علامہ ابن سبکی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں "ہمارے استاذ علامہ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا رہ جانا تسامح کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھکو اس سلسلے میں شرح صدر نہ ہوا، مگر جب امام دارقطنی کے استدراک و نکیر اور حاکم کے اس سے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج کر دینے کی بات یاد آئی تو خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ تصحیح رہ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہوجائے تو دونوں روایتیں

(باقی حاشیہ ص ۱۸۰ پر)

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے[1]،

علامہ شوکانی فرماتے ہیں :۔

قال فی المختصر لہ طرق کثیرۃ کلھا ضعیفۃ وقد ذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات واما الحاکم فاخرجہ فی المستدرک وصححہ واعترض علیہ کثیر من اھل العلم ومن اراد استیفاء البحث فلینظر ترجمۃ الحاکم فی النبلاء[2]

مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت سے طرق ہیں جو سب ضعیف ہیں، اور علامہ ابن جوزی نے اس کا موضوعات میں تذکرہ کیا ہے مگر حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے، اس کی وجہ سے اکثر علماء نے ان پر اعتراضات کیے ہیں جس کو اس کی مفصل بحث دیکھنی ہو وہ سیر النبلاء[3] میں حاکم کا ترجمہ دیکھے

علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے[4]،

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرت طرق کا سہارا لیا ہے، مگر علامہ زیلعی فرماتے ہیں :۔

وکم من حدیث کثرت رواتہ وتعددت طرقہ وھو حدیث ضعیف کحدیث الطیر وحدیث الحاجم والمحجوم وحدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ[5]

کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ زیادہ اور طرق متعدد ہوتے ہیں لیکن وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے جیسے حدیث طیر، حدیث حاجم و محجوم اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ [2] الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ۲۰۸ [3] افسوس ہے کہ سیر النبلاء کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گذری [4] تذکرۃ الموضوعات ص ۹۵ و ۹۶ [5] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۰

"علامہ ابن صلاح نے ائمہ خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی) کے بعد جن کابر محدثین کا ذکر کیا ہے یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن سعید مصری، ابونعیم اصبہانی اور ان کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر بیہقی اور خطیب، یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمہ شافعیہ میں ہیں اور ان لوگوں کو اس مذہب کے بارہ میں شدید تعصب تھا، حافظ ابن جوزی المنتظم میں لکھتے ہیں :-

..... سمٰعیل بن ابوالفضل تومسی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے، (۱) حاکم ابوعبداللہ (۲) ابونعیم اصبہانی (۳) ابوبکر خطیب، اسمٰعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ وصدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو رجال و متون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی، اور وہ بڑے متدین تھے۔"[1]

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت کی ہے، لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے، مگر حاکم کے رسالہ المدخل پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح وتفصیل کے علاوہ اس پر نقد وتعقب بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :-

"حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہییں، اولاً ان کا نقد ونظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے، مگر تعصب پر ممکن ہے ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں بلکہ ائمہ فن کی تصریح ہے، حافظ

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۳۱ بحوالہ المنتظم ج ۸ ص ۲۶۹

بہر حال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔

گو محدثین اور اصحاب فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلم ہے، لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے حضرت علیؓ کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام امام حاکم شافعی المذہب تھے، ان کے الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بیجا غلو اور تعصب تھا، لیکن اس الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے، اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المصنفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شد و مد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" میں تحریر فرماتے ہیں: [illegible]

[illegible] ۱۶۹) [illegible] ہوگی کہ حاکم نے اس حدیث کے بطلان کے علم سے پہلے اس کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا [illegible] ہونا معلوم ہوگیا تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا جیسا کہ اس روایت سے جس کی سند [illegible] صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے [illegible] باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینیوں نے اسکو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص [illegible]) علامہ ابن سبکی نے مخالفین کے بارہ میں جس شبہہ کا اظہار کیا ہے وہ بے بنیاد نہیں ہے۔ خود ابن طاہر [illegible] ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طیر دیکھی تو اسکو تعجب کی وجہ سے نقل کر لیا [illegible] حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح سے اسکو عام شہرت ہوگئی ہو، اور جن لوگوں کو [illegible] یہ حدیث مستدرک میں شامل ہے، اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اسلئے [illegible] عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہوگیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی ہے۔

(۱) امام اعظم کے بارہ میں معتدل محدثین کو اگرچہ یہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت و حدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے،[۵] یہ خیال خواہ تمامتر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو، لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمۂ ثلاثہ خصوصاً امام مالک اور امام احمد کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمۂ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہمنوا بھی، اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کرتے، لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظم کا مخالف و معاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیت میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے،

(۲) حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابوحنیفہ کو صرف فقہ و اجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ حدیث و روایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے، چنانچہ یہاں بھی سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام مالک و امام شافعی کی طرح ان کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمۂ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ انہ "من الائمة الماضین" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد "وکذالک من بعدھما من ائمة المسلمین" سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفت حدیث سے انکار نہیں تھا، لیکن امام شافعی و امام مالک کے ناموں کے ساتھ انھوں نے جو توصیف و تکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو

---

۵ اس کے متعلق مفصل بحث راقم کے مضمون "کیا امام دارقطنی، امام ابوحنیفہ سے تعصب رکھتے تھے" مطبوعہ معارف ستمبر ۶۹ء میں ملے گی۔

عبد الرحمٰن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسمٰعیل بن ابی الفضل قومسی کا یہ قول نقل کیا ہے ..

.... [1] المدخل میں بھی ائمہ احناف کا جس طریقہ پر ذکر کیا ہے اس سے حافظ اسمٰعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفاء سے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت شان کے ساتھ کیا ہے " وھذا مالک ابن انس امام اھل الحجاز بلا مدافعۃ "۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں " وھو الامام ز اھل الحجاز بعد مالک "۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے صرف نام بتانے پر اکتفا کی ہے، چنانچہ تحریر ہے " وھذا ابوحنیفۃ ثم بعدہ ابو یوسف یعقوب بن ابراھیم القاضی ومحمد بن الحسن الشیبانی " اور ابوعصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہاء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے، اور ایک مجہول شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے [2]"

مذکورۂ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) رسالۂ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کیا ہے۔

(۲) حاکم نے امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد ابوعصمہ نوح بن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے [3]، لیکن غالباً اس کو امام اعظم کی تنقیص اور شافعیت میں غلو و تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ

---

[1] یہ بیان پہلی تحریر میں [illegible] ... اس لئے اس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے [2] ماہنامہ برہان فروری ۱۹۴۲ء ص ۱۰۴، ۱۰۵ [3] [illegible]

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم و صاحبین کا بھی اسی تعریف و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا بھی ہو لیکن بعد میں جب حق پسندی کی جگہ عصبیت نے لے لی ہو تو ناقلین نے اسے حذف کر دیا ہو۔

رہا دوسرا جزء تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابوعصمہ کے متعلق المدخل میں یہ ضرور لکھا ہے کہ

"بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت و تلقین کرنے کے لیے ایسا کیا، جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی احمد بن عبداللہ جویباری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبداللہ ہروی وغیرہ .... میں نے محمد بن یونس مقری سے انھوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انھوں نے ابوعمار مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوعصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے جس کو انھوں نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور روگرداں ہو کر امام ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحٰق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کر ڈالی۔"[1]

مگر ابوعصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے، کم و بیش تمام ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو غیر ضابط، منکر الحدیث، بلکہ واضع و کذاب تک کہا ہے ان کے بارہ میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، مگر وہ بھی کہتے ہیں "ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں

---

[1] المدخل ص ۱۹ و ۲۰۔ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نوح کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "و این عذر او بدتر از گناہ است زیرا کہ احادیث صحیحہ کہ در فضائل قرآن وارد شدہ برائے ترغیب کافی بودہ۔" (عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث و روایت میں امام سمجھتی تھی، لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے،

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:-

"حاکم اپنی مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں، اور ان کو ائمۂ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انھوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں[۴۹] نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین و تبع تابعین میں ذکر کیا ہے، جن کی حدیثیں حفظ و مذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں، اور جن کا مشرق و مغرب میں شہرہ ہے[۵]"

(۳) حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو اصلی غلو، جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے، اسی مذہب سے ہوگا، لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان پر [illegible] بنا پر اگر کوئی الزام عائد ہوسکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعیت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث و روایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھکر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ درحقیقت ان کے تعصب کا نہیں بلکہ [illegible] پسندی کا نتیجہ ہے۔

(۴) [illegible] اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے [illegible] دوسرے مقامات و مباحث میں حدیث و روایت [illegible] صاحبین و اکابر [illegible] امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دیا ہے۔

---

[۵] ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲

ابوسعید النقاش :- انھوں نے موضوعات کی روایت کی ہے۔

حافظ ذہبی و ابن عماد :- متروک الحدیث، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور واہی حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

حافظ ابن حجر :- لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے، انھوں نے زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدلیس سے کام لیتے تھے ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے، واقعتہً اس میں وضع کے آثار و علامات بالکل ظاہر و واضح ہیں، ابوجعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں بدءُ الخلق کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورۂ بالا بیان بلا نقد و تبصرہ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے۔[۱]

ائمۂ جرح و تعدیل کے ان متفقہ آراء و اقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حاکم نے بربنائے تعصب نوح کو واضعِ حدیث قرار دیا ہے، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطہ سے بھی ہو تو ان آراء کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی رد و کد نہیں کیا ہے، اور تو اور مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو غالباً مولانا عبدالرشید صاحب سے قریب و متعلق ہیں، ابوعصمہ کے ضعیف و متروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"نوح بن ابی عصمہ نے امام زہری، ثابت بنانی، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم

---

[۱] ائمۂ جرح و تعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۵، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۶ تا ۴۸۹ تقریب التہذیب ص ۳۶۴، خلاصۂ تذہیب ص ۳۰۵، العبر ج ۱ ص ۲۶۴، التاریخ الصغیر امام بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی ملاحظہ ہو۔

جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے، لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی،
اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے، وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے
اور انھیں وضعی و جعلی قرار دیتے تھے، ایک بار وکیع سے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک
شیخ ہیں، ان کا نام ابو عصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلی بن ہلال کرتے تھے،

ابو عصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادان فن کے اقوال اور جرحیں درج کی جاتی ہیں۔

امام احمد :- وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحییٰ ابن معین :- نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی۔

وکیع :- ان کا کیا اعتبار، ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے،

امام بخاری :- ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث و ذاہب الحدیث ہیں۔

ابو حاتم، دولابی، امام مسلم، امام دارقطنی :- متروک الحدیث

ابو زرعہ :- ضعیف الحدیث۔

امام نسائی :- ابو عصمہ غیر ثقہ، غیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث نہیں لکھی جائیگی۔

جوزجانی :- ساقط الحدیث

ابن حبان :- ابو عصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کر کے حدیثیں
بیان کرتے تھے، وہ کسی صورت میں بھی حجت ہونے کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق
کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن خزیمہ، ابو علی نیشاپوری، حاکم :- کذاب تھے۔

خلیلی :- ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی :- متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتی تھیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم و فنون کا ارتقاء

(ایک اجمالی جائزہ)

حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

(۴)

مذکورۂ بالا جائزہ سے آٹھویں صدی ہجری بالخصوص اس کے آخری عہد کی علمی سرگرمیوں کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں جن فضلا نے علم و دانش کی شمعیں فروزاں کیں اُن میں سے اگر مشاہیر ہی کے سوانح و کارناموں کی تفصیل بیان کیجائے تو ایک مستقل ضخیم تصنیف تیار ہو سکتی ہے، ہم ذیل میں صرف ان چار ائمہ فن کے حالات اور علمی کارنامے پیش کرتے ہیں جنھیں علامہ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں "اعجوبۂ روزگار" اور "یکتائے عہد" قرار دیا ہے۔

سراج الدین ابن الملقن

نام و نسب عمر نام، ابو حفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا، پورا نسب نامہ یہ ہے: عمر بن علی بن احمد بن محمد بن عبد اللہ[1]، ابن الملقن اور ابن النحوی دونوں عرفیتیں ہیں، ان میں اول الذکر کو زیادہ شہرت حاصل ہے،[2]

عرفیت کی وجہ تسمیہ جب شیخ ابن الملقن ایک ہی سال کے تھے، ان کے والد داغ مفارقت دے گئے، انتقال کے وقت انھوں نے اپنے صغیر السن لڑکے کو شیخ شرف الدین عیسیٰ

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۱۹۷ و شذرات الذہب ج ، ص ۴۴

سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ راوی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں، ان پر زہد کا بڑا غلبہ تھا..... حافظ ذہبی کتاب العبر میں لکھتے ہیں..... وھو متروک الحدیث

(یہ متروک الحدیث ہیں) (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۲۴۴ و ۲۲۵ ۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسمٰعیل بن ابوالفضل قومسی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدد شخص نے المنتظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے؟ جنھوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات بھی گنائے مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا۔ مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ بجائے ائمہ اور ناقدین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم کے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے ظاہر بینوں کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہو جاتا۔

مستدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی ہے لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اس طرح کے بعض مواقع پر انھوں نے امام شافعی کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا

سے سماع کے لیے دمشق وغیرہ کے سفر بھی کیے، شیخ عیسیٰ المغربی نے طلب علم میں انکے انہماک کو دیکھکر ان کی تعلیم پر بے دریغ رقم خرچ کی، حافظ ابن فہد مکی کا بیان ہے کہ

کان وصیہ انفق علیہ قریباً من ستین الف درہم[1]	ان کے وصی نے ان پر تقریباً ساٹھ ہزار درہم کی رقم خرچ کی۔

شیوخ و اساتذہ | وہ دمشق، قاہرہ، حلب، بیت المقدس کے علاوہ مصر و شام کے علمی سرچشموں سے فیضیاب ہوئے تھے، اور فقہ، حدیث، عربیت اور قرأت کے ماہرین سے ان کی سندیں اور اجازت حاصل کی، ان میں چند ممتاز اور لائق ذکر اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو الفتح بن سید الناس، قطب الدین الحلبی، تقی السبکی، جمال الدین الاسنائی، کمال الشائی، عز بن جماعہ، ابی حیان، جمال بن ہشام، محمد بن عبد الرحمن بن الصائغ، برہان الرشیدی، سلیمان الاشبیطی، اسماعیل الدنیابی، علاء الدین مغلطائی، ابو بکر ابن قاسم الرحبی، حسن بن السدید، احمد بن کشتغدی، عبد الرحمن بن عبد الہادی، محمد بن غالی، جمال یوسف المعدنی، ابو القاسم المیدومی، ابن عبد الدائم، ابن امیلہ، تاج السبکی، حافظ مزی، ابن رجب، احمد بن محمد بن عمر الحلبی، احمد بن علی المستولی، محمد بن احمد الفارقی، ابراہیم بن علی الزرزاری،[2]

جلالت علمی | ان مشاہیر اساتذہ کے فیض نے ان کو جامع العلوم بنا دیا، انھوں نے بلا کسی تفریق کے ہر مسلک کی کتابیں پڑھی تھیں، اس لیے حدیث نبوی سے خصوصی اعتناء کے باوجود فقہ، رجال، اور زبان دانی میں بھی یکساں مہارت رکھتے تھے، علماء و محققین نے ان کے علمی مرتبہ کا پورا اعتراف کیا ہے، زرکلی لکھتے ہیں:

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۱۹۸ [2] الضوء اللامع ج ۹ ص ۱۰۱، شذرات الذہب ج ۷ ص ۹۴، لحظ الالحاظ ص ۱۹۹

المغربی کی کفالت میں دیدیا تھا، جو نہایت صالح بزرگ تھے، اور جامع ابن طولون میں قرآن پاک کی تلقین (تعلیم) دیتے تھے۔ بعد میں انھوں نے شیخ سراج الدین کی والدہ سے عقد بھی کرلیا تھا، شیخ سراج الدین نے انہی کے آغوش تربیت میں نشوونما پائی، اور اسی نسبت سے ابن الملقن مشہور ہوگئے[1]،

حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ شیخ ابن الملقن اس عرفیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور خود اپنے قلم سے اس کو لکھنا گوارا نہ تھا، اور عموماً وہ اپنے نام کے ساتھ عمر بن ابی الحسن النحوی لکھا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے والد علم نحو کے بہت ماہر تھے، یمن میں ان کی اسی عرفیت (ابن النحوی) کو شہرت حاصل ہوئی[2]،

مولد اور وطن | اصلاً ان کا تعلق اندلس کی وادی آش سے تھا، ان کے والد وقتاً فوقتاً نقل مکانی کرتے رہے، چنانچہ پہلے وہ اندلس سے افریقہ کے شہر تکرور آئے اور وہاں عرصہ تک تدریس و تعلیم میں مصروف رہے، پھر قاہرہ چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کرلی[3]، یہیں ۲۴ ربیع الاول ۷۲۳ھ کو شیخ ابن ملقن پیدا ہوئے[4]، علامہ سخاوی کا بیان ہے کہ انہوں نے شیخ کے قلم سے ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ ربیع الاول لکھی ہوئی دیکھی ہے، اسلیے اسی کو مرجح قرار دیا جائے گا[5]۔

تحصیل علم | ان کے مربی شیخ عیسیٰ المغربی نے ابتدا ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ رکھی پہلے خود ان کو قرآن پاک اور پھر عمدۃ الاحکام پڑھایا، اس کے بعد مقامی حفاظ حدیث سے سماع حاصل کرایا، حدیث کی طرف شروع ہی سے خاص رجحان تھا، اس لیے انھوں نے پوری محنت سے اس کی تحصیل کی، وقت کے ممتاز اور مشاہیر شیوخ حدیث

---

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۸ [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۷ و الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰ [3] الاعلام ج ۲ ص ۷۸۴
[4] شذرات الذہب ج ۶ ص ۴۴ [5] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰

صاحب التصانيف التی ما فتح علی غيره بمثلها فی هذه الاوقات[۱]

اور انھوں نے ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں جن کے مثل اس زمانہ میں کسی نے نہیں لکھیں

علامہ ابن حجر عسقلانی کو ان پر شدید نقد و جرح کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑا

ان العراقی والبلقينی وصاحب الترجمة (ابن الملقن) كانوا اعجوبة ذلك العصر الاول فی معرفة الحديث وفنونه والثانی فی التوسع فی معرفة مذهب الشافعی والثالث فی كثرة التصانيف[۲]

بلاشبہ عراقی، بلقینی اور ابن الملقن اس زمانہ کے اعجوبۂ روزگار ہیں، اول حدیث و متعلقات کی معرفت میں، دوسرے مذہب شافعی کی واقفیت میں اور تیسرے کثرت تصانیف میں

درس و افتاء | شیخ ابن الملقن نے مختلف مقامات پر درس و افتاء کی مجلسیں بھی آراستہ کیں۔

ابن عماد حنبلی کا بیان ہے:

تصدی للافتاء والتدريس دهراً طويلاً[۳]

وہ ایک زمانہ دراز تک تدریس و فتا کے صدر نشین رہے۔

۷۶۳ھ میں شیخ ابوسعید احمد الهکاری کی وفات کے بعد جامع حاکم[۴] میں تشنگان علم

---

[۱] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴ [۲] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۱۱ [۳] شذرات الذہب ج ۷، ص ۴۵

[۴] جامع حاکم کی بنیاد عزیز باللہ بن المعز نے رکھی اور حاکم بامر اللہ کے ہاتھوں ۳۹۳ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی، پہلے اس کا نام جامع الخطبہ تھا، لیکن اب جامع حاکم ہی کے نام سے مشہور ہے، یہ مسجد ۷۰۲ھ کے ہولناک زلزلہ میں تقریباً منہدم ہوگئی تھی، سلطان بیبرس نے اس کی از سر نو تعمیر کی، اور اس میں مذاہب اربعہ کے درس کا اہتمام کیا۔ (حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۱۳۹)

من اکابر العلماء بالحدیث	وہ حدیث، فقہ اور رجال کے کبار
والفقہ والرجال[1]	علماء میں سے تھے۔

حافظ برہان الدین العجمی کا جن سے ابن الملقن کو تلمذ کا شرف حاصل تھا، بیان ہے :-

حفاظ حدیث اربعۃ اشخاص	چار شخص حافظ حدیث ہیں اور وہ سب میرے
وھم من مشائخی، البلقینی وھو	شیوخ میں ہیں، پہلے بلقینی جو احادیث احکام
احفظھم لاحادیث الاحکام	کے سب سے بڑے حافظ تھے، دوسرے
والعراقی وھو اعلمھم بالصنعۃ	عراقی جو فقہ کے سب سے بڑے عالم تھے،
والھیثمی وھو احفظھم للاحادیث	تیسرے ہیثمی جو احادیث پر کلی عبور رکھتے
من حیث ھی، وابن الملقن	تھے، چوتھے ابن الملقن جنکی تصنیفات
وھو اکثرھم فوائد فی الکتابۃ[2]	فوائد کا خزینہ ہے۔

امام سخاوی ان کے علم و فضل کو ان الفاظ سے سراہتے ہیں :-

شیخ الاسلام علم الاعلام	وہ شیخ الاسلام، فاضل وقت، فخر خلائق
فخر الانام احد مشائخ الاسلام	شیخ دوران، علامۂ زمن، رئیس المصنفین
علامۃ العصر بقیۃ المصنفین	مفتی مسلمین اور مناظرین کی
علم المفیدین والمدرسین	تلوار تھے۔
سیف المناظرین مفتی المسلمین	

قاضی عفیف الدین شافعی ان کے بارے میں رقمطراز ہیں :-

ـــ احد مشائخ الاسلام	وہ اسلام کے کبار شیوخ میں سے تھے

[1] الاعلام ج ۲ ص ۲۰، [2] لحظ الالحاظ ص ۲۰۱ [3] الضوء اللامع ج ۲ ص ۱۰۴

وغالب تصانیفہ کالسرقۃ من کتب الناس[1]	لوگوں کی کتابوں کا چربہ و سرقہ ہیں۔

علامہ شوکانی کا بیان ہے کہ ابن حجر نے اس بیان میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا ہے، جو ہر منصف مزاج شخص پر ادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ

انہ من الائمۃ فی جمیع العلوم وقد اشتہر صیتہ وطار ذکرہ وسارت مؤلفاتہ فی الدنیا[2]	وہ تمام علوم کے امام تھے، اس کی شہرت ومقبولیت اور ان کی تصنیفات چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھیں۔

ابتلاء | فقہی مہارت کی بنا پر عدل و قضا کی مسند پر متمکن ہوئے، اور ایک طویل مدت تک اپنے فرائض منصبی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، ۸۰۰ھ میں اس سے گلو خلاصی حاصل کرنی چاہی، بعض بدخواہوں نے صلاح دی کہ وہ شاہ سے مالی مطالبہ کریں، شیخ اپنی سادہ لوحی سے اس فریب میں آگئے، سلطان برقوق ابن الملقن سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اور ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتا تھا، اس لیے اس مطالبہ پر شیخ کی جانب سے اس کو سوء ظن پیدا ہو گیا، اور اس کے نتیجہ میں ان کو بڑے ابتلاء و آزمائش سے گذرنا پڑا، جس سے امام اکمل الدین حنفی کی کوششوں سے نجات پائی،[3]

مناقب و فضائل | علمی جلالت کے ساتھ ابن الملقن گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے، مروت ثقاہت تواضع، اخلاق اور محبت و رافت ان کے خمیر میں داخل تھے، علمی وتدریسی مصروفیات کے باوجود مزاج میں خوش طبعی تھی، ہمیشہ باغ و بہار رہتے تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ

---

[1] ایضاً النافع ج ۲ ص ۵۰۸ [2] ایضاً [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴ و ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۹۹

کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا۔ اس کے بعد دارالحدیث الکاملیہ[1] میں قال اللہ و قال الرسول کے نغمے سنائے۔ اس درسگاہ کے شیخ الشیوخ امام زین الدین العراقی کے ۷۸۸ھ میں مدینہ کے منصب قضا پر مامور ہونے کے بعد شیخ ابن الملقن دارالحدیث الکاملیہ کے منصب صدارت پر فائز ہوئے، اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی[2]، یہاں وہ افتاء کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

حافظ ابن حجر کا نقد | حافظ ابن حجر نے شیخ ابن الملقن پر بڑی سخت تنقید کی ہے، وہ نہ صرف حدیث میں ان کے عدم اتقان کے قائل ہیں، بلکہ شیخ کے تلامذہ کے حوالہ سے درس و افتاء میں بھی ان کی مہارت کے منکر ہیں۔ اس سلسلہ میں ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں:

لم يكن في الحديث بالمتقن ولا	وہ حدیث میں غیر متقن تھے، ان سے
له ذوق أهل الفن وقال الذين	تحصیل علم کرنے والوں کا بیان ہے کہ وہ
قرأوا عليه قالوا لم يكن ماهرا	نہ تو افتا میں ماہر تھے اور نہ تدریس کی مہارت
في الفتوى ولا التدريس وإنما	رکھتے تھے، اکثر ان کے روبرو انہی کی تصنیف
كانت تقرأ عليه مصنفاته في	پڑھی جاتی تھیں اور وہ انہی میں تقریر کرتے تھے
الغالب فيقرر ما فيها ولا	نہ تو مسائل کا استحضار انہیں حاصل تھا اور
يستحضر شيئا ولا يحقق علما	نہ علم کی تحقیق۔ ان کی اکثر تصانیف

---

[1] تذکرہ حافظ [illegible] دارالحدیث [illegible] دارالحدیث الکاملیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روئے زمین کا دوسرا دارالحدیث ہے۔ اس سے قبل سلطان نورالدین محمود زنگی نے دمشق میں ایک دارالحدیث قائم کیا تھا۔ پھر سلطان کامل نے مذکورہ بالا ادارہ کی بنیاد رکھی۔ [illegible] اس دارالحدیث کی مسند صدارت پر ابوالخطاب عمر بن دحیہ، حافظ زکی الدین منذری، محدث ابن سراقہ، تاج الدین [illegible] ابن دقیق العید، حافظ ابن المنیر [illegible] اور شیخ ابن الملقن جیسے منتخب روزگار فضلاء رونق افروز ہوئے (حسن المحاضرہ [illegible])
[2] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۴۳

مسلک | مسلکاً شافعی تھے، فقہ شافعی میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، طبقات الفقہاء الشافعیہ کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف کی تھی جس میں امام شافعی کے عہد سے ۸۰۰ھ تک کے رجال شافعیہ کے تراجم ہیں۔

حلیہ | دراز قامت اور نہایت حسین و خوبرو تھے،[1]

وفات | ۸۱ سال تک علم و دانش کی روشنی پھیلانے کے بعد ۱۶ ربیع الاول ۸۰۴ھ کی شب جمعہ کو قاہرہ میں راہی عالم جاوداں ہوئے، باب النصر کے باہر مقام حوش الصوفیہ میں اپنے والد کی قبر کے پاس سپرد خاک کیے گئے، اہل قاہرہ نے ان کی وفات پر بے انتہا رنج والم کا اظہار کیا جس سے ان کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔[2]

تصنیف و تالیف | ابن الملقن کے صحیفہ کمال کا سب سے درخشاں باب کثرت تصانیف ہے، اس میں ان کی مثالیں کم ہیں، حافظ ابن حجر تک اپنی نقد و جرح کے باوجود انھیں اس حیثیت سے آٹھویں صدی کا اعجوبہ قرار دیتے ہیں[3] انھیں عنفوان شباب ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق تھا، حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ نوجوانی ہی میں وہ اپنے زمانہ کے علماء میں کثرت تصانیف کے اعتبار سے ممتاز ہو گئے تھے،[4] پھر جب منصب قضا سے سبکدوش ہوئے تو پوری توجہ سے اس کام میں لگ گئے، علامہ ابن فہد مکی کا بیان ہے:

…… فاخذ فی التصنیف	وہ ہمہ تن تصنیف و تالیف میں لگ گئے اور
واکب علیہ فکان فرید الدھر	بہترین عبارت و حسن بیان اور کثرت
فی کثرۃ التصانیف احسنھا	تصانیف میں یگانۂ روزگار تھے۔
بعبارۃ جلیۃ حسنۃ	

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [2] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵ و لحظ الالحاظ ص ۳۶۵ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵ [4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۸۶

كان يحب المزاح والمداعبة — وہ مزاح اور خوش طبعی کو پسند کرتے تھے

مع ملازمة الاشتغال والكتابة — اور تصنیف وتالیف وغیرہ مشاغل کے

حسن المحاضرة جميل الاخلاق — باوجود نہایت خوش گفتار، خوش اخلاق

كثير الانصاف[1] — اور منصف مزاج تھے۔

علامہ مقریزی جنھیں شیخ ابن الملقن کی سالہا سال کی صحبت اور تلمذ کا شرف حاصل ہے العقود الدرریہ میں رقمطراز ہیں:۔

هو من اعذب الناس لفظا — وہ سب سے زیادہ شیریں گفتار، خوش

واحسنهم خلقا واجملهم — اخلاق، صاحب جمال اور باوقار

صورة واعظمهم محاضرة — تھے۔

حافظ ابن فہد لکھتے ہیں:۔

كثير المروءة والاحسان و — وہ ہر شخص کے ساتھ مروت، احسان

التواضع والكلام الحسن لكل — وسلوک، تواضع وانکسار اور شیریں

انسان[2] — زبانی سے پیش آتے تھے۔

فقراء واہل خیر کے ساتھ خاص طور سے بڑی محبت اور ان کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

كثير المحبة للفقراء واهل الخير — فقراء واہل خیر سے بہت محبت کرتے

والتبرك بهم مع التعظيم الزائد — ان سے برکت حاصل کرتے اور غیر معمولی

لهم[3] — تعظیم وتوقیر کے ساتھ پیش آتے۔

جامع حاکم میں ہر سال اعتکاف کا معمول تھا۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۰۰ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴

یوم الجمعۃ سابع عشرین من جمادی الاولیٰ سنۃ ثلاث وستین وسبعمائۃ میں فراغت پائی۔

اس کا ۱۲۳۲ھ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

عجالۃ المحتاج الی توجیہ المنہاج ۔ یہ امام نووی (۶۷۶ھ) کی مشہور تصنیف "منہاج الطالبین" کی شرح ہے جو شافعی مذہب کے مطابق فقہی کتاب ہے، اس کی بہت سی شروح لکھی گئی ہیں۔ ابن الملقن نے بھی زیر نظر شرح کے علاوہ "منہاج" کی دو شرحیں اور بھی تحریر کی ہیں، اس میں کتاب الطہارۃ سے کتاب امہات اولاد تک کی نہایت خوش اسلوبی سے شرح لکھی گئی ہے، سنہ تصنیف ۷۶۳ھ، تعداد صفحات ۵۹۰، رام پور کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ مزید کتابوں کی تفصیل سخاوی کی الضوء اللامع، شوکانی کی البدر الطالع اور ابن فہد کی لحظ الالحاظ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ایک عظیم المیہ عمر کے آخری حصہ میں ان کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آگیا جو نہ صرف انکی موت کا سبب بنا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے علمی خسارہ تھا، شیخ ابن الملقن عمدہ کتابوں کے بڑے شائق تھے، ان کے پاس بکثرت کتابیں جمع تھیں، ان میں کچھ تو ان کی ذاتی تھیں اور کچھ مدارس سے مستعار لی تھیں، ایک دن ان کے مکان میں آگ لگ گئی جس پر کوشش کے باوجود قابو حاصل نہ کیا جاسکا، اس آتش زدگی میں نہ صرف ان کتابوں کا بڑا ذخیرہ جل کر خاکستر ہوگیا، بلکہ شیخ کی تصانیف کے اکثر مسودات بھی ضائع ہوگئے، اور اب شیخ کی کثرت تصانیف کا ذکر صرف طبقات و تراجم کی کتابوں میں ملتا ہے۔

اس المیہ کا شیخ کے اعصاب پر بہت شدید اثر ہوا اور وہ دماغی توازن

حدیث وفقہ وغیرہ علوم ہیں ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد تین سو[300] کے قریب ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ ان میں خود تصنیف وتالیف کی اہلیت وصلاحیت نہ تھی، اور انکی بیشتر کتابیں دوسرے مصنفین کا سرقہ ہیں لیکن عقلاً بھی یہ خیال صحیح نہیں ہے، اور شوکانی وغیرہ محققین نے بھی اس کی پوری تردید کی ہے[5]،

ان کی اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

تخریج احادیث الرافعی (۷ جلدیں)، المحرر المذہب فی تخریج احادیث المہذب (۲ جلد) شرح العمدہ المسمی بالاعلام (۳ جلد)، طبقات الفقہاء الشافعیہ، طبقات المحدثین، شرح المنہاج (۶ جلد)، شرح التنبیہ (۴ جلد)، شرح الحاوی الصغیر (۲ جلد)، المقنع فی علوم الحدیث، شرح بخاری (۲۰ جلد)، شرح زوائد مسلم علی البخاری (۴ جلد)، زوائد ابی داؤد علی الصحیحین (۲ جلد) زوائد ابن ماجہ علی الخمسہ (۳ جلد)، شرح التبریزی، اکمال تہذیب الکمال (اس میں احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی، حاکم کے تراجم ہیں)، الخصائص النبویہ، طبقات القراء، طبقات الصوفیہ، شرح الفیہ ابن مالک، البدر المنیر فی تخریج احادیث الشرح الکبیر (۶ جلد)، شرح الاربعین النوویہ، زوائد مسلم وابی داؤد، تحفۃ المحتاج الی ادلۃ المنہاج (۸ جلد)، شرح منہاج البیضاوی، الاشباہ والنظائر۔

تذکرہ فی علوم الحدیث۔ اصول حدیث میں ایک مختصر رسالہ ہے، اس میں مولف نے اپنی طویل کتاب مقنع سے اخذ واستفادہ کیا ہے، مصنف کی تصریح کے مطابق یہ صرف دو گھنٹوں میں لکھا گیا ہے

فرغت من تحریر ہذہ التذکرۃ
فی نحو ساعتین من صبیحۃ

میں نے ۲۰ رجمادی الاولیٰ بروز جمعہ ۷۶۳ھ کو
اس یادداشت کی تحریر سے دو گھنٹہ

[5] البدر الطالع ترجمہ ابن الملقن

علماء واصحاب کمال کا بہت بڑا مرکز شمار ہوتا تھا، شیخ البلقینی نے یہاں کے شیوخ سے پورا استفادہ کیا، پھر وطن واپس گئے، اگلے سال ۷۳۷ھ میں دوبارہ قاہرہ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔[1]

تحصیل علم اس کے بعد قاہرہ اور دمشق وغیرہ کے علمی سرچشموں سے فیض حاصل کیا، سب سے پہلے فقہ، اصول، فرائض اور نحو کی تحصیل کی اور ان میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ اپنے ہمعصروں سے آگے نکل گئے، پھر حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اپنے عہد کے ممتاز حافظ حدیث شمار ہوئے۔

شیوخ شیخ البلقینی کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے، انھوں نے ہر فن کے نامور ائمہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، چنانچہ فقہ میں شیخ تقی الدین السبکی، شمس الدین ابن عدلان، محمد بن القماح، نجم الدین بن الاسوانی، زین الدین الکنانی، اور عز بن جماعہ، اصول میں شمس الدین الاصبہانی، حدیث میں شمس الدین، محمد بن القماح، محمد بن غالی، شہاب بن کشتغدی، ابوالفرج بن عبدالہادی، حسن بن السدید، اسماعیل بن ابراہیم التفلیسی، عبدالرحیم بن شاہد الجیش، ابوالفتح المیدومی، ابواسحاق ابراہیم الحلبی، ابوالعباس احمد ابن محمد الحلبی، اور نحو وادب میں ابوحیان اور ابن عقیل کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کی، علاوہ ازیں حافظ مزی، ذہبی، حزری اور ابن نباتہ وغیرہ اکابر مشائخ وقت نے انھیں سند اجازہ عطا کی تھی۔[2]

درس حصول کمال کے بعد مصر کی متعدد و قدیم درسگاہوں میں درس و افادہ کی مجلسیں گرم کیں، جامع عمرو[3] کے مدرسہ خشابیہ میں تقریباً تیس سال اور جامع ابن طولون[4] میں ایک

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۵ [2] ایضاً [3] جامع عمرو بن العاص اپنی عظمت وشان کی بنا پر تاج الجوامع کے نام سے مشہور تھی، ۲۱ھ میں تعمیر ہوئی، کہا جاتا ہے کہ (باقی ص ۲۰۲ پر)

گھر بیٹھے، اور وفات تک مکان ہی میں گوشہ گیر رہے،[۱] ابن عماد حنبلی کا بیان ہے

کان ذهنه مستقیما قبل ان	کتابوں کے جلنے سے پہلے ان کا
تحترق کتبه ثم تغیر حاله	دماغ درست تھا، پھر اسکے بعد
بعد ذالک[۲]	حالت بگڑ گئی۔

عمر بن رسلان بلقینی

نام و نسب عمر نام، ابوحفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا،[۳] نسب نامہ یہ ہے:
عمر بن رسلان بن نصیر بن صالح بن احمد بن احمد بن محمد بن شہاب بن عبد الخالق بن محمد ابن مسافر[۴] وطن مالوف بلقین کی طرف منسوب ہو کر بلقینی کہلاتے ہیں۔

ولادت ۱۲ر شعبان ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء کو مصر کے مشہور مقام بلقین میں پیدا ہوئے،[۵] علامہ سیوطی نے شعبان کے بجائے رمضان لکھا ہے[۶] لیکن اکثر تذکروں سے اول الذکر ہی کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے اجداد میں سب سے پہلے صالح بن احمد نے بلقین میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

نشو ونما انھوں نے ابتداءً بلقین ہی میں نشو ونما پائی اور سات سال کی عمر میں کلام پاک حفظ اور فقہ میں المحرر، اصول میں مختصر ابن الحاجب قرأت میں شاطبیہ اور نحو میں الکافیہ لابن مالک کو بھی زبانی یاد کر لیا، ۷۳۶ھ میں جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی، ان کے والد انھیں اپنے ہمراہ قاہرہ لے آئے، جو اس وقت

---

[۱] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۵، [۲] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۷ [۳] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵
[۴] نظم العقیان ص ... [۵] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [۶] ایضاً

وکان مع ذلک لایحب ان یدرس	اس تبحر علمی کے باوصف وہ بغیر مطالعہ کے
الا بعد المطالعہ[1]	درس دینا پسند نہیں کرتے تھے ۔

تلامذہ ان کے علمی کمالات اور درس کی شہرت کی بنا پر دور دراز ملکوں کے شائقین علم انکے حلقہ میں جمع ہوگئے، جن میں عام طلبہ کے علاوہ بڑے بڑے مفسرین، محدثین اور فقہا شامل تھے اور ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا،

ابن فہد کا بیان ہے کہ

رحل الیہ الطلبۃ من الآفاق	دور دراز ممالک کے طلبہ ان کسب
الشاسعۃ للقراءۃ علیہ	فیض کے لیے سفر کرکے آتے، اور انکے
فانتفعوا بہ وتخرج بہ خلائق	حلقہ درس سے بے شمار طلبہ فارغ ہوئے
لا یحصون وخضع لہ الائمۃ	اور اکابر مفسرین، فقہاء محدثین
من المفسرین والمحدثین	اصولیین اور نحویین نے ان کے سامنے
والفقہاء والاصولیین	زانوے تلمذ تہ کیا ۔
والنحویین[2]	

مصر کے شافعی علماء و فضلا بالخصوص ماہرین فرائض کی اکثریت ان ہی کے فیض صحبت کی پروردہ ہے، حافظ ابن فہد ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

قرأ علیہ خلائق وانتفعوا بہ	ان سے ایک بڑی جماعت نے استفادہ کیا
حتی ان اکثر الفضلاء بالدیار	یہاں تک کہ اس وقت مصر کے اکثر
المصریۃ الآن من الفقہاء الشافعیۃ	شافعی فقہاء ان کے تلامذہ یا تلامذہ
تلامذتہ وتلامذۃ تلامذتہ[3]	کے تلامذہ تھے ۔

---

[1] الضوء اللامع جلد ۲ ص ۰۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۱۱۳ [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۰۹

عرصہ تک تفسیر و حدیث کا درس دیتے رہے[1] مدرسہ حجازیہ اور مدرسۃ الخزرجیہ میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں[2] ان کے درس سے ایک مخلوق فیضیاب ہوئی، انکا درس گوناگوں خوبیوں کا حامل تھا، وہ ایک ایک حدیث کی شرح و توضیح میں گھنٹوں صرف کرتے تھے، بغیر پوری تیاری اور مطالعہ کے درس نہ دیتے تھے، سخاوی کا بیان ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۱) اسی صحابہ کرام نے مل کر اس کے سمت قبلہ کو درست کیا تھا، جن میں حضرت زبیرؓ بن العوام، مقداد بن الاسود، عبادہ بن الصامت، ابو الدرداء، ابو ذر، ابو بصرہ، محمیہ بن جزء الزبیدی، نبیہ بن صواب، فضالہ بن عبید، عقبہ بن عامر اور رافع بن مالک وغیرہ بھی شامل تھے، ابتداً اس مسجد کا طول پچاس گز اور عرض تیس گز تھا، ۵۳ھ میں اہل شہر نے حاکم مصر مسلمہ بن مخلد سے اسکی تنگ دامانی کی شکایت کی، اس نے خلیفہ وقت حضرت امیر معاویہؓ کے ایما سے اس میں اضافہ کیا [illegible] کے حکمران اپنے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق تعمیر و اضافہ کرتے رہے، اس طرح پہلی صدی سے آٹھویں صدی تک جبکہ اسکی عمارت کمال کو پہنچی، اس تاریخی مسجد نے زمانہ کے بہت سے انقلابات کا مشاہدہ کیا، آخر [illegible] (حسن المحاضرۃ للسیوطی ج ۲ ص ۱۳۵)

[3] یہ مسجد امیر ابو العباس احمد بن طولون نے [illegible] خطیر رقم سے تعمیر کرائی، اسکی تعمیر کی ابتدا ۲۶۳ھ اور تکمیل ۲۶۶ھ میں ہوئی، خطیب کا بیان ہے کہ ایک دن امیر [illegible] شکار [illegible] ایک جگہ اسکے گھوڑے کے پاؤں ریت میں دھنس گئے [illegible] تو وہاں سے کروڑوں دینار کا دفینہ برآمد ہوا، امیر مذکور نے اس رقم کو صدقہ و خیرات میں صرف کیا [illegible] مسجد کی تعمیر میں لگایا، سلطان لاجین نے شاہ اشرف کو قتل کرنے کے بعد اسی مسجد [illegible] سے اسکی تجدید و تزئین کی اور اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور طب وغیرہ مختلف علوم [illegible] تشنگان علم سیراب ہوئے

[4] حسن المحاضرۃ [illegible]

حواشی ص ۲۰۴ [1] [illegible] ص ۱۳۰ - ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۰

[2] حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۸۰

درسًا من الروضة و اذن لی[1] عام مجلس میں دی اور میں نے ان سے روضہ کے کچھ اسباق پڑھے، پھر شیخ نے مجھے سند اجازت دی۔

حدیث | یوں تو حافظ بلقینی جملہ اسلامی علوم و فنون کے جامع تھے، لیکن حدیث و فقہ ان کے فکر و نظر کا اصل جولانگاہ اور ان کی کلاہ افتخار کا طرۂ امتیاز تھے، حدیث کی تحصیل میں انھوں نے بڑی محنت صرف کی تھی، رجال و انساب اور حدیث کے حفاظ میں وہ وقت کے بلند مرتبہ شیوخ سے بھی فائق تھے، حدیث میں ان کے فضل و کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے حلقۂ درس میں مذاہب اربعہ کے ممتاز علماء اور طالبان علم کا انبوہ عظیم جمع رہتا تھا خصوصًا احادیث احکام اور مذہب شافعی کی معرفت میں ان کی نظیر معاصر علماء میں نہیں ملتی، اس حیثیت سے حافظ ابن حجر انھیں نابغۂ عصر اور نادرۂ روزگار قرار دیتے ہیں[2]۔

شیخ برہان حلبی جنھیں حافظ بلقینی سے تلمذ کی سعادت حاصل ہے، بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث پر صبح سویرے سے ظہر کے قریب تک کلام کرتے رہتے، اور بسا اوقات نماز ظہر کی اذان بھی ہو جایا کرتی اور ان کی تقریر جاری رہتی[3]۔

فقہ | حدیث کی طرح فقہ میں بھی انھیں پورا کمال حاصل تھا، اس فن میں انھوں نے دوسرے شیوخ کے علاوہ شمس الدین بن عدلان، عز بن جماعۃ، اور شمس الدین محمد بن القماح کے خرمن کمال سے خصوصی استفادہ کیا تھا[4]۔ اور اپنے عہد میں فقہ بالخصوص فقہ شافعی کے سب سے بڑے حافظ شمار ہوتے تھے، قاضی صفد رقمطراز ہیں:

انتهت الیہ مشیخۃ الفقہ فی وقتہ[5] ان کے زمانہ کی فقہ کی امامت ان پر ختم تھی،

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۲ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۶ [4] ایضًا ص ۸۶ [5] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶

اور خود بلقینی کا بیان ہے کہ

ما احد یقرأ الفرائض الا — جو شخص بھی فرائض سے واقفیت رکھتا ہے وہ
وھو تلمیذی او تلمیذ تلمیذی[1] — یا تو میرا شاگرد ہے یا میرے شاگرد کا شاگرد

لیکن ان کے بہت کم تلامذہ کے حالات ملتے ہیں، طبقات و تراجم کی کتابوں سے جو نام معلوم ہو سکے ان میں نمایاں اور لائق ذکر یہ ہیں:۔

بدر الدین الزرکشی، ابن العماد، ابن جماعہ، ابن ناصر الدین، برماوی، ولی العراقی، برہان الدین الحلبی، جمال بن ظہیرۃ، زین الدین الفارسکوری، محب الدین بن نصر اللہ، ابن عمار، علامہ ابن حجر عسقلانی، التنسی، تقی الدین الفاسی، الشمس الشنی، ان میں تنہا علامہ ابن ناصر الدین اور حافظ ابن حجر نے دنیائے علم و فضل میں جو نام پیدا کیا وہی شیخ بلقینی کی حیات جاوداں کے لیے کافی ہے، ان میں ابن ناصر الدین کو ان کے تبحر علمی کی بنا پر زبان خلق نے حافظ دمشق کے خطاب سے نوازا، اور ابن حجر کی شخصیت تاریخ اسلام کا ایک زریں باب ہے، حافظ ابن حجر نے بلقینی سے اپنے تلمذ کا ذکر بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

خرجت له اربعین حدیثاً — میں نے ان کے واسطہ سے چالیس شیوخ
عن اربعین شیخا حدث بها — سے چالیس احادیث کی تخریج کی جنھیں
مرارا وقرأت علیه دلائل — شیخ نے بار بار روایت کیا اور میں نے
النبوۃ للبیهقی فشهد لی بالحفظ — ان سے بیہقی کی دلائل النبوۃ پڑھی
فی المجلس العام [illegible] — چنانچہ شیخ نے میری قوت حافظہ کی شہادت

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۹

ان کے خسر بہاء الدین عقیل کہا کرتے تھے کہ بلقینی اپنے زمانہ میں فتویٰ نویسی کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔[۱]

حافظ بلقینی کا معمول تھا کہ روزانہ نماز عصر کے بعد افتاء کے لیے بیٹھتے اور غروب آفتاب تک اس میں مصروف رہتے۔ بیشتر وہ اپنے حافظہ کی مدد سے قلم برداشتہ فتوی لکھتے تھے، لیکن کسی مسئلہ میں اشتباہ ہو جاتا تو کتابوں سے اس کی پوری تحقیق کرتے۔ اور جب تک ان کا قلب مطمئن نہ ہو جاتا، فتویٰ دینے سے احتراز کرتے۔ اور یہ ان کی حقیقت اور عالی ظرفی کی دلیل ہے کہ فقہی کتابوں کی طرف رجوع کرنے میں انھیں کوئی عار محسوس نہ ہوتا تھا۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ شیخ بلقینی کو افتا میں اس قدر مہارت اور کمال حاصل تھا کہ اکابر علمائے فن کی گردنیں ان کا نام سنکر خم ہو جاتی تھیں۔ علامہ اسنوی جیسے کہنہ مشق فقیہ بھی ان کی موجودگی میں حتی الامکان فتویٰ دینے سے محترز رہتے۔[۳]

عدل و قضا اس کمال تفقہ ہی نے انھیں عدل و قضا کی مسند تک پہنچایا اور وہ دمشق اور مصر میں مدتوں اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے۔ سب سے پہلے ۷۶۹ھ میں علامہ تاج الدین سبکی کی جگہ شام کے قاضی مامور ہوئے[۴]، دمشق اس وقت ایک بڑا علمی مرکز تھا۔ اور وہاں علماء و فضلاء کی بڑی کثرت تھی لیکن حافظ بلقینی کے تفوق و برتری پر سب متفق تھے۔ اور علمائے دمشق میں کسی نے بھی ان سے اختلاف رائے کی جرأت نہیں کی۔[۵] اس منصب پر وہ تقریباً ایک سال تک فائز رہے۔ اس کے بعد امیر طشتمر الدوادار نے انھیں مصر کی مسند قضا سپرد کی، جسے انھوں نے عرصہ تک انجام دیا، پھر اس سے سبکدوشی اختیار کر لی، اور ماہ صفر ۷۷۰ھ میں دمشق واپس آکر علمی مشاغل میں منہمک ہو گئے۔[۶] علامہ شوکانی نے مصر میں ان کے متعدد

۱؎ حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۰ ۲؎ لحظ الالحاظ ص ۲۱۱ ۳؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ ۴؎ شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

۵؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ ۶؎ ذیل طبقات الحفاظ ص [illegible]

ان کی فقہی مہارت اور شہرت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہر مذہب و مسلک کے فضلاء ان کے حلقۂ درس میں شرکت کو باعثِ افتخار تصور کرتے تھے، حافظ ابن فہد لکھتے ہیں:

ممن کان یحضر عندہ الامام	ان کے حلقۂ درس میں جو لوگ حاضر ہوتے
نورالدین ابن الجلال وکان	تھے ان میں امام نورالدین بن الجلال بھی
افقہ اھل القاھرۃ یومئذ فی	تھے، جو اس وقت قاہرہ میں مذہب مالکی
مذھب مالک[۱]	کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

تقی الفاسی کا بیان ہے کہ وہ فقہ و حدیث میں بڑی وسیع اور گہری بصیرت رکھتے تھے،[۲] محدث برہان الدین کا ارشاد ہے کہ میری آنکھوں نے فقہ اور احادیث احکام کا ان سے بڑھ کر حافظ نہیں دیکھا۔[۳]

افتاء: فقہ میں مہارت کی بنا پر افتاء میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، ان کے اساتذہ نے ۱۵ سال کی عمر میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت دیدی تھی، جو ایک منفرد مثال ہے، ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں:-

اشتغل علی علماء عصرہ واذن[۱]	انھوں نے علمائے عصر سے اکتساب علم کیا اور صرف ۱۵ سال
فی الفتیا وھو ابن خمس عشرۃ سنۃ[۲]	کی عمر میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی،

عمر وقت کی رفتار کے ساتھ ان کی فقہی مہارت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا، اور استفتا [illegible] ان کے پاس آنے لگا۔ ابن فہد لکھتے ہیں:-

وردت علیہ الفتوی بحیث انھا کانت	دور دراز ممالک سے ان کے پاس
تاتیہ من اقطار الارض البعیدۃ[۵]	فتوے آنے لگے۔

[illegible] [۲] [illegible] [۳] [illegible] [۴] شذرات الذہب ج [illegible] ص [illegible] [۵] [illegible]

[illegible]

جیسے القاب سے ان کا ذکر کیا گیا ہے،

حافظ ابن فہد مکی نے انکے علم و فضل کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے،

ھو اعجوبۃ الدھر خاتمۃ المجتھدین	وہ اعجوبۂ روزگار، خاتمہ مجتہدین .....
..... شیخ وقتہ وحجتہ وامام زمانہ	شیخ وقت، حجت عصر، امام دوراں، نادرۂ
نادرتہ فقیہ الزمان بالاتفاق	زمن اور بالاتفاق فقیہ عہد تھے، اپنے
شیخ الاسلام علی الاطلاق اعلم	زمانہ میں تمام علوم کے سب سے بڑے عالم
اھل عصرہ بجمیع العلوم واذکاھم	اور عقلی و نقلی امور کے سب سے بڑے واقفکار
بالمفھوم والمنطوق مفتی الانام	تھے، اسی طرح وہ مفتی خلائق، سلطان
ملک العلماء الاعلام عون	علم و علماء، مسلمانان و اسلام کی حامی
الاسلام والمسلمین وحجۃ	اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق پر حجت
اللہ تعالیٰ علی خلقہ اجمعین [1]	و برہان تھے،

قوت حفظ و استحضار | مبدأ فیاض نے انھیں قوت حفظ، کثرت استحضار اور سرعت ادراک سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا، ابن عماد لکھتے ہیں :-

وکان اعجوبۃ زمانہ حفظاً	وہ اپنے زمانہ میں حفظ و استحضار کے
واستحضاراً ..... واعترفت لہ	اعتبار سے ایک عجیب و غریب شخص تھے ....
علماء جمیع الاقطار بالحفظ و	پوری دنیا کے علماء نے انکی قوت حافظہ اور
کثرۃ الاستحضار [2]	کثرت استحضار کا اعتراف کیا ہے۔

ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ کے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں، ۶۷۳ھ میں جب وہ اپنے والد کے ہمراہ مصر گئے تو ان کی ..... کل بارہ سال کی تھی، اس کم عمری میں انھوں نے

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ [2] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

کان فیہ من قوت الحافظہ	قوت حافظہ اور شدت ذکاوت
وشدۃ الذکاء مالم یشاھد	میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔
فی مثلہ[1]	

شیخ ابن الجبل نے ایک بار خود حافظ بلقینی سے کہا

مارأیت بعد ابن تیمیۃ	میں نے ابن تیمیہ کے بعد تم سے بڑا
احفظ منک[2]	حافظ نہیں دیکھا۔

(باقی)

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۱۲ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶

حیات شبلی

یہ نو سو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ملی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں متن اور حاشیہ دونوں میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی آگئے ہیں جن کا اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں، یہ بہت عرصہ سے ختم تھی، اب اس کا نیا اڈیشن بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے، اور پچھلے اڈیشن کی ہو بہو نقل ہے۔

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

قیمت :- ۱۷ روپے ۵۰ پیسے

منیجر

مصر کے ممتاز علماء کے سامنے جب اپنے معلوماتِ زبانی پیش کیے تو وہ ان کی ذہانت و فطانت اور سرعتِ ادراک کو دیکھ کر ششدر رہ گئے[1]، اسی طرح ۷۳۸ھ میں جب دوبارہ قاہرہ آئے اور مدرسہ کاملیہ میں مقیم ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد مدرسہ کے نگراں سے ایک مکان کی درخواست کی، اس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اسی اثناء میں ایک شاعر آیا اور اس نے شیخ کی موجودگی میں ایک قصیدہ سنایا، شاعر کے چلے جانے کے بعد حافظ بلقینی نے ناظر کاملیہ سے فرمایا کہ میں یہ قصیدہ زبانی سنا سکتا ہوں، ناظر نے کہا اگر آپ سنا دیجئے تو میں آپ کے لیے مکان کا انتظام کر دوں گا، حافظ بلقینی نے اسی وقت پورا قصیدہ سنا دیا، اس کو سنکر ناظر نے باب المیضاۃ کی بالائی منزل میں انکو ایک مکان دیدیا[2]۔

علامہ ابن حجر کا بیان ہے:-

کان احفظ الناس بمذهب الشافعي واشتهر بذلك وطبقة شيوخه موجودون قدم علينا دمشق قاضياً وهو كهل فبهر الناس بحفظه وحسن عبارته وقوة معرفته[3]	وہ مذہب شافعی کے سب سے بڑے حافظ تھے، اپنے شیوخ کی موجودگی ہی میں ان کو اس حیثیت سے شہرت حاصل ہو گئی جس وقت وہ ہمارے پاس دمشق آئے کافی بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن اس وقت انھوں نے اپنی قوت حافظہ، حسن عبارت اور قوت معرفت سے لوگوں کو متحیر کر دیا۔

حافظ برہان الدین کہتے ہیں:-

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۶

جاری کردہ نصاب تعلیم — درس نظامی — اکیلے اپنے عہد ہی میں نہیں، صدیوں بعد تک علم وفضل کا اعلیٰ معیار بنا رہا اور وہ جس کی معقولات کی ہمہ گیری اوجِ کمال تک پہنچی ہوئی تھی، ایک اَن پڑھ اور اُمیِ محض کے آستانے پر جبینِ عقیدت رکھے نظر آئے، تو تاریخ کا طالب علم، اس جگہ حیرت کے ساتھ کھڑا اس نادر الوقوع واقعے کے اسباب وعلل پر پوری توجہ صرف کرتا نظر آئے گا، بلاشبہہ اس بظاہر عجیب واقعہ میں استاذ الہند کی سیرت اتنی زیادہ معرضِ بحث میں نہیں آئے گی جتنی اس مرشد اور پیرِ طریقت کے علوِ مرتبت کی تحقیق اور تفتیش جس نے منطق وفلسفہ کے امام الوقت کو اپنی تربیت وارشاد کا محتاج بنا کر رکھ دیا، اور چونکہ اس علوئے مرتبت کا ادراک ہر کس وناکس کے اختیار سے باہر ہے اس لیے جو اس میدان کا نہیں ہے وہ حیرت میں مبتلا رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہوگیا کہ اتنا بڑا فاضل ایک اَن پڑھ پیرِ طریقت کا اس درجہ عقیدت مند!

یہ حیرت ذہنوں میں صرف ایک خلش بن کر نہیں رہ سکتی تھی اور نہیں رہی، دوسرے نہیں، خود گھر والے۔ ملا صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا، حیرت ہی نہیں بلکہ خاصی ناراضگی کے ساتھ کہتے تھے:

عجب است از تو، کہ با ایں علم ووقار	آپ سے تعجب ہے کہ اس علم وعزت کے باوجود
بیعت فقیر جاہل ناخواندہ کردۂ وعزت	ایک ناخواندہ جاہل فقیر کی بیعت کرلی
خاندان خود را نگاہ نداشتی؟	اور خاندان کی عزت کا بھی کوئی پاس نہیں کیا،

حلیم الطبع بڑے بھائی، چھوٹے بھائی کے اس طنز پر غصہ نہیں ہوتے، صرف اتنا کہہ دیتے تھے

محمد رضا! ایں کیفیتے است کہ ادراکش	محمد رضا! جس معاملے پر تم اعتراض کر رہے ہو
بے حصولش ممکن نیست، اگر بیان وتقریر	وہ ایک ایسی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے جس کا

بانیٔ درسِ نظامی مُلّا نظام الدّین محمد فرنگی محلیؒ

جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاد دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۹)

استاذ الہند ملا نظام الدین محمد کی فروتنی، خاکساری، عاجزی اور بردباری کے نمونے واقعات اور خود ملا صاحب کی نجی تحریروں کے ضمن میں اوپر گذرے، بظاہر ان کا بنیادی سبب تو وہ ہولناک واردات ہے جس سے ملا صاحب نوعمری ہی میں دوچار ہوئے تھے، ۱۴ سال کی عمر میں آنکھوں کے سامنے نامور والد ماجد کی شہادت، گھر کی تاراجی اور خود اپنی اسیری وہ زبردست سانحے تھے جنھوں نے ملا صاحب کو تمام عمر کے لیے رقیق القلب اور حلیم بنا دیا تاریخ اسلام میں اس کی نظیر امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی سیرت میں ملتی ہے جن کی نظروں میں پورا حادثۂ فاجعہ کربلا اس طرح بسا ہوا کہ تمام عمر کسی نے ان کو شاداں نہیں دیکھا، ملا نظام الدین پر تو جو کچھ گذرا اس کا بھی فطری تقاضا یہی تھا کہ ان کا قلب رقیق ہو جائے اور ان کے مزاج میں عجز و انکسار کا جوہر پورا پورا دخیل ہو جائے۔ تو ملا صاحب کے اس [illegible] کے استحکام اور درجۂ کمال تک پہنچنے میں اس رشتے کا بھی بہت بڑا ہاتھ نظر آتا ہے، جو ان کے پیر طریقت حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۳۶ھ) سے غلامی اور نیازمندی کا تھا۔

استاذ الہند کے سوانح حیات کا یہ پہلو عقیدت اور ارادت کی تاریخ کا انتہائی روشن باب ہے۔ وہ جس کے علم و فضل کے آگے بڑے بڑوں کی گردنیں خم نہیں ہوتی تھیں، وہ جس کا

لم و فضل کو اس کے قدموں پر نثار کر دینا بھی نفع کا سودا نظر آیا ۔ پھر بھی یہ پہلو تحقیق
طلب رہ جاتا ہے کہ وہ ظاہری اسباب کیا تھے جنھوں نے ایک عالم فاضل کو ایک
می بزرگ کے آستانے تک پہنچا دیا ۔

خواب و خیال کی باتیں عام تاریخ میں خواہ کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن عقیدت
و ارادت کی تاریخ میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ، اسی لیے رویائے صادقہ
کو منجملہ اقسام وحی قرار دیا گیا ہے ، بہت زیادہ قدیم روایت تو اس سلسلے میں کوئی
نہیں ملی ، مولانا عبد الباری فرنگی محلی متوفی ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء نے اپنے بزرگوں سے سلسلہ بہ سلسلہ
سنکر ایک ذکر کیا ہے :-

"ملا نظام الدین اور ان کے بھتیجے اور شاگرد ملا احمد عبد الحق بن ملا محمد سعید نے ایک
ہی رات میں خواب دیکھا کہ حضرت غوث پاک کے دربار میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی
اجمیری بھی ہیں ، اور غوث پاک فرما رہے ہیں کہ ان دونوں کو (ملا نظام الدین اور ملا
احمد عبد الحق کو) ہمیں دیدو ، خواجہ صاحب نے دونوں کو ہاتھ پکڑ کر حاضر کر دیا ، حضرت
غوث پاک نے دونوں کو ایک صاحب کے حوالے کر دیا ، یہ صاحب جو پس پشت کھڑے
ہوئے تھے ، ان کے ہاتھ میں (ہاتھ) پکڑا دیے ، ان کی صورت ان دونوں نے دیکھی
اور خوب یاد کر لی ، صبح کو دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا خواب بیان کیا ،
جو بالکل یکساں تھا ، ملا نظام الدین نے فرمایا کہ غالباً ہماری تمہاری قسمت میں
ان ہی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہے ۔" (فیوض حضرت بانسہ مطبوعہ)

جن صاحب کے ہاتھ میں ان دونوں کے ہاتھ دیے گئے تھے ، ان سے بیداری میں
ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی ، اس سوال کا بھی جواب تذکروں میں صراحت کے ساتھ

ممکن بودے ترا فہمانیدم — ادراک بغیر اس کیفیت کے حصول کے
ممکن نہیں ہے، اگر الفاظ و بیان کے ذریعہ
اس کا سمجھنا ممکن ہوتا تو میں تمہاری تشفی
ضرور کر دیتا۔

دیکھنے کی بات ہے کہ وہ جو افلاطون وارسطو، بو علی سینا و فارابی، رازی و طوسی
کے پیچیدہ خیالات اور باریک نظریات سے شب و روز کھیلنے کا عادی ہو، وہ اس
"لذت کیفیت" کے شرح و بیان سے اس درجہ اپنے کو عاجز ظاہر کرے، سچ ہے:-

تعلیم درس اہل نظر یک اشارت است — کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

استعجاب اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ ملا نظام الدین نے "پیر طریقت" کا انتخاب
خود کیا تھا۔ یہ نہ تھا کہ خاندانی طور پر وہ اس سلسلۂ بیعت سے وابستہ چلے آئے ہوں، اور انھوں نے
محض اس رشتہ کی تجدید کرکے خاندانی روایت کی تعمیل کر لی ہو، ایسا ہوتا تو چنداں تعجب
نہ تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ملا صاحب کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی، حضرت
شیخ محب اللہ الہ آبادی کے جانشین اور خلیفہ قاضی گھانسی کے — جن کا پورا نام قاضی صدر الدین
تھا — مرید اور خلیفہ تھے، اور ملا قطب شہید کے دونوں بڑے صاحبزادے ملا محمد اسعد
اور ملا محمد سعید، جیسا کہ تذکروں میں ضمنی طور پر ملتا ہے، اپنے والد ماجد کے مرید ہوئے تھے
اور ان سے خلافت بھی پائی تھی، منجھلے صاحبزادے ملا نظام الدین محمد کے لیے بظاہر حالات
یہی راہ کھلی ہوئی تھی کہ وہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں جو ان کے والد ماجد کا سلسلہ تھا، مرید
ہو جاتے، لیکن انھوں نے اپنے پیر طریقت کو خود ہی پایا اور ایسا پیر پایا جو عام نگاہوں
میں ان پڑھ اور امی تھا لیکن علم و فضل کی نکتہ شناس نظر میں وہ اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ

" آپ نے فرمایا، جناب رسالت مآب بڑے مرتبے کے ہیں، ان کے خادموں کی یہ نورانیت ہے کہ جس کثیف جسم سے مس کر جائیں اس کو نورانی کر دیتے ہیں، چنانچہ اسی حالت غیظ میں کہا "یہ مسجد ہے اس کے ستون سے مجھکو باندھو، وہ خشتی ستون (جو اب تک ہے) حضرت کی کمر میں باندھا گیا اور چادر اسی طرح نکل آئی "

خشتی ستون جس کا ذکر مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، انکی تحریر کے وقت تک گویا آج سے پچاس سال قبل تک موجود ہوگا، مگر اب نئی تعمیر میں، جو اس کے بعد ہوتی رہی، باقی نہیں رہا، لکڑی کے ستون کے بجائے سمنٹ اور اینٹوں کے کھمبے بنگئے ہیں، بہرحال مولانا عبدالباری صاحبؒ اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں :-

" یہ قصہ (صدور کرامت کا واقعہ جو ملا نظام الدین کے شاگردوں کے سامنے شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر پیش آیا تھا) حضرت ملا نظام الدین نے سنا اور حلیہ حضرت کا دریافت کیا، تو وہ خواب جو انھوں نے دیکھا تھا کہ حضرت غوث اعظمؓ نے ان کو حضرت خواجۂ بزرگ سے مانگ کر ایک بزرگ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیدیا تھا، یاد آیا، حلیہ مطابق ان بزرگ کے حلیہ کے پایا، یہی امر حضرت ملا نظام الدین اور حضرت ملا احمد عبد الحق (فرنگی محلی) قدس سرہما کے داخلِ سلسلہ ہونے کا ہوا "

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے بچشم خود کرامت کا مشاہدہ نہیں کیا، بلکہ ان کے طلبا نے جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر رہتے تھے، صدور کرامت کا واقعہ بیان کیا تھا، ملا صاحب نے ان بزرگ کا حلیہ دریافت کیا، جن سے کرامت صادر ہوئی تھی، طلبہ نے جو حلیہ بتایا وہ بالکل وہی تھا جو خواب میں دکھائے گئے بزرگ کا تھا، اب کوئی وجہ تاخیر کی نہ تھی، ملا صاحب اور ان کے بھتیجے اسی جگہ پہنچے جہاں ان بزرگ کے قیام فرما ہونے کا گمان تھا، اور ملاقات

نہیں ملتا ہے، یہاں تک کہ خود ملا صاحب نے اپنے مرشد کے حالات میں جو رسالہ تحریر فرمایا ہے اور جو اس وقت ہماری دسترس میں بھی ہے، وہ بھی اس سوال کے جواب سے خالی ہے، اس جگہ بھی مولانا عبد الباری فرنگی محلی (متوفی ۱۹۲۶ء / ۱۳۴۴ھ) کی سماعی روایت کا ذکر کرنا پڑ رہا ہے، جو واقعہ کے دو سو برس کے بعد قلم بند ہوئی، لیکن اس تاخر زمانی سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت مستند نہیں رہی، یا ضعیف ہو گئی۔ اس لیے لازم نہیں آتا کہ ملا صاحب کا ایک امی بزرگ کے ہاتھ پر مرید ہو جانا ایسا واقعہ تھا کہ ہر زمانے میں خاندان کے لوگوں میں اس نادر الوقوع معاملے کا ذکر ہوتے رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی تھا،

حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں:۔

"مجھے اپنی سماعت سے یاد پڑتا ہے کہ اکثر اکابر سے یوں سنا ہے کہ اس کرامت کے ہم معنیٰ ذکر حضرت ملا نظام الدین کے درس میں بھی ہوا، ملا صاحب کے طلبا، شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر رہتے تھے، باہم بحث کرنے لگے کہ ملا صاحب نے دلائل عقلیہ سے ہم کو ساکت تو کر دیا مگر یہ بات ناممکن ہے، حضرت (سید شاہ عبد الرزاق بانسویؒ) تشریف لائے یا پہلے سے بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا "کیا بحث کر رہے ہو؟" ایک طالب علم نے کہا "تم کیا جانو جاہل سپاہی! یہ علمی بحث ہے"، آپ نے فرمایا "علما کی باتوں سے جاہل فائدہ اٹھاتے ہیں"۔ غرضکہ ایک طالب علم نے بحث کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا "تم لوگ معقولی ہو، جانتے ہو بعد وقوع کے امکان سے بحث نہیں ہوتی، اگر تم اس امر کو واقع میں دیکھ لو تو پھر تم کو قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا"۔

اس کے بعد طلبہ نے کرامت کا مشاہدہ کر لیا، حضرت سید صاحب پر اس وقت جلال طاری تھا، مصنف "فیوض حضرت بانسہؒ" کے الفاظ میں:۔

گرفته کشیدند اندام مبارک حائل
نشد (مناقب رزاقیہ مطبوعہ)

یہی کر سکتے ہیں، پھر حضرت سید صاحب نے
فرمایا: میری چادر کھینچو، حضار محفل نے
حسب حکم چادر کھینچی اور وہی بات پائی
کہ چادر کے دونوں سروں کو پکڑ کر
گھسیٹ لیا اور وہ کھنچ آئی، جسم مبارک
مانع نہیں ہوا۔

"مجلس بعض علماء کی کوئی وضاحت ملا صاحب نے نہیں فرمائی اور یہ بھی تحریر نہیں فرمایا کہ اس
کرامت کا صدور کہاں ہوا، صاحب عمدۃ الوسائل للنجاۃ ملا ولی اللہ فرنگی محلی (متوفی ۱۲۷۰ھ)
نے جنہوں نے ملا صاحب کی تصنیف "مناقب رزاقیہ" کو از سر نو ترتیب دے کر اور معتدبہ اضافوں
کے ساتھ مکمل کیا اور اس کا نام "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" رکھا، اس کرامت کا قدرے تفصیل سے
ذکر کیا ہے، اس تفصیل کے بیان کے بعد جو ملا صاحب نے تحریر فرمائی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی
لکھتے ہیں:۔

تا آنکہ بعضے از آنہا از سر انکار در گذشتہ
قریب بکفر رسیدند و بعضے در عالم شک
و تذبذب در افتادند حضرت قدس سرہ
مامور شدند بدانکہ اینہا را ازیں ورطہ
نجات بخشد در حال دراں
مجلس رسیدہ و گفتند کہ آں زماں در
عالم ذکری بود ہنوز بجا نہ نشستہ

محفل علماء میں معجزے پر بحث کے دوران
بعض تو بالکل انکار تک پہنچ گئے اور کفر
کے قریب ہو گئے، بعض شک اور تردد میں
جا پڑے، حضرت سید صاحب کو غیبی حکم ہوا کہ
جلد ان لوگوں تک پہنچو اور انہیں گمراہی
کے بھنور سے نجات دلاؤ، فوراً حضرت
سید صاحب علماء کی محفل میں پہنچے، کہتے ہیں کہ وہ

کے بعد تصدیق بھی کر لی کہ بعینہ وہی بزرگ ہیں جن کی زیارت خواب میں ہوئی تھی، دونوں حضرات ان کے مرید ہو گئے،

مگر یہ کرامت کیا تھی؟ جسم نورانی سے کپڑے کا جو جسم پر بندھا ہوا ہے، بغیر کھولے آرپار نکل جانا! اس کرامت کا ذکر خود ملا صاحب نے اپنے مرشد کے ذکر پر مشتمل رسالہ "مناقب رزاقیہ" میں کیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ یہی کرامت ان کے مرید ہونے کا باعث ہوئی۔ ملا صاحب نے کرامت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

در مجلس بعض علماء حرف خرق عوائد درمیان	بعض علماء کی محفل میں معجزے کی بحث
شده، ذکر استعجاب کرامتے کہ حضرت	ہو رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ
سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ	وسلم کے اس معجزے پر جو حضرت بی بی
عنہا از پیغمبر خدا صلوات اللہ تعالیٰ	فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ
علیہ و آلہ دیدہ کہ ردائے مبارک از	آپ کی ردائے مبارک اگر آگے یا پیچھے
پس و پیش می کشیدند اندام مبارک عائق	کھینچی جاتی تو آپ کا جسم مبارک حائل
نمی شد بے تکلف از طرفے بطرفے می آمد	نہ ہوتا اور بے تکلف ردائے مبارک
حضرت شیخ قدس سرہ الاعلیٰ گفت:	ادھر سے ادھر نکل آتی تھی، اس محفل
حالا ہم بفیض رسول خدا صلوات اللہ	علماء میں لوگ انکار کے انداز میں اظہار
تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ از این ہمہ از امنائے	تعجب کر رہے تھے، حضرت سید صاحب
دے کہ مخصوص بحق باشند تواند شد	بانسوی نے فرمایا: حضور انور صلوات اللہ
پس گفت: چادر را بگیرید کشیدہ [illegible]	تعالیٰ علیہ وعلی آلہ کے فیضان سے آپ
ظاہر [illegible] سر ہر دو طرف چادر [illegible]	کی امت کے امین جو باطنی خلفاء کے ہیں

رود نمود — نہیں معلوم ہوتے تھے، جلال ربانی

کا پوری طرح ظہور آپ سے ہو رہا تھا،

پھر اسی طرح ہوا جیسا کہ ملا صاحب نے صدور کرامت کے سلسلے میں مناقب رزاقیہ میں

تحریر فرمایا ہے،

ملا نظام الدین کی "مناقب رزاقیہ" غالباً اولین کتاب ہے جو حضرت سید عبدالرزاق

بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ مستند ترین بھی ہے، نہ صرف

اس لیے کہ مصنف کا مرتبۂ علمی بدرجہا بلند ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہی وہ کتاب ہے جو دیکھنے

والے کی لکھی ہوئی ہم تک پہنچ پائی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی کے بیان کے مطابق ملا صاحب

کی یہ تصنیف کامل اور جامع نہیں ہے۔ وہ اپنی تصنیف "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" کا سبب

تصنیف بیان کرنے کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

"تا آنکہ بخاطر گزشت کہ رسالہ مناقب	یہاں تک کہ اچانک خیال ہوا کہ عارف
رزاقیہ کہ آں را عارف کامل رئیس	کامل رئیس علما مقتدائے زمان قطب
عالماں مقتدائے زماں قطب الاقطاب	الاقطاب مولانا نظام الدین سہالوی
مولانا نظام الملۃ والدین السہالوی	(ثم فرنگی محلی) قدس سرہ کے تالیف کردہ
قدس سرہ تالیف فرمودہ واز اتفاقات	رسالۂ مناقب رزاقیہ کو جس کی تصحیح
تصحیح و تہذیبش میسر نہ گشتہ و تحریف	و ترتیب کا موقعہ مصنف کو نہیں مل سکا
کاتباں علاوہ براں ازیں جہت	تھا اور نقل کرنے والوں کی تحریف نے
عبارتش از نظم دلنشیں فارسی درگزشتہ	اس کی عبارت کو اور مسخ کرکے فارسی
بمقدور خود مساعیِ جمیلہ بکار بردم	اسلوب تک سے ہٹا دیا ہے حتی المقدور

سلام گزارد بر اہل محفل وگفت .....

دور تھا جب حضرت سید صاحب نوکری (سپاہیوں میں ملازمت) کرتے تھے (اور سپاہیوں ہی کی وضع اور لباس میں رہتے تھے) آپنے وہاں پہنچتے ہی حاضرین محفل کو سلام کیا اور ان سے فرمایا .....

حضار مجلس سے حضرت سید صاحب نے وہی فرمایا جس کا ذکر ملا نظام الدین نے "مناقب رزاقیہ" میں کیا ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے اس کے بعد مزید لکھا ہے کہ حضار محفل نے حضرت سید صاحب کے ارشاد کو درخور اعتنا نہ سمجھا بلکہ آپ کا دخل انھیں ناگوار ہوا، خاموش رہنے کی ہدایت کر کے وہ پھر بحث وتکرار میں لگ گئے، دوبارہ حضرت سید صاحب نے انھیں یہ کہکر اپنی طرف متوجہ فرمایا کہ

جائے شک چیست؟ ایں قدرت بر آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات ختم نگردیدہ، دست اولیائے امت او ہم ممکن است

آنحضرتؐ کے اس معجزے میں شک کی کیا وجہ ہے؟ جسم نورانی سے ردائے مبارک کا بند سے بند سے نکل آنے کا معجزہ آنحضرت پر ختم نہیں ہو گیا ہے، آپ کی امت کے اولیاء سے بھی اس کا بطور کرامت صدور ممکن ہے۔

حاضرین محفل نے مطالبہ کیا کہ "اگر تم سے اس کا صدور ممکن ہو تو دکھاؤ، شک آپ ہی رفع ہو جائے گا" ملا ولی اللہ لکھتے ہیں:-

دریں حالت بر آنحضرت طاری شد کہ از خود در گزشت و ظہور جلال ربانی

اسی وقت حضرت سید صاحب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ آپے میں

والدین محمد قدس سرہ درباب خرق عادات | سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کی
آں سید عالی نسب علیہ الرحمہ رسالہا | کرامتوں کے بیان میں رسالے تصنیف
پرداختہ مسمی مناقب رزاقیہ گردانیدہ اند | کیے ہیں اور ان کے نام مناقب رزاقیہ
من بے مایۂ تہیدست راچہ یارا کہ | رکھے ہیں، میرے ایسے بے مایہ اور تہی دست
لب بر مدح آں سید والاحسب بکشایم | کی مجال کہاں کہ سید والاحسب کی مدح
وثنا میں لب کشائی کروں۔

ملا کمال الدین کی تصنیف کردہ ’مناقب رزاقیہ‘ ہمارے لیے معدوم ہوچکی ہے، بہرحال ملا نظام الدین کی ’مناقب رزاقیہ‘ موجود ہے، اور کئی بار طبع ہوچکی ہے، اعتبار اور استناد میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس کے بعد مستند اور معتبر ہونے میں ملا ولی اللہ فرنگی محلی کی کتاب عمدۃ الوسائل للنجاۃ کا درجہ ہے، ملا ولی اللہ نے اپنی تصنیف حضرت سید صاحب بانسویؒ کے وصال پر پچھتر سال گزرنے سے قبل ہی مرتب کر لی تھی، تعجب نہ ہونا چاہیے اگر عمدۃ الوسائل کے مصنف نے صدور کرامت کی تفصیل دیکھنے والوں سے یا دیکھنے والوں سے براہ راست سننے والوں سے سن کر اپنی کتاب میں درج کی ہو۔

پھر بھی ”محفل علما“ کی تفصیل و وضاحت نہیں ہو پائی، یہ وضاحت ”ملفوظ رزاقی“ اور ”کراماتِ رزاقیہ“ کے مصنف نواب محمد خاں رزاقی شاہجہانپوری نے کی ہے، نواب صاحب نے اپنی تصانیف میں تمام واقعات اپنے ان بزرگوں سے جن کو حضرت سید صاحبؒ کے سلسلے سے تلمذی تعلق تھا، اور اپنے مرشد زادوں سے سنکر درج کیے ہیں، نواب صاحب کے پیر و مرشد حضرت شاہ غلام علی بانسویؒ (متوفی ۱۲۲۳ھ) تھے، جو حضرت سید صاحب بانسوی کے فرزند کے فرزند تھے، ملفوظِ رزاقی کا بیان ہے:-

حالانکہ آنحضرت جمع کردہ بطریق تہذیب
بعبارت فارسی سلیس قریب الفہم
ہر عامی وخاصی ترقیم نمایم ولکن
دریں امر خطیر جرأت کردن نمی
توانستم ......

درست کیا جائے اور ملا صاحب نے اپنے رسالے
میں جو حالات جمع کر دیے ہیں ان کو سلیس
فارسی میں ایسی ترکیب کے ساتھ پیش کیا جائے
کہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکے لیکن
اس بار عظیم کے اٹھانے کی ہمت نہیں ہو پاتی تھی...

ملا نظام الدین کا تالیف کردہ تذکرہ "مناقب رزاقیہ" جامع و کامل نہ ہونے نیز نظر ثانی سے محروم ہونے کے باوجود ایک ماہر مصنف اور ایک مستند عالم دین کی تصنیف ہے، اور ایسی تصنیف ہے جو عقیدت و ارادت کے بے محابا اظہار پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی افراط و تفریط سے یکسر مصئون و محفوظ ہے، عقیدت مند مصنف کا قلم نشۂ ارادت میں سرشار ہونے کے باوصف جادۂ اعتدال سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا، کرامات و الہامات کے ذکر فراواں کے دوران بھی احادیث و اقوال فقہاء سے سندیں اور تائیدیں پیش کرتا جاتا ہے۔

ملا صاحب کی مناقب رزاقیہ میں وہ تنہا کتاب ہے جسے حضرت سید صاحب بانسویؒ کی معاصر تاریخ سے یاد کیا جا سکتا ہے، ہو سکتا ہے اور بھی معاصر تاریخیں اور سوانح حیات ہوں مگر ہم تک وہ پہنچ نہیں سکیں۔ ملا صاحب کے شاگرد رشید ملا کمال الدین سہالوی (متوفی ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) نے بھی اپنے مرشد حضرت سید صاحب بانسویؒ کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا سراغ اب کہیں نہیں ملتا ہے، رضی الدین محمود انصاری فتحپوری (متوفی ۱۲۶۰ھ) کی تصنیف "اغصان الانساب" (مخطوطہ) میں بس اس کا حوالہ ملتا ہے

سلطان العلماء ملا نظام الملۃ والدین
محمد [illegible]

ملا نظام الدین محمد قدس سرہ اور ملا کمال الدین
محمد قدس سرہ نے سید عالی نسب (حضرت

"جناب ملا شیخ ابو الفتح عثمانی حنفی چشتی نیوتنوی مرید جناب شاہ پیر محمد لکھنوی" ہیں۔

ملفوظ رزاقی کے بیان کے مطابق صدور کرامت نیوتنی ضلع اناؤ (یو پی) میں ہوا۔ عجیب نہیں اس واقعہ کی شہرت لکھنؤ تک پہنچی ہو جو نیوتنی سے ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے، اور قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی نادر الوقوع کرامت کا ذکر جو دلائل عقلیہ کی رو سے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ استاذ الہند ملا نظام الدین کے ایسے معقولی اور فلسفی کے درس میں طلبہ نے بطور استعجاب کیا ہو اور ملا صاحب نے ایسے خوارق عادت امور کے صدور کو عقلی دلائل سے ثابت کر دیا ہو، طلبہ ملا صاحب کے دلائل سے ساکت ہو گئے ہوں، مگر مطمئن نہ ہوئے ہوں، اور اسی بے اطمینانی کا اظہار اپنی قیام گاہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر کر رہے ہوں کہ حضرت سید صاحب بانسویؒ وہاں پہنچ گئے یا پہلے سے موجود تھے، اور انھوں نے طلبہ کو کرامت کا مشاہدہ کرا دیا، دوسرے دن طلبہ نے درس میں اس کا ذکر کیا اور رات کا واقعہ بیان کیا۔ ملا صاحب ان بزرگ کا حلیہ وغیرہ دریافت کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرید ہو گئے،

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ملا نظام الدین چالیس سال کی عمر میں حضرت سید صاحب بانسوی کے مرید ہوئے۔ اس بنیاد پر ملا صاحب ۱۱۳۰ھ میں مرید ہوئے، کیونکہ انکی پیدائش کا تخمینی سال ۱۰۹۰ھ ہے، تذکرہ نویسوں کا یہ اندازہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ملا نظام الدین کے استاد ملا غلام نقشبند کی حیات میں یہ واقعہ پیش آچکا تھا، اور ملا غلام نقشبند کا انتقال ۱۱۲۶ھ میں ہوا ہے۔ ملفوظ رزاقی کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت سید صاحب بانسویؒ کی اس کرامت کا جب شہرہ ہوا تو علوم عقلیہ کے ماہرین و طالبین نے ملا غلام نقشبند سے رجوع کیا۔ ان رجوع کرنے والوں میں ملا کمال الدین سہالوی بھی تھے (جو اس وقت تک حضرت

روزے آنحضرت قدس سرہٗ در قصبۂ
سوہان تشریف می داشت بر جوئے کہ
بسئی نام دارد بقتضائے حاجت رفتہ
وضو می کرد ملہم شد کہ شخصے طالب علم
باستاد خود از معجزۂ سرور کائنات
علیہ افضل الصلوات والتسلیمات
بدلائل عقلی انکار می نماید و قریب
است کہ ایمانش زائل گردد تو برو
و ایمانش ثابت و قائم دار۔ آنحضرت
قدس سرہٗ حسب موجب امر حق
جل و علیٰ [illegible] ابو الفتح
در قصبہ سونتی [illegible] قریبہ است
ظاہراً بلباس سپاہیانہ و بستہ شمشیر
حمائل و چند تیر [illegible] در دست
[illegible] سوار رسیدہ .....

ایک روز حضرت سید صاحب بانسوی
قصبۂ سوہان میں تشریف رکھتے تھے۔
بسئی ندی پر حوائج ضروریہ سے فارغ
ہوکر وضو فرما رہے تھے کہ الہام ہوا
ایک طالب علم اپنے استاد سے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزے سے
عقلی دلائل کی بنا پر انکار کر رہا ہے،
قریب ہے کہ اس کا ایمان زائل ہو جائے،
فوراً پہنچو اور اس کے ایمان کو قائم اور
سلامت رکھنے کی تدبیر کرو۔ حضرت سید صاحب
حکم خداوندی کے بموجب مولوی ابو الفتح
کے مکان پر قصبۂ سنوتی (جو قصبۂ سوہان
سے قریب ہی ہے) سپاہیانہ وضع میں تلوار
حمائل کیے چند تیر اور کمان ہاتھ میں اٹھائے
گھوڑے پر سوار تشریف لے گئے۔ ....

حسب ملفوظ رزاقی کے مصنف نے صدورِ کرامت کا واقعہ اسی طرح لکھا ہے جس طرح
مناقب رزاقیہ اور [illegible] میں ہے۔ ملفوظ کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی
ابو الفتح کی [illegible] ہے۔ بعض علماء کے الفاظ سے استاذ الہند ملا نظام الدین نے مناقبِ
رزاقیہ میں ذکر کیا ہے۔ مناقب رزاقیہ کے ایک محشی میاں سید شاہ غلام جیلانی بانسویؒ کے الفاظ میں

ی بے نظمی بھی رکھتی تھی، حصول اقتدار کی ہر چہار جانب سے کشمکش نے اصول و نظریات کو جن سے
نظام معاشرت کا قوام تیار ہوتا ہے، اغراض و ہوس نے پس پشت ڈالدیا تھا، پوری سوسائٹی
فکر و عمل کی صداقتوں سے محروم ہوکر ظاہر پرستی اور کج فہمی میں مبتلا ہو چکی تھی، تصوف کی بنیادیں
بھی کھوکھلی ہوتی معلوم ہو رہی تھیں، اس لیے کہ اس کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور نام ہی نام
رہ گیا تھا، اعتدال کی جگہ رسمی انتہا پسندی جس کو صاف لفظوں میں ناحق پرستی کہہ سکتے ہیں،
رائج ہو گئی تھی، یہ زمانہ تھا جب حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کو، جو نہ موروثی
سجادہ نشین تھے نہ اباً عن جدٍ پیرزادے، کج رو اور کج فہم معاشرے کی اصلاح کا فرض سونپا
گیا، اور اس طرح سونپا گیا کہ بظاہر حالات اس سمت ان کے متوجہ ہو جانے کی کوئی وجہ
نہ تھی، کم عمری میں اپنے ننھیال وطن بانسہ (ضلع بارہ بنکی) سے برائے تعلیم و تعلم ردولی (ضلع
بارہ بنکی) بھیجے گئے تھے، راستہ میں ایک درویش سیاح سے ملاقات نے ان کے سفر کی سمت بدل دی،
اور پڑھنے پڑھانے سے دست بردار ہوکر اس منزل کی طرف قدم بڑھا دیے جہاں سے انکو
وہ فرض انجام دینا تھا، جو ان کو تفویض کیا گیا تھا، ملا نظام الدین مناقب رزاقیہ میں
تحریر فرماتے ہیں:-

در ایام طفولیت و خوردسالی از کتابت	بچپن میں حروف و خط (لکھائی پڑھائی)
آشنائی از حروف خط نگرفته الا آنکه	سے شناسائی نہیں حاصل کی، بجز اسکے کہ
دراں ہنگام قرآن مجید را خوانده	خوردسالی میں قرآن شریف پڑھا تھا،
و از لسان پارسی گرفت، چنانچه عادت	اور زبان فارسی سے اس طرح شناسائی
ہندست که طفلاں را از لسان سطوره	پیدا کی تھی جیسا کہ ہند میں رواج تھا،
معتاد می کنند اولاً بالفاظ حروف و	کہ بچوں کو فارسی زبان سے مانوس کراتے ہیں

سید صاحب کے سلسلۂ ارادت سے وابستہ نہیں ہوئے تھے) ملا کمال الدین اس بنا پر اس کرامت کے منکر تھے، کہ جو معجزہ پیغمبر سے ظہور میں آتا ہے وہ کسی ولی سے کرامت کے طور پر ظہور نہیں پا سکتا، ملا غلام نقشبند اس غلط خیال کی دلائل عقلیہ سے تردید فرما رہے تھے۔۔۔ یہ مباحثہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر ہو رہا تھا، جہاں ملا غلام نقشبند، شاہ پیر محمد صاحبؒ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے قیام پذیر رہتے تھے، یہ ٹیلہ دریائے گومتی کے ایک کنارے پر واقع ہے، دریا کے دوسرے کنارے پر تقریباً ٹیلے کے مقابل ایک بزرگ شاہ دوست محمد عرف شاہ دوسیؒ رہتے تھے، شاہ دوسیؒ کے حضرت سید صاحب بانسوی سے گہرے روابط تھے، سید صاحب جب لکھنؤ تشریف لاتے تو شاہ دوسیؒ صاحب کے یہاں قیام فرماتے۔۔۔ ٹیلے پر ملا کمال الدین اور ملا غلام نقشبند میں تکرار و مباحثہ جاری تھا کہ حضرت سید صاحب بانسوی کشف سے معلوم فرما کر شاہ دوسی صاحب کے یہاں سے ٹیلے پر تشریف لائے اور ملا کمال الدین کے مقابل بیٹھ کر فرمایا

"تمھیں اس امر میں شبہ ہے؟ بکرم اللہ وہی کمر ہے وہی چادر ہے کھینچو"

اس واقعہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ملا نظام الدین کے مرید ہونے کا واقعہ ۱۱۲۴ھ سے پہلے کا ہے، کتنا پہلے کا ہے یہ بتانا پیش نظر مسودہ تاریخی کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے، بہرحال ملا صاحب چالیس سال کی عمر میں نہیں بلکہ ۳۵ سال کی عمر سے پہلے ہی حضرت سید صاحب کے مرید ہو چکے تھے، اور کم از کم گیارہ سال اپنے پیر طریقت کے وجود ظاہری سے مستفیض ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۱۳۶ھ میں پیر و مرشد نے وصال فرمایا، اس وقت ملا صاحب کی عمر ۴۸ سال کی تھی،

ملا صاحب کے پیر و مرشد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ نے کم و بیش ۸۵ پچاسی سال میں وصال فرمایا، ان کے ارشاد کا آخری عہد ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے مائل بہ زوال دور کے مطابق تھا۔ ملک کے نظام سیاسی کی ابتری اپنے ساتھ مسلک و عقیدے

عقلیہ و دینیہ کے سب سے بڑے مرکز اور اس مرکز کے سب سے بڑے سردار یہ ! حکمت و فلسفہ منطق و کلام کے امام الوقت کے ذہن و قلب کو اس طرح منور کرنے میں کوئی حکمتِ الٰہی ور رہو نا چاہیے۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ اس حکمتِ الٰہی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ حضرت مجدد صاحب (یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ) کی تعلیم ان نقائص کو جو وحدت الوجود کے مسئلے میں پیدا ہو گئے تھے، دور کرنے کے لیے کافی تھی، اور حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کے ارشادات نے اس مسئلے کو (وحدت الوجود کے مسئلے کو) کما حقہٗ ظاہر کر دیا، ساتھ اس کے ایک تقابل سا پیدا ہو گیا جس سے ایک جماعت منکرِ وحدت الوجود ہو گئی، اور اس نے منتہائے مقصد اپنا صلاحیت ظاہری قرار دیا، دوسری جماعت اس قدر وحدت الوجود میں مستغرق ہو گئی کہ اس سے آدابِ شریعت ظاہری نظر انداز ہونے لگے، سماع و رقص و شاہد پرستی کا اندیشہ غالب ہو گیا، حضرت سید صاحب (بانسویؒ) کے صحبت بر داشتہ علمائے کرام ایسے ہوئے جنھوں نے ان دونوں راہوں کے بین بین طرز اختیار کیا اور خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا، ساتھ ہی اس کے کہ علوم ظاہری رکھتے تھے، علم باطن کے بھی ماہر ہوئے اور وحدت الوجود کے قائل ہونے کے باوجود ان کا معیار عرفان اتنا وسیع تھا کہ حالتِ تفرقہ و جمع میں کسی طرح بے امتیاز نہیں ہونے پاتے تھے۔" (فیوض حضرت بانسہؒ)

حضرت سید صاحب بانسویؒ کے فیض صحبت سے ملا نظام الدین نے تصوف کی حقیقت کو کس طرح پالیا، اس کو اس واقعہ کے ضمن میں معلوم کیا جا سکتا ہے، جو ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی نے بیان کیا ہے :-

در عہد حضرت مولانا نظام الدین سہالوی قدس سرہٗ شخصے دارد شہر لکھنؤ شد و	ملا نظام الدین کے زمانے میں ایک صاحب لکھنؤ تشریف لائے جو تصوف کی گفتگو

نقوش خطیہ: بعد از اعتیاد تفہیم دلالت
نقوش بر الفاظ خود با وطرق دلالت
بر معانیش آشنا می کنند و حضرت
قدس سرہٗ الاقدس بمرتبۂ آمد کہ مقصود از
تعوید باشد مانوس نشدہ یا فی الجملہ
شناسائی یافتہ باشد بعد از ان
این تعلیم و تعلم از میان رفت قبل از
حصول ملکہ بعالم نسیان رفتہ و
بالفعل از دلالت نقوش عربیہ و فارسیہ
مناسبت یافتہ نشد

یوں کہ پہلے حروف کے تلفظ اور نقوش
سے واقف کراتے ہیں اور جب سمجھ
اس سے مانوس ہو جاتی ہے تو ان نقوش
سے جو الفاظ بنتے ہیں ان کو سمجھاتے ہیں
پھر ان الفاظ کے مطالب و معانی بتاتے
ہیں، حضرت سید صاحب بانسوی اس طرز تعلیم
کا جو انتہائی مرتبہ ہے اس سے مانوس نہیں
ہوئے یا ہو سکتا ہے کہ فی الجملہ مانوس
ہو گئے ہوں، اس کے بعد پڑھنے پڑھانے
کا سلسلہ بیچ سے اٹھ گیا اور ملکہ نوشت
و خواند حاصل ہونے سے پہلے ہی جتنی
حرف شناسی وغیرہ ہوئی تھی وہ فراموش
ہو گئی، اب عملاً عربی اور فارسی تحریر سے
ان کے مطالب سمجھ لینے سے آپ کو کوئی
مناسبت نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سید صاحب بانسوی امی (ان پڑھ) تھے، اور جو کچھ
کمالات آپ کے حصہ میں آئے ان میں کسب و اکتساب کا کوئی دخل نہیں تھا،
کسب و اکتساب علوم تو بڑا ہے لے نیاز شیخ طریقت حضرت سید صاحب بانسوی
کا آفتاب ارشاد تو چمک رہا تھا، انہوں کے سامنے چہرہ فروغ ہوتا ہے کہاں؟ اپنے زمانے کے کسب و اکتساب

من بعد مولانا احمد عبد الحق قدس سره که برادر زادهٔ او
و صاحب باطن و اسرار بود امر فرمود: شما رفته حال
آن کس دریافته بمن اطلاع دهید اگر آن کس از اهل باطن
خواهد بود و از آثار باطن او ثمره خواهید یافت
آن زمان بملاقات او خواهم رفت
ملا احمد عبد الحق قدس سره برائے ملاقات
رفتند بجز رنگینی عبارت و تزویر و تخلیط
و تخلیط عوام هیچ نیافته بخدمت عم بزرگوار
خود آنچه مشاهده کرده بود عرض نمود
مولانا باستماع این معنی ارشاد کرد:
صوفی کسے است که باطن خود را از شرک
پاک سازد و چرک ریا و سمعه در آن
نگذارد نه آنکه باطن خود را از حق صاف کند
و به باطل که سمعه و ریا است بیالاید
بندگان خدا مدام تطهیر باطن خود از
اوساخ ذمیمه نمایند و همیشه خدمت
شرعِ شریعت مرعی داشتند امت
بر ظاهر شرع کار ایشان است و
استقامت بر باطن شرع که عبارت

اس کے بعد ملا صاحب نے اپنے بھتیجے اور اسرار
باطنیہ کے واقف ملا احمد عبد الحق قدس سرہٗ
سے فرمایا، تم جاؤ اور ان صاحب کا حال احوال
دیکھ کر مجھے بتاؤ اگر وہ اصحاب باطن میں سے ہوئے
اور ان کی باطنی کیفیات کا کوئی اثر تم پر
بھی ہوا تو پھر میں بھی ان سے ملنے جاؤں گا،
ملا احمد عبد الحق نے جا کر دیکھا تو سوائے
رنگین گفتگو، بد فریبی خیالات کی گڈمڈ اور
عوام کی غلط رہبری کے وہاں کچھ نہ تھا،
واپس آکر اپنا تاثر عم بزرگوار سے بیان
کر دیا، بھتیجے کی بات سنکر ملا صاحب نے فرمایا:
صوفی در اصل وہی ہے جو اپنے باطن کو
آلایش شرک سے پاک رکھے اور دکھاوے
سناوے کے میل کو اندر آنے نہ دے، وہ
صوفی نہیں کہلائیگا جو اپنے باطن کو حق
ہی سے صاف کر ڈالے اور باطل یعنی دکھاوا
سناوا سے اس کو ناپاک کرے، اللہ کے بندے
ہمیشہ اپنے باطن کو اوساخ ذمیمہ سے
پاک رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور

کلام خوش و بیان مطبوع در تصوف
داشت عالمے بادی گرویدہ و خلقے بطرف
وے رجوع آوردہ اوصاف حمیدۂ او
بسمع مولانا رسانیدند و بتواتر حکایات
غریبہ و روایات عجیبہ بطرف او منسوب
کردہ مردم بخدمت مولانا عرض می
ساختند، ہیچ نمی گفت و خاموش ماند
ہر گاہ ہجوم خلائق بتذکار او از حد گزشتہ
فرمود: تصوف بلفظ و بیان در نہ آید
آں عبارت از حفظ باطن و اعتماد برذات
احدیت است کسے کہ باین مرتبہ رسد
بقیل و قال نیفتد و طالب حال و
فاقد قال باشد

بڑی خوش بیانی اور دلنشین انداز سے کرتے
تھے، ایک دنیا ان کی گرویدہ ہو گئی
اور خلقت ان کی طرف متوجہ ہو گئی،
ان صاحب کی خوبیاں بھی لوگ ملا صاحب
سے بیان کرنے لگے۔ لگاتار حیرت انگیز
واقعات اور نادر حکایتیں ان صاحب سے
منسوب کر کے لوگ ملا صاحب کی خدمت میں
بیان کرنے لگے، مگر ملا صاحب کچھ بولتے بھی نہ تھے،
جب ان صاحب کا حد سے زیادہ تذکرہ
عام خلائق نے ملا صاحب سے کیا تو ملا صاحب
نے بالآخر فرمایا: تصوف وہ فن ہے جو
شرح و بیان کی تاب نہیں لا سکتا، دراصل
ظاہر کے بجائے اپنے باطن کی نگہداشت
اور دوسرے وسائل کے بجائے صرف
ذات خداوندی پر اعتماد کا نام تصوف
ہے، اور جس کو یہ دونوں باتیں حاصل
ہو جائیں پھر وہ قیل قال کے جھمیلے میں
کہاں پڑ سکتا ہے، وہ تو اپنے "حال"
کی طلب و جستجو اور انجام کی فکر و
اندیشے میں محو ہو جاتا ہے۔

در مجالس عالی متعارف شده بود
وقتیکه می فرمود ان الذین آمنوا
وعملوا الصالحات می آیند می گفتند
که فلاںؓ فلاں می آید، همون روز
یا روز دوم می رسد ولیکن این خبر
وقتے می رسد که مخبر عنهم متجاوز از منزل
شده مسافر شده یا عزم مصمم نمود
(مناقب رزاقیہ)

خبر دیتا ہے خبر دینے والا) کہ ان الذین
آمنوا وعملوا الصالحات آوت ہیں
(آرہے ہیں) یعنی جو ایمان لائے اور
جنھوں نے اچھے عمل کیے (آیت کا ترجمہ)
خود ہی سے فرماتے کہ فلاں آرہا ہے اور
آپ کی محفل عالی کے حاضر باش اس طرز
سے اس حد تک مانوس ہوگئے تھے کہ
جب حضرت سید صاحبؒ فرماتے کہ "خبر دیت
خبر دیت کہ ان الذین آمنوا وعملوا
الصالحات آوت ہیں" تو حاضر باش
حضرات فوراً کہنے لگتے کہ فلاں فلاں آرہے
ہیں، اور وہ اسی دن یا دوسرے دن
حاضر خدمت ہوجاتے، حضرت سید صاحبؒ
کو غیب سے یہ خبر اس وقت ملتی جب وہ جن کے
بارے میں خبر دی گئی ہے اپنے گھر سے
روانہ ہوکر راستے میں ہوتے یا پھر
قصد مصمم کرچکے ہوتے۔

مناقب رزاقیہ کے شارح ملا عبد الاعلیٰ (حفید ملا نظام الدین) نے اپنی شرح محاسن
رزاقیہ میں تحریر کیا ہے :-

از تصفیۂ قلب و اعتقاد بہ توحید ذات
است بر درجے کہ شرح یافتہ و ثابت نمایان
است۔

(عمدۃ الوسائل قلمی)

شرع شریف کی پاسداری اور خدمت کو
پیش نظر رکھتے ہیں، ظاہری شرع پر ہمیشہ عمل درآمد
کرتے رہنا ان کا عمل ہے اور قلب کی صفائی
اور ذات خداوندی پر کلی اعتقاد، جس کی
کیفیت کی تفصیل بارہا بیان ہو چکی ہے
ان کا شعار اور ان کی پہچان ہے۔

اور یہی تصوف ملا صاحب کو اپنے مرشد کے فیض نظر سے نصیب ہوا اور شریعت کی بھرپور خدمت، باطن پر کڑی نگرانی اور اہل باطن سے انتہائی عقیدت یعنی بظاہر دو متضاد پہلوؤں سے مکمل ہم آہنگی ـــ ملا صاحب اور ان کے بعد حضرت سید صاحب بانسوی کے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ سے وابستہ رہنے والے ان کے رشتہ داروں اور خاندان والوں کا مقصود بنا رہا

ملا نظام الدین، اپنے مرشد کے دربار میں کس مرتبے کے مستحق قرار پائے، اس کی تفصیل ظاہر ہے کہ ملا صاحب کے قلم سے نہ مل سکتی تھی نہ ملتی ہے، وہ خود ہر جگہ اپنے کو "بندۂ درگاہ" ہی لکھکر ذکر کرتے رہے کہ کرامات اور الہامات کے ذکر میں ملا صاحب نے تحریر فرمایا ہے:۔

و از آں جملہ این است کہ بعض یاراں
چوں از جائے خود با قصد عتبہ بوسی
می کردند می فرمود در خانہ کہ خبری ذکر
کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات
می آیند خود شاں می گفت فلاں می آید
و ایں را واقعات بسیار است این

(لسان غیب کی آوازیں سننے کے بکثرت
واقعات میں سے) ایک واقعہ یہ ہے کہ
بعض مرید جب اپنے گھر سے آستاں بوسی
کے ارادے سے روانہ ہوتے تو حضرت
سید صاحب بانسوی اپنے دولت کدے میں
فرما دیتے "خبر دیت خبر دیت (خبر دیتا ہے"

ادبیات

نعت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

ہی فخرِ بشر ہے اور وہی محبوبِ یزداں ہے
ولائے احمد مختار جس کا دین و ایماں ہے

وئی کہہ دے یہ اس سے غم کے ہاتھوں جو پریشاں ہے
مدینے کی بہاروں میں سکونِ دل کا ساماں ہے

رشتوں کے جہاں جلتے ہیں پر واں ہو گزر اس کا
بتایا تو نے انسانوں کو کیا معراجِ انساں ہے

ے محفل نشینوں کا تو ہے کیا ذکر اے مولیٰ
ترے در کا گدا بھی بے نیاز باغِ رضواں ہے

ہ آنسو یاد میں تیری بنا ہے زینتِ مژگاں
متاعِ عیش دو عالم اس اک آنسو پہ قرباں ہے

ہے اہلِ دل کا شیوہ نام پر تیرے فدا ہونا
تری مرضی پہ جاں دینا شعارِ اہلِ ایماں ہے

ری تعلیم نے انساں کو نورِ معرفت بخشا
ترا قرآن دنیا میں چراغِ راہِ عرفاں ہے

جوابِ مہر ہے تابندگی میں ہر خزف ریزہ
ہر اک ذرہ ترے کوچے کا رشکِ ماہِ تاباں ہے

سفینے کو مرے جب مل گیا ہے نا خدا تجھ سا
مجھے کیا غم ہے گر ہستی ہلاکت خیز طوفاں ہے

اٹھا نظریں سوئے کعبہ اگر طالب ہے رحمت کا
مدینہ کی طرف رخ کر اگر جنت کا خواہاں ہے

...اصی ہوں مگر کیا خوف مجھکو نارِ دوزخ سے
شفیعِ روزِ محشر کا مرے ہاتھوں میں داماں ہے

...ورت آج بھی دنیا کو ہے تعلیم کی اس کی
جو اخلاقِ مجسم ہے ز سر تا پا جو احساں ہے

از مولوی احمد حسین و مولوی محمد حسن
و مولوی محمد ولی و مولوی محمد یعقوب
عفر اللہ لھم بالاتفاق شنیدہ ام می
گفتند کہ مراد مولوی نظام الدین
قدس سرہ و برادر زادہ وے
مولوی احمد عبد الحق
محاسن رزاقیہ (قلمی)

ملا احمد حسین، ملا حسن، ملا محمد ولی اور
ملا محمد یعقوب عفر اللہ لھم (شاگردان
ملا نظام الدین اور بھتیجے اور پوتے بھی)
سے بالاتفاق میں نے سنا ہے کہ ان
الذین آمنوا وعملوا الصالحات سے
جن یاران کی آمد کی خبر حضرت سید صاحب
دیتے تھے وہ خود ملا نظام الدین اور
انکے برادر زادہ ملا احمد عبد الحق ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے ازراہ کسر نفسی کنایۃً یہاں بات کہی اور اس کے آگے اپنے پیر بھائی حضرت میر اسماعیل بلگرامی کے بارے میں جب اسی طرح کے نام کا ذکر کیا تو ملا صاحب نے انکے نام کی صراحت کر دی کہ "وقتیکہ میر محمد اسمٰعیل متوجہ ایں صاحب می شود خبر ما دہد کہ سید عالی نسب می آید" (یعنی جب میر اسمٰعیل بلگرامیؒ اپنے یہاں سے حاضری کے قصد سے روانہ ہوتے تو حضرت سید صاحب فرماتے خبر دیتے کہ سید عالی نسب آ رہے ہیں۔

بہرحال ملا صاحب اپنے مرشد کے دربار میں مقرب بھی تھے اور معزز اور اس درجہ معزز کہ زبان فیض ترجمان سے ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات کا مصداق قرار پائے۔

تفسیر ماجدی اردو

تفسیر ماجدی اردو کا دوسرا ایڈیشن جیسا کہ معلوم ہے کثرت اضافوں کے ساتھ خود مولانا دریابادی کے اہتمام میں ہندوستان میں چھپ رہا ہے، اسکی پہلی جلد آل عمران تک ہے جس کا ہدیہ ۔۔۔ تھا لیکن اب محصول ڈاک کے علاوہ ۱۵ روپیہ کر دیا گیا ہے، تاجران کتب کے لیے مزید رعایت ہوگی۔ شائقین طلب فرمائیں، انشاءاللہ جلد دوسری جلد بھی جو سورہ نساء سے شروع ہوگی، زیر طبع ہے جلد شائع ہوگی۔ پتہ: صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ۔

مطبوعات جدیدہ

نقوشِ اقبال ۔ از مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں

اردو تقطیع اوسط ضخامت ۲۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ

پتہ :۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۔

اسلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ دین وملت کی خدمت کسی قوم وقبیلے کے ساتھ مخصوص نہیں، اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کے حصہ میں آجائے ۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش صہیب از روم		ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

اس دور میں اس کی مثال علامہ اقبال تھے، وہ ایک نومسلم برہمن خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کی تعلیم تمامتر جدید ہوئی، مگر اسی آذر کدے سے اس دور کا یہ ابراہیم پیدا ہوا، خود کہتے ہیں :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی		برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اللہ تعالیٰ نے اُن سے دین وملت کا وہ کام لیا جو اس دور کے بڑے بڑے خاندانی علماء سے نہ ہو سکا، وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے مسلمان حکیم وفلسفی اور اسلامی روح کے ایک بڑے عارف تھے، مغربی تہذیب، مغربی علوم اور اس کے فلسفوں پر ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی، وہ ان کی ایک ایک کمزوری سے واقف تھے، اس لیے وہی اس کام کو انجام دے سکتے تھے، انھوں نے اس دور کے مسلمان مصلحین کی طرح مغربی علوم اور مغربی تہذیب

ہوچکا ہے، نقوش اقبال مصنف کے ترمیم و اضافوں کے ساتھ اسی کا اردو ترجمہ ہے، اقبال کے کلام میں خیالات کا ایک عالم ہے، چند مضامین میں ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور مصنف کا مقصد بھی نہیں تھا، اسلیے انھوں نے انکی اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیمات، ان کی روح اور ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم وغیرہ کے متعلق اقبال کے افکار و خیالات کا خلاصہ اور لب لباب پیش کر دیا ہے، جس سے اس کے اہم رخ سامنے آجاتے ہیں، اقبال کا نصب العین، ان کے خیالات کی رفعت وگہرائی، ان کی حکیمانہ تعبیریں، ان کے بیان کی سحر آفرینی بجائے خود اعجاز کی حیثیت رکھتے ہیں، فاضل مصنف کی موثر و دلنشین تشریح و تبصرہ نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے،" ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"۔ اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے لیکن اقبال کے مقصد پیام اور افکار و تصورات کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے، عربی میں مصنف کا حسن انشا مسلم ہے۔ لائق مترجم نے اس کی ساری خوبیوں کو ترجمہ میں منتقل کردیا ہے، اور ترجمہ اتنا سلیس ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، یہ کتاب صاحب ذوق مسلمانوں خصوصاً اقبال کے کلام سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔ "م"

انڈو ایرانیکا (سلور جوبلی نمبر) (انگریزی)۔ یہ انگریزی سہ ماہی رسالہ ایران سوسائٹی، کلکتہ کا ترجمان ہے۔ ابتک اسکی ۳۲ جلدیں اعلیٰ چھپائی کے ساتھ نکل چکی ہیں۔ اسکے بانی مدیر ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم تھے جنھوں نے پچیس سال پہلے ایران سوسائٹی قائم کرکے اس رسالہ کے ذریعہ سے فارسی علم و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اللہ کے پیارے ہوئے، انکی زندگی ہی میں اس رسالہ کے نکالنے کا بار خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، انکی نگرانی میں یہ رسالہ اپنے پورے معیار کیساتھ نکل رہا ہے، ۱۶ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایران سوسائٹی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ زیر نظر رسالہ میں اس جوبلی کی شاندار تقریب کی پوری روداد ہے، جسکو پڑھتے وقت ناظرین کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خود اس میں شرکت کر رہے ہیں، اس ایران سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر محمد اسحٰق کی تصویر کے ساتھ جشن کی مختلف تقریبوں کی تصویریں بھی ہیں، ایران کے سفیر ہز ایکسلنسی امیر تیمور

کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اسلام کو ان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسکو اس کی اصلی شکل میں پیش کرکے اس کی روح کو زندہ کیا، اور مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے دکھایا کہ یہ تہذیب خود لب گور ہے، وہ دوسروں کو کیا زندہ کرسکتی ہے اور اس مادی دور میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی قوموں کی فلاح اسلام کے دامن سے وابستہ ہے، وہی انسانیت کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے، اور اس کی تعلیمات کو ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ کوئی عقل سلیم اس سے انکار نہیں کرسکتی، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی دینی و ملی روح تجدید کرنے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے، ان کی شاعری حساس مسلمانوں میں وجد طاری کر دیتی ہے، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے لیکر علماء و مشائخ تک اس پر سر دھنتے ہیں،

ان کے کلام اور پیام پر بہتوں نے لکھا ہے، اور اپنے ذوق و نظر کے مطابق اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، ان میں جن کو اقبال سے جس قدر فکری ہم آہنگی ہے، اسی قدر انھوں نے ان کی بہتر ترجمانی کی ہے، ان میں ایک مولانا ابو الحسن علی ندوی بھی ہیں، ان دونوں کا نصب العین اور ان کے خیالات کا سرچشمہ ایک ہے، دونوں اسلام کے داعی و مبلغ ہیں، دونوں کا مقصد ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح اور اس کو مغربی تہذیب کے سحر سے بچانا ہے، فرق یہ ہے کہ مولانا ابو الحسن علی کی زبان فصیح مذہبی ہے اور علامہ اقبال کی حکیمانہ اور شاعرانہ، لیکن دونوں کے دل کی آواز ایک ہے، اس لیے مولانا کو ان کے کلام پر لکھنے کا سب سے زیادہ حق تھا اور انھوں نے اس کتاب میں اس کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

انھوں نے عرب دنیا کو اقبال کے کلام و پیام سے متعارف کرانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر عربی میں مضامین لکھے تھے، ان کا مجموعہ عرصہ ہوا "روائع اقبال" کے نام سے شائع

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سُلیمان جلد اوّل تاریخی

مولانا سید سُلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سُلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث۔ محمد بن عمر الواقدی، عرب دام رکیہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سُلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سُلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اُس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غعہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اوّل)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے ۲۱ مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور اُن کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: بعہ

صاحبُ المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور اُن کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:- غعہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، اُن کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ محمد عباسی اعظمی ایم اے قیمت بعہ

"منیجر" دارالمصنفین اعظم گڑھ)

مغربی بنگال کے گورنر ایس، ایس دعاون اور کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس پی۔ بی۔ مکرجی نے اس میں خاص طور پر شرکت کی، انکی تقریریں بھی ہیں، جن سے ایران سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، اسکے سرگرم سکریٹری ام، اے مجید کی رپورٹ سے اسکے مختلف کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، اس جشن میں فارسی اور اردو میں جو نظمیں پڑھی گئیں وہ بھی اس میں ہیں، پھر علمی حیثیت سے وہ مقالات بڑے مفید ہیں جو اس موقع پر پیش کیے گئے، ان میں کچھ یہ ہیں: فارسی حروف تہجی' از ڈاکٹر محمد اسحٰق۔ 'ہندی الایرانی عہد' از پروفیسر فیروز سی وادر 'شوریدہ شیرازی' از ایم۔ اے مجید۔ 'ہند وایران کے تعلقات' از ڈاکٹر چن ماونی وت، 'سبک ایرانی کے علمبرداروں کو ہندستانی اہل علم کے تحفے' از سید صباح الدین عبدالرحمٰن 'اردو کا عظیم شاعر، غالب' از پروفیسر مسعود حسن۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق، 'تاثرات' از خواجہ محمد یوسف۔ پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر حیدر رنیر۔ 'پہلوی خاندان کے زمانہ میں تعلیم' از جہد شیخانی۔ 'گریش چندر سین بنگال میں فارسی اور عربی کا ایک فاضل' از ڈاکٹر عطا کریم۔ 'زبان فارسی در ایالت تامل ناڈو' از حیدر علی خان [illegible] 'روابط ہند و ایران در عصر حاضر' از ڈاکٹر حکیم الدین قریشی۔ 'مرزا غالب دہلوی' از ڈاکٹر [illegible] عباسی۔ مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بڑے سلیقہ اور معیار کے ساتھ نکالا گیا ہے، اسکے مدیر انتظامی خواجہ محمد یوسف خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں

"ص"

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	عطاء اللہ
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	ہندستانی
پتہ	دار المصنفین
اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں عطاء اللہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عطاء اللہ

آرڈنمبر ال (۵۲۰) اپریل ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

۱- **بزم تیموریہ**: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۶۴ صفحے قیمت ۲۵/لعہ

۲- **بزم مملوکیہ**: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۳۵۰ صفحے قیمت معہ/

۳- **بزم صوفیہ**: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک**

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۷۰۰ صفحے، قیمت: عہ/۲۵

۵- **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام**

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: غلہ

۶- **ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے**

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: سعہ/

۷- **ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**

ضخامت: ۲۲۸ صفحے، قیمت: صہ/

۸- **ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں**

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: ۵عہ/

۹- **ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں**

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صہ/

۱۰- **عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں**

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: لعہ/۵۰

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۷ - ماہ صفر المظفر ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۱ء - عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عا
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانی
لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور
کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں
اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے
میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، او
سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن
علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۳۲۰ صفحے   قیمت:- ہے

مشرقی پاکستان والوں کی اکثریت ان کے مطالبات پورے ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے، وہ جیسا دستور چاہیں گے بنا سکیں گے، مرکزی حکومت ان کے ہاتھ میں ہوگی، اسکو جس طرح چاہیں گے چلائیں گے، اکثریت میں ہوتے ہوئے جمہوری حکومت میں مغربی پاکستان کی ماتحتی کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان انکے ماتحت ہوگا، اور اگر جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی اور مشرقی پاکستان کے سارے مطالبات پورے ہو جاتے، اس لیے موجودہ حالات کی ذمہ داری سے وہ بھی بری نہیں ہیں اب بھی اگر فریقین سمجھداری سے کام لیں تو پاکستان تباہی سے بچ سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی خونریزی کی جتنی مذمت کیجائے سب بجا ہے لیکن بنگالی مسلمانوں نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بھی کم افسوسناک نہیں ہے، انکے ساتھ انکا سلوک ہمیشہ نہایت نازیبا رہا، اور اس ہنگامہ میں انھوں نے جس بے دردی سے مہاجرین کو ہلاک اور ان کو تباہ و برباد کیا ہے اسکی توقع ایک مسلمان سے نہیں ہوسکتی تھی، یہ دھبہ ان کے دامن سے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ ان واقعات سے ہندوستان کے وہ تمام مسلمان واقف ہیں جن کے اعزہ مشرقی پاکستان میں ہیں، یحییٰ خاں کے بیانات بھی اس پر شاہد ہیں، اور خود شیخ مجیب الرحمٰن کی تقریروں میں اسکی طرف اشارہ ہے۔

حق جوار اور انسان دوستی دونوں حیثیتوں سے مشرقی پاکستان کے ساتھ ہندوستان کی اخلاقی ہمدردی انسانی فریضہ ہے، لیکن اس کی حمایت میں حد سے زیادہ جوش و خروش سے اسکا رخ بدل جانے اور مشرقی و مغربی پاکستان کے بجائے ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ بنجانے کا اندیشہ ہے جس سے ہندوستان کی ہمدردی کا وزن بہت گھٹ جائیگا۔ اس وقت حالات ایسے نازک ہیں کہ ادنی بے احتیاطی سے مشرقی پاکستان کا مسئلہ بین الاقوامی سیاست کا اکھاڑا بن سکتا ہے، جو خود ہندوستان کے لیے مضر ہے، اسلیے ان دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، اور ہم کو خوشی ہے کہ ان نزاکتوں پر عاقبت اندیش سیاسی مبصرین اور خود مسز اندرا گاندھی کی نظر ہے اور وہ

شذرات

مشرقی پاکستان کے خونیں واقعات سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہر انسانیت دوست کا دل بیقرار ہے، خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی خونریزی اور پاکستان جو کتنی قربانیوں اور کیسی کیسی امیدوں سے قائم ہوا تھا، اس کا یہ حسرتناک انجام کس قدر عبرت انگیز ہے، تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے، آج پاکستان میں بھی تاریخ دہرائی جارہی ہے

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویشتن فریاد

اس وقت اس کے اسباب اور تفصیلات پر بحث کرنا معاملہ کو بڑھانا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ اس خانہ جنگی کو ہر قیمت پر جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کیجائے اور اس کی ذمہ داری فریقین پر عائد ہوتی ہے، اختلافی مسائل اپنی بات پر اڑے رہنے سے نہیں بلکہ مفاہمت سے سلجھتے ہیں۔

مغربی پاکستان والے اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ کسی تحریک کو تشدد کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے نہیں دبایا جا سکتا، اس سے اور شدت پیدا ہوگی، جس سے دونوں کو نقصان پہنچے گا، اگر پاکستان کو بچانا ہے تو ملک کی سالمیت کو برقرار رکھکر سارے اختیارات مشرقی پاکستان کے حوالے کردیے جائیں ورنہ کوئی قوت اسکو علٰحدگی سے نہیں روک سکتی، مشرقی پاکستان والوں کو بھی محض جذبات کی رو میں نہ بہنا چاہیے بلکہ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، ان میں ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے، اور مغربی پاکستان سے علٰحدگی کے بعد ان کی قوت اور گھٹ جائیگی اور وہ دوسری قوتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہونگے جس کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی کہ اس کا اندازہ تجربہ کے بعد ہی ہوگا۔

مقالات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

اسلامی تاریخ میں بہت سے علماء اپنے علم و فضل اور شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے بڑے بڑے القاب و خطابات سے یاد کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے تین اقلیم علم و دانش کے بادشاہ قرار دیے گئے ہیں، ایک مشہور حنفی امام و فقیہ شیخ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاشانیؒ متوفی ۵۸۷ھ صاحب البدائع و الصنائع، ان کا لقب ملک العلماء تھا، دوسرے امام ابو محمد عزالدین عبد العزیز بن عبد السلام سلمی شافعیؒ متوفی ۶۶۰ھ، ان کو ان کے مجددانہ کارناموں کی وجہ سے سلطان العلماء کا لقب دیا گیا، تیسرے ہندوستان کی مشہور عہد آفرین عہد ساز شخصیت قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ۔ ان کو بھی ملک العلماء کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی علوم و فنون میں امامت و عبقریت کا مقام رکھتے تھے، اور شریعت و طریقت کے درمیان واسطۃ العقد تھے۔ اور اپنے دور میں عالم اسلام کے مصنفین کبار میں شمار کیے جاتے تھے، ان کے علمی کمالات و خصوصیات کی وجہ سے ملک العلماء ان کے نام کا جزء بن گیا۔

ان کا رویہ اس معاملہ میں بہت محتاط اور دانشمندانہ ہے

گذشتہ الیکشن میں حکمران کانگریس کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے، الیکشن سے پہلے خود اس کو اس کا گمان نہ تھا، یہ ہندوستانیوں کے سیاسی شعور کا ثبوت ہے کہ انھوں نے متحدہ محاذ کے ہر طرح کے پروپیگنڈے اور ترغیب و ترہیب کے باوجود صحیح فیصلہ کیا، اس کامیابی میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے، اس مرتبہ انھوں نے من حیث القوم متحدہ قوت سے اندرا کانگریس کا ساتھ دیا، اس لیے اب خود اس کے امتحان کا وقت آگیا ہے کہ وہ کہاں تک مسلمانوں کی شکایتوں کا ازالہ اور ان کے مطالبات پورے کرتی ہے، اس طرف کانگریس کمیٹی میں جو بحثیں ہوئیں اور کانگریسی لیڈران نے جو بیانات دیے ہیں ان میں اچھوتوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دینے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے لیکن مسلمانوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، لیکن ہم کو اندرا گاندھی سے توقع ہے کہ انھوں نے اپنے مینی فسٹو میں مسلمانوں سے جو وعدے کیے ہیں ان کو پورا کریں گی۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پروفیسر عبد القادر سروری مرحوم صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے دفعۃً انتقال کیا، اس سے پہلے وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تھے، ان کا وطن بھی حیدرآباد تھا، پروفیسر زور مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی جگہ کشمیر یونیورسٹی میں آگئے تھے، مرحوم اردو زبان کے بڑے مخلص خدمت گذار تھے، اگرچہ وہ شعبۂ اردو کے صدر اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان میں طالب علمانہ شوق اور طلب تھی، انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی، بڑے متواضع اور خاکسار تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

علمی و روحانی حالات درج ہیں وہ نہایت مستند و معتبر ہیں، اندرونی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ملک العلما، کی زندگی میں لکھی گئی ہے، اس لیے بھی ان کا تذکرہ ہر اعتبار سے نہایت معتمد و موثق ہے،

(۲) حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ نے انوار العیون فی اسرار المکنون میں جو کہ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ متوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات و احوال میں ہے. سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ملک العلما، اور شیخ احمد عبد الحق کی ملاقات کے ضمن میں نہایت شاندار الفاظ والقاب میں ملک العلما، کا تذکرہ ہے، ملک العلما، شیخ عبد القدوسؒ کے جد مادری میں ہیں، ان کے دادا شیخ صفی الدین ردولوی ملک العلما، کے نواسے تھے،

(۳) محمد قاسم نے تاریخ فرشتہ (سنہ تالیف ۹۹۸ھ) میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں قاضی صاحب سے سلطان ابراہیم شرقی کے عقیدت مندانہ اور جذباتی تعلقات کے ذکر کے ساتھ ان کی تصانیف کا ذکر بھی ہے، اور خاندانی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) حضرت مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ متوفی ۱۰۵۲ھ کی کتاب اخبار الاخیار (سنہ تالیف ۹۹۹ھ) میں قاضی صاحب کا مستقل تذکرہ ہے، اور ان کے حالات سے زیادہ ان کی تصانیف کا تذکرہ و تعارف ہے، اور دوسرے اصحاب تراجم کے ضمن میں بھی قاضی صاحب کے بارے میں بہت سی مفید باتیں ملتی ہیں، جن سے ان کی زندگی پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، یہ کتاب ہندوستان کے علما، و مشائخ کے حالات کا مستند ترین ماخذ ہے۔

(۵) اخبار الاصفیا، (قلمی) میں شیخ افضل محمد تمیمی انصاری اکبرآبادیؒ متوفی ۱۰۰۳ھ

واقعہ یہ ہے کہ ملک العلماء اپنے علمی کارناموں کے تنوع میں عہد آفرین و انجمن ساز تھے، جنھوں نے جونپور کی شرقی سلطنت کے دور میں دیار پورب کے قریہ قریہ میں علم و معرفت کی شمع فروزاں کی جس کی روشنی سے پورا ہندوستان منور ہوا۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

شرقی سلطنت کے حدود یعنی صوبۂ اودھ، صوبۂ الہ آباد اور صوبۂ عظیم آباد میں بادشاہت تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی تھی، مگر حکمرانی ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی، اس دور کے امراء، سلاطین اور علماء و مشائخ سب نے ان کی عبقریت کا اقرار کیا، اہل بصارت کی طرح اہل بصیرت نے ان کے علمی و دینی حسن و جمال کا اعتراف کیا، اور دانشوروں کی طرح دیدہ وروں نے ان کی جناب میں تشکر و امتنان کا ہدیہ اور ادب و احترام کا نذرانہ پیش کیا، ان کی شخصیت ہر طبقہ کے لیے پرکشش تھی، پھر یہ عقیدت ان کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے ساتھ بڑی عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا، اسی عقیدت کا مظہر یہ بھی ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کے بعد ان ہی کے دیار علم و فضل کا ایک بے بضاعت عقیدت مند اور عجب کیا کہ ان ہی کے سلسلۂ درس و تدریس کا ایک ادنی طالب علم آج ان کی خدمت میں یہ گلہائے عقیدت پیش کر رہا ہے،

ملک العلماء کے تذکرہ کے ماخذ و مصادر

(۱) ہمارے علم میں ملک العلماء قاضی القضاۃ شہاب الدین دولت آبادی کا سب سے قدیم تذکرہ لطائف اشرفی میں ہے جو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کے ملفوظات و حالات کا مجموعہ ہے، اور جسے ان کے مرید و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنی نے جمع کیا ہے، ملک العلماء سید صاحب کے اجل خلفاء میں ہیں اور شیخ نظام الدین ان کے معاصر اور خواجہ تاش ہیں، اس لیے لطائف اشرفی میں ملک العلماء کے

بارے میں معاصرین اور بعد کے سوانح نگاروں کے زبان و قلم سے نکلے ہیں، اس سے قاضی صاحب کے علمی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے، جس شاگرد کے بارے میں مولانا عبد المقتدر دہلوی جیسے فاضل روزگار نے فخریہ انداز میں یہ کہا ہو، وہ آگے چل کر کیا ہوا ہوگا؟

بپیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم	میرے سامنے ایک ایسا طالب علم آرہا ہے
و مغز او علم، و استخوان او علم است، و از یں	جس کا گوشت پوست اور مغز و استخوان
طالب علم قاضی شہاب الدین می خواست[1]	علم ہی علم ہے اور اس سے مراد قاضی شہاب الدین ہیں'

استادی و شاگردی کی تاریخ میں یہ الفاظ یادگار رہیں اور رہیں گے، جس طالب علم کے ذوق طلب کا یہ عالم تھا، بعد میں اس کا علمی مقام کیا رہا ہوگا۔

اس طالب علم کے مقام علم و فضل کا اعتراف اس کے شیخ و مرشد اور اپنے زمانہ کے مشہور روحانی بزرگ اور عالم و مصنف حضرت سید اشرف سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ نے ان گرانقدر الفاظ میں کیا ہے:۔

در ہندوستان ایں مقدار فضیلت	ہم نے قاضی شہاب الدین جیسی فضیلت و بزرگی
در کسے کم دیدہ ایم[2]	ہندوستان کے اندر کسی دوسرے میں کم دیکھی ہے'

ایک دوسرے موقع پر ان کی جامعیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

برادر اعز و ارشد، جامع العلوم قاضی	برادر اعز و ارشد جامع قاضی شہاب الدین
شہاب الدین نور اللہ قلبہ بانوار الیقین	کے قلب کو اللہ تعالیٰ ایمان و یقین کے انوار سے منور کرے'

ایک جگہ ان کی علمی برتری کو اس انداز میں بیان فرمایا ہے

ہر چند برادر قدوۂ علمائے روزگار روزبۂ	مسلّم ہے کہ میرے بھائی! آپ اس زمانہ کے

---

[1] اخبار الاخیار ذکر قاضی عبد المقتدر ص ۱۴۸ مطبع مجتبائی دہلی قدیم [2] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶ نصرت المطابع دہلی۔

کے صاحبزادے شیخ عبدالصمد انصاریؒ نے قاضی صاحبؒ کے ذاتی حالات مختصر لکھے ہیں اور ان کی کتاب بحر مواج اور مناقب السادات کے بارے میں تفصیل سے کام لیا ہے، اور شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کے تذکرہ میں قاضی صاحب اور مولانا فقیہ حیرتیؒ کے درمیان ایک مباحثہ کا ذکر کیا ہے جو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ہوا تھا،

(۶) ملا کاتب چلپیؒ متوفی ۱۰۶۷ھ نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون میں قاضی صاحب کی متعدد تصانیف اور ان کی شروح وحواشی کا ذکر کیا ہے، جن سے ان کی کتابوں کی شہرت ومقبولیت کا پتہ چلتا ہے،

مذکورۂ بالا چھ کتابیں قاضی صاحب کے حالات کا قدیم اور اصل ماخذ ہیں، بعد کی کتابوں میں ان کے بارہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی کی کتابوں سے ماخوذ ومنقول ہے، البتہ ان میں سے بعض کتابوں میں دوسرے تراجم کے سلسلہ میں قاضی صاحب اور انکے متعلقین ومتوسلین کے مزید حالات بھی ملتے ہیں، خاص طور سے (۷) تذکرہ علمائے ہند اور (۸) نزہۃ الخواطر میں ان کے تین نواسوں اور شاگردوں کا اچھا خاصہ تذکرہ ہے، (۹) سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان (۱۰) مرآۃ الاسرار (قلمی)، (۱۱) مشکوۃ النبوۃ (قلمی) (۱۲) خزینۃ الاصفیاء (۱۳) تجلی نور اور (۱۴) برکات الاولیاء میں بھی قاضی صاحب کا ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ملتی ہے، صرف پرانی باتوں کو دہرایا گیا ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں مندرجۂ بالا کتابیں ہمارے سامنے ہیں، اوپر کی چھ کتابیں اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، باقی معاون کی۔

علماء، مشائخ، معاصرین اور مورخین کی نظر میں

اقلیم علم وفن کے جس کج کلاہ کا تذکرہ ہونے والا ہے، اس کی شان وشوکت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو اس کے

اس قطع میں شیخ واحدیؒ نے غالباً حافظ شیرازیؒ کے اس شعر کو پیش نظر رکھا ہے:

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ — بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

حضرت شیخ فتح اللہ اودھیؒ متوفی ۱۲۳ھ نے قاضی صاحب کے علم و فضل کا یہ اعتراف کیا کہ اپنے مسترشد خاص شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کو ظاہری علوم کی تحصیل و تکمیل کے لیے ان ہی کے پاس بھیجا، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

بشارتِ پیر مدتے پیش ملک العلماء شہاب الدین تلمذ کرد۔[1]	شیخ محمد بن عیسیٰ نے اپنے پیر شیخ فتح اللہ اودھی کے اشارہ پر ایک مدت تک ملک العلماء قاضی شہاب الدین کی شاگردی کی۔

سلسلۂ مداریہ کے بانی و پیشوا شاہ بدیع الدین مدار مکنپوری متوفی ۸۳۸ھ نے بعض علمی و دینی مسائل و مباحث میں ان سے خط و کتابت کی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

مکتوبے در مردم است گویند کہ شاہ مدار آں را بجانب قاضی شہاب الدین گذشتہ بود[2]	شاہ مدار کا ایک مکتوب ایک گمنام شخص کے بارے میں ہے، کہتے ہیں کہ اسے شاہ مدار نے قاضی شہاب الدین کو لکھا تھا۔

قاضی صاحب کے بارے میں ان کے معاصرین کے یہ خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ ان کی نگاہ میں قاضی صاحب کا کیا مقام تھا، بعد کے علماء و فضلاء اور اہل نظر نے بھی قاضی صاحب کی جلالتِ شان اور علمی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۴ھ نے ایک موقع پر ان گرانقدر خطابات و القابات سے یاد کیا ہے،

صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ المشرق	مخدوم قاضی شہاب الدین نور اللہ مرقدہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ [2] ایضاً ص ۱۶۰، ذکر شاہ مدار

فضلائے ہر دیار است[1] — علما کے پیشوا اور ہر مقام کے فضلا کے خلاصہ ہیں۔

سید اشرف سمنانی کے خلیفہ وخادم اور قاضی صاحب کے برادر روحانی شیخ نظام الدین غریب یمنیؒ نے اپنے اس معاصر عالم کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن سے ان کے علمی مقام ومرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

امام روزگار، وہمام دیار قاضی شہاب الدین
کہ مقتدائے علمائے فحول وپیشوائے
بلغائے فروع واصول است[2]

امام وقت، پیشوائے دیار، علمائے کبار کے
مقتدا، اور اصول وفروع کے بلغاء وفصحاء
کے رہبر قاضی شہاب الدین۔

دوسری جگہ اس امام روزگار اور ہمام دیار کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

دے ازمعین خلفائے ولایت مآب، وبہترین ندمائے
اصحاب اند، جامع بودہ میان علوم ظاہری
وباطنی، صاحب معاملات یقینی وجامع واردات
دینی شدہ بود، تشرع بسیار داشت، ریاضات
شدیدہ ومشاہدات جدیدہ کشید کہ اشرف
خلافت واجازت یافتہ[3]

قاضی صاحب سید اشرف کے اجل خلفاء اور
افضل اصحاب میں سے ہیں، وہ علوم ظاہری وباطنی
کے جامع اور معاملات ایمانی وایقانی اور
واردات دینی واسلامی کے نقطۂ اتصال تھے،
شریعت کے معاملہ میں بہت زیادہ بیدار تھے،
ریاضات شدیدہ اور مشاہدات جدیدہ میں
اس قدر جد وجہد کی کہ اشرف ترین خلافت

سید اشرف سمنانی کے ایک دوسرے مرید وخلیفہ اور قاضی صاحبؒ کے معاصر اور برادر روحانی شیخ واحدی نے ان کے تعلیم علم کی وسعت کا ذکر ایک قطعہ میں اس طرح کیا ہے:

لشکر علم تو بہ تیغ بیان — از عجم تا عرب گرفتہ دیار
چوں گرفتی عراق عربیت — فارسی را بواحدی بگذار[4]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۳ [2] ذکر سید اشرف [3] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۴ [4] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۶

کاخ سخنوری را اساس بلند نہاد، و گلشن علم	قصر معلی تعمیر کیا، اور گلشن علم کو فطری
را آب یاری فطرت اعلیٰ طراوت بخشیدہ	صلاحیت کی آبیاری سے تر و تازگی
بر علماء روزگار چیرہ دست آمدہ[1]	بخشی

علامہ غلام علی آزاد بلگرامیؒ متوفی ۱۲۰۰ھ نے اپنے محتاط اور جچے تلے الفاظ میں قاضی صاحب کے بارے میں لکھا ہے :۔

ففاق علی اقرانہ وسبق اخوانہ	اپنے اقران و معاصرین پر فائق ہو کر اپنے
... فزین مسند الافادۃ،	تمام دوستوں سے آگے بڑھ گئے اور درس
وفاق البرجیس فی افاضۃ	و افادہ کی مسند کو زینت بخشی اور سعادت
السعادۃ[2]	فیض پہنچانے میں برجیس پر بھی سبقت لے گئے

خزینۃ الاصفیاء میں ہے :۔

در علوم ظاہری طاق، و بر موز باطنی	آپ علوم ظاہری میں فرد زمانہ اور رموز باطنی
شہرۂ آفاق بود . قلم و زبان را طاقت	میں شہرۂ آفاق تھے . زبان و قلم میں آپ کے
آن نیست کہ تحریر و تقریر اوصافش پرداز	اوصاف و کمالات کے لکھنے اور بیان کرنے
در عہد خود قبولے عظیم یافت[3]	کی طاقت نہیں ہے، اپنے زمانہ میں عظیم مقبولیت

صاحب مشاہدۃ النبوت نے قاضی صاحب کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں :۔

آن مرد آزادے، آن فرد اوتادے،	وہ مرد آزاد، وہ فرد زمانہ، مقتدائے وقت
مقتدائے وقت، قاضی شہاب الدین	قاضی شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ، کہتے ہیں کہ
است . رحمۃ اللہ علیہ، گویند شہرتے و قبولیتے	اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت ان کو عطا فرمائی تھی،

---

[1] اخبار الاصفیاء، ورق ۶۰ قلمی [2] سبحۃ المرجان ص ۳۹ طبع بمبئی [3] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۹۰ مطبوعہ ثمر ہند لکھنؤ ۔

والغرب، عالم ربانی لقمان ثانی، مخدوم
قاضی شہاب الدین نور اللہ مرقدہٗ[1]

صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ الشرق والمغرب
عالم ربانی اور نعمان ثانی تھے،

شیخ عبدالقدوسؒ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی نسل سے تھے، اور قاضی صاحب شیخ عبدالقدوس کے پرنانا ہوتے ہیں۔

شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ متوفی ۱۰۵۲ھ قاضی صاحب کے علم و فضل کے بارہ میں لکھتے ہیں:

شہرت اوصافش مستغنی است از شرح
اگرچہ در زمان او دانشمنداں بودہ اند
کہ استاداں و شریکان او بودہ اما
شہرت و قبولے کہ حق تعالیٰ او را عطا کرد
ہیچ کس را اہل زمان او نکرد[2]

ان کے اوصاف و کمالات کی شہرت و ناموری
شرح و بیان سے مستغنی ہے، ان کے زمانہ میں ان
کے استاد اور اساتذہ میں بہت سے علماء
موجود تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو شہرت و قبولیت
قاضی صاحب کو عطا فرمائی تھی ان میں سے کسی کو اس سے
نہیں نوازا تھا۔

شیخ عبدالصمد بن شیخ افضل محمد انصاری لکھتے ہیں:

صیت کمالات او و آوازۂ بدایتش
بر نمود مشہور تر از آن ست کہ نگاشتہ قلم
بدائع نگار آید، الحق در ہندوستان چنوے
کم بظہور آمدہ، دانش رسمی پیش مولانا
خواجگی و قاضی عبدالمقتدر تحصیل اندوختہ

ان کے کمالات کا شہرہ اور ان کے علم کا آوازہ
اس سے بالاتر ہے کہ قلم کی رنگیں بیانی کی مرہون منت
ہو، حق یہ ہے کہ ہندوستان میں قاضی صاحب جیسے
کم علماء پیدا ہوئے ہیں، رسمی علوم مولانا خواجگی
اور قاضی عبدالمقتدر سے حاصل کر کے اپنے علم کا

---

[1] انوار العیون ص ۳۳، گلزار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۵ھ [2] اخبار الاخیار ص ۱۷۵،

نعمان ثانی، علوم ظاہری میں طاق، رموز باطنی میں شہرۂ آفاق، مقتدائے وقت مقبول خاص و عام، ماہر جملہ علوم، مرشد، محقق، مصنف ملک العلماء، قاضی القضاۃ، مخدوم شیخ شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر مقصود ہے جس نے مدرسہ کی شورش میں خانقاہ کا سکون اور خانقاہ کی خاموشی میں مدرسہ کا ہنگامہ برپا کیا،

نام و نسب اور آبائی وطن آپ کا نام احمد، لقب شہاب الدین اور والد کا نام عمر لقب شمس الدین ہے، والد کے لقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے [illegible] ملک العلماء کا نام و نسب بھی تذکرہ نگاروں نے پورا نہیں لکھا ہے، اور کسی کتاب میں سلسلۂ نسب نہیں ملتا، کشف الظنون میں "شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر الهندی الدولة آبادی" اور دوسری جگہ یوں ہے "شہاب الدین احمد بن عمر"[1] سبحۃ المرجان میں ہے "شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولة آبادی"[2] اخبار الاصفیاء میں یوں ہے "شہاب الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی الغزنوی"[3] اور نزہۃ الخواطر میں ہے "احمد بن عمر الزاولی، قاضی القضاۃ، ملک العلماء، شہاب الدین بن شمس الدین الدولة آبادی"[4]۔ ہماری تحقیق میں آپ کا نام شہاب الدین احمد بن شمس الدین عمر ہے، بعض کتابوں میں جو شمس الدین کے بعد "بن عمر" ہے، اسے صرف "عمر" ہونا چاہیئے۔

زاولی اور غزنوی کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا آبائی وطن زابلستان کا شہر غزنین تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کی تصریح موجود ہے، "اصل او از غزنین ست"[5]۔ زابل یا زابلستان ایک وسیع و عریض علاقہ کا نام ہے، جو بلخ اور طخارستان کے جنوب میں واقع ہے، اس کو زابل یا زابلستان بھی کہتے تھے[6]، غزنین یا غزنہ اسی کا دار السلطنت تھا، غزنین

---

[1] ج ۱ ص ۸۶ و ۲۵۰ [2] طبع العقرہ ص ۳۹ [3] ورق ۱۰۹ [4] ج ۳ ص ۲۰ [5] ج ۲ ص ۳۰۶ [6] معجم البلدان ج ۴ ص ۳۶ طبع مصر

کہ حق تعالیٰ او را اعطا کردہ ہیچ کس را	ان کے اہل زمانہ میں سے کسی کو
از اہل زمان او نکردہ[۱]	نہیں دی تھی۔

صاحب تجلی نور شاہ عبد الحق صاحب کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

پیش او جملہ علوم حاضر، واو بجمیع علوم	ان کے سامنے تمام علوم مستحضر ہوتے
ماہر بود، ازیں جہت ملک العلماء ملقب	تھے اور وہ تمام علوم میں ماہر تھے، اسی لیے
گشت[۲]	ان کو ملک العلماء کا لقب دیا گیا۔

سب سے آخر میں صاحب نزہۃ الخواطر نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

الشیخ الامام الکبیر العلامۃ قاضی	شیخ، امام کبیر، علامہ قاضی القضاۃ ملک العلماء
القضاۃ ملک العلماء..... کان	ذکاوت و تیزی ذہن میں درجۂ کمال رکھتے
غایۃ فی الذکاء وسیلان الذہن	تھے، سرعت فہم، قوت حافظہ، مطالعہ میں انہماک
وسرعۃ الادراک وقوۃ الحفظ	اور کتب بینی سے ان کو سیری و سیرابی نہیں
وشدۃ الانہماک فی المطالعۃ	ہوتی تھی، اور نہ علمی مشاغل اور بحث و نظر سے
والنظر فی الکتب لا تکاد نفسہ	کبھی تھکتے اور گھبراتے تھے۔
تشبع من العلم ولا تروی من	
المطالعۃ ولا تمل من الاشتغال	
ولا تکل من البحث[۳]	

آئندہ سطور میں اسی قدوۂ علمائے روزگار، زبدۂ فضلائے ہر دیار، امام روزگار، ہمام دیار، جامع علوم ظاہری و باطنی، صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ الشرق والغرب، عالم ربانی،

---

[۱] مشکوٰۃ النبوت ص ۲۳۱ قلمی [۲] تجلی نور ج ۲ ص ۳۴ [۳] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۹

بعد اس پرآشوب دور میں ہزاروں خاندان کی طرح اس خاندان نے بھی غزنیں کو خیرباد کیا ہو جب کہ وسط ایشیا کا امن و امان مغلوں کی غارت گری سے ختم ہو چکا تھا، چنگیزی فتنہ کی ابتدا ساتویں صدی کے شروع میں ۶۱۶ھ سے ہوئی اور ۶۵۰ھ کے حدود تک پورا عالم اسلام اس آگ میں جلتا رہا، مگر یہ آگ سندھ تک آکر رک گئی تھی، اور ہندوستان اس سے محفوظ رہا تھا، غالب گمان ہے کہ اسی پرآشوب زمانہ میں یہ خاندان بھی دہلی میں آکر آباد ہو گیا تھا، اور قاضی صاحب کے تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ان کی پیدائش اور نشوونما دولت آباد اور دہلی میں ہوئی حتی کہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگار صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی لکھا ہے کہ "در دولت آباد متولد شد" (ص ۸۸) مگر معلوم نہیں کیسے انھوں نے قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین کے ذکر میں لکھ دیا ہے کہ قاضی صاحب بذات خود غزنیں سے ہندوستان آئے۔

بالجملہ شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ
با پسر خود نصیر الدین از مرز بوم غزنیں
باتنے چند در حادثہ ہلاکو خان بعہد دولت
علاء الدین خلجی در ہندوستان نہادہ
مدتے در دہلی قیام ورزید و در فترات
مذکور قاضی شہاب الدین بن شمس الدین
دولت آبادی ہم از ان دیار وارد
دہلی گشت و بزمرۂ تلامذہ قاضی عبد المقتدر
مباہی گردید (تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶ طبع لکھنؤ)

شیخ نظام الدین اپنے صاحبزادے اور دوسرے
چند لوگوں کے ساتھ ہلاکو خاں کے فتنہ میں
غزنیں سے ہندوستان چلے آئے، یہ علاء الدین
خلجی کا عہد سلطنت تھا، اور ایک مدت تک
دہلی میں قیام کیا، ان ہی حوادث میں قاضی
شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی بھی
اس دیار سے دہلی آئے اور قاضی عبد المقتدر
کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل
ہوگئے۔

اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا، جو خراسان اور ہندوستان کے درمیان حد فاصل تھا[1]، آج کل یہ شہر افغانستان میں واقع ہے۔ زاولی اسی زابلستان یا زابل کی طرف نسبت ہے، جس میں با، کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے ۳۰ھ میں سجستان کی فتوحات کے سلسلہ میں مقام بست کے بعد زابل کو صلح و معاہدہ کے ذریعہ فتح کیا تھا، مگر معاہدہ کے شرائط نرم تھے، اس لیے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مقامی باشندوں نے بغاوت اور سرکشی اختیار کی تو حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے رخج کی فتح کے بعد اسے دوبارہ فتح کیا، اس مرتبہ بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے[2]، اس کے بعد زابلستان بھی عجم کے دیگر ممالک کی طرح اسلامی قلمرو میں آگیا، اس کا مرکزی شہر غزنین سلطان محمود غزنوی اور دوسرے سلاطین غزنویہ کے دور میں بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتا تھا، جہاں عالم اسلام کے ہر طبقہ کے باکمال علماء و فضلاء موجود تھے، بغداد کے بعد غزنین مدتوں ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کا مورد و مصدر رہا، اور جہاں کے بہت سے باکمال خاندان اور افراد نے یہاں آکر دہلی کو دوسرا غزنین بنا دیا۔

آبا و اجداد غزنین سے دہلی میں | ان ہی غزنین سے ہندوستان آنے والوں میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین کا خاندان بھی تھا، یہ خاندان کس زمانہ میں یہاں آیا؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا، سلطان شہاب الدین غوری کے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کرنے کے بعد سے غزنین اور دہلی کا علمی و ثقافتی رشتہ قائم ہو گیا تھا، اور وہاں کے ارباب علم و فن یہاں آنا شروع ہو گئے تھے، ہو سکتا ہے کہ اسی دور میں قاضی صاحب کے آبا و اجداد بھی یہاں آئے ہوں یا اسکے

---

[1] معجم البلدان ج ۴ ص ۲۸۹ [2] فتوح البلدان ص ۳۸۰ و ۳۸۸ طبع مصر

میں سلاطین گجرات نے اپنی حکومت کھڑی کرلی، ۷۹۶ھ میں جونپور میں شاہانِ شرقیہ نے شرقی سلطنت قائم کرلی، اسی طرح ۷۷۱ھ میں کشمیر میں الگ حکومت بن گئی، اور ہندوستان میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی کہ وسط ایشیا سے ۷۷۱ھ میں امیر تیمور گورگان کی فتوحات کا ہلاکت خیز سیلاب امنڈا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمرقند، ماوراء النہر، ترکستان، خوارزم، کاشغر، بلخ، خراسان، مازندران، طبرستان، غزنین، استرآباد وغیرہ میں تباہی مچاتا ہوا شام و حلب میں داخل ہوگیا، اور ۸۰۰ھ میں یہ سیلاب سندھ اور پنجاب کی طرف بڑھا، اور قتل و غارت کرتا ہوا جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ میں دہلی میں پہنچ گیا، اور امیر تیمور نے دہلی میں قتل و غارت کا ایسا بازار گرم کیا کہ سلطان ناصر الدین اس کی تاب نہ لاکر گجرات چلا گیا، اور اس کے وزیر اقبال خاں نے برن میں پناہ لی۔

اس پرآشوب دور میں بھی دہلی کی علمی و دینی رونق بدستور قائم رہی، دانشوروں کی تعلیم گاہیں اور مشائخ کی خانقاہیں پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھیں، مگر ۸۰۱ھ میں تیمور کی تباہ کاریوں سے یہ مدرسے بھی ویران اور خانقاہیں سونی ہوگئیں، دہلی کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑ اجڑ کر جونپور، گجرات، دکن اور کشمیر وغیرہ میں جمنے لگیں اور علماء و فضلاء اور مشائخ قافلہ در قافلہ دہلی سے باہر جانے لگے، اسی پرآشوب زمانہ میں قاضی صاحب نے آنکھ کھولی اور دہلی میں نشو و نما اور تعلیم پائی۔

دہلی میں اودھ کے علماء و مشائخ آپ کے بچپن اور طالب علمی کے زمانہ میں اگرچہ دہلی کا امن و امان اور سکون و اطمینان خواب و خیال ہو رہا تھا، پھر بھی وہاں ہر علم و فن کے سرآمدگانِ روزگار موجود تھے، خاص طور سے دیارِ پورب کے اودھی علماء و مشائخ دہلی میں علمی و روحانی فضا قائم کیے ہوئے تھے، اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے شہر کے بام و در روشن تھے،

جو تمام تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود مصنف کی تصریح کے بھی خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ قاضی شہاب الدین نہیں بلکہ ان کے آبا و اجداد میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے تھے، اور قاضی صاحب کی ولادت اور نشو و نما یہیں دولت آباد میں ہوئی تھی، اس بارہ میں دو رائیں ہیں کہ یہ مقام دہلی سے متعلق تھا یا دکن کا دولت آباد تھا؟ پہلا قول یہ ہے کہ دولت آباد دکن مراد ہے، تاریخ فرشتہ میں تصریح ہے کہ "در دولت آباد دکن نشو و نما یافت" (ج ۲ ص ۳۰۶) دوسرا قول یہ ہے کہ دولت آباد دہلی میں پیدا ہوئے، اخبار الاصفیاء میں ہے "زادگاہ او دولتاباد دہلی ست" (ورق ۷۰) سبحۃ المرجان میں ہے "ولد القاضی بدولت آباد دہلی (ص ۳۹) نزہۃ الخواطر میں بھی یہی ہے (ج ۳ ص ۲۰) تذکرہ علمائے ہند میں صرف دولت آباد ہے (ص ۸۸)۔ یہ عجیب بات ہے کہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی نسبت دہلوی اور جونپوری نہیں لکھی ہے، حالانکہ ان کی پوری زندگی ان ہی دونوں مقامات میں گذری ہے۔

سنہ ولادت کسی کتاب میں درج نہیں ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے، البتہ تذکرہ علمائے ہند (ص ۷) اور نزہۃ الخواطر (ج ۳ ص ۱۳) میں ہے کہ قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کی ولادت ۱۲ ربیع الثانی ۸۵۹ھ میں ہوئی، اگر شیخ ابو المکارم اسمٰعیل اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے تو ان کے والد شیخ صفی الدین کے نانا قاضی شہاب الدین کی عمر ۸۵۹ھ میں کم و بیش چالیس سال کی رہی ہوگی، اس حساب و اندازہ سے خود قاضی صاحب کی ولادت حدود ۸۰۰ھ میں ہوئی ہوگی۔

پیدائش اور تعلیم قاضی صاحب کی پیدائش بہرحال آٹھویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی، اس زمانہ میں دہلی میں تغلق خاندان حکمراں تھا، مگر اندرونی بدانتظامی کی وجہ سے ملک میں جگہ جگہ نئی نئی طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں، چنانچہ ۷۴۸ھ میں دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام ہوا، ۷۹۳ھ

شیخ نصیر الدین محمود اودھی نے ان کی علمیت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے:

سألت العلم من احیاک حقا   فقال العلم: شمس الدین یحییٰ

شیخ شمس الدین سلطان محمد بن تغلق کے عہد ۷۴۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف اودھی علم و معرفت کی بزم میں "چراغ دہلی" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، بڑے پایہ کے عالم و مدرس ہیں۔ قاضی عبدالمقتدر سے ابتدائی تعلیم پائی تھی، پھر شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے علمی و روحانی فیوض و برکات حاصل کرکے دہلی میں مولانا عبدالکریم شروانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی کی شاگردی اختیار کی، اور چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی چلے گئے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ سے خلافت حاصل کی۔ شیخ نصیر الدین اور ان کے تلامذہ علوم شرعیہ کی تعلیم و تدریس میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کی اس خصوصیت کا ذکر شاہ عبدالحق صاحب نے قاضی عبدالمقتدر کے حال میں کیا ہے:-

دائم درس می گفت و بافادهٔ علم مشغول بود و طریقہ شیخ نصیر الدین محمود و اکثر خلفائے ایشان این بود، وصیت او بطالبان اشتغال علم و حفظ شریعت او، گفتے فکر در یک مسئلہ شرعی نفضل از دو ہزار رکعتے کہ متوجب تعجب دریا کنند۔[۱]

قاضی عبدالمقتدر ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، اور شیخ نصیر الدین محمود اور انکے اکثر خلفاء کا یہی طریقہ تھا، وہ طالب علموں کو علم میں مشغولیت اور شریعت کی حفاظت و پاسداری کی تاکید کیا کرتے تھے، ان کا قول تھا کہ ایک شرعی مسئلہ میں غور و فکر کرنا ایسی ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے جس میں تساہل برتا گیا ہو۔

۱۔ اخبار الاخیار ص ۱۴۸

قاضی صاحب نے ان ہی اودھی علماء و مشائخ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو کر ان سے اکتساب فیض کیا، اس وقت شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی ــــــــ کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ، دہلی کی مسند درس اور بزم ارشاد و تلقین سے علوم و معارف کی سوغات تقسیم کر رہے تھے، ان ہی بزرگوں سے قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کی، یہاں ان کا مختصر ذکر مناسب ہوگا۔

شیخ الاسلام فرید الدین اودھیؒ آٹھویں صدی میں اودھ کے شیخ الاسلام تھے، ان کا شمار اس دور کے علماء میں ہوتا تھا، اودھ سے دہلی تک ان کے علم و فضل کی دھوم تھی، اور تشنگان علم و معرفت اس آب حیات سے سیراب ہو رہے تھے، ان کے تلامذہ و مسترشدین میں اودھ کے دو بزرگ شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی اور شیخ علاء الدین نیلی اودھی خاص طور سے شہرت رکھتے تھے۔

شیخ شمس الدین محمد یحییٰ نے شیخ الاسلام فرید الدین سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ دہلی میں مولانا ظہیر الدین بھکریؒ کی شاگردی اختیار کی اور پھر وہیں پوری زندگی درس و تدریس ارشاد و تلقین اور عبادت و ریاضت میں گذار دی، حضرت نظام الدین اولیاء کے اجل خلفاء میں سے تھے، ان کی تصانیف میں شمس المعارف اور شرح مشارق الانوار کے نام ملتے ہیں، ان کی علمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ

از مشاہیر علماء دہلی گشت و بیشتر مردم	شیخ شمس الدین دہلی کے مشاہیر علماء میں سے
شہر در تلمذ وے نسبت می کردند و بآن	ہو گئے اور شہر دہلی کے اکثر علماء نے ان سے
نسبت مفتخر و مبتہج بودند[1]	نسبت تلمذ کو اپنے فخر و خوشی کا باعث سمجھا۔

زندگی بھر بڑے بڑے علماء و مشائخ دونوں ان کا احترام کرتے تھے، ان کے شاگرد خاص

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۰

وعقلیہ کی تدریس میں بسر کی اور ۷۹۱ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، قاضی شہاب الدین کو انکی نگاہ کیمیا اثر نے ملک العلماء بننے کی استعداد بخشی، اوران کے دوسرے اساتذہ وشیوخ کے مقابلہ میں قاضی عبدالمقتدر نے ان پر خاص توجہ کی،

شیخ نصیرالدین اودھی کے دوسرے شاگرد وخلیفہ مولانا خواجگی دہلوی ہیں جو قاضی صاحب کے دوسرے مربی ومرشد اور معلم ہیں، واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت سازی میں ان دونوں استاذوں کی توجہ نے بڑا کام کیا ہے، اور اس میں کوئی تیسرا نظر نہیں آتا، مولانا خواجگی نے دہلی کی علمی فضا میں آنکھ کھولی، اور شیخ نصیرالدین سے فیض اٹھایا، اور مولانا معین الدین عمرانیؒ سے بھی تعلیم حاصل کی جو اپنے وقت میں فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت، علم کلام، منطق اور فلسفہ میں دہلی کے مشہور عالم ومدرس مانے جاتے تھے، فراغت کے بعد اپنے استاذ وشیخ نصیرالدین اور ان کے بزرگوں کے طریقہ پر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، اور اسی میں دہلی میں پوری زندگی بسر کردی، اور آخر میں تیموری فتنہ میں دہلی کی تباہی سے پہلے ہی کالپی چلے گئے، اور وہیں ۸۰۰ھ میں فوت ہوئے، اس سفر میں قاضی شہاب الدین بھی ان کے ساتھ تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد انھوں نے جونپور کا رخ کیا،

قاضی صاحب کے اساتذہ میں صرف مولانا عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی کے نام لیے جاتے ہیں، یہ دونوں شیخ نصیرالدین محمود اودھی چراغ دہلی کے واسطہ سے شیخ الاسلام فریدالدین اودھی اور ان کے تلمیذ خاص شیخ شمس الدین اودھی کے علمی وروحانی سلسلہ کے ترجمان اور نمایندے تھے، نیز قاضی صاحب مولانا خواجگی کے اجل خلفاء میں سے تھے، اس اودھی سلسلۂ علم ومعرفت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں علوم شرعیہ اورفنون نقلیہ وعقلیہ کا رواج عام تھا، اور اس کے مشائخ وعلماء درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کی خدمات

شیخ نصیر الدین ۷۵۷ھ میں فوت ہوئے، ان کے تلامذہ میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی، مولانا خواجگی، شیخ محمد بن یوسف گیسو دراز، شیخ علاء الدین سندیلوی اور شیخ علاء الدین الندی وغیرہ ہیں، ان میں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی دونوں بزرگ قاضی شہاب الدین کے اساتذہ وشیوخ میں ہیں۔

مولانا قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کندی تھانیسر میں پیدا ہوئے اور دہلی میں پروان چڑھے، انھوں نے شیخ الاسلام فریدالدین اودھی کے خرمن علم وفضل سے خوشہ چینی کی اور ان کے تلمیذ رشید شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے ابتدائی کتب درسیہ پڑھیں، جس زمانہ میں قاضی عبدالمقتدر ان سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے تلمیذ شیخ نصیر الدین محمود اودھی کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، اور بعض علمی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے جس سے شیخ نصیر الدین کو قاضی عبدالمقتدر کی جودت طبع اور علمی صلاحیت وقابلیت کا اندازہ ہوا، اور انھوں نے ان کو تحصیل علم کی طرف خصوصی توجہ دلائی، بعد میں قاضی عبدالمقتدر نے ان سے تفسیر کشاف اور اصول بزدوی پڑھی، اور ان ہی کی بیعت وخلافت سے اپنی روحانی بزم سجائی۔ قاضی عبدالمقتدر اپنے دور میں دہلی کی جامع ترین شخصیت تھے، علوم نقلیہ وعقلیہ کے ماہر تھے، ادب، فصاحت وبلاغت اور جودت طبع میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کا قصیدہ "لامیہ" جو قصیدہ لامیۃ العجم کے معارضہ میں ان کی قادر الکلامی، فصاحت، بلاغت، ادبیت اور شاعری کے ذوق لطیف پر شاہد عدل ہے جس کے دو ابتدائی اشعار یہ ہیں:

یا سائق الظعن فی الاسحار والاصل	سلم علی دار سلمی وابک ثم سل
عن الظباء التی من دابھا ابدا	صید الاسود بحسن الدل والجل

قاضی عبدالمقتدر نے اپنے استاد کے طریقہ پر پوری زندگی علوم شرعیہ اور فنون ادبیہ

میں جا کر اپنی والدہ سے کہا کہ اسے گھر کے اندر کہیں دفن کر دینا چاہیے، مولانا عبد المقتدر کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی، چنانچہ جب قاضی صاحب درس میں حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا

شما در خیال گور کردن زر دید، با علم کجا پروا زید[1]

تم سونا دفن کرنے کے خیال میں ہو بھلا علم کے ساتھ یہ کیسے نبھ سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی طالبعلمی کے زمانے کے یہی دو واقعات ملتے ہیں، جن سے طلب علم میں ان کے انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی والدہ ماجدہ کا ذکر آگیا ہے، مگر والد ماجد کا ذکر نہیں ملتا، یہ بھی معلوم نہیں کہ اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت میں ان کا کتنا ہاتھ تھا، اور وہ اس وقت بقید حیات بھی تھے یا نہیں؟ (باقی)

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۱

حیات شبلی

(مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی کا آخری کارنامہ)

یہ نو سو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع گوناگوں کمالات بزرگ کی سوانحعمری ہی نہیں بلکہ درحقیقت مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس سالہ علمی، ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی، ملی و قومی تحریکات و واقعات کی ایک مستند تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں متن اور حاشیہ دونوں میں بہت سے ایسے اصحاب علم و فن کے مختصر حالات و سوانح بھی آگئے ہیں، جنکا اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت و خدمت کی تاریخ کے ساتھ ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں، اسی کے ذیل میں سلاطین شرقیہ جونپور کے عہد کے مشہور و ممتاز ترین عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر بھی اردو میں پہلی مرتبہ آیا ہے جس کی تفصیل اس مضمون میں ہے

قیمت :- ۵۰/- روپے

بھی انجام دیتے تھے، اس لیے قاضی صاحب پر بھی یہی رنگ غالب ہوا، اور انھوں نے شیخت سے زیادہ علمیت کے انداز میں زندگی بسر کی، ۸۰۴ھ کے بعد جب جونپور آئے تو یہاں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ کی صحبت و خلافت نصیب ہوئی، ان میں بھی علم و معرفت دونوں کا اجتماع تھا، لیکن علمیت کے مقابلہ میں شیخت کا رنگ غالب تھا، علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محدث، مفسر، فقیہ، مفتی، مورخ اور علوم عقلیہ کے بھی بڑے عالم تھے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر سے تلمذ قاضی شہاب الدین نے سب سے پہلے مولانا عبد المقتدر کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، اور استاذ کی پہلی ہی نگاہ کیمیا اثر نے شاگرد کے مسِ خام کو کندن بنا دیا، وہ اپنے اس شاگرد کے علمی ذوق و شوق، طلب و جستجو اور قابلیت و استعداد کو فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے،

پیشِ من طالب علمے می آید کہ پوست او	میرے پاس ایک ایسا طالب علم آرہا ہے
علم، و مغز او علم، و استخوان او علم است	جس کا چمڑا، ہڈی اور مغز سب علم ہی علم
و ازیں طالب علم قاضی شہاب الدین	ہے، اور اس سے ان کی مراد قاضی
رحمۃ اللہ علیہ می خواست[۱]	شہاب الدین تھے،

استاد کے ان تاثرات سے شاگرد کی علمی لگن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر شفیق استاد ہونہار شاگرد کی تعلیم کے ساتھ اس کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے، اس سلسلہ میں اخبار الاخیار نے مناقب الصدیقین کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قاضی شہاب الدین کو کہیں سے تھوڑا سا سونا مل گیا، جسے وہ بحفاظت گھر لے گئے، اور تنہائی

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۹۱ ذکر قاضی عبد المقتدر

کلام کو ایسے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی صوفی، شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے، آہ عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک و قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔" (ص ۱۰)

اور پھر بجنوری کے تبصرے سے متاثر ہو کر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کون شخص ہے جو دیوان غالب کے مطالعہ کے وقت یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس کا لکھنے والا حقیقی ماہر فن ہے، اور شاعری خدا کی طرف سے اس کو ودیعت کی گئی تھی۔ اس کی شاعری کسبی نہیں...... اس کی ہستی ان چیدہ اور برگزیدہ خاصانِ خدا کے گروہ سے ہے، جن کا وجود ابدی ہے" (ص ۱۱)

اس کے بعد وہ غالب کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندی خیال، ذکاوت، تعمق خیال، وسعتِ نظر، عالمگیر ہمدردی و غم خواری، انسان اور اس کے خصائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی ندرت، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے اور ان کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

غالب بے شک انسانی ہستی کا اعلیٰ مفسر ہے اور اس کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہیگا، اس میں ہیچ میرز کی رائے میں غالب شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے کی عمیق النظری، شلر کی بلند خیالی، فرنس ٹامسن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے۔" (ص ۴۲)

ناظرین کو اس سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن غالب کو اپنی زندگی میں شکایت تھی کہ ان کی قدر دانی نہیں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ سرسید، صہبائی اور شیفتہ کی غیر معمولی قدر دانی سے بھی زیادہ کے متوقع رہے، وہ زندہ ہوتے تو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب

غالب کی وطنیت پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

کلام غالب کو مقبول بنانے میں نظامی بدایونی کی شرح کا بھی بڑا حصہ ہے، اسکے اب تک کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، اس کے پانچویں اڈیشن کی اہمیت اُس وقت بڑھ گئی جب اس میں ڈاکٹر سید محمود بار ایٹ لا کا ایک مقدمہ بھی منسلک کر دیا گیا، یہ پانچواں اڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، لیکن ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ بھی ۱۹۱۹ء کا لکھا ہوا ہے، وہ ابھی تک بقید حیات ہیں، اس وقت ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی ہوگی، وہ اپنی طالب علمی سے لیکر اب تک مختلف قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ممبری سے ترقی کر کے اس کے آل انڈیا سکریٹری بھی ہوئے، پھر صوبہ بہار کے وزیر تعلیم ہوئے، اور آخر میں حکومت ہند کے وزیر مملکت امور خارجہ بھی رہے، ان سیاسی دلچسپیوں کے ساتھ ان کو تاریخ اور شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق ہے، وہ بھی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح غالب کے پرستار ہیں، اسی پرستاری میں ان پر ایک مقالہ لکھا جس کو نظامی بدایونی نے اپنی شرح کلام غالب کے ساتھ بڑی ممنونیت سے شائع کیا، ڈاکٹر صاحب عبد الرحمٰن بجنوری کے بڑے معترف ہیں، لکھتے ہیں:

"اس نئے دور میں خدائے تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا، جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچانی تھی، اور جو غالب کے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

غالب نے اپنے اہلِ وطن کو ان مصائب سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین یہ کہکر کی تھی:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

انگریزوں نے دہلی فتح کی تو اس وقت بڑی افراتفری تھی، نہ کوئی قانون تھا نہ قاعدہ اور نہ نظیر، کوئی کہیں فریاد نہیں کرسکتا تھا، اس کی شکایت غالب اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

وائے محرومیِ تسلیم و بداحالِ وفا　　جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب جس طرح مٹائی، اس کا اثر غالبؔ کے دل پر بھی ہوا، اور انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا جو حقیقتاً دل کو ہلا دینے والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلاکر خون کے آنسو رلواتا ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے　　اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر پورے درد دل کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں۔

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج　　قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ　　تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

کی مذکورۂ بالا داد کو کس نظر سے دیکھتے۔

ڈاکٹر سید محمود نے اپنے اس مقدمہ میں ایک ایسی نئی بات کہی ہے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہی تھی، ان کو غالب کی غزلوں کے بعض اشعار میں ان کے زمانہ کے خوں چکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے، اس کو ناظرین محض حسن تاویل یا ڈاکٹر صاحب موصوف کی ذہانت جو چاہیں سمجھیں، انھوں نے اپنے مقدمہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا، سیاست دانوں کی طرح غالب نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہکر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفا کے مکان ویران اور برباد کر دیے گئے، پورا شہر صحرا ہو گیا، تو غالب اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، ان کو دیکھ کر غالب نے کہا:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

پھر ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین مسلمانوں کو اس طرح کرتے ہیں :

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رہبر چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر سید محمود نے غالب کی غزلوں کے اشعار میں ان کے سیاسی خیالات کی جو تعبیر کی ہے، اس سے ان کے دوستوں کو اتفاق نہیں تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ "اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے، ان کو ملکی اور قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔" ڈاکٹر صاحب کے عزیز دوست سید راس مسعود نے بھی ان کو لکھا کہ غالب کی اکثر تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں اور انگریزی طرز حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کسی غیر ملکی حکومت یا طرز حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے، ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ غالب زمانہ کے تقاضا اور اردو شاعری کے خاص طرز بیان کی وجہ سے اپنے ملکی و قومی جذبات صاف صاف الفاظ میں ظاہر کرنے سے معذور تھے، مجبوراً اپنے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں میں کرتے رہے، جیسا کہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔

اور پھر کہتے ہیں :

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کے حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً وہ اپنے ملک کی بدنصیبی پر یہ کہکر روتے ہیں :

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا　　جاہ و جلال عہد وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے　　عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے دل خراش واقعات پر بھی اس طرح آنسو بہائے :

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں　　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اسی لیے فرماتے ہیں :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے شیر آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق　　میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے تھے لیکن ضبط نہیں ہوا تو کہہ اٹھے :

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے　　میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اسی غزل میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت ہی اصل میں قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے، اور جب کسی قوم کو حکومت حاصل ہو گئی تو گویا سب کچھ مل گیا، اور اس قوم میں زندگی آ گئی :

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو انھوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت ان کو رفتہ رفتہ دیجائے گی، یہاں تک کہ حکومت کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کر دیجائے گی۔ مرزا غالب اس پر بڑی حسرت و مایوسی کا اظہار اس پیرایہ میں کرتے ہیں :

کوشش کی ہے کہ وہ بڑا وطن پرست تھا، اور اسلامی اقتدار کی تباہی سے اس کے دل پر بڑی چوٹ لگی، چنانچہ ذیل کے اشعار اس کے درد دل کے مظہر بیان کیے جاتے ہیں:

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ اک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

جو شخص ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کا ترجمان سمجھتے ہیں، وہ شاید اس سے ناواقف ہیں کہ یہ غدر کے غالباً چالیس سال قبل لکھے گئے۔ ملاحظہ ہو دیوان غالب قلمی نسخہ بھوپال جو ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا۔ (غالب ص ۷۹-۸۰)

یگانہ اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف تو غالب کے مخالفوں میں سے ہیں، اس لیے انکا ڈاکٹر سید محمود پر نکتہ چیں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اکرام غالب کے پرستاروں میں ہیں، وہ بھی ڈاکٹر سید محمود کی رائے سے متفق نہیں، لکھتے ہیں کہ حال ہی میں مرزا کے چند مداحوں نے ان کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں حب وطن کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا، حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالات زندگی اور ان کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا بلکہ مرزا کی افتاد طبیعت کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ مرزا بقول خود شہد کی مکھی نہیں تھے گڑ کی مکھی تھے۔...... جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اس کے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو تو مرزا کو شاہی سلسلہ کے ختم ہونے کا کوئی صدمہ نہیں ہوا ــــ کوئی فکر تھا تو اپنے مستقبل سے متعلق، اور انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں درخواستیں گذرانی شروع کر دیں کہ تمام دوا

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی | یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

اور یہ بھی

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے | اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

غالب کے اشعار کی مذکورہ بالا سیاسی تعبیر پر بڑی نکتہ چینیاں ہوئیں، غزل کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ حسب حال موقع بموقع پڑھے اور استعمال کیے جاتے ہیں، غالب کے زمانہ میں جو خونچکاں سیاسی واقعات ہوتے رہے، ان کی تطبیق غالب کے بہت سے اشعار سے کی جا سکتی ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ غالب نے یہ اشعار ملک کی زبوں حالی ضائع شدہ قومی وقار، کھوئی ہوئی ملکی آزادی اور پھر آزادی کی تڑپ میں کہے، جن کو کہتے وقت یہ ساری باتیں ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ رہی ہونگی، لیکن ان کی غزل گوئی کی کرامتیں جہاں اور طرح سے دکھائی دیتی ہیں، وہاں سیاسی رنگ میں بھی دکھی گئیں مگر ڈاکٹر سید محمود کی تعبیر پر جل کر یگانہ چنگیزی نے جو غالب کے مخالفین میں ہیں حسب ذیل رباعی بھی لکھ ڈالی :

تلوار سے مطلب نہ کھانڈے سے غرض | مومن سے سروکار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگوں میں دم توڑتا ہو شاہ ظفر | غالب کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے یہ لکھکر نکتہ چینی کی کہ ایک اور نقاد ڈاکٹر سید محمود بیرسٹر ایٹ لا ..... بدایونی نسخہ کے دیباچہ میں غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنا دیتے ہیں، اس طرز کی تنقیدوں سے اردو داں طبقہ میں ایک قسم کی بد ذوقی پیدا ہو چلی ہے

(غالب مصنفہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف ص ۱۱، اردو ترجمہ)

آگے چل کر ڈاکٹر سید عبد اللطیف لکھتے ہیں کہ غالب کے قدردانوں نے یہ بتانے کی

جو کچھ کہا ہے، اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کیسے یقین کیا جائے کہ مرزا اپنے مقابلہ میں بہادر شاہ کو اہم نہیں سمجھتے تھے۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ	مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف	نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز	جس کا ہر قول معنیِ الہام
اے ترا لطف زندگی افزا	اے ترا عہد فرخی فرجام
ہو سکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے	دفتر مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستایش نا تمام	عجزِ اعجاز ستایش گر کھلا
فخرِ دیں، عزِ شان و جاہ و جلال	زینت طینت و جمال کمال
کارفرمائے دین و دولت و تخت	چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا، ہما کا سایہ ہے	خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے بفیضِ وجود و سایہ و نور	جب تلک ہے نمود سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو	وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد، دل شاد، شادماں رکھیو

اور غالب پہ مہرباں رکھیو

تجھ کو شرف مرحبا نتاب مبارک	غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

غالب فارسی میں بھی اسی قسم کی قصیدہ خوانی کر کے بہادر شاہ ظفر کو اپنے عجز و نیاز کا خراج پیش کرتے رہے، پھر معلوم نہیں کون سا ایسا موقع آیا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنے کو بہادر شاہ ظفر سے اہم سمجھتے رہے، ان سے مرید ہوئے، ان کی ملازمت کیلیے

کے بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں، مجھے کیوں نہ کوئین پوئٹ گنا جائے، مرزا معاملہ فہم آدمی تھے، اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے انکی دل بستگی کبھی بھی اتنی گہری نہیں ہوئی کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے اور اگر ہوتے بھی تو اپنے سوا مرزا کس کو اس قدر اہم سمجھتے تھے کہ اس کے لیے آنسو بہاتے" (غالب نامہ ص ۱۴۵-۱۴۶)

یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ غالب کو بہادر شاہ سے دلچسپی نہیں رہی، غالب کے حسب ذیل اشعار یا تو ان کی محض کذب بیانی پر محمول کیے جائیں یا ان کی راست گوئی سمجھی جائے جو ان کی سیرت کا ایک اہم جزو بتایا جاتا ہے۔

اے شہنشاہ آسماں اورنگ — اے جہاں دار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

پھر اسی قطعہ میں یہ بھی کہتے ہیں:-

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

نہ صرف اس قطعہ بلکہ غالب نے اپنے اور قصیدوں میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کر کے

وہ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں میں بھی مبتلا رہے۔ انھوں نے تقریباً ۳۴ مثنویاں لکھیں جن میں عشق و عاشقی کی داستان کے بیان کے علاوہ اپنی پالتو سوہنی و موہنی بلی، مرغ، بکری، بٹیر بازی وغیرہ پر بے سود باتیں لکھ کر اپنی شاعرانہ صلاحیتیں ضائع کیں، انھوں نے اپنی آنکھوں سے نادرشاہ کے حملے سے دلی کو برباد ہوتے ہوئے دیکھا، ہندوستان پر احمد شاہ ابدالی کے پانچ حملے ان ہی کی زندگی میں ہوئے، دلی کئی بار لوٹی گئی، مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں نے دلی اور آگرہ کو جس طرح تباہ کیا، اس کا ہولناک نقشہ ان کی نظروں کے سامنے رہا، عالمگیر ثانی کا قتل ان کی زندگی میں ہوا، غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کے سینہ پر چڑھ کر اس کو اندھا کیا، یہ سارے جاں گداز واقعات ان کی زندگی میں ہوئے، لیکن انھوں نے ان کو اپنی مثنویوں کا موضوع نہیں بنایا، اگر بناتے تو یہ قیمتی تاریخی ماخذ بھی ہو جاتے، ذکر میر میں اپنے زمانہ کے جستہ جستہ کچھ واقعات لکھ کر بظاہر کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن انھوں نے اس طرح محض اوس سے اپنی پیاس بجھائی ہے، ذکر میر ہی کی طرح غالب نے بھی دستنبو میں غدر کے واقعات کو گھٹی گھٹی تحریروں میں قلمبند کرکے اور اپنے خطوط میں اپنے زمانہ کی ہولناکیوں کی طرف اشارہ کرکے ہی کفارہ ادا کیا ہے، لیکن ان پر سے یہ الزام دور نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شاہی آقا اور ولی نعمت بہادر شاہ ظفر کو بھول کر انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگ گئے، لیکن اس بے غیرتی اور بے حمیتی میں سارا ہندوستان مبتلا ہو گیا تھا، ہندوستانیوں کو بہادر شاہ ظفر کا ماتم کرنے کی جرأت برطانوی دور حکومت میں تو نہ ہوئی، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ان کے المناک انجام پر کھلے بند آنسو بہانے کا موقع ملا۔

غالب کی یہ کوتاہی اور تقصیر نظر انداز کر دی جائے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی غزلوں

تڑپے، پھر ان کے مصاحب بننے کے بعد شہر میں اتراتے پھرے، ورنہ بقول ان ہی کے شہر میں ان کی آبرو کیا تھی۔

غالب پر یہ الزام ضرور عائد آتا ہے جس کے مداح، غلام، کارگزار، خانہ زاد اور مرید، ادھار کھانے سے محفوظ نوکر اور بندہ رہے، اس کی مصیبت، زوال، اور موت پر ان کا قلم خاموش رہا، انھوں نے عارف کا جس انداز میں مرثیہ لکھا تھا اسی طرح غزل کے علامتی الفاظ کی آڑ میں بہادر شاہ کا مرثیہ لکھ سکتے تھے، جس سے انگریزان کی حکومت کے قانون کی گرفت میں بھی نہ آتے، اور ان کا ایک اہم فرض بھی ادا ہو جاتا، لیکن برطانوی حکومت کی قہرمانی سے مرعوب ہو کر یہ جسارت نہ کر سکے، اور سچ تو یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر خواہ کیسے ہی بے جان حکمراں رہے ہوں لیکن ان کی موت ایک عظیم الشان سلطنت، ایک شاندار تہذیب، ایک پرشکوہ ماضی کی موت تھی، جس طرح سعدی نے زوالِ بغداد پر ایک خونچکاں ماتم کیا تھا، اسی طرح دہلی کی تباہی پر ایک دل فگار اور دل خراش ماتم لکھنے کی ضرورت تھی، غالب ہی یہ فرض اور اپنی نمک خواری کا حق ادا کر سکتے تھے، لیکن وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ مگر وہ کوئی ماتم لکھنا بھی چاہتے تو شاید لکھ نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ محض ایک غزل گو شاعر تھے، کربلا کے واقعات پر مراثی لکھنے کی کوشش کی تو اس میں وہ ناکام رہے۔ غزل کے ذریعہ سینہ کوبی کی ساری قوت عارف کی موت پر صرف کر چکے تھے، پھر تمام غزل گویوں پر یہ الزام آتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے سنگین واقعات سے بے خبر ہو کر حسن و عشق ہی کے نغمے الاپتے رہے، ان میں سے بعض شاعر شہر آشوب لکھ کر قانع ہو جاتے، گو ان میں بھی واقعہ نگاری سے زیادہ شعر گوئی ہی کے فن کا مظاہرہ ہوتا امیر کے بارہ میں مشہور ہے

غالب کی حب الوطنی پوری اترتی ہے،

غالب کا مولد اکبرآباد یعنی آگرہ تھا، اس کو چھوڑ کر وہ دہلی میں آکر آباد ہو گئے، یہی ان کا وطن ہو گیا تھا، لیکن وہ اپنے مولد کو نہیں بھولے، نواب ضیاء الدین احمد ایک دفعہ آگرہ گئے تو ان کو غالب نے فارسی میں ایک خط لکھا، اس میں آگرہ کو یاد کر کے جس طرح تڑپ اٹھے ہیں، اس سے ان کو اپنے مولد سے جو غیر معمولی محبت رہی، اس کا اظہار پورے طور پر ہوتا ہے، انھوں نے یہ خط اشک و آہ کے ساتھ لکھا، اور اپنے اس وطن میں نیر کو اپنے دیدہ و دل کا پیام شوق بھیجنے میں بہت خوش تھے، نیر کو لکھتے ہیں کہ اکبرآباد کو چھوٹی نظر سے نہ دیکھنا، وہ اس کی آبادی اور ویرانہ کے ساتھ اپنے کھیل کی جگہ کو بھی یاد کرتے ہیں، جہاں وہ مجنون کی طرح رہتے اور اب اسکی یاد میں خونیں آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ جب اس سرزمین میں گھاس کے بجائے ان کی محبت اُگتی تھی، اور درخت کے بجائے ان کا دل بار آور ہوتا تھا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس گلکدہ میں نسیم اس طرح بہتی کہ غنچہ صبوحی پینا اور بلبل سانا زمیں پڑھنا بھول جاتے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس گلزار کا ہر ذرۂ خاک ان کے لیے ایک دل نشین پیام ہوتا، اور اس گلستاں کی ہر پتی ان کے لیے نماز نشان دعا بنی رہتی۔

(یہ فارسی خط مولانا غلام رسول مہر کی غالب کے صفحہ ۵ پر درج ہے۔)

انھوں نے ہندوستان کے بعض شہروں کی جو تعریف دل کھول کر کی ہے اس سے ان کے وطنی جذبات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، ۱۸۲۷ء میں غالب کلکتہ جاتے ہوئے بنارس ٹھہرے، یہ شہر ان کو بہت پسند آیا، اپنے ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

"بھائی! بنارس خوب شہر ہے، اور میرے پسند ہے ایک مثنوی میں نے اسکی تعریف میں لکھی ہے، اور چراغ دیر اس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔"

میں تو نہیں لیکن ان کی مثنوی چراغ دیر، پھر دستنبو اور ان کے خطوط میں انکی حب الوطنی
کے جذبات کے روشن ستارے جھلملاتے نظر آتے ہیں ۔

اکرام صاحب اپنی کتاب غالب نامہ کے پہلے اڈیشن میں تو یہ کہہ گئے کہ مرزا میں
حب وطن نہ تھا، وہ شہر کی کھی نہیں تھے، گرد کی کھی تھے، وہ ملکی یا نسلی تعلقات کو بہت
اہمیت نہیں دیتے تھے، لیکن اکرام صاحب کی رائے ان کی کتاب کے چوتھے اڈیشن میں
کچھ بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ وطنیت کی موجودہ صورت جو حقیقتاً
مغرب سے ماخوذ ہے، اس قدر نئی ہے کہ مرزا سے اس کی توقع رکھنا عبث ہے ..... لیکن
اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حب وطن سے عاری تھے یا اگر ان کے ہم وطنوں پر کوئی زیادتی
ہوتی تو اس کا ان کو دکھ نہ ہوتا، غدر کے بعد اہل دہلی کو میرٹھ کے باغیوں کی جو سزا بھگتنی
پڑی تھی، اس کی شکایت سے مرزا کے خطوط بھرے ہوئے ہیں، اور جا بجا ان کے دل
کے پھپھولے پھوٹ گئے ہیں، ان خطوط کو پڑھتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ انہیں
لکھتے وقت مرزا نے اپنا مافی الضمیر پوری طرح ظاہر نہیں کیا، اور تمام حالات ڈر ڈر کے
لکھے ہیں۔" (ص ۳۷۹)

یہ صحیح ہے کہ ان کی حب الوطنی میں وطنیت کا وہ معیار نہیں جو آجکل کے سیاست دانوں
اور صحافت نگاروں نے قائم کر رکھا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانہ میں جو
حب الوطنی کا معیار تھا وہ ان میں موجود تھا، اس زمانہ کا معیار یہ تھا کہ مولد اور مسکن
کے ساتھ ملک کے اور دوسرے شہروں اور وہاں کی تمام چیزوں سے شیفتگی ہو، وہاں
کے لوگوں سے اخلاص و محبت ہو، ان کے دکھ درد سے دل تڑپ اٹھتا ہو، یا وہاں کے
باشندوں میں جو خوبیاں ہوں ان کی قدر و منزلت دلوں میں ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اس معیار پر

کہ می آید بدعویٰ گاہ لافش | جہان آباد از بہر طوافش

پھر کہتے ہیں کہ نظر جب بنارس سے ناآشنا ہوتی ہے تو اس میں آشنائی کی بہار کی وجہ سے خود گلشن کی ادائیں پیدا ہو جاتی ہیں، بنارس کی شاعرانہ تعریف سے خود شاعری کو بہشت کا سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے،

سخن را نازش مینو قماشی | ز گلبانگ ستایش ہائے کاشی

پھر بنارس کو بہشت، خرم اور فردوس معمور کہتے ہیں :

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور | بہشت خرم و فردوس معمور

بنارس میں جو گنگا بہتی ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ کسی نے کہدیا تھا کہ بنارس چین ہے یعنی چین جس طرح اپنے نگارخانوں کے لیے مشہور رہے، اسی طرح بنارس ہے، اس کو سن کر بنارس کی پیشانی پر شکن پڑ گئی، جو گنگا کی شکل میں بہتی نظر آتی ہے،

بنارس را کسے گفتا کہ چین است | ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بنارس کو پھر دہلی پر ترجیح یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ اس کی پرکاری کو دیکھکر دہلی اس پر درود بھیجتی رہتی ہے، یعنی دہلی اس کی تعریف و تحسین کرنے پر مجبور رہے،

بخوش پرکاری طرز وجودش | ز دہلی می رسد ہر دم درودش

کہتے ہیں کہ دہلی میں جو نہر بہتی ہے وہ دراصل بنارس کو خواب میں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر گیا ہے،

بنارس را مگر دیدست در خواب | کہ می گردد ز نہرش در دہن آب

بنارس کے خس و خار کو گلستاں اور اس کے غبار کو روح کا جوہر بتایا ہے.

خس و خارش گلستانست گوئی | غبارش جوہر جانست گوئی

یہ مثنوی لمبی ہے، اس میں تقریباً ۱۰۴ اشعار ہیں، شروع میں وہ شکایت کرتے ہیں کہ دلی چھوڑنے کے بعد ان کے دوستوں نے ان کو بھلا دیا۔ وہ بنارس میں بیٹھ کر اپنے دلی کے دوستوں میں سے مولانا فضل حق، حسام الدین حیدر اور امین الدین احمد خاں کو یاد کرکے بے چین رہتے ہیں، جو دلی سے ان کی شیفتگی کا مزید ثبوت ہے، وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی شکل میں پھر ایک بار ناز و افتخار کے جلوے دیکھنا چاہتے تھے، حسام الدین حیدر خاں کو یاد کرکے لکھتے ہیں کہ وہ انکے بازوئے ایمان کے تعویذ ہیں، اور امین الدین احمد خاں کو یاد کرکے کہتے ہیں کہ وہ ان کی قبائے جاں کے پیوند ہیں، ان دوستوں نے ان کو یاد نہیں کیا تو پھر ایک نامراد عاشق کی طرح دلی پر یہ داسوخت لکھ کر اپنی بھڑاس نکالی کہ دل ان کا دلی کے بوستاں کے داغ فراق سے تو نہیں بلکہ دوستوں کی بے مہری کے غم میں جل رہا ہے، لیکن دلی کی محبت میں اس کو بوستاں ہی کہنے پر مجبور ہوئے، پھر جلی کٹی باتیں بھی لکھتے ہیں، کہ دلی میں اگر نہ بھی رہے تو غم نہیں، یہ آباد رہے یا اجڑ جائے اس کا بھی افسوس نہیں لیکن پھر ان کا قلم رک جاتا ہے کہ دلی کے ایسے دوست پھر نہیں ملیں گے، وہ دوستوں کی سرد مہری کی وجہ سے دلی جیسی پیاری جگہ کو چھوڑنے کے لیے تیار تو ہوگئے لیکن چھوڑی نہ جا سکی، ۱۸۲۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اپنی زندگی کی بہار و خزاں یہیں گذاری، جس سے ان کی محبت اور بھی بڑھتی گئی،

بنارس کی تعریف دل کھول کر کی ہے، یہ تعریف اسی طرح کی ہے جس طرح کہ ایک عاشق اپنے ایک معشوق کو چھوڑ کر کسی دوسرے معشوق کی تعریف میں رطب اللسان ہوجائے اس سے غالب کے دلی کے ان دوستوں کا دل جلا ہوگا، جنھوں نے ان سے سفر کے دوران سرد مہری دکھائی تھی، بنارس کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ دلی بنارس کا طواف کرنے کے بعد ہی دوسرے شہروں پر لاف زنی کر سکتی ہے۔

اور دل کے لیے سراپا مژدۂ آسایش ہے، اپنی مستی میں موجوں سے بھی زیادہ مست ہیں اور لطافت میں پانی سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، گنگا کی آغوش بھی ان کے لیے بے تاب رہتی ہے، ان کے جلووں سے سیپ کے اندر کے موتی بھی شرمندہ رہتے ہیں، اب ذرا اصل اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

میانہا نازک و دلہا توانا ز نادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست دہنہا رشک گلہائے ربیعی ست
بہ لطف از موج گوہر نرم روتر بناز از خونِ عاشق گرم روتر
ز رنگیں قد انداز خرامی بپائے گلبنی گستردہ دامی
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش بہار بستر و نوروز آغوش
ز تاب جلوۂ خویش آتش افروز بتانِ بت پرست و برہمن سوز
بسامانِ دو عالم گلستاں رنگ ز تاب رخ چراغانِ لب گنگ
رسانندہ آزادی شست و شوی بہر موجے نوید آبروی
قیامت قامتاں مژگاں درازاں ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں
بتن سرمایۂ افزایش دل سراپا مژدۂ آسایش دل
بمستی موج را فرمودہ آرام ز نغزی آب را بخشیدہ اندام
ز بس عرض تمنا می کند گنگ ز موج آغوش ہا وا می کند گنگ
ز تاب جلوہ ہا بے تاب گشتہ گہرہا در صدف ہا آب گشتہ

اس کے بعد پھر بنارس کی تعریف یہ لکھکر کرتے ہیں کہ بنارس ایک معشوق ہے، گنگا اس کا آئینہ ہے، جس سے وہ اپنی آرایش صبح و شام کرتا رہتا ہے اور اس

اس سلسلہ میں غالب کہتے ہیں کہ بنارس کا ہر موسم معتدل رہتا ہے، بہار کا موسم ہو یا گرمی و سردی کا ہو، ہر موسم میں اس کی فضا جنت کی ایسی رہتی ہے، اس کی تائید یا تردید تو وہاں کے لوگ کر سکتے ہیں، بنارس کی اور تعریفیں اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے چمن زار کی فضا میں بہاروں نے پھولوں کا زنار باندھ رکھا ہے، اور آسمان کے شفق کی رنگینی دراصل بنارس کا تلک ہے۔

بتسلیم ہوائے آں چمن زار — زموج گل بہاراں بستہ زنار

فلک را قشقہ اش گر بر جبیں نیست — پس ایں رنگینی موج شفق چیست

پھر یہاں کے معشوقوں اور پری زادوں کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ان کی کمر تو نازک ہوتی ہے، لیکن دل مضبوط ہوتا ہے، وہ نادان ہیں لیکن اپنے کام یعنی دل لینے میں دانا ہیں، ان کے لبوں کی مسکراہٹوں میں بڑا فطری پن ہے، ان کے منہ بہار کے پھولوں کے لیے قابل رشک ہیں، وہ اپنی لطافت میں موتیوں کی موج سے زیادہ نرم ہیں اور ناز میں عاشق کے خون سے زیادہ گرم رو ہیں، ان کی چال ڈھال کی صورت کا نقش بناتی ہے، اور پھولوں کی جھاڑی کا جال بچھاتی ہے، وہ نہ صرف غارت گر ہوش ہیں، بلکہ بستر کی بہار اور آغوش کی عید نوروز ہیں۔ وہ اپنے جلوؤں سے آگ کو بھی روشن کرتے رہتے ہیں، وہ خود تو بت ہیں، لیکن بت پرستوں اور برہمنوں کے جلانے والے معشوق ہیں، وہ دونوں عالم کا سامان سمیٹے ہوئے گلستاں کا انداز رکھتے ہیں، ان کے چہروں کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گنگا کے کنارے کسی نے چراغ روشن کر دیے ہیں جب گنگا میں نہاتے ہیں تو گنگا کی ہر موج کو آبرو بخشتے ہیں، ان کا قد قیامت کا سا ہوتا ہے ان کی لمبی لمبی پلکیں دلوں کی صفوں پر برچھیاں چلاتی رہتی ہیں، ان کا جسم دل افزا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کو اس لیے پسند کیا کہ وہ انگریزی دارالحکومت اور انگریزوں کا پسندیدہ مرکز تھا، غالب کو یہاں کی آب و ہوا راس آئی تو کیا اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پسندیدہ مرکز تھا؟ بنارس تو انگریزوں کا پسندیدہ مرکز نہیں تھا، پٹنہ میں بھی اس وقت تک انگریزوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا، غالب انگریزوں کی بھٹنی ضرور کرتے رہے، لیکن شہروں کی پسندیدگی انگریزوں کی خاطر نہیں ہو سکتی تھی، اس میں زیادہ تر وہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ یہ ان کے ملک کا ایک ترقی یافتہ شہر تھا، دہلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی تعریف ایک ساتھ اس طرح کرتے ہیں:

گفتمش اکنوں بگو کہ دہلی چیست	گفت جان است و این جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت	شاہدے مست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد	گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد	گفت خوشتر نہ باشد از سوہن (دریائے سون)
حال کلکتہ باز جستم گفت	باید انتیلم ہشتمش گفتن
گفتمش آدم ہم رسد در وے	گفت از ہر دیار و از ہر فن

اگر غالب انگریزوں کے کسی قصیدہ میں کلکتہ کی تعریف کرتے تو خیال ہو سکتا تھا کہ انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر یہ مدح سرائی ہو رہی ہے، لیکن وہ اپنے نجی خطوط میں اس کی تعریف کرتے رہے، اپنے ایک فارسی خط میں علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں کہ کلکتہ کیا ہے کہ یہاں دنیا بھر کا مال مل سکتا ہے، یہاں موت کا علاج تو نہیں دستیاب ہو سکتا ہے، اور نہ قسمت حاصل ہو سکتی ہے لیکن ان کے علاوہ ہر چیز ارزاں ہے"

پری چہرہ کا عکس فلک پر سونے کے سورج میں پڑتا رہتا ہے، سبحان اللہ کیا حسن و جمال ہے کہ اس کا حسن ایسے آئینہ میں رقص کرتا رہتا ہے، بنارس ایک لاابالی حسن کا بہارستان ہے جس کی کوئی مثال نہیں،

مگر گوئی بنارس شاہدی ہست ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

نیاز عکس روی آں پری چہر فلک در زر گرفت آئینہ از مہر

بنام ایزد زہے حسن و جمالش کہ در آئینہ می رقصد مثالش

بہارستانِ حسن لاابالی ست بکشور ہا سمر در بے مثالی ست

غالب بنارس سے پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے، جہاں دو سال تک مقیم رہے، وہ اپنی پنشن کی بحالی کی کوشش میں گئے تھے، وہاں ان کی مطلب برآری نہ ہو سکی لیکن وہاں کی آب و ہوا ان کو راس آگئی، تو کلکتہ کی آب و ہوا اور دوسری چیزوں کی تعریف دل کھول کر کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ کلکتہ ہندوستان کا سب سے زیادہ نشیبی حصہ ہے، آب و ہوا حد درجہ مرطوب اور بالائی ہند کی تمام صحت افزا خصوصیات سے محروم..... اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں، کلکتہ کو آب و ہوا کے اعتبار سے بدترین مقام قرار دیتی ہیں ..... بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ مرزا غالب دو سال تک کلکتہ رہے، اور آب و ہوا کی ناموافقت انھیں یک قلم محسوس نہیں ہوئی، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی لطافت و خوشگواری کی مداحی میں رطب اللسان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و امیال کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ تھا، انگریزوں کے اوصاف و اطوار سے خوش اعتقادی اور ہر اس چیز کی پسندیدگی جو انگریزوں کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ (بحوالہ غالب از غلام رسول مہر ص ۱۱۲-۱۱۰)

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

(۴)

مجددیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے تحفظ اور اس کی تجدید و اصلاح کے لیے ہر صدی میں اپنے کسی منتخب بندہ کو مامور فرمایا ہے، جو اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو بیرونی آمیزش سے پاک کرکے اس کی اصل صورت میں پیش کرتا ہے، اس کا سلسلہ ہر زمانہ میں قائم رہا، پہلی صدی ہجری میں اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضہ سے اس سلسلہ کا آغاز ہوا، اور آٹھویں صدی میں جن علماء نے تجدیدی خدمات انجام دیں ان میں حافظ سراج الدین البلقینی کا نام بھی لائق ذکر ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی جنھیں خود بھی نویں صدی ہجری کے مجدد ہونے کا دعوی ہے، فرماتے ہیں کہ "حافظ بلقینی آٹھویں صدی کے مجدد تھے، ان میں اس کے تمام شرائط موجود تھے"[1] یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ پہلی صدی سے نویں صدی تک کے تمام مجددین وطناً مصری اور مسلکاً شافعی رہے ہیں[2]، حافظ سخاوی اور ابن عماد حنبلی نے بھی بلقینی کو آٹھویں صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے[3]۔

---

[1] حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۳۲۵ [2] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۰ وشذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

پھر کلکتہ سے واپسی کے بعد مولوی سراج الدین احمد کو ایک فارسی مکتوب میں اس شہر کی تازگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کو اہل وعیال کا خیال نہ ہوتا تو اسی مینو کدہ میں وہ آباد ہو جاتے، اپنی پسندیدگی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کو یہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ملتی تھیں، پانی بھی انکے مزاج کے مطابق تھا، پھر بقول ان ہی کے ان کو یہاں خالص شراب بھی ملتی رہی اور میٹھے میٹھے پھل بھی جن میں کھجوریں بھی تھیں، اور پھر کلکتہ پر تغزلانہ رنگ میں اشعار بھی کہہ دیے جن سے اس شہر سے ان کے دلی لگاؤ کا پورا اندازہ ہوگا۔

کلکتہ کا کیا جو ذکر تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ انکی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

یہ واضح رہے کہ کلکتہ ہی میں غالب سے وہ ادبی مجادلہ ہوا جس سے ان کا وہاں رہنا دشوار ہو گیا تھا انھوں نے کلکتہ کے لوگوں کی بدسلوکیوں سے گھبرا کر اپنی مثنوی باد مخالف لکھی جس میں اپنی غریب الوطنی کا اور اہل کلکتہ کی نامہربانیوں کی شکایت کی ہے، اس میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ چاہتے تو اس جھگڑے کو بڑھا سکتے تھے لیکن ان کو خیال ہوا کہ اس طرح ان کے وطن کی عزت و آبرو پر حرف آئیگا اور دہلی کا خون ان کی گردن پر آئے گا۔ وہ ننگ دہلی بننا نہیں چاہتے تھے۔

برگ دشمنی ساز دنیش بود — ننگ دہلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم کہ جوہ رفتن من — خون دہلی بود بہ گردنِ من

ان اشعار سے بھی ان کو دہلی کی محبت اور وطن دوستی کا پورا اظہار ہوتا ہے،

اپنی زندگی کی تلخیوں کو یاد کر کے وہ کلکتہ کی ہجو لکھ سکتے تھے لیکن اس شہر کی محبت ان پر غالب آئی اور انکی ہجو لکھنے کے بجائے اپنے خطوط اور اشعار میں اس کی تعریف کرتے رہے۔

(باقی)

مکارم اخلاق ان کے صحیفۂ کمال میں مکارم اخلاق کا باب نہایت نمایاں حیثیت رکھتا ہے، علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

کان عظیم المروءۃ جمیل	بہت بامروت اور بڑے محبت کرنے
المودۃ مھیبا مع کثرۃ المباسطۃ	والے تھے، اور اپنے احباب سے محبت
لاصحابہ والشفقۃ علیھم	وشفقت اور لطف و کرم کے باوجود
والتنویۃ بذکرھم[1]	بڑے باوقار تھے۔

شادی وہ شیخ بہاء ابن عقیل کے خصوصی تلامذہ میں تھے، شیخ مذکور ان سے اتنا زیادہ تعلق خاطر رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی بھی کر دی تھی،

اولاد طبقات کی کتابوں میں ان کے تین صاحبزادوں کا نام ملتا ہے، یہ تینوں علم و فضل میں اپنے والد کے خلف الصدق تھے، سب سے بڑے لڑکے بدر الدین محمد تھے، جو ۷۶۹ھ میں شام کے قاضی مقرر ہوئے، حافظ بلقینی کو اپنی زندگی ہی میں ان کی موت کا داغ اٹھانا پڑا۔

دوسرے شیخ الاسلام جلال عبد الرحمن رمضان ۷۶۳ھ میں پیدا ہوئے، حدیث میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، انھوں نے تفسیر و فقہ میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں، مصر میں کئی بار منصب قضا و افتاء کی خدمت انجام دی، ابن فہد کا بیان ہے کہ حافظ بلقینی کی وفات کے بعد افتاء کی سیادت ان پر ختم تھی[2] حافظ شمس الدین بن ناصر الدین لکھتے ہیں کہ "وہ اعیان امت میں سے تھے اور اجتہاد، حفظ اور علوم اسناد میں اپنے والد کے صحیح جانشین تھے، میں نے ان کو علمی درس میں شیخ بلقینی سے مباحثہ کرتے بارہا دیکھا ہے"[3] ۸۲۴ھ میں بمقام قاہرہ وفات پائی،

۱؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ ۲؎ لحظ الالحاظ ص ۲۸۲ ۳؎ ایضاً

اجتہاد | حافظ بلقینی شافعی مذہب سے متاثر تھے، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر اس عہد میں شوافع کا مرکز شمار ہوتا تھا، چنانچہ بلقینی کو جن شیوخ سے کسب فیض کا موقع ملا ان کی اکثریت شافعی المسلک تھی، اس لیے ان کا رجحان قدرتاً شافعی مسلک کی طرف ہوا، لیکن وہ ان کے جامد مقلد نہیں تھے، عمر و علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں اجتہادی شان پیدا ہوگئی، اور علماء وائمہ نے انھیں مجتہد مطلق قرار دیدیا، حافظ ابن فہد نے لکھا ہے کہ وہ آخر میں مجتہد ہوگئے اور بہت سے مسائل میں منفرد تھے[1]

ابن حجر کا خیال ہے کہ ان میں اجتہاد کے تمام شرائط بدرجۂ اتم موجود تھے، "وکانت آلۃ الاجتہاد فیہ کاملۃ"[2] ابن عماد رقمطراز ہیں

فاق الاقران واجتمعت فیہ	وہ معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے
شروط الاجتہاد[3]	اور ان میں اجتہاد کے تمام شرائط مجتمع تھے

علامہ جلال الدین سیوطی اعتراف کرتے ہیں

بلغ رتبۃ الاجتہاد ولہ ترجیحات	وہ اجتہاد کے رتبہ پر پہنچ گئے تھے، بعض
خارجۃ عن المذھب[4]	امور میں ان کے تفردات مذہب سے
	جداگانہ تھے۔

شعر وسخن | دینی علوم کے ساتھ شعر وادب کا بھی ذوق رکھتے تھے لیکن اس میں کوئی خاص ملکہ حاصل نہ تھا، کبھی کبھی واردات قلبیہ شعر کی شکل اختیار کرلیتی تھیں، مگر ان میں فنی سقم رہ جاتا تھا، اس لیے حافظ بلقینی اپنی طرف شعر کے انتساب کو عار تصور کرتے تھے[5]

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۱۴ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۲ [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

[4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [5] لحظ الالحاظ بذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۱۶

جن میں سے کچھ یہ ہیں: حواشی الروضۃ (۲ جلد) شرح الترمذی حواشی علی الکشاف، التدریب فی الفقہ الشافعیہ تصحیح المنہاج (۶ جلد) الملمات برد المہمات، محاسن الاصطلاح، الاجوبۃ المرضیۃ عن المسائل المالکیۃ[1]

زین الدین العراقی

نام و نسب عبد الرحیم نام، ابو الفضل کنیت اور زین الدین لقب تھا۔ پورا نسب نامہ یہ ہے: عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمن بن ابراہیم بن ابی بکر بن ابراہیم[2] اصلاً عراقی اور وطناً مصری مشہور ہوئے۔

خاندان، وطن اور ولادت امام عراقی کردی الاصل تھے، ان کے آباء و اجداد اربل کے ایک قصبہ رازنان کے رہنے والے تھے، اربل عراق کا ایک مردم خیز اور حسین و جمیل شہر ہے، امام عراقی کے والد شیخ حسین اپنی صغر سنی ہی میں بعض اعزہ کے ہمراہ وہاں سے نقل مکان کر کے دریائے نیل کے کنارے واقع ایک مقام منشیہ المہرانی پہنچ گئے، اور وہاں کی مشہور خانقاہ رسلان کے شیخ تقی الدین القنائی کے دامن سے وابستہ ہو گئے، اور ان کے خصوصی خدمتگاروں کے زمرہ میں شمار ہونے لگے، وہیں ایک صالحہ خاتون سے ان کا عقد ہوا، اور کچھ عرصہ کے بعد جب ان کی اہلیہ حاملہ ہوئیں تو شیخ تقی الدین نے پیشین گوئی کی کہ عبد الرحیم نام کا بچہ پیدا ہوگا، چنانچہ ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۷۲۵ھ کو امام زین الدین العراقی عدم سے وجود میں آئے[3]

نشو و نما ان کے والد انھیں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں برابر لاتے تھے، شیخ ان پر دست برکت پھیر کر درازیٔ عمر و سعادت مندی کی دعا فرماتے، ابھی امام عراقی تین ہی

---

[1] الضوء اللامع ج ۲ ص ۱۷۱ [2] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۵۱ [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۵ ... الضوء ... ص ۲۹۰

تیسرے شیخ علم الدین صالح تھے، جو اپنے زمانہ میں مذہب شافعی کے بہت بڑے علمبردار شمار ہوتے تھے۔ ۷۹۱ھ میں پیدا ہوئے، پہلے اپنے والد اور بھائی سے فقہ کی تحصیل کی، اس کے بعد دیگر شیوخ کے خرمن علم سے بھی استفادہ کیا، ۸۲۶ھ میں قاضی مقرر ہوئے، فقہ میں منفرد مقام حاصل تھا، ۵ رجب ۸۶۸ھ کو فوت ہوئے۔[۱]

وفات ۱۰ ذی القعدہ بروز جمعہ ۸۰۵ھ کو عصر سے کچھ قبل علم و عمل اور فضل و کمال کا یہ نیر تاباں سرزمین قاہرہ میں غروب ہو گیا،[۲] دوسرے دن صبح کو ان کے صاحبزادہ جلال الدین عبد الرحمٰن نے جامع حاکم میں نماز جنازہ پڑھائی، شیخ بلقینی نے محلہ بہاء الدین قاہرہ میں اپنے مکان کے قریب اپنے قائم کردہ مدرسہ میں مدفون ہوئے،[۳]

ان کی وفات کا عام غم منایا گیا، شعراء نے بکثرت مرثیے لکھے، ان میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کا مرثیہ بہت مشہور ہے، یہ مرثیہ ایک سو بائیس اشعار پر مشتمل ہے، علامہ جلال الدین سیوطی نے حسن المحاضرہ میں اس کو نقل کر دیا ہے،[۴] اس کا پہلا شعر یہ ہے:

یاعین جودی لفقد البحر بالمطر واذری الدموع ولا تبقی ولا تذری

تصنیفات دینی علوم میں تبحر کے باوجود کوتاہ قلم تھے، اور بہت کم کتابیں تکمیل تک پہنچ سکیں، اس کی وجہ علامہ سخاوی یہ بیان کرتے ہیں کہ بلقینی ہر تصنیف کا آغاز بڑے جوش اور ولولہ و انہماک کے ساتھ کرتے لیکن وسعت علم کی بنا پر مضامین کا احاطہ کرنے میں ناکام رہتے اور تصنیف شرمندۂ تکمیل ہی رہتی، انھوں نے بخاری کی شرح لکھنا شروع کی تو صرف بیس حدیثوں کی شرح ۲ جلدوں میں کی،[۵] ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ ہے، ان میں جو دو ممتاز کتابوں کے نام حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں درج کیے ہیں۔[۱۴]

۱؎ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۹۰ ۲؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۹۰ ۳؎ شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۲
۴؎ حسن المحاضرہ [illegible]

اس میں مہارت فنی پیدا کی، ابن عبد الہادی سے صحیح مسلم کا سماع کیا،

تحصیل علم کے لیے سفر | مقامی علماء اور اہل کمال سے استفادہ کے بعد دوسرے ممتاز و نمایاں علمی مرکزوں سے استفادہ کرنے کے لیے وطن سے باہر قدم نکالا، حافظ تقی الدین ابن فہد کا بیان ہے کہ ۷۵۴ھ میں وہ پہلی بار تحصیل علم کے سلسلہ میں شام گئے۔ اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گذرتا تھا، جس میں وہ طلب علم یا حج کے لیے سفر نہ کرتے ہوں۔ چنانچہ ۷۵۵ھ میں مکہ، ۷۵۶ھ میں اسکندریہ اور ۷۵۸ھ میں دمشق گئے، اس کے بعد علمی اسفار کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا، جن ممالک کا انھوں نے سفر کیا اُن میں طرابلس، بعلبک، نابلس، بیت المقدس، خلیل، غزہ، مکہ، مدینہ، حلب، قاہرہ، حمص، حماۃ، اور صفد کا ذکر ملتا ہے[1]، ان کے علاوہ جہاں کہیں بھی انھیں کسی علمی سرچشمہ کا علم ہوا اس سے مستفید ہوئے، اس ذوق و شوق کا یہ ثمرہ تھا کہ اپنے شیوخ کی موجودگی ہی میں حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم میں مرجع خلائق بن گئے تھے۔

حدیث | قرأت کی تحصیل کے بعد پہلے انھوں نے مقامی علماء سے حدیث کی تحصیل کی، اسکے بعد دمشق میں شیخ احمد بن عبد الرحمٰن المرداوی، محمد بن اسمٰعیل الحموی، ابن الخباز اور محمد بن اسمٰعیل سے، شام میں امام تقی الدین السبکی سے، مکہ میں احمد بن قاسم الحراری سے، مدینہ میں عفیف المطری سے، حلب میں سلیمان بن ابراہیم سے، مختلف کتب حدیث کا سماع اور اس فن کے نکات حاصل کیے، علامہ سخاوی نے لکھا ہے کہ انھیں علم حدیث پر استعداد عبور حاصل تھا کہ

---

[1] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۳

سال کے تھے کہ والد داغ مفارقت دے گئے، ان کی وفات کے بعد شیخ تقی القنائی نے انکی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، امام عراقی کو ذہانت و ذکاوت اور قوتِ حفظ سے وافر حصہ ملا تھا، اس لیے آٹھ سال کی عمر میں نہ صرف کلام پاک کے حفظ سے فارغ ہوگئے بلکہ کتاب لحاوی، التنبیہ اور الالمام لابن دقیق العید کو بھی دماغ میں محفوظ کرلیا،[1] علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ وہ ایک دن میں "الالمام" کی چار سو سطریں زبانی یاد کر لیتے تھے[2]

طلب علم میں غیر معمولی ذوق کے باعث تمام ممتاز مقامی فضلاء کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے، سب سے پہلے شیخ ناصر بن محمد بن سمعون، شیخ برہان الدین ابراہیم ابن لاجین الرشیدی، احمد بن یوسف السمین عمر بن محمد الدمنهوری سے عربیت اور قرأت کے فن کی تحصیل کی، جو اس زمانہ میں ان فنون کے صدر نشین شمار ہوتے تھے،

طلب حدیث امام عراقی کو ابتدا میں علم قرأت سے غیر معمولی شغف تھا، اور انھوں نے اپنی پوری توجہ اس کی طرف منعطف کر دی تھی، اس لیے عزالدین بن جماعہ نے ان کو سمجھایا کہ

ان علم القرأة كثير التعب	علم قرأت بڑا مشکل علم ہے، اور تم ذہین
وانت متوقد الذهن فينبغي	ہو، اس لیے تمھیں اپنی صلاحیتوں
صرف الهمة الى غيره	کو دوسرے علم میں لگانا چاہیے۔

اس سے علم حدیث کی طرف اشارہ تھا، اس لیے ۷۴۲ھ سے وہ حدیث کی تحصیل میں منہمک ہوگئے، اور سب سے پہلے شیخ شہاب الدین احمد بن البابا سے حدیث پڑھی، اس کے بعد شیخ علاء الدین الترکمانی اور علی بن شاہد الجیش سے صحیح بخاری کی سماعت اور

---

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۱ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۴

بالتفرد فيه عدة من حفاظ عصره[1]	ان کے ہم عصر علماء میں اس کی نظیر نہیں ملتی، ان کے متعدد معاصر حفاظ حدیث نے انکے یکتائے فن ہونے کی شہادت دی ہے۔

امام عز بن جماعۃ جن سے شیخ عراقی کو شرف تلمذ حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ مصر کا ہر محدث ان ہی کے فیض کا ممنون ہے[2]

فقہ | فقہ اور اصول فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، اس میں انھوں نے محمد بن عدلان محمد بن اسحاق البلبیسی، جمال الدین الاسنوی اور شمس بن اللبان کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کی تھی اور اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ اسنوی جیسے جلیل القدر فقیہ بھی ان کی فہم و دانش کے معترف تھے اور عراقی کے فقہی مباحث کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا کرتے تھے، حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ اسنوی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

ان ذهن العراقي مستقيم لا يقبل الخطاء[3]	عراقی کا ذہن اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی،

شیوخ و اساتذہ | امام عراقی نے مختلف ملکوں کے علماء سے استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کے اساتذہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے، تقی الفاسی جو عراقی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں لکھتے ہیں:

مسموعاته وشيوخه في غاية الكثرة	ان کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بے انتہا ہے۔

کچھ شیوخ کے نام اوپر آچکے ہیں، ان کے علاوہ جن ممتاز علماء کے اسمائے گرامی

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۲۷　[2] طبقات الاسنوی ورق ۹۱　[3] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۵۱،
[4] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶

کان شیوخ عصرہ یبالغون	ان کے ہم عصر شیوخ جیسے سبکی، علائی
فی الثناء علیہ بالمعرفۃ کالسبکی	اور ابن جماعۃ وغیرہ ان کے علم و
والعلائی وابن جماعۃ وابن	معرفت کی بے حد تعریف کرتے
کثیر وغیرھم[1]	تھے۔

امام اسنائی انھیں حافظ کہا کرتے تھے[2]، حدیث سے ان کے شغف کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دمشق میں شیخ محمد اسماعیل سے صحیح مسلم کو صرف ۶ نشستوں میں ختم کیا[3] مقریزی کا بیان ہے کہ

ھو شیخ الحدیث انتھت	وہ شیخ الحدیث ہیں اور ان پر
الیہ ریاستہ[4]	اس فن کی امامت ختم ہے۔

حافظ ابن فہد کی رقمطراز ہیں:

انھمک فی ھذا الفن وصرف	وہ اپنے تمام اوقات صرف کرکے اس
اوقاتہ الیہ حتی غلب علیہ	فن (حدیث) کی تحصیل میں منہمک
وصار مشھوراً بہ فتقدم	ہوگئے، یہاں تک کہ یہ فن ان پر چھا گیا
فیہ وانتھت الیہ ریاستہ	اور اسی کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے،
فی البلاد الاسلامیۃ مع المعرفۃ	اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے،
والاتقان والحفظ بلا ریب	اسلامی ممالک میں وہ حدیث میں
ولا مریۃ بحیث انہ لم یکن	اپنی معرفت، اتقان اور حفظ کے
فیہ نظیرہ فی عصرہ وشھد لہ	باعث بلا شبہ صدر نشین تھے، اور

[1] الضوء اللامع ج ۳ ص ۲۴ [2] ایضاً [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۳ [4] الضوء اللامع ج ۳ ص ۲۴

همه سوى السماع والتصنيف	تصنیف اور افادہ کے علاوہ ان کا
والإفادة فتوغل فى ذلك حتى	کوئی اور مشغلہ نہ رہتا، اس میں انھیں
ان غالب اوقاته اوجميعها	اتنا انہماک تھا کہ ان کے اوقات
لا يصرفها فى غير الاشتغال	کا بڑا حصہ اسی میں گذرتا تھا، اس کے
فى العلوم[1]	علاوہ اور کسی مشغلہ میں نہیں۔

ان کے علمی کمالات کا شہرہ سن کر ایک مخلوق استفادہ کے لیے ٹوٹ پڑی، جن میں مختلف طبقوں اور مختلف ملکوں کے تشنگان علم شامل تھے، حافظ شمس الدین دمشقی لکھتے ہیں:-

رحل اليه للأخذ عنه و	ان سے تحصیل علم اور سماع کے لیے
السماع الجم الغفير الكبير منهم	چھوٹے بڑے طالبان علم کا ایک جم غفیر
والصغير فلازموه واستفعوا	ٹوٹ پڑا، انھوں نے عراقی کی صحبت
به وكتب عنه جميع الأئمة	میں رہ کر ان سے استفادہ کیا، اسکے
من العلماء الأعلام والحفاظ	علاوہ بڑے بڑے ائمہ علماء، اور
ذوا الفضل[2]	جلیل المرتبت حفاظ نے انکی مرویات کی کتابت کی۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے ہم عصر علماء کی اکثریت ان ہی کے خرمن فیض سے مستفید ہوئی، خاص طور سے محدثین مصر کے بارے میں امام ابن جماعہ اور تقی الفاسی کا بیان ہے کہ وہ سب امام عراقی کے صحبت یافتہ تھے، ان کے شیوخ کی طرح ان کے تلامذہ کا یکجا ذکر کہیں نہیں ملتا، متفرق طور پر تقی الفاسی، حافظ جمال الدین بن ظہیرہ، علاء الدین

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۲۶ [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۴

کا ذکر ملتا ہے، وہ یہ ہیں:-

محمد بن علی القطروانی، ابن الاکرم، محمد بن عبد اللہ النعمانی، علی بن احمد بن عبد المحسن،
محمد بن ابی القاسم الفارقی، مظفر العطار، احمد بن محمد الرصدی، قاضی فخر الدین بن مسکین،
ابوالحرم القلانسی، ابوالحسن لرضی، محمد بن احمد الدلاصی، محمد بن موسیٰ الشقراوی، ابن قیم الضیائیہ
ابوبکر بن عبد العزیز، محمد بن محمد الحرانی، یحییٰ بن عبد اللہ الفارقی، شیخ الاسلام تقی السبکی،
امام جمال الدین، ابراہیم بن الشہاب، قاضی عبد الرحیم بن ابراہیم البارزی، عبد اللہ
ابن داؤد السلمی، محمد بن احمد النقیبی، عثمان الاعزازی، محمد بن ابی بکر الخابوری، عبد القادر
ابن علی، عمر بن حمزہ، ابراہیم بن عبد اللہ الزبیادی، محمد بن عثمان، طاہر بن احمد، قاسم
ابن سلیمان الاذرعی، حافظ صلاح الدین العلائی، خلیل بن عیسیٰ المقری، امام خلیل
المالکی، فقیہ احمد بن قاسم الحرازی[1]

درس وافادہ امام عراقی کا چشمۂ فیض نہایت وسیع تھا، انھوں نے مختلف مقامات
پر درس وتدریس کی مجلسیں آراستہ کیں، دار الحدیث الکاملیہ، مدرسہ ظاہریہ، قراسنقوریہ
اور جامع ابن طولون میں مدت دراز تک حدیث کا اور مدرسہ فاضلیہ میں فقہ کا درس
دیا، علاوہ ازیں حرمین میں بھی کافی عرصہ درس وتدریس کی خدمت انجام دی[2]
محققین نے لکھا ہے کہ امام عراقی کے شب وروز کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہوتا تھا، وطن
کے قیام کے زمانہ میں یا تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے یا درس وافادہ میں،
ابن فہد مکی رقمطراز ہیں :-

فی مدۃ اقامتہ فی وطنہ لم یکن   وطن کے قیام کے زمانہ میں سماع حدیث،

---

[1] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۲۲ تا ۲۲۵ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۴

ان کے تلمیذ رشید صلاح الاقفہسی کا بیان ہے کہ "میرے استاذ امام عراقی حدیث
کے متن اور سند دونوں میں بڑے ماہر تھے[1]" علامہ تقی الدین ابن رافع کو جب قاضی
عز الدین بن جماعہ کے انتقال کی خبر ملی تو انھوں نے فرمایا کہ

ما بقی الآن بالقاہرۃ محدث	اب قاہرہ میں سوائے امام عراقی
الا الشیخ زین الدین العراقی[2]	کے کوئی محدث باقی نہیں رہا،

حافظ ابن حجر نے جو منتخب زمانہ محدثین کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، انباء الغمر
بانباء العصر میں شیخ امام عراقی کے فضل و کمال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے
ایک جگہ لکھا ہے:

لم ار فی ھذا الفن اتقن منہ	میں نے اس فن میں ان سے زیادہ صاحب
... ولم ار اعلم بصناعۃ	اتقان نہیں دیکھا ... اور نہ فن حدیث
الحدیث منہ وبہ تخرجت	کا ان سے بڑا عالم میری نظر سے گذرا
	اور میں نے بھی انہی سے استفادہ کیا۔[3]

حافظ ابو المحاسن الدمشقی نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے:

الامام الاوحد العلامۃ	وہ علامہ امام، حافظ اسلام، یگانہ عہد
حافظ الاسلام فرید	اور منتخب روزگار تھے، اپنے زمانہ
دھرہ و وحید عصرہ من فاق	میں حفظ و اتقان میں سب پر فائق
بالحفظ والاتقان فی زمانہ	تھے، اور ان کے معاصر ائمہ نے بھی حدیث
وشھد لہ بالتفرد فی فنہ ائمۃ عصرہ[4]	میں ان کی انفرادیت کی شہادت دی ہے،

---

[1] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶، [2] لحظ الالحاظ ص ۲۲۱، [3] بحوالہ الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۵، [4] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۰

لاتفہنی، نورالدین الہیثمی، حافظ عمادالدین ابن کثیر اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے نام ملتے ہیں، ان میں ابن حجر خاص طور پر امام عراقی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے تھے، وہ خود ابناء الغمر میں لکھتے ہیں:

قرأت علیہ کثیرًا من المسانید	میں نے ان سے بکثرت مسانید اور
والاجزاء وغیر ذلک	اجزاے حدیث وغیرہ کو پڑھا۔

امام عراقی حافظ ابن حجر کی ذہانت اور قوت حافظہ کے بہت معترف تھے اور اپنے تمام تلامذہ میں انھیں بہت محبوب رکھتے تھے، وفات کے وقت جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد حفاظِ حدیث میں کون باقی رہا، تو شیخ عراقی نے سب سے پہلا نام علامہ ابن حجر ہی کا لیا، اس کے بعد اپنے صاحبزادے ابوزرعہ کا اور پھر نورالدین الہیثمی کا[1]، اور یہ حقیقت ہے کہ امام عراقی نے اگر علم وفن کے میدان میں کوئی اور کارنامہ نہ بھی انجام دیا ہوتا تو بھی ان کے فخر کے لیے ابن حجر جیسا جلیل القدر امام کافی تھا۔

تبحر وجلالت علم امام عراقی کو حدیث کے علاوہ قرأت، اصول فقہ، نحو، لغت اور عربیت وغیرہ مختلف علوم میں پورا کمال حاصل تھا، لیکن حدیث نبوی میں علم ومعرفت کی شہرت کے مقابلہ میں دوسرے علوم دب گئے اور ان کی مقبولیت وشہرت محدث ہی کی حیثیت سے زیادہ ہے، ابن الجزری طبقات القراء میں انھیں حافظ الدیار المصریۃ ومحدثھا وشیخھا لکھتے ہیں، مقریزی رقمطراز ہیں:

شیخ الحدیث انتہت الیہ	وہ شیخ الحدیث تھے، فن کی قیادت
ریاستہ	ان پر ختم تھی۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۶

اقول لمن یشکو توقف نیلنا سل اللہ یدارد بفضل و تائید
وانت نغفار للذنوب ساترا العیوب وکشاف الکروب اذا نودی

(یعنی جو شخص تیل کے خشک ہو جانے کا شکوہ کرتا ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ خدا کے فضل ومغفرت کا طالب ہو، اے خدا تو گناہوں کی مغفرت کرنے والا، عیبوں کو چھپانے والا ہے، اور جب دعا کیجاتی ہے تو مصیبتوں کو دور کرنے والا تو ہی ہے)

شاعری میں ان کی قادر الکلامی کے اور بھی شواہد ہیں، انھوں نے امام بغوی کی مشہور کتاب "المنہاج" کو ایک ہزار تین سو سرسٹھ اشعار میں نظم کیا، اور اس کا نام النجم الوہاج رکھا، اسی طرح الاقتراح لابن دقیق العید کو چار سو ستائیس اشعار میں منظوم کیا، اس کے علاوہ ان کی ایک منظوم کتاب "الدرر السنیۃ" کا بھی ذکر ملتا ہے، جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔[1]

کثرت عبادت | علمی کمالات کے ساتھ عمل کے بھی پیکر تھے خشوع وخضوع، انابت الی اللہ عبادت و ریاضت اور زہد وتقوی میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، حافظ ابن حجر جو ان کے شب و روز کے معمولات کے بڑے واقف کار تھے، لکھتے ہیں:

لازمتہ مدۃ فلم ارترک قیام اللیل بل صار کالمالوف ویتطوع بصیام ثلاثۃ ایام فی کل شہر[2]

میں ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہا، اس اثنا میں کبھی میں نے انھیں قیام لیل کا ناغہ کرتے نہیں دیکھا، یہ گویا ان کی عادت سی بن گئی تھی، علاوہ ازیں وہ ہر مہینہ تین نفلی روزے بھی رکھتے تھے۔

---

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۱۳۱ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۲۳۶

ذکاوت و ذہانت نہایت ذہین و ذکی تھے، بڑا قوی حافظہ پایا تھا، ارباب طبقات نے لکھا ہے کہ وہ امام ابن دقیق العید کی چار سو سطریں روزانہ زبانی یاد کر لیتے تھے، کتاب الحاوی کا بیشتر حصہ انھوں نے بارہ دن میں حفظ کر لیا تھا، بعض علماء کا خیال ہے کہ انھوں نے صرف پندرہ دن میں یہ پوری کتاب حافظہ کے خزانہ میں محفوظ کر لی تھی[1]، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ :-

کان یملیها من حفظه متقنة	وہ اپنے حافظہ سے بکثرت نئے نکات
مهذبة محررة کثیر الفوائد	و فوائد بڑی خوبی اور ترتیب کے ساتھ
الحدیثیة[2]	املا کراتے تھے،

عہدۂ قضاء اپنی دیانت، عدالت اور تقوی کی بنا پر ۱۲ جمادی الاولی ۷۸۸ھ کو مدینہ منورہ کے منصب قضاء پر مامور ہوئے، اس عہدہ کے ساتھ مسجد نبویؐ کی امامت و خطابت کا شرف بھی حاصل ہوا، کچھ عرصہ کے بعد اسی منصب پر مکہ مکرمہ منتقل کر دیئے گئے، اور تین سال پانچ ماہ تک حسن و خوبی کے ساتھ اس کے فرائض انجام دیئے، ۱۲ شوال ۷۹۱ھ کو اس سے سبکدوشی حاصل کر لی، اور شیخ شہاب الدین [illegible] ان کے جانشین مقرر ہوئے[3]

ذوق شعر و سخن حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ امام عراقی کو شعر و ادب کا بھی بہت پاکیزہ ذوق تھا، ان کے قصائد و نظمیں اس کا ثبوت ہیں، ایک قصیدہ کا اول اور آخری شعر درج کیا جاتا ہے، اس سے ان کے ذوق شعری اور طرز کلام کا اندازہ ہوگا۔ یہ دعائیہ نظم انھوں نے اس وقت کہی تھی جب دریائے نیل کے خشک ہو جانے کی وجہ سے مصر میں قحط پڑ گیا تھا، فرماتے

---

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۴ [2] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۵ [3] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۳۴

اور مکارم اخلاق ان کے نمایاں جوہر تھے جس کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے،

حافظ ابو المحاسن الدمشقی نے امام عراقی کے مناقب کو سب سے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے :-

شیخ عراقی بہت متواضع، کثیر الحیاء، بردبار، عالی ظرف اور کشادہ صدر تھے، وہ کسی پر غصہ نہ ہوتے تھے، الا آنکہ کوئی بہت بڑی بات ہو جائے اور اس وقت بھی بہت جلد ٹھنڈے ہو جاتے تھے، بغض و کینہ باقی نہ رکھتے، جب کسی بات کو حق سمجھتے تو اس پر پہاڑ کی طرح اٹل ہو جاتے، حق کے معاملہ میں وہ کسی صاحب سطوت و اقتدار سے مرعوب نہ ہوتے تھے، سختی کے مواقع پر چٹان سے زیادہ سخت اور نرمی کی جگہوں پر حریر و دیبا سے زیادہ ملائم ثابت ہوتے"[۱]

وفات | ۸ شعبان شب چہار شنبہ ۸۰۶ھ کو علم و عمل کا یہ نیر تاباں سرزمین قاہرہ میں غروب ہو گیا، اور وہیں باب البرقیہ کے باہر مدفون ہوئے، انتقال کے وقت ۸۱ سال کی عمر تھی،[۲] شیخ شہاب الدین الذہبی جو اس وقت کے مشہور بزرگ و عالم تھے، امام عراقی کے جنازے میں شریک ہوئے،[۳] حافظ ابن حجر نے اپنے استاذ کی رحلت پر ۳۶ اشعار کا نہایت رقت انگیز مرثیہ لکھا ہے، جو علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں پورا نقل کر دیا ہے، اس کے دو شعر یہ ہیں :-

فیا اهل الشام و مصر فابکوا		علی عبد الرحیم العراقی
علی الحبر الذی شهدت قوم		له بالانفراد علی اتقان[۴]

---

[۱] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۱ و البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۶ [۲] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۴

[۳] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۱

کثرت سے کلام پاک کی تلاوت کرتے، اور ایام بیض کے علاوہ شوال کے ۶ روزے بھی پابندی کے ساتھ رکھتے، نماز فجر کے بعد اسی جگہ اذکار و اشغال میں مصروف ہو جاتے، اور آفتاب بلند ہونے کے بعد اشراق کی نماز پڑھتے، اسکے بعد تصنیف و تدریس میں مشغول ہوتے[1] حج بیت اللہ کی سعادت سے متعدد بار بہرہ ور ہوئے تھے، اور ہر مرتبہ حرمین میں کافی عرصہ تک مقیم رہے، اور تحدیث و املا کی خدمت انجام دی، ربیع الاول ۷۸۸ھ میں انھوں نے اپنے تمام اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ حج کیا، اس سفر میں پہلے مدینہ حاضر ہوئے، وہاں چند ماہ قیام کرنے کے بعد مکہ گئے، اسی سفر میں شیخ شہاب بن النقیب نے ان سے الفیۃ الحدیث کا درس لیا، اور اسکی کتابت کی (یہ کتاب خود امام عراقی کی تالیف ہے)

مناقب و فضائل اخلاق | امام عراقی کے صحیفۂ کمال میں ان کے شمائل، مناقب اور فضائل اخلاق کا باب بھی بہت نمایاں ہے، ان کے دیدار سے مشرف ہونے والوں کا بیان ہے کہ عراقی کے باطن کا نور ان کے چہرہ پر چمکتا صاف نظر آتا تھا،

کان ذو وضاء ظاهرة وشكالة حسنة كأن في وجهه مصباحاً[2] — وہ بڑے وجیہ اور حسین و جمیل تھے، انکا چہرہ اتنا منور تھا کہ معلوم ہوتا تھا چراغ روشن ہے

۷۷۶ھ میں جب مصر میں خشک سالی ہوئی تو یہاں کے لوگوں نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے نماز استسقاء پڑھائی اور ایک پر اثر و بلیغ خطبہ دیا، اس کی برکت سے نیل خوب چڑھی اور بے انتہا غلہ پیدا ہوا،

طہارت کا بے حد اہتمام رکھتے تھے، اس بارے میں انھیں خود اپنی ذات اور اپنے تلمیذ رشید نور الدین الہیثمی کے علاوہ کسی پر اعتماد نہ تھا، کم گوئی، شرم و حیا، انکسار، تواضع

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۲۹ [2] ایضاً

ممکن ہے اس سے صاحبزادے کی حوصلہ افزائی مقصود ہو، لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ابوزرعہ کی قوت حفظ اور تبحر علمی کا شہرہ دور دور تک ہوگیا تھا، اور اپنے والد کی وفات کے بعد وہ عام مرجع بن گئے تھے، بیس سال تک قاضی عماد الکرکی کے نائب رہے پھر جب مصر کے قاضی جلال الدین البلقینی کا انتقال ہوگیا تو ۸۲۴ھ میں پورے مصر کے قاضی مامور ہوئے۔ علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:

فسار فیہ احسن سیرۃ بعفۃ	عہدۂ قضا کے دوران ان کا کردار
ونزاھۃ وحرمۃ وصرامۃ	بے داغ رہا، حسن سیرت، پاکدامنی تقویٰ
وشہامۃ ومعرفۃ[1]	بلند ظرفی اور منصف مزاجی انکا شیوہ تھا،

لیکن صرف دو ہی ماہ کے بعد اس منصب سے بد دل ہو کر گلو خلاصی حاصل کرلی، کیونکہ نہ وہ حق سے منحرف ہو سکتے تھے، اور نہ اہل سطوت کی رضا جوئی کے لیے مدارات سے کام لے سکتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عدالتی فیصلوں میں ان کے اور حکمران طبقہ کے درمیان ایک مستقل چپقلش رہا کرتی تھی،

بالآخر ۲۷ شعبان بروز پنجشنبہ ۸۲۶ھ کو ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا، اور اپنے والد کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔

امام ابوزرعہ تصنیف و تالیف میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے، انکی چند تصنیفات کے نام یہ ہیں: البیان والتوضیح، المستجاد فی مہمات المتن والاسناد، تحفۃ التحصیل فی ذکر رواۃ المراسیل، اخبار المدلسین، ذیل علی الکاشف للذہبی، الاطراف شرح سنن ابی داؤد حافظ ابن عماد حنبلی نے انھیں حافظ العصر اور امام ابن امام کے الفاظ سے خراج عقیدت

---

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۷۳

علامۂ جزری کو ان کی وفات کی خبر ملی تو انھوں نے بھی ایک مرثیہ لکھا جس میں کہتے ہیں

رحمۃ اللہ للعراقی تترٰی حافظ الارض حبرھا باتفاق

انني مقسم الیۃ صدق لم یکن فی البلاد مثل العراقی[1]

ابوزرعہ عراقی امام عراقی کی جسمانی یادگار ان کے نامور فرزند ابوزرعہ ولی الدین کا ذکر ملتا ہے، وہ اپنے باپ کے صحیح معنوں میں خلف الصدق تھے، امام جزری نے ایک جگہ لکھا ہے ابوزرعہ اپنے باپ کے بعد مسند علم کے صدرنشین ہوئے، کم ازکم اس عہد کے مصر میں ان کی نظیر نہیں ملتی[2]، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امام ابوزرعہ کے مختصر حالات و کمالات پیش کر دیے جائیں۔

احمد نام، ولی الدین لقب، اور ابوزرعہ کنیت تھی، ۳ ذی الحجہ بروز دوشنبہ ۷۶۲ھ کو قاہرہ میں پیدا ہوئے، ابتداءً والد نے انھیں مقامی شیوخ کے حلقۂ درس میں بٹھایا، اس کے بعد ۷۶۵ھ میں انھیں اپنے ہمراہ دمشق لے گئے اور وہاں کے اکابر علماء کی مجلسوں میں شریک کرایا[3]، پھر ابوزرعہ نے خود اپنے ذوق اور لگن سے فقہ، اصول، معانی و بیان وغیرہ فنون مختلف ممالک کے فضلاء سے حاصل کیے اور ان میں مہارت پیدا کی اور ان کے شیوخ نے ان کو درس و افتا کی اجازت دیدی،

وہ اپنے والد کی حیات ہی میں عنفوان شباب میں طلبہ کی بڑی بڑی جماعتوں کو درس دیا کرتے تھے، امام عراقی اپنے صاحبزادے کی یہ صلاحیت و استعداد دیکھ کر اکثر اپنے حلقۂ درس میں فرمایا کرتے تھے

دروس احمد خیر من دروس ابہ وذلک عند ابیہ منتھی ارابہ[1]

---

[1] الضوء اللامع ج ۹ ص ۱۷۶ [2] ایضاً [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۱۷۳

کتاب القرب فی محبۃ العرب : یہ بیس ابواب پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے،
ن میں قبائلِ عرب کی فضیلت، ان سے محبت کرنے کی ترغیب اور بغض و دشمنی کی مذمت
وغیرہ کا بیان ہے، مؤلف نے اس رسالہ کی تالیف سے ۲۵ رجب ۷۹۱ھ کو
مدینہ منورہ میں فراغت پائی، ۱۳۰۳ھ میں پہلی بار بمبئی سے طبع ہوئی، تعداد صفحات ۱۷۔

الفیۃ العراقی : اس میں مولف نے ابن صلاح کی کتاب علوم الحدیث کے
مضامین کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے، اکثر مقامات پر اصل کتاب پر کچھ
اضافے بھی کیے گئے ہیں، اشعار کی کل تعداد ایک ہزار ہے، اسی وجہ سے الفیہ کے
نام سے مشہور ہوئی، مولف نے مدینہ طیبہ میں ۷۶۸ھ میں اس کو مکمل کیا، جیسا کہ خاتمہ
کتاب میں لکھتے ہیں :

کملتہ بطیبۃ المیمونۃ فبرزت من خدرھا مصونۃ

اصول حدیث میں یہ بہت مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے، اکابر علماء نے اس کے
شروح لکھنے کی طرف توجہ کی، خود حافظ عراقی نے بھی فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث
کے نام سے اس کی ایک شرح لکھی ہے، الفیۃ العراقی کا ۳۸ صفحات پر مشتمل ایک مخطوطہ
رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ حافظ عراقی کی کچھ اور تصنیفات یہ ہیں :۔

التقیید والصلاح ۔ الاحادیث المخرجۃ فی الصحیحین ۔ احیاء
القلب المیت ۔ المورد الھنی ۔ محجۃ القرب الی محبۃ العرب ۔ الانصاف
قرۃ العین بفاء الدین ۔ ترجمۃ الاسنائی ۔ تفضیل زمزم ۔ فضل حراء
مسالۃ قص الشارب ۔ اجوبۃ ابن العربی ۔ تخریج احادیث المنہاج

پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان من خیر اهل عصرہ بشاشة	وہ ظاہری بشاشت، فیصلہ کی پختگی،
وصلابة فی الحکم وقیاماً فی	اقامت حق، خوش اخلاقی اور خندہ
الحق وطلاقة وجه وحسن	روئی میں اپنے زمانہ کے بہترین لوگوں
خلق[1]	میں تھے،

تصنیف و تالیف | امام عراقی کثرت تصانیف میں ممتاز تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ میں نے قاہرہ میں ان سے زیادہ کثیر التصانیف کسی کو نہیں دیکھا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ شیخ ابن الملقن اس خصوصیت میں امام عراقی سے بھی فائق تھے، بہرحال ان کی کچھ نمایاں کتابوں کے نام یہ ہیں:-

اخبار الاحیاء: چار جلدوں میں ہے، مولف نے اس کی تسوید سے ۷۵۱ھ میں فراغت پائی، اس کا کچھ حصہ حافظ عماد الدین بن کثیر نے ان سے پڑھا تھا، اور اس میں حج کے بیان تک کی تبییض بھی کی تھی جو ۵۴ کاپیوں پر مشتمل تھی، پھر مؤلف نے المغنی عن حمل الاسفار کے نام سے ایک ضخیم جلد میں اس کتاب کی تلخیص بھی کی تھی، جس کے متعلق حافظ ابو المحاسن الدمشقی نے لکھا ہے:

اشتھر وکتب منه نسخ عدیدة	یہ کتاب بہت مشہور ہوئی اور اسکے
وسارت بھا الرکبان الی	بہت سے نسخے تیار کیے گئے، جنھیں
الاندلس وغیرھا من	لوگ اندلس اور دوسرے ملکوں
البلدان[2]	میں اپنے ساتھ لے گئے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۵ [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۳

تلخیص و تبصرہ

چینی مسلمانوں کا ماضی اور حال

(عالم اسلام کے ایک مبصر کے قلم سے)

عالم اسلام کے ایک فاضل مبصر جمیل بیہم حکومت چین کی دعوت پر چین گئے تھے، جہاں ان کا قیام ایک مہینہ رہا، دوران قیام میں انھوں نے مسلمانان چین کے دینی، تعلیمی اور تمدنی حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا، اور مختلف اسلامی اداروں کے مذہبی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور اپنے عینی مشاہدات قلمبند کیے، اس میں انھوں نے عرب و چین کے قدیم تعلقات، چین میں مسلمانوں کی آمد اور جمہوریۂ چین میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

مسلمان چین میں کب داخل ہوئے، تاریخوں سے اس کی شہادت ملنا دشوار ہے، لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ عہد نبوی میں چین پہنچ چکے تھے، کیونکہ خاندان طانگ کا دسواں بادشاہ شو جانگ جو عہد نبوی میں چینی سلطنت ـــــ کے تخت و تاج کا مالک تھا، اس کے زمانہ میں دوسرے مذاہب کے مبلغین بکثرت چین آئے، جن کو شو جانگ نے اپنے

للبیضاوی ۔ تکملہ شرح المہذب للنووی ۔ اطراف صحیح ابن حبان ۔
رجال سنن الدارقطنی ۔ شرح جامع الترمذی لابن سید الناس
(اس کی نو جلدیں لکھیں ، مگر مکمل نہ کر سکے ۔ علامہ شوکانی جنھوں نے یہ شرح دیکھی ہے ،
اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

ھو شرح حافل ممتع فیہ	یہ بہت مفید اور ایسے فوائد سے
فوائد لا توجد فی غیرہ[1]	مملو شرح ہے جو دوسری کتابوں
)	میں نہیں ملتے ۔

---

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۵۵

ندائے ملت کا رسول نمبر

یعنی

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ کے مبارک موقع پر دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ کا یادگار نذرانۂ عقیدت ، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ، ڈاکٹر حمید اللہ پیرس ، سید قطب شہید (مصر) محمود شیث خطاب (عراق) ، محمد احمد باشمیل (سعودی عرب) جیسے ہندوستان و عالم اسلام کے مشاہیر اہل قلم مصنفین کے بلند پایہ وگرانقدر مضامین وافادات قلم پر مشتمل ہے ، شائقین حضرات اس کو حاصل کر کے اپنے قلب ونظر کی تسلی کا سامان بہم پہنچائیں ۔

ملنے کا پتہ

ہفت روزہ ندائے ملت ، ۹۹ ۔ گوئن روڈ ، لکھنؤ

چنانچہ احمد بناکتی اس کا سب سے بڑا مشیر تھا، جو بعد میں رئیس الوزراء کے مرتبہ پر پہنچا، احمد بناکتی کے دور وزارت میں مسلمانوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کیے، اور ہزاروں کی تعداد میں چینی فوج میں شامل ہوئے، ابن بطوطہ نے اس دور کے مسلمانوں کا مفصل حال اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے،

چینی مسلمانوں نے ہر دور میں قومی اور وطنی خدمات بھی انجام دیے ہیں، جن کو چینی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، جمہوریت اور حریت کے علمبرداروں میں پہلا شخص مسلمان ہی تھا جس نے ملوکیت اور غلامی کے خلاف آواز بلند کی، اور پوری قوم کو ہمنوا بنا لیا، لیکن آج چین میں مسلمانوں کا قومی شیرازہ بکھر چکا ہے، وہ مختلف طبقوں اور فرقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں،

سب سے بڑا فرقہ فوازی[۵] ہے، جن کی تعداد کم و بیش ساڑھے تین لاکھ ہے، ان کے الگ مذہبی ادارے، اسکول اور کالج ہیں، مسلمانوں کا دوسرا گروہ جو اسلامی تہذیب و تمدن سے زیادہ قریب ہے، وہ چین کے شمال مغرب میں ترکستان کے پاس آباد ہے،

۱۹۴۹ء میں جمہوری انقلاب کے بعد چینی مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے اور ان کو قومیانے کی پوری کوشش کی گئی، لیکن مذہبی حمیت رکھنے والے مسلمان

---

[۵] ابتدا میں چینی مسلمان فرقہ بندیوں کی لعنت سے پاک تھے لیکن چیانگ لونگ ۱۷۳۶ء کے عہد میں انکے دو بڑے فرقے پیدا ہو گئے، ایک خوازی اور دوسرا کوان جوان، اول الذکر کا بانی مالزی نام کا ایک شخص تھا، جن کا لقب خوازی تھا جس کی طرف یہ فرقہ منسوب ہے، اور کوان جوان کا بانی امین شبن (محمد امین) تھا، دونوں ہمعصر اور ایک ہی درسگاہ کے تعلیم یافتہ تھے، دونوں نے بخارا میں تعلیم پائی تھی، مانچو کے زمانہ میں دونوں فرقہ کے مسلمان بڑی بری طرح قتل کیے گئے، چین میں اس وقت مسلمانوں کا خوازی فرقہ سب سے بڑا فرقہ سمجھا جاتا ہے.

مذاہب کی تبلیغ کی اجازت دی تھی، اسی زمانہ میں ایک صحابی وہاب ابن رعشہ چین آئے اور ایک مدت تک تبلیغ اسلام کرتے رہے جس کے اثر سے بہت سے چینی مشرف باسلام ہوئے ان کی وفات بھی یہیں ہوئی، صاحب معجم العمران نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے خاقان چین سے ملاقات بھی کی تھی۔

یہ مسلّم ہے کہ عرب سپاہیوں نے کبھی چین میں فاتحانہ قدم نہیں رکھا، بلکہ چینیوں نے خود مسلمانوں کو دعوت دی اور اپنے یہاں عزت و اکرام سے ٹھہرایا، اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے اسلام قبول کیا، مسلمانوں کی آمد سے پہلے چین میں یہود کے فرقۂ نسطوریہ اور بدھ مبلغین اپنا کام کر رہے تھے، لیکن اسلام اپنی ایمانی حرارت کے ساتھ آیا اور تھوڑی مدت میں توحید پرست چینیوں کے سینوں کو گرما دیا۔

مغربی چین کی سرحد ازبکستان میں قتیبہ ابن مسلم کی آمد کے بعد یہاں کے بہت سے قبیلے مسلمان ہو گئے، جن کو آج بھی (ہوئی ہوئی) کہتے ہیں، یہی نومسلم چینی آہستہ آہستہ وسط چین تک پہنچے اور اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے۔

خلافت عباسیہ کے زمانہ میں چینیوں اور عربوں کے تعلقات اور زیادہ مستحکم ہو گئے، چنانچہ ایک مرتبہ ہسوی تسنگ نے اپنے دشمنوں اور باغیوں کے خلاف خلیفہ منصور سے مدد مانگی تو اس نے پانچ ہزار سپاہ سے مدد کی تھی، ان سپاہیوں کی بیشتر تعداد چین ہی میں رہ گئی اور یہیں بود و باش اختیار کر لی جن کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔

تاتاریوں کے دور میں چینی مسلمانوں نے اور زیادہ ترقی کی، قوبلائی خاں نے جو چنگیز کا لڑکا تھا مسلمانوں کو نہ صرف اپنے درباریوں میں شامل کیا، بلکہ اپنا مشیر بھی بنایا،

سے ملحق ہے، مگر بدقسمتی سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ شاید کہیں سفر پر تھے، پھر بھی میرا وہاں پہنچنا فائدے سے خالی نہیں رہا، مسجد میں وہاں کے دو عالموں سے ملاقات ہوئی، جو بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے ملے، ان سے مل کر میں نے اجنبیت محسوس نہیں کی اور دیر تک مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی، ان سے یہ سنکر حیرت ہوئی کہ صرف پیکنگ میں مسلمانوں کی تعداد اسّی ہزار ہے، اور اسی تناسب سے مسجدیں بھی ہیں، جن میں سے بعض عورتوں کے لیے مخصوص ہیں، عورتیں آج بھی مسجدوں میں جاتی ہیں اور آخری صف میں نماز ادا کرتی ہیں، مسلمان دینی انحطاط کے باوجود مسجدوں کی تعمیر میں پوری دلچسپی لیتے ہیں، اور دیہاتوں میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہاں وہ مسجدیں تعمیر کرتے رہتے ہیں۔

پورے چین میں تقریباً چالیس ہزار مساجد ہیں، جن میں عام دنوں میں تو نمازیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جمعہ کے دن اچھی خاصی ہو جاتی ہے، اور عیدین میں کم ہی ایسی مسجدیں ہوتی ہیں، جو نمازیوں سے نہ بھر جاتی ہوں، کاشغر صوبہ سیکیانگ کی جامع مسجد میں عیدین کے دن دس ہزار مصلیوں کا اندازہ کیا جاتا ہے،

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مسلمانوں نے اپنی پستی کے باوجود تعلیم و تعلم کی طرف اپنی توجہ برقرار رکھی، اور اپنے بچوں کو خاص طور سے دینی تعلیم کی طرف لگاتے رہے، چنانچہ آج بھی مذہبی تعلیم کے لیے بکثرت مکاتب قائم ہیں، جو عموماً مسجدوں سے ملحق ہیں، صرف پیکنگ میں ساٹھ مکاتب ایسے قائم ہیں جن میں مسلمان بچے دین کی ابتدائی تعلیم پاتے ہیں۔

ہمیشہ اس کے خلاف برسرپیکار رہے، اور طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہوئے، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو دینی حمیت کا علمبردار تھا، تباہ و برباد ہوا، سیہائکو، ہاؤتنگ، کانسو اور سنکیانگ کے مسلمانوں کا خون خصوصیت سے بڑی بے دردی سے بہایا گیا۔

ان مظالم کے بعد مسلمان کمزور ہو گئے، دینی حمیت اور اتحاد کا جذبہ ختم ہو گیا، اقتصادی حیثیت سے وہ پہلے ہی سے کمزور تھے، چین جیسے صنعتی ملک نے ان کو معاش کی طرف متوجہ کر دیا، اس سے رفتہ رفتہ قومی، ملی اور مذہبی خصوصیات بھی ختم ہوتے گئے، لیکن تعلیم خصوصاً مذہبی تعلیم کی طرف ان کی توجہ برابر برقرار رہی، بلکہ اس میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا، چین کی ایک جامع مسجد تونگ سی کے امام کے بقول مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی رفتار ۹۵ فیصد ہے، جب کہ گذشتہ سالوں میں بیس فیصد تھی، قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں طالبات کا اوسط طلبہ سے زیادہ ہے۔

مسلمانوں نے انقلاب چین کے چند ہی سالوں کے بعد ۱۹۵۳ء میں اسلامی اوقاف اور دیگر مذہبی امور کے تحفظ کے لیے ایک انجمن قائم کی اور اس کی صدارت کے لیے پہلی دفعہ سید برہان شہیدی کا انتخاب عمل میں آیا، اور شیخ نور محمد ان کے شریک کار نائب صدر مقرر ہوئے، یہ دونوں یہاں کے اکابر علماء میں شمار کیے جاتے ہیں، سید برہان شہیدی پیکنگ میں ایک اور قومی انجمن کے نائب صدر ہیں، ان کا قیام پیکنگ ہی میں رہتا ہے، میری ان سے پہلی ملاقات بیروت میں ہوئی تھی، جب حج کے ارادے سے حجاز جاتے ہوئے بیروت میں ٹھہرے تھے، یہاں ان کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا گیا تھا، اس لیے چین آنے کے بعد ان سے ملنا ضروری تھا، چنانچہ میں ان کے دفتر پہنچا جو جامع مسجد تونگ سی

بڑا قومی کالج ہے، اس میں عربی اور اسلامی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے، کالج ابتدائی اور ثانوی دو حصوں میں تقسیم ہے، اور تقریباً دونوں حصوں میں اٹھارہ سو مسلمان طلبہ زیر تعلیم ہیں، جن میں چالیس فی صد طالبات ہیں، اس کالج کے دو اساتذہ نصر الدین اور نعمت اللہ ابراہیم قابل ذکر ہیں، جو جامعۂ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔

اس وسیع کالج میں ایک بڑا کتب خانہ بھی ہے، جس کو دیکھکر خوشی ہوئی اور تعجب بھی ہوا کہ اس میں عربی کی کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں تھی، میں نے اس کتبخانہ کو ایک قرآن مجید کا نسخہ ہدیۃً دیا۔

۱۹۴۹ء کے انقلاب کے بعد چین میں دوسری مادی ترقیوں کے ساتھ حکومت نے تعلیم کی طرف بھی توجہ دی ہے، اور مختلف شہروں اور قصبوں میں اسکول اور کالج قائم کیے گئے ہیں، اس سلسلہ میں دوسرے ملکوں سے بھی امداد حاصل کر کے بہت جلد تعلیمی میدان میں ترقی کر لی ہے، پیکنگ یونیورسٹی آج دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تسلیم کیجاتی ہے، اس میں آٹھ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، اس یونیورسٹی کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ یونیورسٹی کیا ہے، ایک پورا شہر آباد ہے جس میں مختلف قسم کی جدید عمارتیں ہیں، یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس یونیورسٹی میں بھی عربی کی تعلیم ہوتی ہے جس کے پڑھنے والے طلبہ کی تعداد اچھی خاصی ہے، اس لیے میں نے اس شعبہ کو بھی دیکھا، وہاں میری ملاقات شعبہ کے صدر محمد مکنی سے ہوئی جو جامعۂ ازہر کے فارغ ہیں، انھوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا اور عربی طلبہ سے میرا تعارف کرایا، جو اپنی استعداد کے مطابق مجھ سے گفتگو کرتے رہے، محمد مکنی نے یونیورسٹی کے بارے میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور بتایا کہ یونیورسٹی میں تین سو طلبہ علوم مشرقیہ کی تعلیم

اسی طرح سرکاری پرائمری اور مڈل اسکولوں میں مسلمان بچوں کا تعلیمی اوسط قابل تعریف ہے، گذشتہ چند برسوں میں اس میں دو چند اضافہ ہو گیا ہے،

مسلمانوں نے خالص مذہبی تعلیم کے بھی ادارے قائم کیے ہیں، جو مسلمانوں ہی کی امداد سے قومی انجمن یا فوازی کالجور کی سرپرستی میں چلتے ہیں، ان کا حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، جن اسکولوں اور کالجوں میں اسلامی علوم کی تعلیم ہوتی ہے، ان میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا، چنانچہ میں فوازی فرقہ کے ایک کالج میں گیا اور وہاں کے منتظمین اور کالج کے پرنسپل جمال الدین لن شو سے ملا، کالج ہی کے استاد عزالدین میرے ترجمان تھے، جو چینی ہونے کے باوجود فصیح عربی بول رہے تھے، انھوں نے بتایا کہ یہ کالج ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا، اور اس کے بنیادی مقاصد میں اسلامی علوم کی ترویج ہے، اس وقت کالج میں ڈیڑھ سو طلبہ عربی تعلیم پا رہے ہیں، کالج میں عموماً تین طرح کی تعلیم ہوتی ہے، پہلی اسلامی تعلیم ہے، جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم ہے، دوسری زبان ہے، جس میں چینی اور عربی سکھائی جاتی ہے، اور پھر تہذیب و ثقافت [illegible] پر توجہ دی جاتی ہے،

کالج کے معائنہ کے سلسلہ میں میں نے خواہش کی کہ میں طلبہ کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں، اور اپنے رہنما ترجمان سے درخواست کی کہ وہ میری باتیں طلبہ کو انکی زبان میں بتائیں، انھوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں، طلبہ اچھی طرح عربی سمجھتے ہیں، چنانچہ میں نے ان سے باتیں کیں، اور مجھے حیرت ہوئی جب آخر میں ایک طالب علم نے فصیح عربی میں میری تقریر کا شکریہ ادا کیا،

ایک دوسرے کالج میں بھی جانے کا موقع ملا، جو [illegible] کے مسلمانوں کا

مطبوعات جدیدہ

حیاتِ عبدالحئی:۔ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع بڑی، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد گیارہ روپے، غیر مجلد دس روپے۔ پتہ: ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شخصیت بڑی جامع تھی، وہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے خانوادہ کی یادگار، اپنے دور کے مشہور عالم، حاذق طبیب، عربی اور اردو زبان کے بلند پایہ مصنف اور بادۂ عرفان کے ذوق شناس تھے، لیکن خاموشی سے کام کرنے والے تھے، ان کی زندگی میں اردو کے دو چار رسالوں کے علاوہ ان کی کوئی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، اس لیے ان کی شہرت زیادہ تر ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے تھی، اور اب تو نزہۃ الخواطر کی ضخیم مجلدات، الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند، اور گل رعنا کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب دنیا کا علمی حلقہ بھی ان سے واقف ہے، ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کی مستقل سوانح عمری کی ضرورت تھی، اس کام کو ان کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی نے انجام دیا ہے، حیات عبدالحئی اسی کا مرقع ہے، اس میں ان کے سوانح کے ساتھ ان کے علمی اور مذہبی و ملی کارناموں کی پوری تفصیل ہے اور اس عہد کے بہت سے تاریخی واقعات آگئے ہیں، ندوہ کے معاملات میں مولانا عبدالحئی اور مولانا شبلی

پاتے ہیں، ان میں عربی کے پڑھنے والے طلبہ سب سے زیادہ ہیں،

یونیورسٹی میں ایک پارک کے پاس سے میرا گذر ہوا، جن میں چند طالبات عربی پڑھ رہی تھیں، اور اس وقت وہ عربی میں ایک قومی نغمہ گا رہی تھیں جس کو سنکر بڑی مسرت ہوئی، اور تھوڑی دیر کے لیے میں اپنی اجنبیت کو بھول گیا،

چین سے واپسی کے چند برسوں کے بعد اخبار میں یہ خبر پڑھکر خوشی ہوئی کہ چینی حکومت نے اسلامی تعلیم کے لیے ایک قدیم اسلامی طرز کی عمارت تعمیر کرائی ہے، جس میں ایک بیچ ہال اسلامی آثار کی حفاظت کے لیے مخصوص ہے، اسکی خدمت کے لیے خاص طور پر بغداد کے ایک عالم شیخ جلال حنفی کو بلایا گیا ہے، وہ پیکنگ میں چند برسوں سے مقیم ہیں، اور اس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، چینی حکومت یقیناً تمام عالم اسلام کی طرف سے اس اقدام پر قابل مبارک باد ہے۔

میں علمائے سوء، صوفیائے خام، اور اس عہد کی بعض ہندو، عیسائی اور خصوصاً ایران کی نقطوی تحریک کے اثرات کا ذکر ہے، شروع میں فیروز تغلق سے اکبر کے عہد تک کی علمی، دینی، سیاسی، اور اخلاقی حالت کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، اور اکبر کی ابتدائی مذہبی زندگی اور راسخ العقیدگی کا ذکر ہے، آخر میں دین الٰہی کے نتائج و اثرات کے سلسلہ میں اسلام اور اسلامی شعائر کی بے حرمتی و پامالی اور غیر اسلامی اقدار کے فروغ کی تفصیل ہے، اکبر اور اس کے دین الٰہی کا بنیادی اور اصلی ماخذ ملا عبد القادر بدایونی کے بیانات ہیں، جنکو کذب و دروغ گوئی سے متہم کیا جاتا ہے، مصنف نے اس کی قطعی دلائل سے تردید کی ہے۔ آج کل دین الٰہی "کو صرف لا مذہبیت اور اکبر کے سیکولرزم اور وسیع المشربی کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے، دین الٰہی اسلام کے خلاف دوسری ملحدانہ تحریکوں کی طرح ایک مستقل تحریک تھی، جو خود اکبر کی حماقتوں کی وجہ سے اس کی زندگی ہی میں ناکام ہو گئی تھی، مصنف نے اگرچہ دین الٰہی پر محققانہ بحث کی ہے لیکن اس کے اثرات دکھانے میں انتہا پسندی سے کام لیا ہے، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور اس پایہ کے دوسرے بزرگوں کو صوفیائے خام کے زمرہ میں شامل کرنا بڑی زیادتی ہے، حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی تحریک کو صرف اکبری الحاد اور دین الٰہی کا رد عمل قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر اردو میں اس موضوع پر یہ سب سے زیادہ جامع اور محققانہ کتاب ہے،

دلی جو ایک شہر تھا۔ ترجمہ جناب سلیم احمد صاحب ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۵۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب راجندر لال ہانڈا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود علم و ادب کا

کے درمیان اختلافات بھی پیش آئے، ان نازک مراحل کو لائق مصنف کے محتاط قلم نے بڑی سلامت روی سے طے کیا ہے اور اعتدال و توازن کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، مولانا عبد الحیٰ کی اولاد بھی خلف الصدق تھی، مولانا سید ابو الحسن علی کی شخصیت سے تو سبھی واقف ہیں، ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم نے اگرچہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے زندگی بسر کی، لیکن وہ جدید و قدیم تعلیم کا سنگم، ان دونوں کی خوبیوں کے حامل اور علم و فضل اور تدین و تقویٰ میں اپنے والد بزرگوار کے صحیح جانشین تھے، ندوۃ العلماء کی نظامت کے ساتھ انھوں نے بہت سے علمی و دینی کام انجام دیے، اس کا ایک نمونہ خود مولانا سید ابو الحسن علی ہیں، جو ان ہی کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہیں، اس لیے انھوں نے حیات عبد الحیٰ میں ان کے حالات بھی لکھ دیے ہیں، اس طرح اس کتاب میں مصنف کے اسلاف کرام کا بھی مختصر ذکر آگیا ہے۔ "م"

دین الٰہی اور اس کا پس منظر۔ مرتبہ پروفیسر محمد اسلم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۴ مجلد، قیمت ۱۰ ؍، غیر مجلد ۵ ؍۔

پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

زیر نظر کتاب میں اکبر کے دین الٰہی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس عہد کے مختلف سیاسی و دینی فتنوں، اکبر کی بے دینی، نت نئے اجتہادات، اسلام کے ساتھ اس کی معاندانہ روش اور دین الٰہی کے مرکزی کرداروں، شیخ مبارک، ابو الفضل اور فیضی کے افکار و عقائد اور بعض دوسرے علماء و مشائخ کے افسوسناک طرز عمل پر بحث کی گئی ہے، لائق مصنف نے ان اسباب و عوامل کی تحقیق و جستجو میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، جو اکبر کے الحاد اور نئے دین کے اختراع کا باعث بنے تھے، اس بحث

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے۔ قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب دامرکیہ، اسلامی رصد خانے، کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں۔ (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ۔ قیمت: غعہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے ۱۲ مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: ہےعہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:- غعہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی اعظمی ایم اے قیمت بعہ

بھی عمدہ مذاق رکھتے ہیں، ان کو کئی زبانوں سے واقفیت ہے، ہندی اور انگریزی میں مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں، زیر نظر کتاب ان کی دلچسپ ہندی تصنیف "دلی میں دس برس" کا اردو ترجمہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۰ء میں اور دوسرا ترمیم و اضافہ کے بعد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کی دلی کی سماجی معاشرتی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی و ادبی زندگی کا خاکہ اور مختلف طبقوں کے مزاج و خصوصیات کی تصویر کشی کی گئی ہے، دلی عروج و زوال کے مختلف دوروں سے گذری ہے، لیکن ان دس سالوں میں اس کو جس اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا وہ نہایت سنگین تھے، گذشتہ جنگ عظیم کی ہولناکی ۱۹۴۲ء سے لیکر آزادی تک کے مختلف مراحل اور ان سے متعلق واقعات و حوادث ملک کی تقسیم، مسلم کش فسادات، گاندھی جی کا وحشیانہ قتل، دلی میں پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کی آبادکاری اور مسلمانوں سے اس کا تخلیہ وغیرہ کا مرقع نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے، مصنف طبعاً ظریف اور خوش طبع ہیں، اس لیے ان حوادث میں بھی ظرافت کی آمیزش ہے، ان کو قومی و ملکی مسائل سے بھی گہری دلچسپی ہے، چنانچہ وہ زبان اور قومی یکجہتی وغیرہ کے مسائل پر اپنے خیالات اخبار و رسائل میں ظاہر کرتے رہتے ہیں، اس مجموعہ میں بھی اس قسم کے چند مضامین ہیں، گو ان کے تمام خیالات خاص طور سے مسلمانوں کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ان سے پورا اتفاق نہیں کیا جاسکتا، لیکن مصنف کی نیک نیتی اور خلوص میں شبہہ نہیں، انھوں نے اس کتاب میں جن دس سالوں کے دلی کا نقشہ پیش کیا ہے، اس سے ان کے ذہن کی دراکی، نظر کی گہرائی، مشاہدہ کی قوت اور تخیل کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جناب سلیم احمد نے اس دلچسپ کتاب کا اتنا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔

"ض"

اٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) مئی ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱۔ بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۶۴۲ صفحے قیمت: ۲۴؍

۲۔ بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے، ۳۵۰ صفحے قیمت: ۱۲؍

۳۔ بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۶ صفحے، قیمت: ۲۵؍

۵۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: ۱۶؍

۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: ۱۶؍

۷۔ ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت: ۸؍

۸۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: ۶؍

۹۔ ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: ۸؍

۱۰۔ عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: ۲۵؍

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۷ - ماہ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۱ء - عدد ۵

مضامین

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات واحکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اس کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے

((مرتبہ))

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے   قیمت: ؎

بویز سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہی، یہ تو اردو والوں کی دلی آرزو ہے، سوال جو کچھ ہی وہ اس راہ کی
رکاوٹوں کا ہی، اس میں سب سے بڑی رکاوٹ صوبائی حکومتیں ہیں، وہ زبانی تو اردو کے حقوق کا اعتراف
کرتی ہیں اور کبھی کبھی اردو کی تعلیم کے متعلق کوئی سرکلر بھی جاری کر دیتی ہیں لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا اور
اردو کا قدم جہاں تھا وہیں ہے، اس لیے جب تک اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام نہ ہو،
یونیورسٹی کا قیام بے معنی ہی، اس میں پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے، اسلیے سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم
کی رکاوٹیں دور کرنا ضروری ہی جو اردو والوں کے اختیار میں نہیں ہی، دوسری رکاوٹ خود اردو والوں
کی غفلت اور لاپرواہی ہی حکومت نے اردو کو تعلیم سے خارج کرکے اتنا غیر اہم بنا دیا ہی کہ عملی زندگی میں
اسکی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہی، بلکہ وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھی جاتی ہی، اسلیے جنکی زبان اردو ہے
وہ بھی اسکی تعلیم سے گریز کرتے ہیں، اسکا جواب خواجہ صاحب نے دیا ہی مگر وہ تشفی بخش نہیں ہی، اس لیے یونیورسٹی
کے قیام سے پہلے یہ ضروری ہی کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کیے جائیں
اسکے بغیر یونیورسٹی کا تخیل کامیاب نہیں ہوسکتا جب بنیاد ہی غائب ہوگی تو عمارت کس پر تعمیر ہوگی

بھوپال کی تاج المساجد اپنی وسعت اور شکوہ و عظمت کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخی مسجدوں
میں ہی، اس میں دلی کی جامع مسجد جیسا حسن و تناسب تو نہیں ہی لیکن اس سے زیادہ وسیع ہے، نواب
شاہجہاں بیگم نے اس کو تعمیر کرایا تھا مگر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ انکا انتقال ہوگیا، انکے بعد ان کے جانشینوں
کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے مسجد کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور وہ رفتہ رفتہ جھاڑیوں کا جنگل اور جانوروں
کا بھٹ بن گئی اور برسوں اس حالت میں پڑی رہی، مسجد کی اصل عمارت تو مکمل ہی صرف مینار باقی ہیں،
صحن کے تین طرف جو دالان ہیں، ان میں جنوبی اور مشرقی سمت کے دالان تو مکمل ہیں، شمالی سمت کا دالان
اور صدر دروازہ نامکمل ہے، اور بنے ہوئے حصے بھی مرمت طلب ہو گئے تھے۔

برسوں کے بعد اللہ تعالی نے مولانا محمد عمران خاں ندوی بھوپالی کو مسجد کی تکمیل کی طرف متوجہ
کر دیا، انھوں نے اس کی جھاڑیاں اور ملبہ صاف کرایا، اور جنوبی اور مشرقی سمت کے دالانوں کو

شذرات

مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ ایسا متفقہ ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں، ہندوستان کے دستور نے بھی اس کا حق دیا ہے، اور کانگریس ورکنگ کمیٹی، ایجوکیشن کمیشن، وزارت تعلیم، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن وغیرہ سب نے اسکی پوری حمایت کی ہے، جو ۱۴ قومی زبانوں میں اردو بھی شامل ہے، چنانچہ ان زبانوں میں تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے حکومت نے جو خطیر رقم منظور کی ہے اس میں ایک کروڑ اردو کا بھی حصہ ہے، دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم کا آغاز ہو گیا ہے اور جلد ہی انکی یونیورسٹیاں بھی قائم ہو جائیں گی، اردو زبان میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا مسئلہ نیا نہیں ہے، برسوں سے چل رہا ہے، ریاست حیدرآباد نے تو ہندوستان کی آزادی سے مدتوں پہلے اردو کی یونیورسٹی قائم کر دی تھی جس میں سارے فنون کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی، مگر آزادی کے بعد حالات نے اردو کے خلاف ایسی فضا پیدا کر دی کہ اردو میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا سوال الگ رہا، اسکو اسکے مرکزوں سے نکالدیا گیا، جامعہ عثمانیہ بھی اسکی بھینٹ چڑھ گئی، مگر اردو کی مخالفت اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے، فرقہ پرور پارٹیوں کو چھوڑ کر ہر سطح پر اسکے حقوق کا اعتراف کیا جانے لگا ہے، اسلیے مادری زبان میں تعلیم کے فیصلہ کے بعد اردو یونیورسٹی کا مسئلہ پھر سامنے آگیا ہے۔

اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو کسی ریاست کی علاقائی زبان نہیں مانا جاتا، اور خوش قسمتی یہ ہے کہ پورا ہندوستان اسکا علاقہ ہے، اور وہ ہندی ریاستوں کے بڑے حصہ کی مادری زبان ہے، اسکے بولنے والوں کی تعداد کئی کروڑ ہے، علمی حیثیت سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، اور ہندوستان کے سیکولر کردار کی سب سے بڑی نشانی ہے، اسلیے ہر حیثیت سے یونیورسٹی کی مستحق ہے، اسلیے خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی نے اس مہم کو اٹھایا ہے، اور "اردو یونیورسٹی کی تجویز" کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے، اس میں بڑی خوبی سے اسکی وکالت کی ہے، اور اردو کی اہمیت اور اردو یونیورسٹی کی تجویز کو بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیا ہے، اس

مقالات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر "البلاغ" بمبئی

(۲)

فراغت کے بعد دہلی میں تدریس و تعلیم کی خدمت

قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کے بعد دہلی میں کس قسم کی زندگی بسر کی؟ اس کے ذکر سے بھی کتابیں خاموش ہیں، مگر قرائن اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعلیمی و تدریسی مشغلہ اختیار کیا تھا، ان کے درس سے ان کے کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے، جن میں ان کے تین نواسے شیخ صفی الدین، شیخ فخر الدین اور شیخ رضی الدین مشہور ہیں، ان میں سے مقدم الذکر دو نے قیام دہلی ہی کے زمانہ میں شہرت و ناموری حاصل کرلی تھی، شیخ رضی الدین ردولی میں عہدۂ قضا پر فائز ہوئے اور شیخ صفی الدین ردولی آکر سید اشرف سمنانیؒ کے مرید و خلیفہ ہوئے، اور اپنے صاحبزادے ابو المکارم اسمٰعیل کو بھی جو ۱۲ ربیع الثانی ۸۰۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے، سید اشرف سمنانیؒ کی ارادت میں دیدیا،

ہمارا یہ دعویٰ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے خلاف ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، تذکرہ علمائے ہند میں شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین ابن نظام الدین کے حال میں ہے کہ

چوں حادثۂ مغل در دہلی رو نمود و بعہد سلطان   جب دہلی میں مغلوں کا فتنہ شروع ہوا تو بعہد

جن کے در کھلے ہوئے تھے، کمرہ کی شکل میں بدل کر ان میں عربی کا ایک دار العلوم قائم کر دیا، یہ کمرے اس قدر وسیع ہیں اور اتنی تعداد میں ہیں کہ دار العلوم کے جملہ شعبوں کے لیے کافی ہیں، اور یہ دار العلوم کئی سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے مسجد کی ناتمام عمارتوں کی تکمیل کا بھی بیڑا اٹھایا، اس میں لاکھوں روپئے کا صرف ہے، انھوں نے ہندوستان اور بیرون ہند سے اس کے لیے معقول سرمایہ بھی فراہم کر لیا۔ اور گذشتہ مہینہ ۲۲ر اپریل کو بڑے اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کے افتتاح کی تقریب ہوئی جس میں ہندوستان کے بہت سے مشاہیر مدعو تھے، افتتاح کی رسم سعودی عرب کے سفیر شیخ انس یوسف یاسین ادا کرنے والے تھے، لیکن عین موقع پر بعض ناگہانی حوادث کی وجہ سے خود نہیں جا سکے اور ان کے بجائے انکے نائب شیخ یوسف مطبقانی نے یہ رسم انجام دی۔

ایک زمانہ میں بھوپال دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا، مگر حالات کے انقلاب نے اس کی یہ حیثیت ختم کر دی تھی، اب دار العلوم کے بدولت پھر اس کے زندہ ہونے کی امید ہو گئی ہے، اگر مسلمان ہمت سے کام لیں تو دار العلوم تاج المساجد پورے صوبۂ متوسط کا اسلامی مرکز بن سکتا ہے، یہ بھوپال والوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو مولانا محمد عمران خاں کے جیسا مخلص اور حوصلہ مند شخص مل گیا ہے جس نے اپنی زندگی تاج المساجد اور اس کے دار العلوم کے لیے وقف کر دی ہے، ورنہ اس زمانہ میں اتنے بڑے کام کی کون ہمت کر سکتا ہے، اس لیے عام مسلمانوں خصوصاً اس کے صاحب ثروت طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اس کار خیر میں ان کا ہاتھ بٹائے اور پوری فیاضی سے مسجد کی عمارتوں کی تکمیل میں حصہ لے، یہ مسجد کی بھی خدمت ہے، اور دار العلوم کی بھی۔

شیخ رضی الدین دران ہنگام بہ ردولی عہدۂ قضا داشت، شیخ صفی الدین ہم دراں جا رخت اقامت انداخت۔[1]

عطا فرمایا، اس زمانہ میں ان کے چھوٹے بھائی شیخ رضی الدین ردولی میں قاضی تھے اسلیے شیخ صفی الدین نے بھی وہیں اقامت اختیار کرلی۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے حال میں لکھتے ہیں :-

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین ردولوی دوازدہم ربیع الثانی سال ہفتصد و ہشتاد و نہ ولادت یافتہ چہل روزہ بود پدرش وے را بپائے سید اشرف جہانگیر سمنانی برخود انداخت، سید موصوف فرمود "ایں ہم مرید من است"[2]

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین ردولوی ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں پیدا ہوئے، ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ انکے والد نے ان کو سید اشرف جہانگیر سمنانی کی خدمت میں پیش کیا، سید صاحب نے انکو دیکھکر فرمایا "یہ بچہ بھی میرا مرید ہے"۔

نزہۃ الخواطر میں بھی شیخ صفی الدین کے سید اشرف سمنانی سے خلافت حاصل کرنے اور انکے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں پیدا ہونے کی تصریح موجود ہے،[3] ان تصریحات سے یہ نتائج نکلتے ہیں :- (۱) شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کی شادی قاضی شہاب الدین کی صاحبزادی سے ۸۰۰ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے بہت پہلے دہلی میں ہوگئی تھی، اور قاضی صاحب کے تینوں نواسے دہیں پیدا ہوئے، اور وہیں اپنے جد مادری سے تحصیل و تکمیل کی، (۲) قاضی صاحب کے ساتھ ان کی لڑکی، داماد اور نواسوں کے جونپور آنے سے پہلے ان کے منجھلے نواسے شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر ہوکر وہیں مقیم ہوگئے تھے، ان ہی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۹ [2] ایضاً ص ۷ [3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۰ و ص ۳۱

ابراہیم شرقی، قاضی شہاب الدین و شیخ
نظام الدین جد صاحب ترجمہ از دہلی بجونپور
قدوم آوردند، قاضی دخترے داشت اورا
بشیخ نصیر الدین بن نظام الدین منکوح
فرمود، ازو سہ پسر بوجود آمدند، صفی الدین
فخر الدین، رضی الدین، و ہر یکے بخدمت
قاضی شہاب الدین جد مادری خود با کتساب
علوم متداولہ دانشمند متبحر شدند، شیخ
صفی الدین بعد فراغ بدرس علوم متعارفہ
پرداخت، و بسیارے کتب عربیہ و فارسیہ
از شروح و متون تصنیف فرمود.....
شیخ صفی الدین مدتے بدرس و تدریس نشستہ
بالآخر بتلاش شیخ وارد دہلی گشت
بعد، ان زمان سید اشرف جہانگیر در
بلدہ، رونق افروز بود چون شیخ صفی الدین
بخدمتش رسید اشرف قدس سرہ بمجرد دیدنش
برخاست و قریب خود نشانید، و ہماں ساعت
وے را بسلسلہ چشتیہ نظامیہ مرید گرفتہ
خرقۂ خلافت عطا فرمود، برادر خورد

سلطان ابراہیم شاہ شرقی قاضی شہاب الدین
اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے،
قاضی صاحب کی ایک دختر تھی جس کا نکاح
شیخ نصیر الدین بن نظام الدین سے کر دیا،
ان سے تین لڑکے پیدا ہوئے صفی الدین،
فخر الدین اور رضی الدین اور سب کے سب
اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم متداولہ
حاصل کر کے متبحر عالم ہوئے، شیخ صفی الدین
نے فراغت کے بعد علوم متعارفہ کے پڑھنے پڑھانے
کا کام شروع کیا، اور عربی و فارسی میں
بہت سی شرحیں اور متن میں کتابیں لکھیں،
پھر ایک مدت تک درس و تدریس کی خدمت
انجام دیکر شیخ کی تلاش میں دہلی آگئے،
اس زمانہ میں سید اشرف سمنانی بھی دہلی
تشریف لائے تھے، جب شیخ صفی الدین
ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے
ان کو دیکھتے ہی بڑھکر استقبال کیا اور اپنے
پاس بٹھایا اور شیخ صفی الدین کو اسی وقت
سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں داخل کر کے خرقہ خلافت

ں کی یورش سے دہلی ہر وقت خطرات کی زد میں رہتی تھی، اور یہاں کے باشندے بڑی
ے اطمینانی کی زندگی بسر کرتے تھے، یہی زمانہ قاضی شہاب الدین کے دینی اور علمی میدان
ں آنے کا ہے، ظاہر ہے کہ جس پرآشوب دور میں پرانی علمی اور روحانی محفلوں کو ہر آن
یرانی کا خطرہ ہو، اس میں کسی نئی درسگاہ کو مرکزیت و مرجعیت حاصل ہونا مشکل تھا،
گر قاضی صاحب نے ان ہی ناسازگار حالات میں اتنی شہرت و ناموری حاصل کی کہ
ونپور کے مشرقی دربار تک میں ان کے علم و فضل کا شہرہ گونج رہا تھا، اور سلطان ابراہیم
ے دربار میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا،

فتنۂ تیموری میں دہلی سے کالپی کی طرف روانگی

قاضی صاحب کے ایک استاد مولانا عبد المقتدر دہلی کی تباہی سے پہلے ۷۹۱ھ میں وصال فرما چکے تھے، اور دوسرے استاذ مولانا خواجگی بقیہ حیات رہ کر افادہ و ارشاد میں مصروف تھے کہ ان کے روحانی برادر شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ کے مرید و خلیفہ سید محمد بن یوسف گیسو دراز نے خواب دیکھا کہ تیموری فتنہ کا سیلاب دہلی تک آگیا ہے، سید محمد صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، مولانا خواجگی نے جب ان کا یہ خواب سنا تو فتنہ سے چند ماہ یا چند روز پہلے ہی دہلی سے کالپی کے لیے روانہ ہوگئے، قاضی صاحب کو استاذ و شیخ کی جدائی گوارا نہ ہوئی، کیونکہ مولانا عبد المقتدر کی وفات کے بعد یہی ان کی علمی و روحانی زندگی کے مربی رہ گئے۔

نیز دہلی کے حالات علم اور اہل علم کے بارے میں تیزی سے ناسازگار ہوتے جا رہے تھے، اس لیے قاضی صاحب بھی مولانا خواجگی کے ہمراہ کالپی روانہ ہوگئے، یہ ۸۰۱ھ کی بات ہے، مولانا خواجگی نے کالپی میں رخت سفر ڈال دیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی، یہاں تک کہ اسی مقام میں سات آٹھ سال کے بعد ۸۰۹ھ میں وصال فرمایا، مگر قاضی صاحب کو

ایام میں بڑے نواسے شیخ صفی الدین بھی شیخ کی تلاش میں ردولی آئے اور سید اشرف سمنانیؒ سے مرید ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی قاضی رضی الدین کے ساتھ ردولی میں بس گئے، اور یہیں ان کے صاحبزادے ابو المکارم اسمعیل ۸۰۹ھ میں پیدا ہوئے، جو بچپن ہی میں سید اشرف کی نسبت سے مشرف ہو گئے، (۳) اس طرح قاضی صاحب اور ان کے نواسوں کے دہلی سے ترک وطن کرنے ۸۰۱ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے پہلے ہی یہ دونوں نواسے حدود جونپور میں آباد اور متاہل ہو چکے تھے، اور ان کو سید اشرف سمنانیؒ سے تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس تعلق سے خود قاضی صاحب اور سید اشرف سمنانیؒ میں قیام دہلی کے زمانہ ہی میں موانست قائم ہو چکی تھی، جو آگے چل کر علمی و روحانی تعلق کا باعث بنی، اور جونپور میں اس کی تجدید ہوئی، (۴) تذکرہ علمائے ہند کی عبارت سے واضح طور پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب کی دختر کا نکاح شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کیساتھ جونپور آنے کے بعد ہوا، اور انکے تینوں نواسے اور شیخ ابو المکارم اسمعیل جونپور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے یہیں اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی، مگر ابہام ضرور ہوتا ہے، غالباً اسی لیے بعض تذکرہ نویسوں نے ان حضرات کی پیدائش اور تعلیم و تربیت جونپور میں بیان کی ہے، نزہتہ الخواطر میں قاضی رضی الدین کے بارے میں ہے "ولد ونشأ بجونپور وقرأ العلم علی جدہ (تذکرہ الشہداء دہلی) حالانکہ وہ قاضی صاحب وغیرہ کے جونپور آنے سے بہت پہلے ردولی میں عہدۂ قضا پر مامور ہو چکے تھے، اسی طرح شیخ فخر الدین کے بارے میں بھی یہ تصریح محل نظر ہے کہ "ولد ونشأ بجونپور وقرأ العلم علی جدہ (تذکرہ الشہداء ج ۳ ص ۵۱) تینوں نواسوں کا اپنے نانا سے تعلیم حاصل کرنا تو مسلم ہے مگر ان سب کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کا جونپور میں آنے کے بعد ہونا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ سب مراحل دہلی میں طے ہو چکے اور انکی شہرت ہو چکی تھی،

یہ زمانہ مشرقی دنیائے اسلام کے لیے بڑا پُرآشوب تھا، اس سے کئی صدی پہلے تاتاریوں نے جو تباہی و بربادی برپا کی تھی اور عالم اسلام میں ابھی اس کے اثرات باقی ہی تھے کہ ۷۷۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وہ وسط ایشیا کو روندتا ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی میں داخل ہو گیا۔

تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی ہے:

قاضی شہاب الدین ہمراہ استاد خود مولانا خواجگی از دہلی بکالپی شتافت. مولانا خواجگی بکالپی رخت اقامت انداخت، وقاضی بجونپور رفت[1]

قاضی شہاب الدین اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمراہ دہلی سے کالپی گئے، مولانا خواجگی نے تو کالپی ہی میں اقامت اختیار کرلی، اور قاضی صاحب جونپور چلے گئے۔

مولانا خواجگی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں درس وتدریس میں گذار چکے تھے، اس لیے ان کو کالپی کا گوشہ راس آگیا، اورچند سال وہاں ترک وتجرید اورعبادت وریاضت میں گذار کر [illegible]ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئے، مگران کے جوان عزم وجواں ہمت شاگرد کو یہاں کام کرنے کے مواقع وامکانات کم نظر آئے، اس لیے وہ اپنے استاد کو کالپی میں چھوڑکر جونپور چلے آئے۔

کالپی سے جونپور میں آمد اس وقت جونپور شاہان شرقیہ کے حسن انتظام، علم دوستی اور ارباب علم وفضل کی قدر دانی میں دہلی ثانی تھا، اور دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کی ساری علمی ودینی رونق کھنچ کر جونپور میں چلی آئی تھی، خصوصاً سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے تخت نشین ہونے کے بعد ۸۰۴ھ میں دیار پورب دیار العلم والعلما بن گیا تھا، اور یہاں کے قریات وقصبات علم وفضل کے گہوارے ہوگئے تھے، قاضی نصیر الدین دہلوی جونپوری، شیخ ابو الفتح بن عبد الحیٔ بن مولانا عبد المقتدر شریحی دہلوی جونپوری، شیخ نصیر الدین بن نظام الدین غزنوی، دہلوی، جونپوری، مولانا قیام الدین دہلوی ظفرآبادی اور شیخ محمد بن عیسیٰ دہلوی جونپوری وغیرہ فتنۂ تیموری کے بعد دہلی سے جونپور چلے آئے تھے، ان ہی ایام میں قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے کالپی گئے اور وہاں سے جونپور آگئے، شاہ

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸

کالپی کی آب و ہوا راس نہیں آئی، اور اس پیکر علم کے مزاج نے دہلی کی طرح یہاں بھی اطمینان و سکون کی فضا نہیں پائی، اس لیے دیار پورب کا رخ کیا اور جونپور آگئے، اس واقعہ کو تمام تذکرہ نگاروں نے بیان کیا، مگر کسی نے کالپی میں قاضی صاحب کے اقامت کی تصریح نہیں کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی رروار دی کی حالت میں گئے اور فوراً ہی وہاں سے واپس ہوگئے، اس کی بھی تصریح نہیں ملتی ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے پھر دہلی واپس گئے ہوں اور وہاں سے جونپور آئے ہوں۔ اخبار الاصفیاء میں ہے:

درسنہ ہشتصد ہجری کہ صاحبقران بہند جا[لش]	۸۰۰ھ میں جبکہ امیر تیمور صاحبقران نے
فرمود، او ہمراہ استاد خود مولانا خواجگی کہ	ہندوستان کا رخ کیا، قاضی شہاب الدین
خلیفہ نصیر الدین محمود اودھی است، از	اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمراہ اپنے وطن
وطن گاہ برآمد، مولانا خواجگی در کالپی	دہلی سے نکل گئے، مولانا خواجگی نے کالپی میں
آرام گزید ودبے بجونپور آمدہ علم توقف	آرام کیا، اور قاضی صاحب نے جونپور آکر اقامت
بزد، و کوس شہرت فرد کوفت[۱]	اختیار کی اور شہرت و ناموری پائی۔

اس میں قاضی صاحب کے مولانا خواجگی کے ساتھ نکلنے کی تصریح ہے، مگر ان کے کالپی جانے کی تصریح نہیں ہے، البتہ دوسری کتابوں میں ان کا کچھ دنوں کے لیے کالپی جانا صراحت کے ساتھ مذکور ہے، سبحۃ المرجان میں ہے۔

خرج القاضی شہاب الدین صحبتہ	قاضی شہاب الدین اپنے استاد کی معیت میں
استاذہ الی کالپی فاقام مولانا	کالپی گئے، مولانا خواجگی تو وہیں رہ گئے،
خواجگی بکالپی و ذھب القاضی	قاضی صاحب جونپور چلے گئے۔

(سبحۃ المرجان ص ۳۸)

---

[۱] اخبار الاصفیاء، ورق ۶۰

قاضی صاحب اور ان کے متعلقین کے جونپور آنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اس وقت سلطان ابراہیم شرقی کی سلطنت قائم ہوچکی تھی، اور سید اشرف سمنانی بقید حیات تھے، سلطان ابراہیم بن خواجہ جہاں شرقی کی حکومت اس کے بھائی سلطان مبارک شاہ شرقی کے بعد ۸۰۴ھ میں شروع ہوئی اور سید اشرف سمنانی کا وصال ۸۰۸ھ میں ہوا، اسی درمیان میں قاضی صاحب جونپور تشریف لائے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کی بربادی کے نتیجہ میں جونپور آباد ہورہا تھا، اور ہند و بیرون ہند کے علماء، فضلاء، مشائخ اور دانشوروں کے قافلے یہاں چلے آرہے تھے، طبقات اکبری میں اس دور کے جونپور کا نقشہ یہ درج ہے کہ "سلطان مبارک شاہ شرقی کے مرنے پرجب سلطان ابراہیم شاہ شرقی سریر آرائے سلطنت ہوا تو امن و امان کی فضا میں عوام و خواص نے سکون کا سانس لیا اور جو علماء و مشائخ آشوب زمانہ سے پریشان تھے، وہ جونپور چلے آئے، وہ اس زمانہ میں دارالامان تھا، اور شرقی سلطنت علماء کی کثیر تعداد کے آنے سے دارالعلوم بن گئی"[۱] تاریخ فرشتہ نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ "آشوب زمانہ کے مارے ہوئے ہندوستان کے اطراف و اکناف کے لوگ جونپور چلے آئے تھے، یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق اعزاز حاصل ہوا، علماء، مشائخ، سادات اور علماء وغیرہ ہر طبقہ کے اعیان اس طرح جمع ہو گئے کہ جونپور دہلی ثانی کہلانے لگا، لوگوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت سمجھکر حیات دو روزہ کو اس نشاط و انبساط سے بسر کیا کہ شاہ سے لیکر گدا تک خوش اور مطمئن تھے، اور غم و اندوہ اس دیار سے اپنا بوریا بستر باندھ چکا تھا"[۲]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی قدردانی اور جونپور میں اقامت

بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، جو قرین قیاس

---

۱ طبقات اکبری ص ۵۲۸ طبع نولکشور ۲ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

عبدالحق صاحب کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے دہلی آئے، پھر یہاں سے جونپور تشریف لے گئے، شیخ ابوالفتح شرحی کندی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

شیخ ابوالفتح اول در دہلی بود، در واقعہ صاحب قران امیر تیمور با بعضے دیگر از اکابر شہر جونپور رفت، و قاضی شہاب الدین ہمدراں واقعہ از دہلی بد انجا رفتہ است[1]	ابتدا میں شیخ ابوالفتح دہلی میں تھے، امیر تیمور کے فتنہ میں دوسرے اکابر کے ہمراہ جونپور چلے گئے، اسی واقعہ میں قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے اس جگہ پہنچے۔

قاضی صاحب کے ساتھ ان کی صاحبزادی، داماد شیخ نصیرالدین اور ان کے والد شیخ نظام الدین غزنوی بھی مع دیگر اہل خانہ کے دہلی سے جونپور آکر مستقل طور سے آباد ہوگئے، قاضی صاحب کے دو نواسوں قاضی رضی الدین اور شیخ صفی الدین کے پہلے ہی سے رودلی میں سکونت اختیار کر لینے کی تصریح گذر چکی ہے، تذکرہ علمائے ہند میں ہے

چوں حادثہ مغل در دہلی رو نمود بعہد سلطان ابراہیم شرقی قاضی شہاب الدین و شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ از دہلی بجونپور قدوم آوردند[2]	جب دہلی میں مغل حادثہ رونما ہوا تو بعہد سلطان ابراہیم شرقی، قاضی شہاب الدین اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے۔

اغلب یہ ہے کہ قاضی صاحب، ان کی لڑکی اور داماد کے جونپور آنے کے محرک شیخ صفی الدین اور شیخ قاضی رضی الدین رہے ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی سے بات چیت کر کے اپنے نانا اور دادا وغیرہ کو جونپور آنے کی دعوت دی ہو،

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰، [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۷

اسی کا ترجمہ تذکرہ علماے ہند میں ہے " سلطان ابراہیم شرقی قدوم قاضی مغتنم شمرده باعزاز و تعظیم تمام پیش آمدش، وا ورا بملک العلماء ملقب کرد"[1] تاریخ فرشتہ اور تجلی نور میں اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے " سلطان در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید، و در مجلس خود برکرسی نقرہ جا داد، و قاضی القضاۃ کرد"[2] مگر لطائف اشرفی میں ہے کہ ملک العلماء کا لقب قاضی کو سید اشرف سمنانی نے اس وقت دیا تھا جب ان کو خرقہ خلافت سے نوازا تھا[3] ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے عطا کردہ لقب کو سلطان ابراہیم شاہ نے سرکاری حیثیت دیدی ہو،

قاضی صاحب نے جونپور کے محلہ خواجگی میں سکونت اختیار فرمائی اور یہیں اپنا مکان اور مدرسہ بنوایا، تجلی نور میں ہے " مولانا شہاب الدین در جونپور بمحلہ خواجگی قیام پذیرفت وبعد فوت متصل آں محلہ دروازۂ جنوبی مسجد اٹالہ مدفن یافت"۔ (ج ۲ص ۴۷) یہ معلوم نہیں کہ پہلے ہی سے یہ مقام اور محلہ خواجگی کے نام سے آباد و مشہور تھا، یا قاضی صاحب نے یہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے استاذ و مرشد مولانا خواجگی کے نام پر اس محلہ کا نام رکھا، جو صورت بھی ہو، یہاں قاضی صاحب کی سکونت اپنے شیخ و استاذ سے عقیدت و محبت اور نسبت کا پتہ دیتی ہے ؎

دریں دیار ازاں سرخوشیم کہ گاہے
نسیم بوئے توام زیں دیار می آید

قاضی صاحب جونپور میں کیا رونق افروز ہوئے کہ دیار پورب کے علمی و روحانی سلسلہ کی وہ تمام دولت جو دہلی میں لٹ رہی تھی، سمٹ سمٹا کر پھر پورب میں آگئی، اور آٹھویں صدی میں اودھ کی جو روشنی دہلی کے میناروں پر ہو رہی تھی، وہ نویں صدی کے شروع ہوتے ہی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴ [3] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۱

بھی ہے۔ قاضی صاحب کی علمی شہرت قیام دہلی کے زمانہ میں عام ہو چکی تھی۔ ان کی درسگاہ کے دو فضلا جو ان کے نواسے بھی تھے، ردولی میں موجود تھے، ایک عہدۂ قضا پر مامور تھے، اور دوسرے درس و تدریس میں نام پیدا کرکے طریقت میں سید اشرف سمنانیؒ سے منسلک ہو گئے تھے، ان کے علاوہ قاضی صاحب کے جو احباب و معاصرین اور شرکائے درس جونپور آچکے تھے، انھوں نے بھی ان کی شہرت و قابلیت کا تذکرہ کیا ہوگا، خصوصاً قاضی نصیر الدین گنبدی جو قاضی صاحب کے استاذ مولانا عبد المقتدر کے مشہور تلامذہ میں تھے، اور شیخ ابو الفتح شرکی جو مولانا عبد المقتدر کے پوتے اور ان کے فیض یافتہ تھے، ان کی آمد سے جونپور میں قاضی صاحب کے علم و فضل کا چرچا ہوا ہوگا، ان کے کمالات سنکر سلطان ابراہیم نے قاضی صاحب کو دعوت دی ہوگی، تجلی نور میں ہے:

مولانا خواجگی بکالپی توطن کرد، و قاضی	مولانا خواجگی نے کالپی کو وطن بنایا اور قاضی
حسب الطلب سلطان ابراہیم شرقی	شہاب الدین سلطان ابراہیم شرقی کی طلب
بجونپور تشریف آورد[1]	پر جونپور تشریف لائے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے جس عقیدت اور قدر و منزلت کے ساتھ قاضی صاحب کا استقبال کیا وہ اس کی دعوت سے کہیں بڑھ کر تھا، سبحۃ المرجان میں ہے:

فاغتنم السلطان ابراهيم الشرقي	والی جونپور سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب
والی جونفور ورودہ ونضر	کی آمد کو غنیمت سمجھا اور اپنے ابر دولت
سقاہ اللہ سحائب الاحسان	[illegible] مملکت میں ان کو بلند مقام دیکر
وزودہ وعظمہ بین الکبراء	ملک العلماء کے خطاب سے ملقب کیا۔
ولقبہ بملک العلماء[2]	

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۳۳ [2] سبحۃ المرجان ص ۳۹

اکثر علماء وفضلاء نے درس و تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور آخر میں صرف قاضی صاحب کا مدرسہ باقی رہ گیا تھا یا چند اور مدارس رہ گئے تھے جن میں ان کے مدرسہ کو اہمیت و خصوصیت حاصل تھی۔ قاضی صاحب کی تدریسی خدمات میں اس کی تفصیل آئے گی۔

علمائے وقت کی حسد کی ایک روایت اور اس پر تنقید

قاضی صاحب کے جونپور تشریف لانے پر ان کا شاہانہ استقبال اور بڑا اعزاز و اکرام ہوا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور ارکانِ دولت شرقیہ نے پرجوش استقبال اور علماء و مشائخ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعزاز و اکرام نے قاضی صاحب کے حاسد بھی پیدا کر دیے، اخبار الاصفیاء میں ہے کہ

آوردہ اند کہ علمائے وقت را پیمانۂ حسد پر شد شمہ از آن بمولانا نوشت مولانا این دو بیت سعدی در جواب نگاشت	بیان کیا جاتا ہے کہ علمائے وقت کے حسد کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو قاضی صاحب نے اشارۃً مولانا کو لکھا ہے، مولانا نے اس کے جواب میں سعدی کے دو اشعار لکھ بھیجے

اے بیش ازاں کہ در قلم آید ثنائے تو — واجب براہل مشرق و مغرب دعائے تو

اے در بقائے ذات تو نفع جہانیاں — باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو[1]

لیکن یہ روایت کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذری۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی عقیدت و فریفتگی

سلطان ابراہیم شاہ شرقی بڑا نیک دل، علم پرور، علما نواز اور خدا پرست فرمانروا تھا، اسے علماء و مشائخ سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کی خدمت اور تعظیم و تکریم میں اپنی سعادت سمجھتا تھا، اس نے اپنے چالیس سالہ دور حکومت میں قاضی صاحب

---

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۶۰

جونپور کی فصیلوں پر ہونے لگی جس سے دیار پورب کے بام و در جگمگا اٹھے، اس طرح اس دیار کی متاعِ علم وفن پھر اسی دیار میں لوٹا دی گئی۔ ھذہ بضاعتنا ردت الینا۔

قاضی صاحب کو سارا علمی و روحانی سرمایہ شیخ الاسلام زین الدین اودھی اور ان کے تلامذہ شیخ شمس الدین اودھی اور شیخ نصیر الدین اودھی سے ملا تھا۔ ان کے دونوں استاد ومرشد مولانا عبد المقتدر اور مولانا خواجگی اسی دبستانِ علم ومعرفت کے فضلا میں تھے، اس لیے آپ نے بھی اس خانوادہ کی روایات کے مطابق جونپور میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری کیا۔

قاضی وسادۂ افادہ ودرس بجونپور عزیز فرمود وبتصنیف کتب معرفت گردید[1]	قاضی صاحب نے جونپور میں درس وافادہ کی مسند کو زینت دی اور کتابوں کی تصنیف کا شغل اختیار کیا۔

اس وقت جونپور میں متعدد [illegible] علما وفضلاء کی درسگاہیں تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دے [illegible] قاضی [illegible] اور قاضی عبد المقتدر کے تلامذہ تھے ان کے [illegible] اور شیخ نصیر الدین کے حلقۂ [illegible] مرجع بن رہے تھے، مولانا [illegible] حلقۂ درس [illegible] علاوہ دوسرے علما وفضلا کی تعلیم وتعلم سے معمور تھے، ان [illegible] قاضی صاحب نے بھی اپنا حلقہ قائم کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں علما اور مشائخ دونوں طبقوں میں ان کی درسگاہ کی افادیت واہمیت کا عام چرچا ہوگیا، چنانچہ شیخ فتح اللہ اودھی نے اپنے تلمیذ رشید شیخ محمد بن عیسیٰ کو قاضی صاحب ہی کے پاس بھیجکر علوم شرعیہ وظاہریہ کی تحصیل وتکمیل کرائی، پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ بعد میں

---
[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۸

ابراہیم شاہ شرقی مغموم گشت در ہماں	کے انتقال پر وہ اس قدر غمگین ہوئے کہ
سال یعنی اربعین وثمانمائۃ بخلد قدس	اسی سال ۸۴۰ھ میں رحلت فرما گئے اور
تشریف برد، والبقاء للملک المعبود	بعض کہتے ہیں کہ اس کے دو سال کے بعد
وبعضے گویند کہ بدو سال بعد از فوت	۸۴۲ھ میں ان کا طائر روح باغ جنت
سلطان ابراہیم طائر روحش درسنہ	کو پرواز کر گیا،
اثنی واربعین وثمانمائۃ روضۂ رضوان	
پرواز کرد۔[1]	

قاضی صاحب اور سلطان ابراہیم میں قلبی تعلق کا یہ نتیجہ تھا کہ سلطان ان سے تمام علمی ودینی امور ومعاملات اور افراد ورجال کے بارے میں مشورہ کیا کرتا تھا، اور ان کو پوری شرقی سلطنت کا قاضی القضاۃ بنا دیا تھا، اور ان ہی کے مشورے سے قضاۃ کا تقرر کرتا تھا، حاجتمندوں کے بارے میں قاضی صاحب کی سفارش کا خاص خیال رکھتا تھا سید اشرف سمنانیؒ جیسے بزرگ تک سلطان سے اپنے متوسلین ومتعلقین کی سفارش میں قاضی صاحب کو وسیلہ بناتے تھے، سلطان کی علم دوستی کا ایک مظاہرہ یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی دربار میں قاضی صاحب اور دوسرے علماء کے درمیان مباحثہ ومناظرہ کی دینی وعلمی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا، اس طرح ملک العلماء کا علمی دربار سجاتا تھا، ان دونوں شاہ وگدا یعنی سلطان الشرق اور ملک العلماء کے تعلقات پہلے دن سے لیکر آخری دن تک یکساں شگفتہ رہے، چالیس سالہ مدت میں ان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، اس سے دونوں کے ظرف وحوصلہ اور تعلقات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے، ان دونوں کا تذکرہ لازم وملزوم بن گیا ہے، جو صرف الحبُّ للہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

کو سر آنکھوں پر رکھا، فرشتہ کا بیان ہے "سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید و روز ہائے متبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست"۔ فرشتہ ہی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی صاحب زیادہ بیمار پڑ گئے، سلطان ابراہیم کو خبر ہوئی تو مزاج پرسی اور عیادت کے لیے ان کے گھر پر حاضر ہوا اور مزاج پرسی اور اظہار محبت و تعلق کے بعد پانی سے بھرا ہوا پیالہ منگایا اور اسے قاضی صاحب کے سر کے گرد گھمایا اور یہ کہکر اس کا پانی پی گیا کہ

بار خدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد نصیب من گرداں، و او را شفا بخش	خداوندا! ہر وہ مصیبت جو قاضی صاحب پر آنے والی ہو اسے میرے نصیب میں ڈال دے اور ان کو شفا بخش دے،

تخت و تاج اور علم و دانش کی تاریخ میں یہ واقعہ یادگار رہے گا کہ سلطان ابراہیم ملک العلما کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا، جو قاضی صاحب کے علم و فضل و کمال کے اعتراف اور علماء و فضلا سے سلطان کی محبت و عقیدت کا اعلیٰ نمونہ ہے، فرشتہ نے اس واقعہ سلطان کے بارے میں یہ تاثر ظاہر کیا ہے:

ازیں جا عقیدۂ آں صاحب تخت و تاج نسبت بعلمائے شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معلوم می تواند کرد، تا چہ غایت بود	اس واقعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس صاحب تخت و تاج بادشاہ کو شریعت محمدی کے علماء سے کس درجہ عقیدت تھی۔

قاضی صاحب کو بھی سلطان سے کچھ کم محبت نہ تھی، اگر سلطان ان پر جان چھڑکتا تھا بقول فرشتہ قاضی صاحب نے اس پر جان چھڑک ہی دی اور اسکے بعد زیادہ دنوں زندہ

قاضی شہاب الدین نیز با سلطان عصر موافقت کرد، چنداں از فوت شاہ	قاضی شہاب الدین نے بھی سلطان کا پورا پورا ساتھ دیا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی

صاحب علم و فن کا، مگر دونوں ہم ذوق و ہم فکر تھے، قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی کو سید صاحب سے بہت پہلے سے روحانی نسبت حاصل تھی، ان کے صاحبزادے ابو المکارم اسمٰعیل کو بھی سید صاحب سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا، اس لیے قاضی صاحب اور سید صاحب میں پہلے سے ایک گونہ روحانی و علمی تعلق قائم ہو چکا تھا جس نے نئے دور میں مرشد و مسترشد کی نسبت اختیار کر لی، تعجب ہے کہ قاضی صاحب اور سید صاحب کے گوناگوں تعلقات اور ان کی بیعت و خلافت کا تذکرہ کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی نظر سے لطائف اشرفی کی وہ تصریحات نہیں گذر سکیں جن میں دونوں بزرگوں کے احوال و کوائف اور سید صاحب کی قاضی صاحب پر خاص توجہات و عنایات کا ذکر ہے، صرف شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے سید صاحب کے ایک مکتوب کے پیش نظر قاضی صاحب کو ان کا معاصر بتایا ہے، اور سید صاحب کے ذکر میں ان کے اس بائیسویں مکتوب کو درج کیا ہے۔

از مکتوبات سے مشتمل بر تحقیقات	سید اشرف کا ایک خط ان کے معاصر قاضی
غریبہ با قاضی شہاب الدین دولت آبادی	شہاب الدین دولت آبادی کے نام ہے
معاصر بود۔ غالباً قاضی از وے تحقیق	جو تحقیقات غریبہ پر مشتمل ہے، غالباً قاضی صاحب
ایمان فرعون کرد در فصوص اشارتے	نے سید صاحب کو فرعون کے ایمان کے بارے
بداں واقع شدہ است کردہ بود	میں خط لکھا تھا جس کی طرف فصوص الحکم
او دریں باب بوے مکتوبے نوشت[۱]	میں اشارہ ہے۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی اخبار الاخیار سے یہی عبارت نقل کر دی ہے[۲]،

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۶۱ و ص ۱۶۲ [۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳

کا نتیجہ ہے،

حضرت سید اشرف سمنانیؒ کی عنایات و توجہات | قاضی شہاب الدین کو ملک العلماء، اور قاضی القضاۃ بنانے میں بادشاہ کی مرحمت خسروانہ کے ساتھ ملک العلماء کے قلندرانہ فقر کو بھی بڑا دخل ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔ قاضی صاحب جس زمانہ میں یہاں آئے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ کا آخری زمانہ تھا، ان کی مقبولیت و شہرت اپنے کمال عروج پر تھی، سید صاحب سمنان میں پیدا ہوئے، اور وہیں مروجہ علوم و فنون کی تکمیل کی، پھر ترک و تجرید اختیار کر کے عالم اسلام کی سیر و سیاحت فرمائی، اور علم و عرفان کے ہر خرمن سے خوشہ چینی کر کے آخر میں ہندوستان آئے، اور سندھ میں شیخ جلال الدین بخاریؒ سے، بہار میں شیخ شرف الدین منیریؒ سے اور بنگال میں شیخ علاء الدین لاہوریؒ وغیرہ سے کسب فیض کر کے جونپور آئے، جہاں شرقی سلطنت کے بدولت ہر قسم کا امن و سکون تھا، یہیں قریب ہی روح آباد عرف کچھوچھہ نامی مقام پر سکونت اختیار فرمائی، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، آپ شیخ وقت ہونے کے ساتھ نامور عالم و مصنف بھی تھے، ان کی جامعیت کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے، تفسیر میں نور بخشیہ، فقہ میں حاشیہ ہدایہ، فتاوی اشرفیہ، حاشیہ فصول، مختصر اصول فقہ، نحو میں رسالہ اشرفیہ، علم کلام میں قواعد العقائد، ادب میں دیوان اشعار، تاریخ و انساب میں بحر الانساب اور اشرف الانساب کے علاوہ ارشاد و تلقین اور سلوک و تصوف میں ان کی متعدد معیاری تصانیف ہیں، جن سے انکی علمی استعداد و قابلیت کا پتہ چلتا ہے، قاضی شہاب الدین اور سید اشرف میں یہی علمی ذوق وجہ اشتراک ثابت ہوا، جب دونوں ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک مکتب فکر کے دو عالم مل گئے ہیں، فرق صرف یہ تھا کہ سید صاحب پر مشیخیت کا رنگ غالب تھا اور قاضی صاحب

مشہور ہمہ فنون شدہ است، ایشانند — علوم وفنون میں مشہور اور ان سب میں ماہر ہیں۔

یہ سنکر سید صاحب ان کے استقبال کے لیے بڑھے، قاضی صاحب سید صاحب کو آتا دیکھکر پالکی سے اتر پڑے اور اپنے ہمراہی علماء و فضلاء کو ہدایت کی کہ اس ملاقات میں کوئی شخص اپنی ہنرمندی ظاہر کرے اور نہ کوئی علمی سوال چھیڑے، کیونکہ

کہ در حسن جبین سید نور ولایت می تابد — کیونکہ سید صاحب کی پیشانی کے حسن وجمال میں ولایت کا نور چمکتا ہے۔

سید صاحب نے نہایت ادب و احترام سے قاضی صاحب کو بیٹھایا، دونوں میں مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو رہی، اسی اثنا میں منع کرنے کے باوجود قاضی صاحب کے بعض ساتھیوں نے درسیات اور علم کلام کی بعض بحثیں چھیڑ دیں، اس مجلس میں سید صاحب کے مرید شیخ ابوالحسن ناخوارزمی بھی موجود تھے، جو تمام علوم وفنون میں کمال رکھتے تھے، انھوں نے اس بحث پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ تمام حاضرین مطمئن ہوگئے۔

قاضی صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ آج سلطان ابراہیم آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہونے والے تھے، مگر اس خادم نے چاہا کہ پہلے خود شرف زیارت حاصل کرلے، انشاء اللہ کل سلطان حاضر خدمت ہوں گے، اس کے جواب میں سید صاحب نے فرمایا

نزدیک فقیر شما از سلطان بسیار بہتر آید — فقیر کے نزدیک آپ کا مرتبہ سلطان سے بلند ہے

اگر می آید ہم حاکم اند — اگر سلطان آئے تو بادشاہ وقت ہی، اسکو اختیار ہے

ملاقات کے بعد قاضی صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رخصت ہوگئے، ان کے جانے کے بعد سید صاحب نے احباب سے ان کے بارے میں یہ تاثرات ظاہر فرمائے

در ہندوستان ایں مقدار فضیلت در کسے — ہندوستان میں اس قدر فضیلت رکھنے والے

حالانکہ ان دونوں بزرگوں میں معاصرت سے بڑھ کر مرید و مرشد اور محبت و مودت کا رشتہ قائم تھا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد سید اشرف سمنانی ہی قاضی صاحب کے خاص قدردان و مداح رہ گئے تھے، اور قاضی صاحب کو بھی ان سے ارادت و خلافت کی نسبت سے بڑا گہرا تعلق تھا، اس حقیقت کا اظہار صرف لطائفِ اشرفی سے ہوتا ہے، جو سید صاحب کے ملفوظات و حالات میں نہایت مستند کتاب ہے اور جسے ان کے خادم و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنی معاصر قاضی شہاب الدین نے لکھا ہے، اس کی تالیف غالباً قاضی صاحب کی زندگی میں ہوئی ہے، ہم اس سلسلہ کی ضروری باتیں لطائفِ اشرفی سے نقل کرتے ہیں، انکے بغیر قاضی صاحب کا ذکر جمیل نامکمل رہے گا۔

قاضی صاحب کی سید اشرف سے پہلی ملاقات جونپور میں سید صاحب اور قاضی صاحب کی پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ سید اشرف صاحب اپنے خدام و احباب کے ساتھ روح آباد (کچھوچھہ) سے جونپور تشریف لائے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی جامع مسجد میں قیام فرمایا سلطان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق آپ کی زیارت کے لیے حاضری کا ارادہ کیا، مگر قاضی شہاب الدین نے سلطان سے کہا کہ سید اشرف کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑے پایہ کے بزرگ ہیں، ان کے مزاج سے واقفیت نہیں ہے، بہتر ہے کہ پہلے ان سے مل کر ان کا طور و طریقہ معلوم کیا جائے، سلطان نے اس رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ قاضی صاحب علماء کی ایک جماعت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، سید صاحب اس وقت ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر اوراد و وظائف میں مشغول تھے، جب ان کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ملاقات کے لیے آرہے ہیں تو دریافت فرمایا کہ کون آرہا ہے، خدام نے عرض کیا

قاضی شہاب الدین کہ منسوب بجمیع علوم اند یہی وہ قاضی شہاب الدین ہیں جو تمام

آپ سے مستفید و مستفیض ہوئے، اس مدت میں قاضی شہاب الدین کی عقیدت و محبت سید صاحب سے اسقدر بڑھ گئی کہ پابندی سے وہ ہر تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے ان کو قبول کرکے ان کی تحسین و تعریف فرمائی، اور بہترین تاثرات کا اظہار فرمایا، الارشاد فی النحو کو زیادہ پسند کیا اور فرمایا

گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمدہ — کہتے ہیں کہ جادو ہندوستان سے نکلا ہے،
غالباً ایں راست سحر بود — وہ جادو غالباً یہی کتاب ہے۔

بدیع البیان کو جو کہ علم معانی و بیان میں ہے قبول فرماکر اس کی تحسین فرمائی، فارسی تفسیر بحر المواج کے بارہ میں فرمایا:

سخن خالی از اطالتے نیست — اس کی بحثیں طوالت سے خالی نہیں ہیں

اور جامع الصنائع کے متعلق جو فارسی زبان میں بدائع و صنائع پر ہے، ارشاد ہوا:

حضرت قاضی دریں فن ہم دست زدہ اند — قاضی صاحب نے اس فن میں بھی ہاتھ مارا ہے۔

سید صاحب کے ان الفاظ کا مجلس پر بہت اثر ہوا، اس مجلس میں شیخ واحدی بھی موجود تھے، انھوں نے اسی وقت سید صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا، اسے سنکر قاضی صاحب اور سید صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور تبسم فرمایا، اور سید صاحب نے قاضی صاحب سے مخاطب ہوکر کہا:

چون ہمہ از علوم سر بردہ اید، فارسی را بشیخ گذارید — آپ تمام علوم میں ماہر و کامل ہیں، فارسی زبان کو شیخ واحدی کے لیے چھوڑ دیجئے۔

کم دیدہ ایم — علما، ہم نے بہت کم دیکھے ہیں ۔

دوسرے دن سلطان ابراہیم اپنے حشم وخدم اور امرائے دولت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، جب مسجد کے دروازے پر پہنچا تو قاضی صاحب کو خیال ہوا کہ سلطانی خدم وحشم سے سید صاحب کو کلفت ہوگی، اس لیے صرف بیس امرا، وعلماء کے ساتھ سلطان نے سید صاحب سے ملاقات کی، اس زمانہ میں سلطانی فوج قلعۂ چنار کا محاصرہ کئے ہوئے تھی، سید صاحب نے فتح کی بشارت دی اور جب سلطان رخصت ہونے لگا تو سید صاحب نے اس کو اپنی خاص مسند عنایت فرمائی، جس سے سلطان بے حد خوش ہوا، اور دربار میں پہنچنے کے بعد سید صاحب کے متعلق یہ تاثرات ظاہر کیے :

چہ سیدیست عالی جناب ومقاصد مآب — سید صاحب کس قدر عالی مرتبہ اور با مقصد بزرگ

الحمد للہ در ہندوستان چنیں مردم درآمدہ اند — ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان میں ایسے آدمی آئے ہیں۔

اس واقعہ کے تیسرے دن قلعۂ چنار کی فتح کی خوشخبری آئی، سلطان نے دوبارہ حاضر ہو کر سید صاحب کو اس کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں تو حضرت میرؒ کے دست ارادت دے چکا ہوں، البتہ خادم زادے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوں گے، چنانچہ اسی دن دو تین شہزادے سید صاحب سے مرید ہوئے، اور نذر پیش کی جسے آپ نے قبول نہیں فرمایا، شہزادوں نے جونپور میں مستقل قیام کرنے پر اصرار کیا، آپ نے ان کی دلجوئی کے لیے ارشاد فرمایا

از دیار سلطان بیرون نخواہیم رفت — ہم سلطان کی مملکت کے باہر نہیں جائیں گے ۔

سلطان ابراہیم سید صاحب کی ان باتوں سے بہت پُر امید اور خوش ہوا، اور سید صاحب نے بھی دو مہینہ سے زیادہ جونپور میں قیام فرمایا اور وہاں کے اکابر واصاغر

غالب کی وطنیت پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے دہلی واپس آگئے تھے، اور بقیہ عمر یہیں گذاری، کبھی کبھی رام پور، اور دوسرے شہر کا سفر ضرور تاً کرلیا کرتے تھے۔

ان کو دہلی سے بڑی محبت رہی، یہاں ان کی پوری زندگی گذری، اور یہیں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس شہر میں ان کو بہت دکھ درد بھی اٹھانا پڑا، یہیں وہ قمار بازی کے الزام میں جیل گئے، یہیں وہ اپنے قرض خواہوں کے تقاضے سے پریشان رہے، ان کے خوف سے ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ دن بھر گھر میں بند رہتے، رات کو چپکے سے نکلتے اور ملنے والوں سے جاکر ملاقات کرلیتے، اپنی زبوں حالی کا ذکر ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں :-

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یہ ہے، غالب کیا مرا، ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے

اور شیخ واحدی نے یہ درخواست پیش کی۔

لشکر علم تو بہ تیغ بیان — از عجم تا عرب گرفتہ بار
چوں گرفتی عراق عربیت — فارسی را بواحدی بگذار

اس سفر میں معاملہ یہیں تک رہا، جب سید صاحب دوسری بار جونپور تشریف لے گئے تو قاضی صاحب کو خرقۂ خلافت عطا فرماکر ہدایہ کا ایک خصوصی نسخہ عنایت کیا (غالباً ہدایہ کا یہ نسخہ سید صاحب کے حواشی سے مزین تھا)[1] (باقی)

---

[1] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۵ - ۱۰۶

"شہر کے بلند مرتبت، دانشمند لوگوں میں کوئی نہ تھا، جو اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر گھر کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھ گیا ہو..... کھلم کھلا قہر و غضب اور بغض خصومت کو دیکھ کر خوف سے سب کے چہروں کا رنگ اڑ گیا، زرداروں اور ناداروں، دوروں میں مردوں اور پردہ نشین عورتوں کی کثیر تعداد کو شمار میں نہ لائی جا سکے ان تینوں دروازوں (یعنی اجمیری، ترکمان، دلی دروازہ) سے نکل کھڑی ہوئی، اور چھوٹی چھوٹی بستیوں اور مقبروں شہر سے باہر جا کر دم لیا تاکہ واپسی کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں، یا وہاں بھی اطمینان حاصل نہ ہو تو رات دن سفر کر کے کسی دوسری جگہ پہنچ جائیں........ شہر بھر میں پندرہ ستمبر سے ہر مکان اور حجرے کا دروازہ بند ہے اور دوکاندار اور خریدار دونوں پابند، غلہ فروش کہاں کہ غلہ خریدیں، دھوبی کہاں کہ کپڑے دھلنے کو دیں، حجام کہاں تلاش کریں کہ سر کے بال تراشے اور خاک روب کو کہاں سے لائیں کہ صفائی کرے، ان پانچ دن میں...... لوگ جاتے تھے اور پانی ہمیشہ اور آٹا نمک کبھی کبھی اگر مل جاتا لے آتے تھے، عاقبت کار دروازہ پتھروں سے پٹ گیا، اور دلوں کے آئینے زنگ خوردہ ہو گئے،...... خوش و ناخوش جو کچھ کھانے کو میسر تھا، کھا لیا گیا، اور پانی اس طرح سے جیسے کنواں ناخنوں سے کھودا گیا ہو، پیا گیا اور کوزہ و سبو میں پانی اور مرد و زن میں ضبط کی تاب باقی نہ رہی، صبر سے کٹنے اور آب و دانہ میسر آ جانے کی ابلہ فریبی کی نوبت گذر گئی۔ اور دو رات دن بھوک پیاس میں بسر ہوئے... حکم ہوا کہ چوک بازار تک جایا جا سکتا ہے، چوک سے آگے مقتل ہے، مجبور خستہ حالوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا، سقا، اور مشک اور پکھال، یہ چیزیں عنقا کا حکم رکھتی تھیں، ہر گھر سے ایک مرد اور میرے نوکروں

از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ، عرش نشین خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے، آئیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے، میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے، او غلان صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا۔ تھا یہ بھی سونچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔" (خط بنام مرزا قربان علی بیگ خان صاحب خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص ۹۱)

اس زبوں حالی سے پریشان ہو کر اپنے شعر میں بھی کہہ اٹھے تھے:

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد ہم نے مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

لیکن دلی ہی میں ان کو بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب دیا، اپنا استاد بنایا، مولانا فضل حق، سرسید احمد خاں، صہبائی، شیفتہ، آزردہ، حسام الدین حیدر خاں، امین الدین احمد خاں، نواب ضیاء احمد خاں نیر وغیرہ نے سر آنکھوں بٹھا کر مرجع کرام و ثقات بنا دیا، اس لیے وہ اپنی پریشان حالی کو بھولکر دلی کے سوجان سے شیدا و شیفتہ بنے رہے، غدر میں دلی تباہ ہوئی، تو دستنبو میں ان کا رواں رواں چیکے چیکے روتا نظر آتا ہے، گو وہ وقت کے تقاضے سے پورے طور پر اپنے نالہ و شیون کو بلند نہیں کر سکے ہیں، پھر بھی دستنبو کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑا جائے تو دلی کی تباہی کا نقشہ نظر کے سامنے اس طرح آتا ہے۔

کہ زمانہ کیسا بے پروا ہے، اگر میں کہ ایک گوشۂ اندوہ ہوں، دیوار کی جانب منہ کیے پڑا ہوں، سبزہ و گل کو نہ دیکھ سکوں اور مشام جاں کو نکہت گل سے معطر نہ کرسکوں تو بہار کی رونق میں کیا کمی آئے گی، اور صبا سے کون تاوان طلب کرے گا۔“

(یہ تمام اقتباسات دستنبو کے اردو ترجمے سے لیے ہیں جو مارچ ۱۹۲۹ء کے رسالہ تحریک دہلی میں شائع ہوئے)

غدر کے بعد دہلی پہ انگریزوں کا پھر سے قبضہ ہوا، تو اس وقت وہاں کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کا جو برا حال تھا، اس کا ذکر اپنے ان چند اشعار میں کرتے ہیں (نسخہ حمیدیہ ۳۳۷، غالب از مولانا غلام رسول مہر، دوسرا اڈیشن ص ۳۰۸)

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوے سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا۔

پھر اپنے مختلف خطوط میں دہلی کی تباہی اور بربادی پر برابر آنسو بہاتے رہے اور

میں سے دو نوکر گئے، چونکہ میٹھا پانی دور تھا اور دور نہیں جانا چاہیے تھے، مجبوراً کھاری پانی گھڑوں اور صراحیوں میں بھر لائے، آخر وہ آگ جس کا دوسرا نام پیاس ہے، اس نمکین پانی سے بجھنے میں آئی، باہر جانے اور پانی لے کر آنے والے کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہمیں اجازت نہیں، فوجیوں نے چند مکانوں کے دروازے توڑ دیے ہیں ...... پوشیدہ نہ رہے کہ پکڑ دھکڑ کے اس شہر آشوب ہنگامے میں جس طرح ہر گلی کوچے میں زور و تعدی کا ہنجار ایک نہیں ہے، اسی طرح سپاہیوں کا قتل و غارت کا ڈھنگ بھی ایک نہیں، کسی طرف نرمی یا سختی کا برتاؤ، اس کی اپنی کیفیت مزاج پر منحصر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو کوئی سر اطاعت خم کرے اس کے مال و متاع کے ساتھ اسکی جان بھی لے لیں، مقتولوں نے غالباً سرکشی کی، اسی وجہ سے ان کے سر تن سے جدا کر دیے گئے، شہرت بھی یہی ہے کہ بیشتر صورتوں میں اسباب چھین لیتے ہیں، جان نہیں لیتے، بہت کم اور وہ بھی تین گلیوں میں ایسا ہوا ہے، کہ پہلے سر اڑایا اور اس کے بعد مال و متاع اٹھالے گئے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے"۔

دہلی کی اس تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم کہیں کہیں رک جاتا ہے، اور پھر وہ واقعی رونے لگتے ہیں،

"آفتاب برج حمل میں مقام کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ اُگے اور پھول نہ کھلیں، ہاں نظام قدرت کبھی نہیں بدلتا، اور آسمان اس مقرر گردش کے سوا جو اس کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کرتا، میں خود پر آنسو بہاتا ہوں، باغ پر نہیں، اور مجھے مقدر سے گلہ ہے، بہار سے نہیں ..... میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں

یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ لہذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی، غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں، جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے، کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔ بلکہ ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں، دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔"

(مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

دہلی کی بربادی کا ایک دوسرا نقشہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں بھی پیش کرتے ہیں، جس میں بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کا بھی ضمناً ذکر دبے الفاظ میں آگیا ہے:

"چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا، بلی ماروں کے دروازہ کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر جوڑا کر لیا، شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں، تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے، بادشاہ، میرزا جواں بخت میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے، اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی، دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں، خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری سال ۱۸۵۹ء

اس کا غم ان کی زندگی کے آخری لمحات تک رہا، ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

"میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس کے محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا، واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ آباد ہوگئے ہیں، اب پوچھو تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے، راجہ صاحب نے صاحبان عالیشان (یعنی انگریزوں) سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں، چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آبیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے، جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور بازپرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگامہ میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں، میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا، اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا، میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں

بند ہوگیا، لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے، خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے، پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا، مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے، اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہوجائے، یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا، پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا، قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے، اور پانی گوہر نایاب ہوگیا، تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہوجائے گا۔ اللہ اللہ، دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے، واہ رے حسن اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔" (۱۸۶۱ء، خطوط بنام غالب جلد اول، مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۳۳۳ - ۳۳۲)

ایک اور خط مورخہ ۱۸۶۲ء میں دہلی مرحوم کا ذکر کرکے بری طرح دل فگار ہوتے ہیں، دلی، بادشاہ، امرا، احباب، علما، صلحا، قلعہ، جھجر، بہادر گڈھ اور بلب گڈھ، فرخ نگر

میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپئے دیئے جائیں گے، خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے، اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے۔"

(مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۵۸ء بنام سرفراز حسین)

انگریزوں نے دہلی کے خاص خاص حصوں میں پھاوڑے چلائے، ان کا ذکر غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے جیسے ان کے قلب پر پھاوڑا چلا ہے۔

"شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟ پون ٹوٹی (یعنی ٹون ڈیوٹی بمعنی چنگی) کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے، سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر محصول نہ لگا ہو، جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی، دارالبقا (مفتی صدرالدین آزردہ کی درگاہ) فنا ہو جائے گی، رہے نام اللہ کا، خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے، باقی خیر و عافیت ہے۔" (مورخہ ۹ نومبر ۱۸۵۹ء خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، جلد اول ص ۳۲۰)

دہلی کا ماضی یاد آ جاتا ہے تو اس طرح روتے ہیں:

"اے اب اہل دہلی ہندو یا اہل حرفہ ہیں، یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں، یا گورے، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی، پُروا ہوا اب کہاں۔ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا، اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے، بہر حال می گزرد، مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں

خاک میں مل گئیں، ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے، جو حکماء کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے، صلحاء اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔" (خط بنام علاء الدین احمد خاں علائی، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص ۴۰ - ۳۸)

لکھنؤ کی تباہی سے بھی ان کو بڑا دکھ ہوا، اور اپنے ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں :-

"ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے، خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی، امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔"

(خطوط غالب جلد اول ص ۲۲۲)

ان کی وطن دوستی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ان کو اپنے ہم وطن ہندوؤں سے وہی جذباتی ہم آہنگی رہی، جس کے نشو و نما کے لیے موجودہ ہندوستان طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہے، غالب اپنے ہندو ہموطنوں کے خیالات و عقائد کا احترام کرتے رہے، جیسا کہ ان کی مثنوی چراغ دیر سے ظاہر ہے، اور ان ہی کے قلوب کی تسخیر کی خاطر بنارس کو ہندوستان کا کعبہ بھی قرار دیا ہے،

عبادت خانۂ ناقوسیانست ہمانا کعبۂ ہندوستانست

اور پھر یہاں کے بتوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی اصل کوہ طور کے شعلے سے اور وہ ایزد تعالیٰ کے سراپا نور ہیں، اس سے صرف غالب کے شاعرانہ خیالات

وغیرہ ریاستوں کی بربادی پر درد انگیز طریقہ پر نوحہ خوانی کی ہے۔

" اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں جسمیں تم نے تحصیل علم کیا۔ وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے، مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود، معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السلف ہیں، وہ پانچ پانچ روپئے پاتے ہیں، اناث میں جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں، امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپئے روز کا پنشن دار، سو روپئے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا، میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا، آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا، تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی، احبا کو پوچھو۔ ناظر حسین مرزا اس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی امداد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے، بڈھے صاحب ساری املاک کو بیچکر نوش جان کرکے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کی کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ، اور فرخ نگر کم و بیش بیس لاکھ روپئے کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں

[illegible] جانِ من، مرزا تفتہ، مشفق میرے، کرم فرما میرے، میری جان وغیرہ کے القاب سے مخاطب کرتے،

"مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا، دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا، لیکن ناخوش بھی نہ رہا، بہرحال مجھ کو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ (جلد اول ص ۱۰۱)

[illegible] سوائے تمہارے اور کہیں نہیں پاتا۔" (ص ۱۲۷)

[illegible] آفریں، تم کو یوں ہی چاہیے تھا (۱۸۵۸ء ص ۱۳۹)

[illegible] کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے [illegible] ۲۰ جنوری ۱۸۵۹ء ص ۱۰۲)

قصیدے پر قصیدہ بھیجا اور خوب لکھا، آفریں ہے (مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔

جو تم نے لکھا [illegible] بے دردی ہے، اور بدگمانی، معاذ اللہ تم سے اور آزردگی!

مجھ [illegible] ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں،

[illegible] ہرگوپال [illegible] مرزا تفتہ تخلص ہے، تم ایسی کونسی بات لکھو گے کہ موجب

ملال ہو، رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی بھی ایک تھا،

وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا، وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمہاری

برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا، اور اس سے زیادہ آزردہ ہوتا، بھائی

مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے، برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی

شدت بڑھ گئی، تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں،

کا اندازہ کیجئے، عقیدہ کو ابھی بحث میں نہ لائیے۔

بتانش را ہیولی شعلۂ طور سراپا نور ایزد چشم بد دور

اس شہر کے لالہ زار بیابان در بیابان ہیں اور اس کی نوبہار گلستان در گلستان

بیابان در بیابان لالہ زارش گلستان در گلستان نوبہارش

کہتے ہیں کہ آواگون کے ماننے والے کاشی کی تعریف کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں، اور

ان کا خیال ہے کہ جو کوئی اس گلشن میں مرتا ہے، اس کا ملاپ دوبارہ جسم سے نہیں ہوتا،

یعنی پھر آواگون کے ماتحت ہو کر زندہ نہیں ہوتا ہے، وہ یہاں مرنے کے بعد زندۂ

جاوید ہو جاتا ہے۔

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند بہ کیش خویش کاشی را ستایند

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد دگر پیوند جسمانی نگیرد

چمن سرمایۂ امید گردد بمردن زندۂ جاوید گردد

اور پھر غالب کو اپنے ہندو شاگردوں، دوستوں اور ہم وطنوں سے جو محبت

رہی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں بھی جذباتی ہم آہنگی کی شفق پھولی ہوئی

نظر آتی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ سے ان کا اخلاص ضرب المثل رہا، وہ سکندرآباد

ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ غالب سے عمر میں صرف دو سال چھوٹے تھے۔ لیکن

انھوں نے غالب کو اپنا استاد تسلیم کر لیا تھا، پچاس ہزار اشعار کے مالک تھے۔

نام جتنے خطوط ان کے مجموعوں میں کسی اور کے نام نہیں، ان میں غالب

جو کچھ لکھا ہے، اس کے اقتباسات سے ان کی محبت کا اندازہ ہوگا، ان میں ان کو کبھی

مہاراج، کبھی بھائی [illegible] بالتحقیق، کبھی بندہ پرور، صاحب منشی صاحب، جان من

ان تمام ہنگاموں کی تفصیل بیان کرنے میں غالب نے دستنبو میں اچھے ہندوؤں اور سکھوں کا ذکر خیر بڑی فراخ دلی سے کیا ہے، اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ ان میں وطنی رواداری اور وطنی محبت بہت ہی جاگزیں ہوگئی تھی، وہ اس ابتلا و آزمائش کے زمانہ میں پٹیالہ کے مہاراجہ نرندر سنگھ کے بڑے معترف اور ممنون رہے، اور ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا علاقہ ان ہی کی بروقت امداد سے محفوظ رہا، دستنبو میں لکھتے ہیں،

اس ابتلا میں کشائش کی ایک صورت ظہور پذیر ہوئی تفصیل یہ ہے کہ خورشید شکوہ، کیواں جاہ، مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرمانروائے پٹیالہ اس لڑائی میں فاتحین (یعنی انگریزوں) کے ساتھ ہیں، ان کی فوج ابتدا سے انگریزی فوج کی ہمراہی میں ہے، راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان کی سرکار میں بلند رتبہ اور شہر کے ممتاز رئیس ہیں، مثلاً حکیم محمود خاں، حکیم مرتضی خاں، حکیم غلام اللہ خاں، کہ خلد آشیاں حکیم شریف خاں کی اولاد میں ہیں، اس گلی میں رہتے ہیں۔ آستاں در آستاں، اور بام در بام، دور تک ان کی دو رویہ عمارتیں اذ راقم الحروف دس سال سے ان صاحبان ثروت میں سے ایک کا ہمسایہ ہے، ان تین میں سے اول الذکر اہل وعیال کے ساتھ اپنی خاندانی روایت کے مطابق شہر میں عزت مندانہ بسر کرتے ہیں، اور دوسرے دو پٹیالہ میں راجہ کی ہمدمی و ہم نشینی سے بہرہ ور ہیں، چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے از راہ بندہ پروری نبرد آرا زور آزماؤں سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب مساعدت وقت سے ظفریاب ہوں، اس گلی کے دروازے پر محافظ بٹھا دیں، تاکہ انگریز فوجیں جنھیں گورا کہا جاتا ہے، گلی کو نقصان نہ پہنچائیں، ..... تیسرے روز مہاراجہ کے سپاہی آئے،

معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمہاری پختہ ہو گئی، خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔" (مورخہ ۲ نومبر ۱۸۶۲ء، جلد اول ص ۱۹۷)

آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو، یکشنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا، پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ریٹاگن صاحب کے لکھا تھا، پھر خط صاحب نے اب مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا، دونوں دیوان تمہارے اور نشتر عشق اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمہاری بھیجی ہوئی آن پہنچیں، صاحب تم سے بہت خوش اور تمہارے معتقد ہیں، کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو، فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمہارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے، باقی بالخیر شما سلامت۔

تفتہ کو بھی غالب سے بڑی محبت رہی، وہ موقع بموقع ان کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے، ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے میں ان کی ہر طرح خبر گیری کی، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔ غالب کی وفات ہوئی تو ان کی وفات پر یہ قطعہ لکھا، جس میں ان سے ان کی پوری عقیدت و محبت کا اظہار ہے،

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے	ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا و حسن و عشق	چھ لفظ اسکے مرنے ہےہائے یاد سر ہوئے

۱۸۵۷ء کے پر آشوب ہنگامے کے زمانہ میں بڑی نفسا نفسی رہی، پہلے تو ہندو اور مسلمان مل کر انگریزوں سے برسرپیکار رہے، لیکن واقعات کا رخ کچھ ایسا پلٹا کہ ہندو اور مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا، جس سے انگریزوں کو اپنی حکومت پھر سے جمانے میں پوری مدد مل گئی،

اس نیم ویران نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیو جی برہمن بھی ہے
جو ایک جوان، دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے۔ اس درویش دل ریش کو بہت کم
تنہا چھوڑتا ہے، اور اپنی بساط کے بقدر میری فرمانبرداری کرتا اور میرے کام
بناتا ہے۔ اس کا بیٹا بال مکند بھی ایک نیک طینت اور پرہیزگار نوجوان ہے،
اپنے باپ کی طرح میری فرمانبرداری میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔

دور دست دوستوں میں آسمان مہر و مروت کا وہ ماہ کامل شیوا زبان
ہرگوپال تفتہ جو میرا پرانا ہمدم و ہم آواز ہے، اور چونکہ شاعری میں مجھے اپنا
استاد کہتا ہے۔ اس کا کلام جملہ خداداد ہے، مجسم محبت اور سراپا مہربانی،
شاعری اس کے فروغ کا باعث اور اس سے شاعری کا ہنگامہ گرم، فرط محبت
سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے، اور میرزا تفتہ خطاب دیا ہے،
اس نے میرٹھ سے ایک ہنڈی مجھے بھیجی ہے، اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے،
یہ باتیں جن کا بیان لازمی نہیں تھا، میں نے خاص طور پر اس لیے بیان کیں کہ
شکر محبت و انسانیت ادا ہو جائے اور جب یہ داستان دوستوں کے
ہاتھوں میں پہنچے وہ جان لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے، راتوں کو ان لوگوں کے
گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں، اور دن کو دیواروں کے روزن دھوئیں
سے [illegible] غالب شہر آشنا، ہزار دوست [illegible] گیا کوئی دوست اور
ہم نفس [illegible] آشنا ساتھ تھا، اب اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی ہمنوا
اور [illegible] بھی نہیں ..... اگر شہر میں یہ چار دو آدمی نہ ہوتے
تو میرے [illegible] کوئی نہ ہوتا۔"

(دستنبو کا یہ اردو ترجمہ مارچ ۱۹۶۹ء کے رسالہ تحریک سے لیا گیا ہے)

پہرہ بیٹھ گیا اور گلی والوں نے لٹیروں کے گھس آنے کے خوف سے نجات پائی۔"

ہندوؤں میں مہیش داس، ہیرا سنگھ، شیو جی رام برہمن اور مرزا ہرگوپال تفتہ نے سماج اور خود ان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کا ذکر بھی بڑے امتنان و تشکر کے ساتھ کرتے ہیں، لکھتے ہیں:-

میں سخت قلاش، اگر خدا دوست، خداشناس، فیاض اور دریا دل مہیش داس گنگے کی دیسی شراب بھیجکر جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور مہک میں اس سے بڑھ کر ہے، دل کی آگ پر پانی نہ ڈالتا، تو میں زندہ نہ رہ سکتا، اور جگر تشنگی کی شدت سے دم توڑ دیتا...... دانش مند مہیش داس نے مجھے وہ آب حیات بخشا جسے سکندر اپنے لیے ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا اور گیا جب رکھے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس نیک طینت نے شہر کے مسلمانوں کی آبادی کے سلسلہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، چونکہ سرنوشت آسمانی اس کے ساتھ نہ تھی، کام مشکل ہو گیا، ہندوؤں کی آزادی اور آبادی سب جانتے ہیں، کہ مہربان حاکموں کی مہربانی کا نتیجہ ہے، اگرچہ اس خیر پسند خیر گزیں کی خیر خواہی اور کارسازی کو اس انتظام میں دخل رہا ہے، مختصر قصہ ایک نیک بخت آدمی ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والا، ناؤ و نوش کے ساتھ اچھی زندگی گزارنے والا، اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت سے اور کبھی کوئی تحفہ بھیجکر مجھے احسان مند کرتا ہے اور داد مہربانی دیتا ہے۔

میرے دوسرے دوستوں اور شاگردوں میں ایک ہیرا سنگھ ہے، وہ ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے، میرے پاس برابر آتا اور میرا غم غلط کرتا ہے"

آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی، چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے، بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے، ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے، اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی، اور پاس اس کے ایک گھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریے والا کہلاتا تھا، اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پیچ لڑا کرتے تھے۔" (خطوط غالب جلد اول ۔ ص ۵۸-۲۵۷)

ایک اور خط میں غالب ان کو لکھتے ہیں :۔

میاں، میں تم کو اپنا فرزند جانتا ہوں، خط لکھنے نہ لکھنے پر موقوف نہیں ہے، تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔ (جلد اول ص ۲۷۳)

غالب جواہر سنگھ جوہر اور ہیرا سنگھ سے بھی اپنے بچوں کی طرح محبت رکھتے تھے، یہ دونوں سگے بھائی انگریزوں کی حکومت میں تحصیلدار اور نائب تحصیلدار تھے، جواہر سنگھ جوہر فارسی میں اشعار کہکر غالب سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے، ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ (مطابق ۶۱-۱۸۶۰ء) میں ہوا تو غالب نے ان کے لیے حسب ذیل تاریخ وفات کہی :۔

گو بندرے گلچہ ء دل شیریں کلام مرد	دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا دریغ
گفتم کسے زسال وفاتش نشاں دہد	غالب شنید و گفت چہ گویم بما دریغ

۱۲۷۷

غالب نے اپنی ایک رباعی میں بھی ان کا ذکر کیا ہے :

آہنگش وجوہر دو سخنور داریم	شان دگر و شوکت دیگر داریم
در سلکہء پیریم کہ سنگش از ماست	در معرکہء تیغیم کہ جوہر داریم

غالب منشی شیو نرائن آرام کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ آگرہ کے ممتاز خاندان کے ایک فرد تھے۔ ان کے پردادا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کے ساتھی تھے، ان کے دادا منشی بنسی دھر غالب کے دوستوں میں تھے۔ ان کے والد منشی نند لال بھی با رسوخ آدمی تھے۔ غالب نے ان خاندانی تعلقات کا لحاظ بہت اچھی طرح کیا۔ منشی شیو نرائن آرام نے آگرہ میں ایک مطبع کھول رکھا تھا۔ ان سے خط و کتابت کرتے وقت غالب ان کو مہاراج، نور بصر، لخت جگر، برخوردار، اقبال نشان، برخوردار کامگار، میری جان وغیرہ لکھتے ہیں۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

"برخوردار، منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو، جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو، اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار، تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم، مجھ سے سنو۔

تمھارے دادا کے والد عہد نجف خان و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور کہیں نوکری نہ کی، یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں، میں اور وہ ہم عمر تھے شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت

ساتھ ہو گئے، لفٹنٹ گورنر نے غالب سے پوچھا کہ کیا یہ آپ کا لڑکا ہے، غالب نے جواب دیا نہیں مگر لڑکے سے زیادہ ہے۔ (خطوط غالب جلد دوم ص ۱۹ - ۳۱۸)

غالب کے ہندو دوستوں میں ہرگوبند سنگھ، رائے امید سنگھ، بلوان سنگھ، بال مکند، گوبند سہائے، منشی نولکشور، اور خدا جانے کتنے اور تھے، ان سب کا ذکر اپنے خطوط میں بہت ہی محبت و شفقت سے کرتے ہیں،

غالب نے اپنی رواداری، بے تعصبی اور اپنے ہندو دوستوں اور شاگردوں سے محبت و اخلاص کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں آج ہزاروں غالب اور ان کے ساتھ لاکھوں ہرگوپال تفتہ شیونرائن آرام، ہیرا سنگھ، جواہر سنگھ اور پیارے لال آشوب پیدا ہو جائیں تو پھر اس ملک میں بھی وہی جذبۂ باہمی ہم آہنگی، وہی باہمی اتحاد، وہی مکمل یگانگت اور وہی وطنی موانست پیدا ہو جائے، جس سے ملک آگے اور بہت آگے بڑھتا رہتا ہے۔

قاطع برہان کے تنازعہ میں جوہر غالب کے ساتھ تھے، جب یہ کتاب لکھی گئی تو اسکی تاریخ اس طرح کہی

این نسخہ کہ غالباً چو او دیگر نیست | تالیف حریف غالب دوران ہست
جوہر این گفت سال طبعش طبعم | زیبا فرہنگ قاطع برہان ہست

اوپر ذکر آیا ہے کہ غدر کے ہنگامہ میں ہیرا سنگھ غالب کے ساتھ سایہ بن کر رہے، دہلی کے منشی بہاری لال مشتاق (المتوفی ۱۹۰۸ء) سے بھی غالب کو بڑا لگاؤ رہا، غالب ان کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

مجھکو تم سے جو محبت ہے اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تمھارے خال فرخ فال مکند لال میرے بڑے پرانے یار ہیں، خوش خو، شگفتہ رو، بذلہ گو، دوسرے تمھاری سعادتمندی اور خوبی اور حلم اور بقدر حال علم، اردو نظم و نثر میں تمھاری طبع کی روانی اور تمھارے قلم کی گل فشانی، مگر چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے، یہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں، میں تم کو جا بجا آگاہ کرتا رہتا ہوں۔" (جلد دوم ص ۳۳۷)

رائے بہادر پیارے لال آشوب کو بھی غالب بہت عزیز رکھتے تھے، انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی، محکمۂ تعلیم کے اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے، ۱۸۶۶ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ نے دہلی میں دربار کیا، تو غالب کا آخری زمانہ تھا، بہت بوڑھے ہو چکے تھے، اس میں رائے بہادر پیارے لال آشوب بھی غالب کے پاس ہی بیٹھے تھے، غالب لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کے لیے اٹھے تو رائے بہادر سہارا دینے کیلئے

صوفی ابوالحسین بن ابی علی الکازرونی (المتوفی ۳۵۳ھ) کے نام لائقِ ذکر ہیں[۱]، علامہ مجدالدین بھی اسی معدن کے گوہر آبدار تھے،

تحصیلِ علم علامہ فیروز آبادی نے اپنے مولد کازرون ہی میں نشو و نما پائی اور وہیں تحصیلِ علم کا آغاز کیا، اس وقت کے عام دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا صرف سات سال کی عمر میں اس دولت سے بہرہ ور ہوئے، پھر شیراز منتقل ہو گئے، اور وہاں اپنے والد بزرگوار کے علاوہ عبداللہ بن محمود بن النجم اور ابو عبداللہ محمد بن یوسف الانصاری وغیرہ شیراز کے دوسرے اہل علم سے حدیث، ادب اور لغت کی تعلیم حاصل کی،

تحصیلِ علم میں ان کے انہماک کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صحیح بخاری کا سماع انھوں نے علامہ زرندی، علامہ تبریزی، فارقی، شیخ عز بن الحموی، مسعودی، قلقشندی اور حافظ علائی سات شیوخ سے کیا، اول الذکر سے سماع بخاری کے علاوہ جامع ترمذی کو بھی سبقاً سبقاً پڑھا، ناصرالدین محمد بن ابی القاسم الفارقی سے رمضان ۵۵ھ تک جامع ازہر میں صحیح بخاری کی سماعت کی، صحیح مسلم کو بیت المقدس میں علامہ بیانی سے ہا نشستوں میں اور امام محمد بن جہبل سے دمشق میں تین روز میں پڑھا، انکے علاوہ ابن الخباز، عز بن جماعۃ، نجم عبدالرحیم البارزی، محمد بن عبدالہادی سے بھی مسلم کا سماع کیا، سنن ابی داؤد کو ابو حفص عمر بن عثمان … ابو … محمد سے سنا، سنن ابن ماجہ کی سماعت بعلبک میں ابوالفضائل عبدالملک عبدالرحیم اور عز بن مظفر سے کی[۲]،

علمی سفر انھوں نے تحصیلِ علم کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا، سب سے پہلے عراق کا قصد کیا،

---

[۱] … ج، ص ۲۰۶ [۲] الضوء اللامع ج ۱ ص ۸۰ - ۸۱

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

(۵)

علامہ فیروز آبادی صاحب القاموس

نام ونسب | محمد نام، ابو طاہر کنیت اور مجد الدین لقب تھا، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے:
محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ بن الشیخ ابی اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف بن عبداللہ بن السراج ابی یوسف بن الصدر ابی اسحاق بن الحسام بن السراج[۱] فیروز آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، یہ مقام شیراز کا ایک نواحی قریہ ہے، جسے شاہ فارس فیروز نے بسایا تھا[۲]، علامہ مجد الدین کے آباء واجداد وہیں کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کو بھی اسی طرف منسوب کیا جاتا ہے، ورنہ انکی پیدائش کازرون نامی ایک دوسرے شہر میں ہوئی تھی،

ولادت | ماہ ربیع الآخر ۷۲۹ھ میں کازرون میں متولد ہوئے[۳]، جو شہر بحرین اور شیراز کے درمیان واقع ہے، جسے عضد الدولہ بن بویہ نے بسایا تھا، اس کی مردم خیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل علم کی ایک بڑی جماعت کو اس کی طرف انتساب کا شرف حاصل ہے، متاخرین علماء میں ابو العباس احمد بن منصور کازرونی (المتوفی ۵۸۶ھ) اور

---

[۱] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷، البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰ [۲] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۲ [۳] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۷۹

ابی سعید العلائی، محمد بن احمد بن عبد المعطی، ابو حفص عمر بن عثمان، ابو اسحٰق ابراہیم محمد، ابو محمد بن البارزی، ابو الفضائل عبد الکریم، عمر بن المظفر، حمزہ بن محمد[1]

انھوں نے اگرچہ کسی مقام پر مستقل مجلس درس آراستہ نہیں کی، اور علم کی تشنگی نے عمر بھر جہاں گردی میں مصروف رکھا، لیکن ان کی علمی جلالت کی بنا پر جہاں کہیں ہوگئے وارفتگان علم اس کے گرد جمع ہوگئے، اور ان سے مستفیض ہوئے، علامہ شوکانی رقمطراز ہیں :-

کثر الآخذون عنه وتلمذ	ان سے تحصیل علم کرنے والوں کی تعداد
له جماعة من الاكابر[2]	بکثرت ہے، اکابر علما بھی ان کے حلقۂ
	تلامذہ میں داخل ہیں،

اس بیان سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد کثرت ہے، لیکن تلامذہ کی تعداد کا کہیں ذکر نہیں ملتا، صرف ذیل کے چند نام منتشر طور پر ملتے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی، تقی الفاسی مقریزی، صلاح الصفدی، جمال بن ظہیرہ اور برہان الحلبی۔

لغت یوں تو انھیں تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ تمام ہی علوم میں کامل دسترس تھی، لیکن فن لغت سے ابتدا ہی سے خصوصی شغف رکھتے تھے، اور آٹھ سال کی عمر سے اس کے حصول میں غیر معمولی محنت شروع کردی تھی، اور اس ... کمال پیدا کیا کہ ادیب اور ... ن کے نام کا جزو بن گئے، فاسی کا بیان ہے :

تحصیل فی فنون من العلم	انھوں نے مختلف علوم و فنون کی تحصیل

---

[1] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۷۹　[2] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰

اور واسط میں احمد بن علی الدیوزی سے قرأت عشرہ میں مہارت پیدا کی، پھر بغداد گئے اور وہاں تاج محمد بن السباک اور عمر بن علی القزوینی، محمد بن العاقولی، نصر اللہ بن محمد الکتبی اور قاضی بغداد عبد اللہ بن بکتاش سے کسب فیض کیا، علامہ قزوینی سے صحیح بخاری کے سماع کے علاوہ صغانی کی مشارق الانوار بھی پڑھی۔

اس کے بعد ۷۵۰ھ میں دمشق آئے اور یہاں کے سو سے زیادہ شیوخ سے تحصیل کی، پھر حماۃ، حلب اور قدس کا سفر کیا، قدس میں تقریباً بیس سال تک افادہ و استفادہ میں مشغول رہے، پھر غزہ و رملہ ہوتے ہوئے سرزمین قاہرہ میں قدم رکھا اور وہاں کے کبار علماء سے اپنے ذہن و دماغ کو مالا مال کرنے کے بعد یمن، روم اور ہندوستان کے بھی علمی سفر کیے[1]

اساتذہ اوپر تفصیل سے معلوم ہو چکا کہ علامہ فیروز آبادی نے شیراز کے علاوہ مختلف ممالک کے ائمۂ فن کے خرمن فضل و کمال سے خوشہ چینی کی تھی، اس لیے ان کے اساتذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ممتاز اور نمایاں شیوخ میں لائق ذکر نام یہ ہیں:

عبد اللہ بن محمود بن النجم، محمد بن یوسف الزرندی، احمد بن علی الدیوانی، تاج محمد السباک، عمر بن علی القزوینی، محمد بن العاقولی، نصر اللہ بن محمد الکتبی، عبد اللہ بن بکتاش، تقی السبکی، ابن الخباز، ابن القیم، محمد بن اسمٰعیل الحموی، احمد بن عبد الرحمن المرداوی، احمد بن مظفر النابلسی، یحییٰ بن علی الحنفی، بہار بن عقیل، جمال الاسنوی، ابن ہشام، عز بن جماعہ، مظفر العطار، ناصر الدین التونسی، ناصر الدین الفارقی، ابن نباتہ، احمد بن محمد الجزائری، خلیل المالکی، تقی الحرازی، نور الدین القسطلانی، نجیب الحرانی، ابن عبد الدائم، شرف الدمیاطی، اسماعیل القلقشندی،

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰

فاسی کہتے ہیں :

وله شعر کثیر و نثره اعلیٰ[ا] ان کے بکثرت اشعار ہیں، انکی نثر بھی عمدہ ہوتی تھی،

علامہ شوکانی اور حافظ سخاوی نے سلطان اشرف کے نام ان کا ایک مکتوب نقل کیا ہے، جو ان کے بلند ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے[۲]

منصب قضا | ایک مرتبہ علمی سیاحت کے دوران میں وہ رمضان ۷۹۶ھ میں یمن کے مشہور شہر زبید پہنچے، اس زمانہ میں یہاں کے قاضی القضاۃ جمال الریمی شارح التنبیہ کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے سلطان اشرف اسمٰعیل نے علامہ فیروز آبادی کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑے اعزاز و اکرام سے ان کو زبید میں رکھا، اور ایک ہزار دینار عطا کیے، پھر ایک سال دو مہینہ کے بعد ۷۹۷ھ میں انھیں پورے یمن کا قاضی مقرر کیا، اور وہ تا حیات وہاں اس منصب پر فائز رہے، اس طویل مدت میں انھوں نے سلطان اشرف کے بعد اس کے لڑکے سلطان ناصر کا عہد حکومت بھی دیکھا۔[۳]

سلاطین وقت سے روابط | ان کی علمی جلالت کا سکہ امراء و سلاطین کے دلوں پر بھی نقش تھا، وہ جس ملک میں بھی پہنچے، وہاں کے حاکم نے انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے ملک میں ان کا قیام مایۂ افتخار تصور کیا، حافظ سخاوی رقمطراز ہیں :-

ولم يتفق له قط انه دخل بلداً الا واكرمه متوليها وبالغ[۴] جس شہر میں بھی وہ گئے وہاں کے حاکم نے ان کا غایت درجہ اکرام و اعزاز کیا۔

اس لیے بہت سے امراء و سلاطین سے ان کے روابط رہے، علامہ شوکانی کا

[ا] روضات الجنات ج ۸ ص ۲۰۸-۲۰۰ [۲] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱ [۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷،
[۴] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۰

سیما اللغة فلہ فیہا الید الطولی والف فیہا توالیف حسنة[1]

کی تھی، بالخصوص لغت میں وہ ید طولی رکھتے تھے، اس میں انھوں نے بہترین کتابیں تالیف کیں۔

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :۔

نظر فی اللغة وکانت جل قصدہ فی التحصیل فمہر فیہا الی ان بہر وفات[2]

لغت میں انھوں نے خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا اور اس میں انتی مہارت پیدا کی کہ سب سے گوئے سبقت لے گئے۔

طاش کبری زادہ لکھتے ہیں :۔

امام عصرہ فی اللغة .....

وہ لغت میں امام دوراں تھے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

اما معرفتہ باللغة واطلاعہ علی نوادرھا نامرہ مستفیض[3]

لغت میں انکی معرفت اور اسکے نوادر و نکات سے انکی واقفیت مشہور ہے۔

ذوق شعر و سخن | ادب و لغت سے شغف کا نتیجہ تھا کہ وہ شعر و سخن کا بھی نکھرا ذوق رکھتے تھے نثر بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی لکھتے تھے، ان کی بعض نگارشات ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہیں، تقی الدین الکرمانی کا بیان ہے کہ

الشیخ مجد الدین الفیروزآبادی عدیم النظیر فی زمانہ نظماً ونثراً بالفارسی والعربی

شیخ مجد الدین فیروزآبادی اپنے زمانہ میں فارسی و عربی نظم و نثر میں عدیم النظیر تھے۔

---

[1] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۰ [2] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷ [3] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۳ و ۱۰۴

اشتریت بخمسین الف مثقال ذھبا کتبا[1] — میں نے کتابوں کی خریداری پر پچاس ہزار مثقال سونا صرف کیا،

ان کو مطالعہ سے اتنا شغف تھا کہ سفر میں بھی متعدد اونٹوں پر کتابیں بار کر کے ساتھ لیجاتے تھے، اور جہاں پڑاؤ ہوتا، نکال کر مطالعہ کرتے، کتابوں کی خریداری اور حاجتمندوں کی حاجت برآری میں وہ اس قدر صرف کرتے تھے کہ بعض اوقات اپنی ضرورت کے لیے کتابوں کو فروخت کرنے کی نوبت آجاتی تھی اس فیاضی کا نتیجہ یہ تھا کہ وفات کے وقت انھوں نے کوئی اندوختہ نہ چھوڑا، سخاوی کا بیان ہے:

كان اذا سافر لا وصحبته منها عدة احمال كتب ويخرج اكثرها فی كل منزل فينظر فيها ثم يعيدها اذا ارتحل وكذا كانت له دنيا طائلة ولكنه كان يد فعها الى من يحقها بالاسراف فی صرفها بحيث يملق احيانا ويحتاج لبيع بعض كتبه فلذلك لم يوجد له بعد وفاته ما كان يظن به[2]

وہ جب بھی سفر کرتے متعدد بار شتر کتابیں ساتھ لیجاتے اور جہاں منزل ہوتی ان کو نکال کر پڑھتے اور روانگی کے وقت پھر اسی میں رکھدیتے، انھیں بکثرت دولت دنیا ملی لیکن انھوں نے اس کو اس اسراف سے صرف کیا کہ کبھی کبھی ان کو اتنی تنگی ہوجاتی تھی کہ بعض کتابوں کے بیچنے تک نوبت آجاتی تھی، اسی لیے ان کی وفات کے بعد کوئی قابل ذکر اندوختہ نہیں ملا،

طاش کبری زادہ لکھتے ہیں:

حصل له دنيا طائلة ومع ذلك — انھیں بہت زیادہ دولت دنیا ملی، اسکے

---

[1] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۷۹ [2] ایضاً ج ۱۰ ص ۸۱

بیان ہے "کان مقبولاً عند السلاطین"[1] شاہ منصور بن شجاع والی تبریز، سلطان فرج والی مصر، ابن عثمان شاہ روم، احمد بن اویس حاکم بغداد، سلطان اشرف والی یمن، اور تیمور لنگ وغیرہ نے ان کو وقتاً فوقتاً بیش قیمت نذرانے و تحایف پیش کیے، سلطان اشرف نے ان کا اتنا اعزاز کیا کہ ان کو یمن کا قاضی القضاۃ بنانے کے علاوہ ان کی صاحبزادی سے شادی کر کے ان سے عزیزانہ تعلق بھی پیدا کر لیا،

مالی خوشحالی طاش کبری زادہ کا بیان ہے کہ فیروز آبادی روم گئے تو وہاں کے حکمران ابن عثمان نے ان کو بہت سا مال دیا[2] علامہ سیوطی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ فیروز آبادی نے ملک اسماعیل کے لیے ایک کتاب لکھی، اور اس کو طباق میں رکھ کر بادشاہ کو پیش کیا، اس نے وہ طباق سونے سے بھر دیا[3] صاحب روضات رقمطراز ہیں کہ

اجتمع بتیمور لنك فعظمه	وہ تیمور لنگ سے ملے تو اس نے ان کا
وانعم علیه بمائة الف درهم[4]	اکرام کرنے کے ساتھ ایک لاکھ درہم بھی دیے

سلاطین و امرا کی اس داد و دہش سے ان کو ہمیشہ بڑی فراغت حاصل رہی،

کتابوں سے شغف اس دولت کا بڑا حصہ وہ اپنے تعیش کے بجائے کتابوں کی خریداری پر صرف کرتے تھے، علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

ووصل الیه من عطایا هم شیئ کثیر فاقتنی من ذلك کتبا نفیسة[5]	امراء سے ان کو بہت عطیے ملے انھوں نے اس سے قیمتی کتابیں خرید لیں۔

ان کا خود بیان ہے۔

---

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱، [2] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۴، [3] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷، [4] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۸، [5] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱

بضع واربعون مصنفاً   زائد شمار کی گئی ہیں،

جن کتابوں کے نام مل سکے وہ حسب ذیل ہیں:

اللامع المعلم العجاب، القاموس المحیط، فتح الباری، لطائف ذوی التمییز (کئی جلد)
[مقا]ییس (چار جلد) تیسیر فاتحۃ الایاب فی تفسیر فاتحۃ الکتاب، الدر النظیم، حاصل
[...]ۃ الخلاص فی فضائل سورۃ الاخلاص، تحبیۃ الخشاف فی شرح خطبۃ الکشاف، شوارق
[...]علیہ فی شرح مشارق الانوار، عمدۃ الحکام، امتضاض السهاد فی افتراض الجهاد،
[...]اسعاد بالاصعاد (تین جلد) المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ، البلغۃ فی تراجم ائمۃ النحو
واللغۃ (اس کا ۱۲۹۲ھ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے، تعداد
صفحات ۶۰) الفضل الوفی فی عدل الاشرفی، نزہۃ الاذہان فی تاریخ اصبہان، تسہیل
طریق الوصول فی الاحادیث الزائدۃ علی جامع الاصول، الاحادیث الضعیفہ، الدر
الغالی فی الاحادیث العوالی، سفر السعادۃ، المتفق وضعاً والمختلف صقعاً، المقصود
لذوی الالباب، تحبیر الموشین، المثلث الکبیر (پانچ جلد) الروض المسلوب،
النفحۃ العنبریہ فی مولد خیر البریہ، روضۃ الناظر فی ترجمۃ الشیخ عبدالقادر، منیۃ السول
فی دعوات الرسول، الدرر المبثثۃ فی الغرر المثلثۃ، بلاغ التلقین، اسماء السراح
فی اسماء النکاح، اسماء الغادہ فی اسماء العادہ، الجلیس الانیس فی اسماء الخندریس،
انواء الغیث فی اسماء اللیث۔

ان میں سے بیشتر کتابیں غیر مطبوعہ اور معدوم ہیں، مشہور تصانیف کا تعارف
ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

۱۔ اللامع المعلم العجاب الجامع المحکم والعباب۔ یہ فن لغت میں ان کی سب سے مبسوط

انه کان قلیل المال لسعة نفقته[1]　　باوجود مصارف کی کثرت کی وجہ سے ان کے پاس بہت کم رہتا تھا۔

سرعت کتابت اور قوت حافظہ حافظہ نہایت قوی تھا، عمدہ اشعار بکثرت یاد تھے، بہت خوش خط اور سریع القلم تھے، روزانہ شب میں سونے سے قبل دو سو سطریں زبانی یاد کرنا ان کا معمول تھا، حافظ سیوطی نقل کرتے ہیں کہ

کان یقول ماکنت انام حتی احفظ مائتی سطر[2]　　وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک میں دو سو سطریں حفظ نہیں کر لیتا سوتا نہیں۔

مکہ سے والہانہ تعلق مکہ مکرمہ سے انھیں بڑا قلبی لگاؤ تھا، اس مبارک سرزمین کی کشش انھیں بار بار اپنی طرف کھینچتی رہی، پہلی مرتبہ ۷۷۰ھ میں اور دوسری بار ۷۷۷ھ میں مکہ گئے، اس مرتبہ ۵۔۶ سال مسلسل قیام رہا، پھر متعدد مرتبہ اس کی زیارت اور طویل مدت تک قیام کی سعادت حاصل کی، مکہ سے ان کو اتنا عشق تھا کہ عمر بھر اسی سرزمین میں جان دینے کی تمنا کرتے رہے، لیکن خدا کی مشیت کچھ اور تھی، اس لیے زبید کی خاک کا پیوند ہوئے۔

وفات نصف صدی سے زیادہ ضیا باری کے بعد علم و دانش کا یہ آفتاب ۲۰ شوال ۸۱۷ھ کو بمقام زبید غروب ہوا، وفات کے وقت ۹۰ سال سے زائد عمر ہو چکی تھی، شیخ اسماعیل الجبرتی کی تربت کے قریب دفن ہوئے[3]۔

تصانیف ان کی تصانیف کی تعداد چالیس سے زیادہ بیان کی جاتی ہے، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ اور لغت ہر فن کی کتابیں شامل ہیں، طاش کبری زادہ رقمطراز ہیں:

ومصنفاته کثیرة وقد عد منها　　ان کی تصنیفات کثرت ہیں، چالیس

---

[1] مفتاح السعادة ج ۱ ص ۱۰۴، [2] بغیة الوعاة ص ۱۱۷، [3] ایضاً ص ۱۱۸

العجاب الجامع بين المحكم	کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی ....
والعباب وهما غرتا الكتب	مگر وہ ساٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی ،
المصنفة في هذا الباب	جس کی تحصیل طلبہ کے لیے بڑی دشوار
غير اني ختمته في ستين سفراً	طلب تھی ، اس لیے مجھ سے اسی قسم کی
يعجز تحصيله الطلاب سئلت	ایک مختصر کتاب لکھنے کی خواہش کی گئی
تقديم كتاب وجيز على ذلك	..... چنانچہ میں نے یہ کتاب تالیف
النظام ..... فالفت هذا الكتاب	کی جس میں شواہد و زوائد حذف
محذوف الشواهد ومطروح	کر دیے گئے ہیں ..... میں نے مذکورہ
الزوائد ..... ولخصت كل	کتاب کے تیس حصوں کی ایک حصہ
ثلاثين سفراً في سفر	میں تلخیص کر دی ، .... اور اسکا
وسميته القاموس المحيط	نام القاموس المحيط رکھا ، اس لیے کہ
لانه البحر الاعظم[1]	وہ ایک سمندر بے پایاں ہے ۔
تقی الکرمانی کا بیان ہے کہ	
صنف القاموس مطولا في	انھوں نے متعدد جلدوں میں مطول
مجلدات عديدة ثم امره	قاموس تصنیف کی ، پھر میرے والد نے
والدي باختصاره فاختصره	ان کو اسکی تلخیص کا حکم دیا ، چنانچہ ایک
في مجلد ضخم وفيه فوائد	ضخیم جلد میں انھوں نے اس کا خلاصہ
عظيمة وفوائد كريمة و	کیا ، اس میں بہت ہی نوادر فوائد

---

[1] القاموس مطبوعہ نولکشور جلد اول ص ۲

اور ضخیم تصنیف ہے وہ اس کتاب کو سو جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اور ہر جلد ضخامت میں صحاح جوہری کے برابر پیش نظر تھی، لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی سخاوی کا بیان ہے کہ "میں نے اس کتاب کی پانچ جلدیں مصنف کے خط کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔"[۱] یہ کتاب ۶۰ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی[۲] جیسا کہ القاموس کے آغاز میں خود مصنف نے تصریح کی ہے،

۲- **القاموس المحیط**۔ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ، یہ کتاب علامہ فیروزآبادی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس نے انھیں تاریخ میں لازوال شہرت عطا کی ہے، اور صاحب **القاموس** ان کے نام کا جزو ہوگیا، اسکی تکمیل مکہ میں کوہ صفا پر کی تھی، جیسا کہ کتاب کے آخر میں مصنف نے خود لکھا ہے،

قد یسّر اللہ اتمامہ علی	اللہ تعالیٰ نے اس کی تکمیل مکہ میں کعبہ
الصفا بمکۃ المشرفۃ تجاہ	کے سامنے کوہ صفا پر کرنے کی توفیق
الکعبۃ المعظمۃ[۳]	عطا فرمائی۔

یہ کتاب درحقیقت اللامع المعلم العجاب کی تلخیص ہے، اس کے سبب تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

کنت برھۃ من الدھر التمس	میں ایک زمانہ تک ایک جامع و مبسوط
کتابا جامعا بسیطا	کتاب کی تلاش میں رہا ..... اور جب
ولما اعیانی الطلاب شرعت	طلب نے بیحد اصرار کیا تو میں اللامع المعلم
فی کتاب الموسوم باللامع المعلم	العجاب الجامع بین المحکم والعباب کے

---

[۱] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۲ [۲] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۴ [۳] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۴۶۰

اس کا پہلا اڈیشن کلکتہ سے لیتھو میں ۱۲۳۰ھ سے ۱۲۳۲ھ تک چار حصوں میں شائع ہوا، اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۹۰۸ ہے، اس اڈیشن کے شروع میں انگریزی میں ایک مقدمہ اور عربی میں مولف کے حالات وغیرہ بھی ہیں، دوسرا اڈیشن ٹائپ میں بمبئی سے ۱۸۴۴ء میں اور پھر لکھنؤ سے ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا، مصر میں جزو دوم کا پہلا اڈیشن ۱۲۷۲ھ میں چھپا، جس کی ابتدا میں چار صفحات شیخ نصر الہورینی کی معرفۃ اصطلاح القاموس کے بھی ہیں، جزو چہارم مطبعہ بحریہ قسطنطنیہ سے بھی ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوا، جو ۹۱۵ صفحات پر مشتمل ہے، القاموس کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہوا جو قسطنطنیہ سے ۱۲۳۰ھ میں اور بولاق مصر سے ۱۲۵۰ھ میں شائع ہوا،[۱]

خصوصیات و نقائص | القاموس کی شہرت و مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج بھی جبکہ عربی معاجم میں گرانقدر اضافہ ہو چکا ہے، اسے مستند ترین لغت شمار کیا جاتا ہے۔

اس سے قبل امام جوہری (المتوفی ۳۹۳ھ) کی شہرۂ آفاق الصحاح فی اللغۃ کا سکہ دنیائے علم میں رواں تھا، لیکن علامہ فیروز آبادی نے القاموس کے ذریعہ اسکو ختم کر دیا، انھوں نے صحاح کی طرف لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی توجہ کو بجا قرار دیتے ہوئے اسکی تعریف کی ہے، لیکن اس کے نقائص اور فرو گذاشتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، خود فیروز آبادی کے الفاظ میں صحاح جوہری کی خامیاں یہ ہیں: "انه فاته نصف اللغة اواکثر امابا همال المادة او بترک المعانی الغریبة المادة۔"

جوہری نے جہاں کہیں جادۂ صواب سے انحراف کیا ہے، فیروز آبادی نے اس کو شواہد سے واضح کیا اور اس پر تنبہ دلایا ہے، اس کے باوجود علمی بحثوں اور ان پر اعتراضات

[۱] معجم المطبوعات ج ۲ ک ۱۴۷۱

اعتراضات علی الجوھری[1] | اور جوہری پر اعتراضات ہیں

علامہ شوکانی رقمطراز ہیں :-

ھو کتاب لیس لہ نظیر وقد انتفع بہ الناس ولم یلتفتوا بعدہ الی غیرہ[2]	وہ ایک بے نظیر کتاب ہے، لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، اور اس کے بعد پھر کسی کتاب کی طرف التفات نہ کیا۔

صاحب روضات کا بیان ہے :

قد سارت الرکبان بتصانیفہ سیما القاموس فانہ اعطی قبولاً حسناً[3]	ان کی تصانیف تمام دنیا میں پھیل گئیں، بالخصوص قاموس کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں :

ھو عدیم النظیر و مقصود ذوی الالباب فی علم الاعراب[4]	وہ عدیم النظیر کتاب ہے، اور اہل خرد علم اعراب میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تقی الدین الفاسی بیان کرتے ہیں :

الف فی اللغۃ توالیف حسنۃ منھا القاموس ولا نظیر لہ فی کتب اللغۃ لکثرۃ ما حواہ من الزیادات علی الکتب المعتمد کالصحاح[5]	انھوں نے فن لغت میں بہت اچھی کتابیں تالیف کیں، انہی میں القاموس ہے جس کی نظیر معاجم میں مفقود ہے، کیونکہ اس میں لغت کی دوسری معتبر و مستند کتابوں مثلاً صحاح وغیرہ پر بہت سے اضافے اور زیادات ہیں۔

---

[1] الضوء اللامع ۱۰ ص ۸۲ [2] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۳ [3] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۸
[4] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۲ [5] ایضاً ص ۸۴

نہیں قرار دیا جا سکتا، علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ میں نے القاموس کے مطالعہ کے دوران میں اس کی بہت سی فروگذاشتوں اور نقائص کو محسوس کیا، اور ان کو تتمہ کے طور پر ایک مستقل جلد میں یکجا کرنے کا ارادہ کیا، قاضی ادریس بن محمد المعروف بوسیی (۱۰۳۰ھ) نے جوہری پر فیروز آبادی کے اعتراضات کے جوابات مرج البحرین کے نام سے ایک کتاب میں جمع کیے ہیں، شیخ داؤد زادہ (المتوفی ۱۰۱۷ھ) نے بھی در اللقیط فی اغلاط القاموس المحیط کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، اس میں بھی صحاح پر کیے گئے اعتراضات پر بحث اور کچھ اضافہ ہے[1]،

حافظ سخاوی فرماتے ہیں :

تعرض فیہ لاکثر الفاظ الحدیث	اس میں مصنف نے حدیث و روایت
والروایۃ ووقع لہ خطأ	کے اکثر الفاظ سے تعرض کیا ہے، لیکن بہت سے
فی ضبط کثیر من الرواۃ[2]	رواۃ کے ضبط میں اس سے غلطی ہو گئی ہے

تقی الفاسی ذیل التقیید میں لکھتے ہیں :

"علامہ فیروز آبادی نے حدیث میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے اسانید و رواۃ کے سلسلہ میں بہت جگہ لغزشیں کی ہیں[3]"

القاموس کا سب سے مستند نسخہ القاموس ۸۱۳ھ میں لکھی گئی، اس کا مستند ترین نسخہ وہ ہے جس کی قرأت فیروز آبادی کے سامنے سب سے آخر میں ہوئی، وہ بہت سے ایسے اضافوں اور ترمیمات پر مشتمل ہے، جس سے دوسرے نسخے خالی ہیں، اس کے آخری نسخہ کو علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے اس نسخہ سے بھی بہتر قرار دیا جاتا ہے، جو چار جلدوں میں مدرسہ باسطیہ مصر

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۴ [2] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۴ [3] ایضاً

میں کتاب کو جوہری پر طعن وطنز سے داغدار نہیں ہونے دیا ہے، لغت کی دوسری کتابوں میں صحاح جوہری کے نقد کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنے کے سلسلہ میں بیان کرتے ہیں،

اختصصت کتاب الجوھری	میں نے لغت کی دوسری کتابوں میں
من بین الکتب اللغویۃ مع	صحاح کا اس لیے انتخاب کیا کہ اس میں
ما فی غالبھا من الاوھام	بہت سے واضح اوہام ہیں اور اسکے
الواضحۃ لتداولہ واشتھارہ	نصوص و نقول پر مدرسین کو بڑا اعتماد
بخصوصہ واعتماد المدرسین	ہے، اور وہ بہت متداول و مشہور
علی نقولہ ونصوصہ[1]	ہے،

القاموس میں صحاح پر اضافے اور زیادات اس قدر کثرت سے ہیں کہ اگر انھیں علیحدہ کیا جائے تو صحاح جیسی ضخیم ایک جلد تیار ہو سکتی ہے، اس کی عبارت کی روانی و صفائی اور اسلوب کی شگفتگی و دل آویزی فیروزآبادی کے اعلیٰ ادبی ذوق کا ثبوت ہے، علامہ مرتضیٰ زبیدی رقمطراز ہیں

کتاب القاموس للامام مجدالدین	امام مجدالدین الشیرازی کی کتاب
الشیرازی اجل ما الف فی	القاموس فن لغت کی کتابوں میں
ھذا الفن لاشتمالہ علی کل	بہت اہم کتاب ہے، اس میں فصیح و
مستحسن من قصاری فصاحۃ	بلیغ عربی زبان کی تمام خوبیاں موجود
العرب العرباء[2]	ہیں۔

ان خصوصیات و محاسن کے باوجود اس کتاب کو بشری خامیوں سے بالکل مبرا

---

[1] القاموس ص ۲ وکشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۳ [2] تاج العروس ج ۱ ص ۲

۔۔۔ گوشہ گیر ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ۱۲۰۵ھ میں مرض طاعون میں وفات پائی۔[1]

تاج العروس کا پہلا اڈیشن ۱۲۸۶ھ میں مطبع وہبیہ مصر سے شائع ہوا، مگر اس کی صرف پانچ ہی جلدیں اس وقت طبع ہو سکیں، پھر ۱۳۰۶ھ میں مطبعہ خیریہ مصر نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا، اور کامل دس جلدوں میں نہایت اہتمام سے اس کو شائع کیا، یہی اڈیشن اب عام و مشہور و مقبول ہے، اس کے شروع میں دس ابواب پر مشتمل علامہ زبیدی کا ایک نہایت مفید مبسوط مقدمہ ہے، جس میں فن لغت، نحویین اور انکے طبقات اور فیروزآبادی کے سوانح حیات وغیرہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ منح الباری بالسیح الفسیح الجاری۔ یہ صحیح بخاری کی شرح ہے، اسے مصنف چالیس جلدوں میں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن صرف بیس[2] ہی جلدیں لکھی جا سکیں اور وہ بھی باب العبادات کے چوتھائی تک ہے، اور اب معدوم ہے، مگر بقول تقی الفاسی علامہ فیروزآبادی کو حدیث اور اس کے متعلقات میں پوری مہارت نہ تھی، اس لیے وہ منح الباری میں شرح کا پورا حق ادا نہ کر سکے، حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ:

اما شرحہ علی البخاری فقد ملأہ بغرائب المنقولات[3]	انھوں نے اپنی شرح بخاری کو عجیب و غریب باتوں سے بھر دیا ہے

حافظ ابن حجر عسقلانی نے جنھیں فیروزآبادی سے خاص تلمذ حاصل تھا، بخاری کی مشہور عالم شرح فتح الباری کے نام سے لکھی، صاحب روضات کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ نام اپنے شیخ کی منح الباری سے اخذ کیا ہے،

اخذ من اسم شرح الفیروزآبادی علی الصحیح المذکور[4]	ابن حجر نے یہ نام فیروزآبادی کی شرح بخاری سے اخذ کیا ہے۔

---

[1] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۷۲۰، [2] الخطط الجدیدۃ ج ۳ ص ۹۵، [3] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۲، [4] روضات الجنات ج ۴ ص ۹۴

میں محفوظ ہے۔[1]

شروح وحواشی القاموس کی بکثرت شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس ہے، جو دس جلدوں میں ہے، قاموس کا خطبۂ افتتاحیہ اپنی جامعیت اور معنویت میں ضرب المثل ہے، اس لیے بہت سے علماء نے اس کی بھی شرحیں لکھی ہیں، ان میں محب بن شحنہ، قاضی ابی روح عیسیٰ بن عبدالرحیم گجراتی اور مرزا علی شیرازی کی شرحیں لائق ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ پوری کتاب کی شرحوں میں سیوطی کی الافصاح فی زوائد القاموس علی الصحاح، عبد الباسط بن خلیل (۹۲۰ھ) کی القول المانوس بشرح مغلق القاموس، علی بن غانم المقدسی (۱۰۰۴ھ) کے حواشی، شیخ ابراہیم حلبی (۹۵۶ھ) کی تلخیص القاموس، عبد اللہ بن شرف الدین الحسنی (۹۷۳ھ) کی کسر الناموس، محمد بن یحییٰ القراتی کی بہجۃ النفوس فی المحاکمۃ بین الصحاح والقاموس، امام محمد بن الطیب الفاسی (۱۱۷۰ھ) اور برہان الحلبی کی تلخیص قاموس ممتاز ونمایاں ہیں۔[2]

تاج العروس علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اپنی شہرۂ آفاق شرح تاج العروس من شرح جواہر القاموس کے نام سے کامل ۱۴ سال کی محنت شاقہ کے بعد تصنیف کی تھی، جس میں انھوں نے صحاح جوہری، لسان العرب اور شرح ابن الطیب سے کافی استفادہ کیا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۱۸۱ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی تو اس کی خوشی میں غبط المعدیہ میں ایک شاندار دعوت دی، جس میں مشاہیر شیوخ اور علماء وفضلاء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس مایۂ ناز تصنیف کے بعد علامہ زبیدی اپنے مکان

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۴ [2] تاج العروس ج ۱ ص ۳

ایک ضروری استدراک

ولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے ملا نظام الدین پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ایک سلسلہ
لکھا ہو کہ "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کے ورد کے جواز و عدم جواز کے بارہ میں علماء میں اختلاف
ے ہو بعض علماء اس ورد کے پڑھنے کی ممانعت کرتے ہیں، کوئی سو سال پہلے اس سلسلہ میں
صاحب نے جن علماء سے استفتاء کیا تھا، اُن میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دیوبندی بھی تھے۔ انھوں نے
بہ اس ورد کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے، ان علماء کے جوابات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، کتاب کا
ہے "فتویٰ جواز یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ"، مولانا اشرف علی صاحب نے بھی اسکی اجازت دی ہے، انکی تحریری
ازت مولانا حکیم واثق الیقین صاحب سجادہ نشین کرسی ضلع بارہ بنکی اور مولانا محمد ناصر فرنگی محلی حفید
نظام الدین کے پاس موجود ہے، مولانا سید ابوالحسن ندوی اس اجمال کی تفصیل یہ تحریر کی ہے

"میں نے فتاویٰ رشیدیہ و امدادیہ دونوں سے مراجعت کی حضرت گنگوہی تو عدم جواز کے قائل
ہیں، اور مولانا تھانوی بعض شرائط و قیود کے ساتھ اجازت دیتے ہیں اور خواص کیلئے جائز
سمجھتے ہیں، فتاویٰ رشیدیہ میں جو حضرت مولانا رشید احمد کے فتاویٰ کا زیادہ مستند مجموعہ اور انکے
صحیح اور آخری مسلک کا ترجمان ہے، اسکے خلاف فتویٰ موجود ہے، اس کے مطابق وہ
اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور مولانا تھانوی صرف خواص اہل علم کے لیے اس کی
اجازت دیتے ہیں۔

لیکن علامہ قسطلانی نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مجدالدین سمی شرح الحافظ منح	مجدالدین نے حافظ کی شرح کا نام ف کے بجائے
الباری بالمیم بدل الفاء وان	میم سے منح الباری رکھا تھا جب ابن حجر کو
الحافظ اطلع علیہ ولم یرتضہ	یہ معلوم ہوا تو اس نام کی کثرت نقل کی وجہ سے
لکثرۃ نقلہ عن ابن عربی [۱]	انھوں نے اس کو پسند نہ کیا۔

فیروز آبادی کی جو تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر قبول عام کا تمغہ حاصل کر چکی ہیں ان میں القاموس کے علاوہ تحبیر الموشین فی التعبیر بالسین و الشین، تنویر المقباس من تفسیر سیدنا عبد اللہ ابن عباس، اور سفر السعادۃ کے نام ملتے ہیں، اول الذکر ۱۳۲۷ھ میں مطبعہ ثعالبیہ جزائر اور ۱۳۳۰ھ میں مطبعہ اہلیہ بیروت سے طبع ہوئی [۲]

خاتمہ کلام راقم سطور نے اس مقالہ کے پہلے نمبر میں عرض کیا تھا کہ آٹھویں صدی ہجری کا زمانہ پوری اسلامی تاریخ کا اس حیثیت سے بڑا تابناک ہے کہ مختلف علوم کی جس قدر ترقی و اشاعت اور ماہرین فضلاء کی کثرت اس زمانہ میں رہی اس کی نظیر کسی دوسری صدی میں نہ مل سکے گی، صرف نویں صدی کو کسی حد تک اس کے مقابلہ پر پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اس عہد کے اوائل کے جتنے با کمال اہل علم گذرے وہ سب بالواسطہ یا بلا واسطہ آٹھویں صدی ہی کی بہار کے پروردہ تھے، مذکورہ بالا جائزہ سے مقصود اسی عہد زریں کی علمی چہل پہل کی صرف ایک جھلک دکھانا تھا، ورنہ اسکی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

---

[۱] ارشاد الساری ج ۱ ص ۴۹ [۲] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۴۷۰

ادبیات

نعت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

کر جہاں سے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں | ہے عالمِ سرور، غزل کہہ رہا ہوں میں

یارے ضبطِ شدتِ جذبات اب نہیں | اے طبعِ ناصبور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ہو نعتِ خیال کا ہر شعر آئینہ | اے فطرتِ غیور، غزل کہہ رہا ہوں میں

شانۂ خلوص میں جلتی ہے شمعِ دل | روشن ہے لاشعور، غزل کہہ رہا ہوں میں

نشے میں سر جھکائے ہوئے ساکنانِ ہوش | یہ کس نشہ میں چور، غزل کہہ رہا ہوں میں

رتا ہے نذرِ ساقیِ کوثر ہر ایک شعر | پی کر مئے طہور، غزل کہہ رہا ہوں میں

لکھتا ہوں شعر مہرِ رسالت کی شان میں | ہے نور کا وفور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ل میں خیالِ گنبدِ خضرا لیے ہوئے | فکرِ جہاں سے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں

بوئے گلِ ردائے نبی ہے مشامِ جاں | بکھری ہو زلف حور، غزل کہہ رہا ہوں میں

اہِ عرب کا دل میں تصور ہے ہر گھڑی | پھیلا ہوا ہے نور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل ہے کہاں دماغ کہاں یہ نہ پوچھیے | کہنے کو ہاں ضرور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل ہے ترے دیار میں اے سرورِ جہاں | گو تجھ سے رہ کے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ہر شے میں دیکھتا ہوں جھلک تیرے نور کی | جلووں کا ہے ظہور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ملتا ہے فیضِ صحبتِ روح القدس ولیؔ

روشن ہے شمعِ طور، غزل کہہ رہا ہوں میں

وفیات

حکیم حافظ خواجہ شمس الدین

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ دو ممتاز اہل علم نے وفات پائی، حکیم حافظ خواجہ شمس الدین صاحب لکھنوی اور سید اختر علی صاحب تلہری، حکیم صاحب تنہا حاذق طبیب ہی نہیں تھے، بلکہ عربی زبان اور اسلامی علوم کے فاضل بھی تھے، اور شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، طب یونانی کے تو ماہر ہی تھے، اور اب لکھنؤ میں اسکی عظمت انہی کے دم سے قائم تھی، طب کی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے، جن کے پڑھانے والے اب کم رہ گئے ہیں، آداب، اخلاق میں لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور وضعداری کا نمونہ تھے، لکھنؤ کے متعدد قومی ملی اداروں کے رکن تھے اور انکے کاموں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، ندوہ سے خاص تعلق تھا، اور اسکی مجلس منتظمہ کے جلسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے، مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، اس تعلق سے ان سے بہت پرانی شناسائی تھی، آخر میں تصوف کیطرف زیادہ رجحان ہو گیا تھا، اب طب یونانی کے ماہر اٹھتے جا رہے ہیں، طبی درسگاہوں سے حکیم کے بجائے ڈاکٹر پیدا ہونے لگے ہیں اور خالص فن طب ختم ہوتا جاتا ہے، مرحوم لکھنؤ میں اسکی آخری یادگار تھے، انکی موت سے فن طب اور پرانی تہذیب شرافت کی ایک بڑی یادگار مٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

سید اختر علی صاحب تلہری

سید اختر علی صاحب صاحب فن شاعر اور نکتہ سنج ادیب تھے، اردو اور فارسی زبان و ادب پر استادانہ نظر تھی، عربی اور انگریزی سے بھی واقف تھے، ساری عمر درس تدریس اور تالیف تصنیف میں گذری، انکے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، انکی تربیت نے بہت سے شاعر و ادیب پیدا کر دیے، انکا کلام اور مضامین رسالوں میں نکلتے رہتے تھے، معارف میں بھی انکی غزلیں شائع ہوتی تھیں، عرصہ ہوا معارف میں ہندوستان کے عربی شعرا پر ایک مبسوط مضمون شائع ہوا تھا، اتفاق سے اس میں کسی شیعہ شاعر کا ذکر نہ تھا، تلہری صاحب نے مجھکو شکایت کا خط لکھا، میں نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے، مضمون جس شکل میں آیا تھا میں نے شائع کر دیا، اگر آپ شیعہ شعرا پر لکھ بھیجیں تو اسکو بھی شائع کر دیا جائیگا، چنانچہ یہ مضمون انھوں نے لکھکر بھیجا اور وہ شائع ہوا، مضامین کے علاوہ مستقل علمی و ادبی تصانیف بھی انکی یادگار ہیں، آجکل شاعروں اور ادیبوں کی کمی نہیں، انکی تعداد روز افزوں ہے، اس سے نظم و نثر دونوں کا دامن بہت وسیع ہو گیا ہے لیکن فنی مہارت اور علمی و ادبی بصیرت مفقود ہوتی جاتی ہے، تلہری مرحوم کی وفات سے ایک صاحب علم و ادب اور صاحب فن شاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔

نعت

از

جناب مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری

نگاہوں میں سمایا ہے مدینہ کا دیار ابتک
نظر کے سامنے ہے سبز گنبد کی بہار ابتک

زمانہ ہو گیا دنیا میں وہ تشریف لائے تھے
برستی ہے جہاں میں رحمتِ پروردگار ابتک

وہ جنت کا سماں وہ گنبدِ خضریٰ کی تابانی
نظر میں رقص کرتے ہیں وہی لیل و نہار ابتک

غبارِ کارواں دشتِ طیبہ یاد ہے مجھکو
بڑھاتے ہیں جنونِ عشق، وہ گرد و غبار ابتک

شریعت تیری اے ہادیٔ اعظم عینِ فطرت ہے
وہ اندھے ہیں جنھیں آتا نہیں ہے اعتبار ابتک

مدینہ کے در و دیوار پہ رحمت برستی ہے
چلی آتی ہے رحمت کے فرشتوں کی قطار ابتک

سنوارا باغباں نے اس طرح گلشن مدینے کا
ہے اپنے حال پر قائم گلستاں کا نکھار ابتک

ابھی تک یاد ہیں وہ مثلِ گل کانٹے مدینے کے
مزہ دیتے ہیں تلوؤں کو مرے وہ نوکِ خار ابتک

تری ذاتِ منور سے درخشاں ہے جہاں سارا
ترے جلوے سے خورشید و قمر ہیں شرمسار ابتک

تمام اہلِ خرد طفلِ دبستاں ہیں ترے آگے
ہے ناممکن تجھے اوصافِ عالی کا شمار ابتک

نگاہِ لطف اب عثمان کیجانب بھی ہو جائے
جدائی میں وہ روتا جا رہا ہے زار زار ابتک

نعتِ مبارک

از

جناب محوی صاحب صدیقی لکھنوی

یہ بھی عجب کمالِ محبت دکھا دیا
تم کو خدا نے جانِ دو عالم بنا دیا

اس بارشِ کرم پہ ہے انسانیت کو ناز
انسانیت کی روح کو پھر سے جگا دیا

اسرارِ کائنات کو سمجھے کچھ آپ ہی
قانون کو بھی جانِ شریعت بنا دیا

دینِ خدائے پاک پہ چھائی تھی مردنی
کشتِ اجل رسیدہ کو پھر لہلہا دیا

حیرت میں ہے زمانہ کہ چھ سات سال میں
بچھڑے ہوئے دلوں کو خدا سے ملا دیا

آئے جو یادِ عظمتِ ماضی تو کیا کروں
اس نے تو اور جان و جگر کو گھلا دیا

دونوں جہاں کی نعمتیں اس نے تو دی ہیں
اب یہ بتاؤ ہم نے محمد کو کیا دیا

ہر ہر گلی مدینے کی ہے نازشِ بہار
ہر ہر قدم پہ ایک نیا گل کھلا دیا

فرعونِ وقت نذرِ جہنم ہوئے تمام
بوجہل و بولہب کو بھی نیچا دکھا دیا

نازاں حریمِ کعبہ تو حیراں تھا ہر صنم
پھر بتکدے کو گلکدہ دیں بنا دیا

یہ کیف یہ سرور یہ مستی یہ سرخوشی
کیا اہلِ حق کو بادۂ عرفاں پلا دیا

اچھا ہوا کہ مل گئی کچھ رخصتِ سخن
محوی نے آپ ہی کا فسانہ سنا دیا

یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے میں صرف تحقیق اور تلاش مدنظر ہے، یا تحقیق و تلاش کی آڑ میں کسی خاص مقصد کی تکمیل کی جا رہی ہے، انگریزوں نے اپنے زمانہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ لکھی تو ان کی تحقیقات میں ان کے سیاسی مصالح غالب رہے لیکن اسی زمانہ میں بعض مورخوں مثلاً ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر بینی پرشاد، ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، ڈاکٹر ایشوری پرشاد، ڈاکٹر ترپاٹھی، ڈاکٹر پی، ان، سرن، پروفیسر رام پرشا د کھوسلا وغیرہ نے جو تاریخیں لکھیں ان میں سیاسی مصالح کے بجائے مصالحانہ انداز بیان تھا، جو آج بھی مفاہمت پیدا کرنے میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ مورخین کا وہ انداز نہیں رہ جو ان مورخوں کا تھا، ان کی تاریخوں میں تحقیق کے پردے میں دل آزار اور تکلیف دہ باتیں کہی جانے لگی ہیں،

زیر نظر کتاب کے مولف نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ ان کا مطالعہ غیر جانبدارانہ اور عالمانہ ہو، ان کی کتاب سے اس عہد کے امرا کے کارناموں کا ایک واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، اس زمانہ میں سلاطین سے زیادہ اہم امرا ہی تھے، اور وہ اپنی خواہش کے مطابق جس طرح سلاطین کو تخت پر بٹھاتے اور معزول کرتے رہے، اس لحاظ سے تو اس زمانہ کی بادشاہت دستوری بادشاہت معلوم ہوتی تھی، جیسا کہ مولف نے بھی اپنی اس کتاب میں اعتراف کیا ہے،

ان امرا کے کارناموں کا باضابطہ جائزہ تو ضمنی حیثیت سے مختلف کتابوں کے مختلف ابواب یا اوراق میں لیا گیا تھا، مگر نظام صاحب نے یہ جائزہ ایک کتاب میں لے کر ایک کمی کو پورا کر دیا ہے، اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے، لیکن اس میں کہیں کہیں لائق مولف کی رائے کھٹکتی، مثلاً وہ لکھتے ہیں :

باب التقریظ والانتقاد

سلاطین دہلی کے عہد کے امرا

(۱۲۰۶ء - ۱۳۹۸ء)

از سید صباح الدین عبد الرحمن

یہ انگریزی کتاب جناب ایس ۔ بی ۔ پی نگم صاحب پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی تصنیف ہے، فاضل مؤلف اودے پور یونیورسٹی میں تاریخ کے لکچرار ہیں، کتاب کا حجم اشاریہ اور کتابیات ملاکر ۲۲۳ صفحے پر مشتمل ہے، یہ غالباً پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا مقالہ ہے، اس میں حسب ذیل ابواب ہیں،

(۱) تمہید (۲) البار ی امرا سلاطان گر (۳) خلجیوں کے عہد میں امارت کا ارتقا (۴) تغلق کے عہد میں امارت کا ارتقا، (۵) ترک امرا کی نوعیت (۶) امارت کی تنظیم (۷) امرا، علما، اور سلاطین (۸) امرا کی ملازمت کے شرائط، مراعات اور نظام تربیت (۹) تتمہ، ان کے علاوہ کچھ ضمیمہ جات ہیں،

لائق مصنف فارسی بھی جانتے ہیں اس لیے فارسی کے معاصر ماخذوں سے پورا استفادہ کیا ہے،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر اب جب کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو پڑھتے وقت

"ایسے ہندو امرا کی تعداد بھی بہت ہے جو شاہی دربار کے معاون تھے اور یہاں برابر حاضر ہوتے رہے، اگرچہ ان کے سیاسی کارنامے نظر انداز کیے جانے کے لائق ہیں، رائے دنوج نے لکھنوتی کے مقطع طغرل کو گرفتار کرنے میں بلبن کو مدد پہنچائی، بلبن رائے دنوج سے اپنے دربار میں عزت سے پیش آیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہندو معاون راجاؤں کو امن سے رہنے دیتا تھا۔ گرچہ یہ ہندو راجہ دربار یا اس زمانہ کی سیاست میں زیادہ اثر نہ رکھتے تھے، سلطان معز الدین کیقباد کے زمانہ میں بھی رایوں اور راجاؤں کی تعداد زیادہ تھی، معز الدین کی وفات کے بعد جب سلطان جلال الدین نے ملک چھجو کے خلاف فوج بھیجی تو رائے پرم دیو کوتھ اور رائے بھیم دیو نے موخر الذکر کی اس لیے مدد کی کہ وہ بلبن کے خاندان کے وفادار تھے (ص ۱۰۸)

اوپر کی عبارت میں ہندو امرا کے سیاسی کارنامے نظر انداز کیے جانے کے لائق بتائے گئے ہیں اسلیے کہ ان کے کارناموں کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا لیکن میرا خیال ہے کہ آگے چل کر جب زیادہ معلومات فراہم ہونگی تو سلاطین دہلی کے دربار کے ہندو راجاؤں کے اثرات نظر انداز کیے جانے کے لائق نہ سمجھے جائیں گے۔ اب بھی تاریخوں میں کچھ ایسے مواد ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو راجہ دربار میں اثر انداز ہوتے رہے، مثلاً علاء الدین خلجی کے زمانہ میں دیوگیر کے راجہ رام دیو کا ذکر معاصر مورخین بہت احترام سے کرتے ہیں، عصامی نے فتوح السلاطین میں اس کے لیے "سرفراز ہندو"، "بندۂ خاص درگاہ شاہ" جیسے فقرے لکھے ہیں، اور رقمطراز ہے کہ جب وہ علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تو اس پر موتی نچھاور کیے گئے، دو لاکھ تنکے نذر دیے گئے اور رائے رایان کا خطاب دیا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس کو چتر بھی عطا ہوا (فتوح السلاطین ص ۲۷۴-۲۷۶)۔ خود رام دیو نے جنوبی ہند کی تسخیر میں علاء الدین خلجی کی فوج کو ہر قسم کی مدد پہنچائی، ضیاء الدین برنی اس کی اطاعت، فرمانبرداری اور ہوا خواہی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"و ... بیان و تجربہ یافتگان لشکر اطاعت و فرمانبرداری و اخلاص و ہوا خواہی رام دیو مشاہدہ می کردند و می گفتند کہ اصیل و اصیل زادہ را بہ سرکاری کردن ہمیں بار آرد کہ از رام دیو معاینہ می شود" (ص ۳۲۶)

"علما ...... ہمیشہ یہ آواز بلند کرتے رہے کہ موت یا اسلام، یہ مسلمانوں کی لڑنے والی جماعت کی ہمت کو بلند کرنے کے لیے ایک مقبول نعرہ رہا، علماء سلاطین کو یہ مشورہ دینے میں بالکل نہیں جھکتے، اگر اس قسم کی باتیں جنگ کے زمانے میں کہی جاتیں تو ان کو محض ایک پروپگنڈا کی حیثیت دیکر نظر انداز کر دیا جاسکتا تھا، لیکن المیہ تو یہ ہے کہ علماء نے اس قسم کی تجویزیں امن کے زمانے میں بھی پیش کیں، مورخ کا مشکک ذہن قدرتی طور پر یہ پکار اٹھتا ہے کہ کیا یہی اسلام ہے؟" (تمہید ص ۱۰)

مؤلف نے اسی قسم کی باتیں کئی اور جگہ (ص ۱۲۲، ص ۱۳۱) لکھی ہیں اور حوالہ ضیاء الدین برنی کی تاریخ کا دیا ہے، گرچہ ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ انتہا پسندانہ خیال صرف برنی کے ذہن کی پیداوار ہے (ص ۱۳۱)۔ اگر وہ اس کو واقعی بعض علماء کا انتہا پسندانہ خیال سمجھتے تو پھر اوپر کی عبارت لکھ کر اسلام پر حرف گیری کر کے اپنے مشکک ذہن کا اظہار نہ کرتے، گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر معلوم نہیں کتنی بار ایسی رائے کی تردید کی جاچکی ہے، مولانا شبلی نے الفاروق، پھر اپنے مضمون الجزیہ اور حقوق الذمیین میں بڑی مدلل بحث کی ہے، اگر مولف کی نظر ایسے لٹریچر پر بھی ہوتی تو اس قسم کی رائے ظاہر کرنے سے گریز کرتے، اس سے قطع نظر اگر یہ مذہبی مسئلہ ہے تو پھر اس پر بحث کلام پاک، حدیث اور خلفائے راشدین کے عمل کی روشنی میں کی جانی چاہئے تھی، کسی ایک یا دو عالم کا حوالہ دے کر اس کو اسلام کی تعلیم نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اور اگر یہ تاریخی بحث ہے تو پھر مولف کو بھی اسکا اندازہ ہے کہ اس پر عمل کبھی نہیں ہوا، بعض مورخین اپنے فاتحانہ پندار میں کچھ ایسی باتیں ضرور لکھ گئے ہیں جن سے بے جا فائدہ اٹھا کر ذہن کو مسموم کیا جاسکتا ہے، لیکن خود مولف کو اعتراف ہے کہ

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر اسلامؐ ۔ مترجمہ مولانا وارث علی ایم اے فاضل دیوبند، تقطیع بڑی، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۶۴۴، مجلد قیمت دس روپے (عـہ) پتہ: نمبر ۳۰ زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۱۳۔

زیر نظر کتاب ایک یورپین عالم کونسٹان ورزیل جارج کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے مصنف کا وطن رومانیہ ہے، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد انھوں نے فرانس میں بود وباش اختیار کرلی اور وہیں یہ کتاب لکھی۔ اس کی تصنیف کے بعد وہ حلقہ بگوش اسلام بھی ہوگئے، یہ کتاب بڑی محنت اور بائیس سال کے مطالعہ وتحقیق کے بعد لکھی گئی ہے، مصنف یورپین ہیں تاہم انھوں نے واقعات کے اسباب اور عقلی توجیہات بھی بیان کی ہیں مگر بعض توجیہات صحیح نہیں ہیں، بعض واقعات وحالات بہت مفصل تحریر کیے ہیں لیکن ۔۔۔، بعض غیر مستند واقعے بھی درج کردیے ہیں جو سیرت کی مشہور ومتداول کتابوں میں نہیں ہیں، بعض صحیح واقعات میں غلط واقعات اور تفصیلات بھی شامل کردی ہیں، لائق مترجم نے ایسے بیانات کی تردید کردی ہے لیکن بعض غلطیوں کی تردید رہ گئی ہے، جیسے مہاجرین حبشہ کی تعداد نوسو (۹۰۰)، حضرت ابوبکرؓ کا رسول اللہ صلعم سے تین سال عمر میں بڑا ہونا، ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا گھاٹی کے اندر ہی انتقال کرنا اور سراقہ بن جعشم کا نام سراقہ بن مالک وغیرہ، مترجم نے اپنی اصلاحات کو حواشی میں لکھنے کے بجائے متن ہی میں گڈمڈ کردیا ہے، ترجمہ میں تعبیر اور زبان وبیان کی بعض خامیوں

امیر خسرو نے اس کو رائے نیاک اصل لکھا ہے۔ (خزائن الفتوح ص ۳۸)

امیر خسرو ہی کا بیان ہے کہ اسکی وجہ سے ہندو اور مسلمان میں بڑی یگانگت پیدا ہو گئی تھی، اس طرح کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے   نہ ہندو را مخالف بود رائے

عصامی کے بیان کے مطابق تو سلطان قطب الدین خلجی رام دیو کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ [illegible]

جب علاء الدین خلجی کی فوج معبر کی طرف بڑھی تو دھور سمندر کے راجہ بیر پانڈیا (بلال) نے اس کی اعانت پہنچائی۔ عصامی اسکو فخر رایان ہندستان [illegible] لشکر ملک کافور [illegible] فخر ہندستان لکھتا ہے اور پھر بڑے جوش و خروش سے معبر کی فتح میں اس کی فوجی اعانت کا ذکر کرتا ہے:

پس از ہفتہ گفتش آں کامران (ملک کافور)   کہ اے فخر رایان ہندوستان

تو چوں از دل و جان شدی یار ما   دل و جان تو باد عشرت گرا

کنوں بشنو اے فخر ہندستان   چنین است فرمان شاہ جہان

کہ ایں بار ہمراہ لشکر شوی   زنی کوس و در سمت معبر شوی

کہ آگہ نگردد کس از ایں راہ   کشد تا کہ بر سر معبر سپاہ

بہ سمع بلال ایں سخن چوں رسید   گریزے نہ کرد و اطاعت پذیر

پذیرفت فرمان شاہ جہان   پے رہبری بست محکم میان

اس قسم کے تعاون و یگانگت کے واقعات بہت کچھ مل سکتے ہیں۔ تاریخ کے واقعات کی حیثیت کچھ ہوا کی ہوتی ہے، ان سے دلوں کو توڑے جا سکتے ہیں تو جوڑے بھی جا سکتے ہیں۔ ہندستان کی فلاح و بہبودی کی خاطر ہندستان کے موجودہ دور کے مورخوں کو یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ گزشتہ زمانے میں جو کچھ ہوا اسکی تلافی اب نہیں ہو سکتی ہے۔ ان پر زہریلے تبصرے کر کے دلوں کو تو ضرور توڑے جا سکتے ہیں لیکن ہندستان کو اسوقت دلوں کو توڑنے کے بجائے دلوں کو جوڑنے کی ضرورت ہے، ایک مورخ اس کام کو اپنے قلم کے ذریعہ سے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے۔

زیر نظر تصنیف منشی رام منوہر لال، تاجر کتب نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، قیمت پچیس ۲۵ روپے، لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔

"ع، ب"

س کے لیے فاضل مرتب اصحاب علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

اسلام کی دعوت ۔ مرتبہ مولوی سید جلال الدین صاحب عمری تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۳۰۴ قیمت تین روپئے۔ پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

اس کتاب میں اسلام کی دعوت اور اس سے متعلقہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے، پہلے انبیاء و مسلام کے کاموں کی غرض و نوعیت اور ان کی دعوت کے بعض مراحل کا ذکر ہے، پھر اسلام دعوت کی عمومیت، امت کی تبلیغی ذمہ داری، داعیانِ حق کے لیے اسلام کی مکمل اتباع ضرورت و اہمیت، دعوت کے اصول و آداب، اس کی کامیابی و ناکامی کے تصور اور سائے انکار کے اسباب وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، تیسرا حصہ داعی کے ضروری اوصاف تمل ہے، آخر میں دعوت کے لیے تنظیم و تشکیل جماعت کی ضرورت بیان کی گئی ہے، مصنف ماعت اسلامی کے رکن رکین ہیں، اس لیے انھوں نے اسلام کی دعوت کے سلسلہ میں اس کے سیاسی غلبہ و حکمرانی کے پہلو کو زیادہ نمایاں طور سے پیش کیا ہے، زبان سادہ و سلیس اور طرز بیان شگفتہ ہے۔

کینسر وارڈ ۔ مترجمہ جناب گوپال متل صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۵۰۸ قیمت تین روپئے۔ پتہ نیشنل اکاڈمی ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶

یہ مشہور روسی ادیب الیکزنڈر سولنٹین کے اس نئے اور شاہکار ناول کا اردو ترجمہ ہے جس پر ان کو ۱۹۷۰ء کا نوبل پرائز ملا ہے، اس سے کمیونزم کا اصلی مرقع، کمیونسٹوں کے سچے خط و خال اور ان کے ظلم و تشدد اور فکری، ذہنی اور اخلاقی پستی کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں ادیبوں اور اہل قلم کے افکار و خیالات پر ہر قسم کی پابندی عائد کر دینے اور مذہبی و اخلاقی قدروں کو جبریہ پامال

کے علاوہ کہیں کہیں غیر مانوس الفاظ بھی آگئے ہیں، ایک جگہ حلف الفضول کے معنی "لڑنے والا فوج" اور دوسری جگہ "چھوٹی سی فوج" لکھا گیا ہے، جو غلط ہے، غالباً اس کتاب کو فارسی ترجمہ سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی تصریح نہیں ہے، مجموعی حیثیت سے ترجمہ بہتر اور مصنف کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور غیر جانبدارانہ قابل تعریف ہے، اس کتاب سے سیرت کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہوا ہے،

تعارف مخطوطات کتبخانہ دار العلوم دیوبند } مرتبہ مولانا محمد ظفیر الدین صاحب تقطیع کلاں، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۶۶۸ قیمت دس روپئے،

ناشر دار العلوم دیوبند۔ یو۔ پی۔

دار العلوم دیوبند کے عظیم الشان کتبخانہ میں قلمی کتابوں کا بھی اچھا اور وسیع ذخیرہ ہے اب کتبخانہ کی جدید ترتیب و تزئین کے سلسلہ میں اس کے مخطوطات و نوادر کی فہرست کی ترتیب و اشاعت کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں قرآن مجید کے قلمی نسخوں اور تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور ان کے متعلقہ علوم کے مخطوطات کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، لائق مرتب نے مخطوطات کے تعارف میں جہانتک ممکن ہو سکا ہے ان کے سنہ تالیف و کتابت، موضوع، سائز، ہر صفحہ کی سطروں کی تعداد کاغذ و کتابت کی حالت، اہم خصوصیت اور مصنفین و کاتبین کے ناموں کی تصریح اور ان کے سنین وفات وغیرہ تحریر کیے ہیں، اور مصنفین کے مفصل حالات کے ماخذ وں کی نشاندہی بھی کر دی ہے، اس جلد میں تقریباً ۸۰۰ مخطوطات کا تعارف شامل ہے، ان میں بعض نادر و کمیاب ہیں، شروع میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق کتابوں کی اور آخر میں مصنفین کے ناموں کے اعتبار سے دو فہرستیں دی گئی ہیں، فہرست محنت اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے،

ہماری بعض نئی مطبوعات

کرنے کے باوجود نہ تو انسان کی فطری آواز کو دبایا جا سکا ہے، اور نہ مذہبی و اخلاقی رجحان کو معدوم کیا جا سکا ہے۔ یہ ناول مصنف کے گہرے فکر و شعور اور خلوص و دردمندی کا نتیجہ ہے، اردو کے مشہور ادیب و صحافی جناب گوپال متل نے اس کا ایسا رواں اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ کمیونزم اور روسی زندگی سے واقفیت کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری اور نہایت مفید ہے۔

سفر حج ۔ مرتبہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۳۵، مجلد مع گرد پوش، قیمت چھ روپے، پتہ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔

بستی کے نامور ایڈووکیٹ اور دینی و تعلیمی تحریک کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی صاحب نے [illegible] بیت اللہ کا حج کیا تھا، یہ کتاب ان کا سفرنامہ ہے، جو سفر کے حالات، حرمین کے تاریخی آثار و مشاہدات اور حج و عمرہ کے ارکان و مناسک و متعلقات کے ان تمام تفصیلات پر مشتمل ہے جو عموماً حج کے سفرناموں میں ہوتے ہیں، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے حاجیوں کو پیش آتی ہیں، اسی سلسلہ میں حکومت سعودیہ کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کو مفید مشورے بھی دیے گئے ہیں، قاضی صاحب مشاق اہل قلم ہیں، یہ سفرنامہ شگفتہ اور دلآویز طرز تحریر کا نمونہ ہے، متعدد مقامات پر مصنف کے حالات، جذبہ ایمان اور محبت و عشق کے مشاہدات، اور قاضی صاحب کے واردات قلب کا تذکرہ

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"

کا مصداق ہے، جو لوگ حج و زیارت کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیے۔

ع۔ ص۔

ماہ اگست ۱۹۷۱ء — نمبر ۲ — جلد ۱۰۸ (۵۲۰)

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

۱- بزمِ تیموریہ : تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعرا و فضلا کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۶۴ صفحے قیمت للعہ

۲- بزمِ مملوکیہ : ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلا و ادبا کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۳۵۰ صفحے قیمت معہ

۳- بزمِ صوفیہ : عہدِ تیموریہ سے پہلے کے اہلِ قلم و صاحبِ ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۶ صفحے قیمت: عہ ۲۵

۵- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت عـٰ

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰ صفحے، قیمت: عہ

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت :- ۲۲۰ صفحے، قیمت :- صر

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: عہ

۹- ہندوستان کے بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صر

۱۰- عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے قیمت: للعہ ۵۰

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۸ - ماہ جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۱ء - عدد ۲

مضامین

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اس کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق، ان میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے،

(مرتبہ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے   قیمت: [illegible]

دران سے ایسے تعلقات ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنے آخری مجموعۂ کلام سرمایۂ تسکین کا
قدمہ راقم سے باصرار لکھوایا، وہ راسخ العقیدہ اور پابند مذہب مردِ مومن تھے، انکی موت
سے ایک نامور اور شائستہ غزلگو شاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس صاحبِ دل شاعر کی
مغفرت فرمائے۔

مسز اندرا گاندھی نے الیکشن کے زمانہ میں اردو زبان اور تعلیمی اداروں کے بارہ
میں جو وعدے کیے تھے، اس کے نتیجہ میں اردو کے لیے فضا سازگار ہونے کے کچھ آثار ہیں،
چنانچہ اترپردیش کی حکومت نے مختلف شعبوں میں اردو کو جو سہولتیں دی ہیں یا دینے والی
ہے اس کی تفصیل شائع کی ہے، لیکن اصل سوال ان پر عمل کا ہے، اس سے پہلے کی حکومتیں
بھی اس قسم کی سہولتوں کا اعلان کر چکی ہیں، مگر عملاً اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس میں حکومت
کا قصور ہو یا ماتحت عملہ کا، مگر اس کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ سنجیدگی
سے کوئی حکم نافذ کرنا چاہے تو ماتحت عمال اس کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے، آخر اردو
ہی کے معاملہ میں ان کی یہ آزادی کیوں ہے، بہرحال اس قسم کے وعدے تو بہت سننے میں آچکے
ہیں، اس نئے وعدہ کا بھی تجربہ کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک پہلو قابل غور ہے، اردو کے حقوق میں اصل اور بنیادی مسئلہ اس کی
تعلیم کا ہے، جب تک یہ خاطر خواہ طریقہ سے حل نہیں ہوتا، اردو کو جو حقوق بھی ملیں گے ان سے
پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بقدر ضرورت اردو کی تعلیم لازمی
کردی جائے، طلبہ کی تعداد کی شرط سے اسکولوں کے منتظمین کو اس کی تعلیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں
پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے، جس سے مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہونے پاتی، اردو کے اساتذہ اور
اور نصاب کی کتابیں بھی نہیں ملتیں، اگر کسی طرح ان دشواریوں پر قابو بھی پالیا جائے تو

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ دو مہینوں کے اندر اردو کے پرانے خدمت گذار خیر بہوروی اور نامور شاعر تسکین قریشی مرحوم نے انتقال کیا، خیر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ اردو کی خدمت میں گذرا، وہ برسوں انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے، مولوی عبدالحق صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کے زمانہ میں انکی حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کی تھی، وہ محض انجمن کے تنخواہ دار ملازم نہ تھے، بلکہ ان میں اردو کی خدمت کی لگن تھی، جس سے انجمن کے کاموں کو بڑا فائدہ پہنچا، انکی کوشش سے بعض مقامات پر اردو کانفرنسیں بھی ہوئیں، صاحب قلم بھی تھے، اور کبھی کبھی رسالوں میں مضامین بھی لکھتے تھے، انجمن سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ میں میر اکیڈمی اور غالب اکیڈمی قائم کیں، جن سے مدحتِ غالب اور مرقعِ غالب شائع کیں، باہر کے جو ادیب لکھنؤ آتے تھے، ان کو اکیڈمی میں مدعو کرتے تھے، اور بڑے شوق سے اس کے کاموں کو دکھلاتے تھے، ان کو جس پہلو سے بھی اردو کی خدمت کا موقع ملتا تھا، اس سے فائدہ اٹھاتے، اور انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ اردو کی خدمت انجام دی، طبعاً بھی خلیق و شریف تھے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے اردو کی مغفرت فرمائے۔

تسکین قریشی غزل گو شعراء میں نہایت ممتاز اور تغزل میں جگر کے صحیح جانشین تھے، وہ ملازم پیشہ تھے، اس لیے پیشہ ور شعراء کی کمزوریوں سے ان کا دامن پاک تھا، اور اپنی اخلاقی بلندی کے اعتبار سے شعراء کی آبرو تھے، طبعاً خاموش، عزلت پسند اور شہرت طلبی سے دور تھے، مشاعروں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے، اور اخبارات و رسالوں میں بھی اپنا کلام اشاعت کے لیے کم بھیجتے تھے، اس لیے ایک عرصہ تک ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن آخر میں ان کے کلام کی نکہت صاحب ذوق طبقہ میں پوری طرح پھیل گئی تھی، راقم کو ان کے کلام کا اندازہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "گلگونہ" کی اشاعت کے بعد ہوا، ان کی شاعری خیالات کی لطافت و پاکیزگی اور زبان کی نفاست و سلاست کا نمونہ ہے، نعتیں بھی بڑی پرکیف کہتے تھے، ان سے ملاقات کی نوبت کبھی نہیں آئی، مگر کبھی کبھی وہ اپنا کلام معارف میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، اس سلسلہ میں ان سے خط و کتابت رہتی تھی،

مقالات

ملا عبدالقادر بدایونی

از سید صباح الدین عبدالرحمن

ملا عبدالقادر کی ولادت ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ٹونڈہ، بساور ضلع بدایوں میں ہوئی، ان کے والد کا نام ملوک شاہ تھا، خود ملا صاحب ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ "وہ بحر علم" "معدن احسان" اور "کان فضل" تھے (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۵۳) ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی تو وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل گئے، اور میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو بہت بڑے عالم اور صوری اور معنوی کمالات کے حامل تھے، شیخ عزیز اللہ طلبنی سے بیعت تھے، ان کی خانقاہ میں رہ کر ملا صاحب نے قصیدہ بردہ کا درس لیا، ان سے تبرکاً حنفی فقہ کی کتاب کنز کے چند سبق بھی پڑھے، جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میاں حاتم سنبھلی نے ان کو اپنے مریدوں میں داخل کر لیا، اور شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ بھی عطا کیا، تاکہ ان کو علوم ظاہری کا بھی فائدہ ہو (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳)

ملا صاحب نے سنبھل ہی میں قرآن پاک کی قرأت میر سید محمد مکی سے سیکھی، جو سات قرأتوں کے قاری تھے (ج ۲ ص ۲۱)۔ انھوں نے عربی علوم کی تحصیل اپنے نانا مخدوم اشرف سے بھی کی، (ج ۲ ص ۶۲)، کافیہ بیانہ کے ایک عالم شیخ سعد اللہ نحوی سے پڑھی، شرح شمسیہ مرزا سمرقندی سے اور وقایہ ابو المعالی سے پڑھی،

یہ واقعہ ہے کہ اردو پڑھنے والے طلبہ صرف مسلمان ہوتے ہیں، جن کا ملازمتوں میں بہت کم گذر ہے اور اعلیٰ عہدوں پر تو خال خال ہی نظر آتے ہیں، اور ان کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے، ہندو طلبہ میں ہزاروں میں مشکل سے دو چار اردو پڑھنے والے نکلیں گے۔ اور یہی ملازمتوں میں جاتے ہیں، جو اردو سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے عدالتوں اور دوسرے شعبوں میں اردو کو جو حقوق ملیں گے اسکے سمجھنے والے کہاں ہونگے، اردو کے ٹرینڈ اساتذہ تک مشکل سے میسر آئیں گے۔ اسی لیے اردو کے بارہ میں حکومت جو ہدایتیں جاری کرتی ہے ان پر عمل نہیں ہو پاتا، اس کا حل صرف یہ ہے کہ آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم لازمی کر دیجائے، اسکے بغیر اردو کو دی ہوئی سہولتوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس سے ہندی کی برتری میں کوئی فرق نہیں آتا، وہ تو حکومت کی مسلمہ زبان ہے اور شروع سے آخر تک لازمی ہے، قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے کہ ہندی اور اردو والوں میں جو دوری اور بیگانگی ہے وہ دور کیجائے، اسکا ایک بڑا ذریعہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوں۔

اقلیتی اداروں میں سب سے بڑا مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے کردار کے تحفظ کا ہے، اس کا حل غالباً جلد ہی پیش ہو، اسکے متعلق اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں، حکومت بھی پوری طرح سمجھتی ہے کہ کردار کا مقصد کیا ہے، اور وہ کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے، سپریم کورٹ کے فیصلہ کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ بھی اپنی جگہ قانونی حیثیت سے صحیح ہے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی ہے، اس کے دروازے اگرچہ غیر مسلموں کے لیے کبھی بند نہیں رہے لیکن اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی ایسی تعلیم ہے جس سے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ انکی ملی خصوصیات بھی قائم رہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب یونیورسٹی کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، حکومت کی کم سے کم مداخلت ہو، محض مسلم کے لفظ سے کوئی فائدہ نہیں ہے، یوں تو مسلمانوں کی بہت سی شکایتیں اور مطالبات ہیں ان میں دو زیادہ اہم ہیں، اردو کا حق اور مسلم یونیورسٹی کے کردار کا تحفظ اگر یہ دونوں مطالبے پورے ہو جائیں تو مسلمان بڑی حد تک مطمئن ہو جائیں، گذشتہ الیکشن میں محض مسز اندرا گاندھی کی شخصیت کی بنا پر کانگریس کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوا تھا جس سے اس کو بڑا فائدہ پہنچا، اس لیے اس اعتماد کو قائم رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے، اور وہ ان دونوں مطالبوں کو پورا کر کے اس اعتماد کو قائم رکھ سکتی ہیں۔

و فارسی و نجوم و حساب و وقوف در نغمۂ ولایتی و ہندی بہ مرتبۂ کمال داشت و قادری

تخلص بود۔"

جس علمی و ادبی مجلس میں پہنچ جاتے ، اپنی لیاقت اور فضیلت کا سکہ جما دیتے ، ان کے
زمانے میں شیخ احمدی فیاض انبیٹھی وہاں بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے ، اکثر درسی کتابیں
پڑھایا کرتے ، ایک بار ملا صاحب ان سے ملنے گئے تو وہ شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے ،
ان کا ایک شاگرد ذیل کا ایک ہزلیہ قطعہ پڑھ رہا تھا :

ابو بجر الولد المنتجب　　اراد الخروج لامر عجب

فقد قال انی عزمت الخروج　　لکفارۃ بی لی ام اب

فقالت الم تسمعن یا بنی　　بنھی النبی عن تلقی الجلب

اس قطعہ میں یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ لفظ کفتارہ ہے یا کفارہ جو کافر کی تانیث
میں مبالغہ کا صیغہ ہے ، شیخ احمدی فیاض نے فرمایا معنی کے لحاظ سے کفارہ ہو گا ،
کفتارہ کا لفظ تو فارسی ہے ، ملا صاحب بیچ میں بول اٹھے کفتارہ کو کفارہ سے
کہیں زیادہ ترجیح ہے (ج ۳ ص ۸۷)

اکبری دربار میں شمس الدین حکیم الملک حکمت و طب میں جالینوس زماں اور
مسیح دوراں سمجھے جاتے تھے ، طب کے علاوہ علوم نقلی کے بھی عالم تھے ، اپنے مذہبی عقیدہ
میں بڑے راسخ رہے ، ہمیشہ طالب علموں کو سبق پڑھاتے رہتے ، ان کے اخراجات خود
برداشت کرتے ، ایک دن وہ شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے علمی گفتگو کر رہے تھے ،
اثنائے گفتگو میں بوعلی سینا کی خوبیاں بیان کرنے لگے ، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علماء اور حکماء ایک
دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی خاطر مجادلہ و مناقشہ کیا کرتے تھے ،

چند روز شیخ ابو الفتح تھانیسری کے حلقۂ درس میں بھی رہے، شیخ عبد اللہ بدایونی سے کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی کتابیں پڑھیں (ج ۳ ص ۱۲۹، ۱۵۱، ۱۴۹) اپنی فطری ذہانت اور صلاحیت سے فارسی، عربی، سنسکرت، تفسیر، تاریخ، شعر، ادب، حساب، موسیقی اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت پیدا کی، اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر اہل علم ہوئے، جس کے معترف اس زمانہ کے ارباب کمال بھی ہیں، فیضی ان کے فضل و کمال کا بڑا قدر دان تھا، اپنے ایک خط میں لکھتا ہے :-

"بافضیلت علمی طبع نظم وسلیقۂ انشا می عربی و فارسی چیزے از نجوم ہندی و حساب یاد داشت در ہمہ وادی و وقوف در نغمہ ولایت و ہندی چیزے از شطرنج صغیر و کبیر دارد (ج ۳ ص ۳۰۴)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی ان کو بہت عزیز رکھتے، وہ جب ان سے ملتے تو ان کے شوق و اشتیاق کی پیاس نہ بجھتی بلکہ اور بڑھ جاتی، ان کی ملاقات میں روحانی اور باطنی لذت محسوس کرتے، اپنے ایک مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں کہ خدا کے لیے مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ بند نہ کیجئے، اور اگر یہ راستہ ان کی طرف بند ہوگا، تو پھر ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا۔

از برائے خدا برمن قافلۂ اسرار خود راہ نہ بندند، واگر از ان طرف بندند، ازیں طرف بستہ نخواہد شد (ج ۳ ص ۱۱۰)

ملا صاحب کے ایک اور معاصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری تھے، اکبران کے علمی فضائل اور روحانی کمالات کا بڑا قدر دان تھا، وہ ملا صاحب کو دوانی سے افضل تر سمجھتے تھے، لکھتے ہیں :

از دوانی بداؤنی بے شک در فنون فضیلت است فزون (ج ۳ ص ۱۴۴)

بختاور خاں عالمگیری مراۃ العالم میں لکھتا ہے :-

"ملا عبد القادر بدایونی جامع معقول و منقول و با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقہ انشاء عالی

پر جہالت کا پردہ پڑ گیا، درگاہ میں جو بے ادبی ہوئی اس کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا۔
خداوند تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ بھی، ان کے معشوق کی قوم کے چند افراد نے ان پر
لیا، اور تلوار سے ان کے سر، ہاتھ اور کندھے پر نو زخم لگائے، جان جانے میں کوئی
مر نہیں رہ گئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی، اس شکرانہ میں یہ اشعار لکھے ہیں :

نقصہ ہر آنچہ کرد گردون از جفا　　حق باید گفت بود دون حق ما
شکرانہ نعمتش نمی کردیم ہیچ　　تا لاجرم فگند در رنج وبلا

اس مصیبت میں منت مانی کہ اچھے ہو کر حج کریں گے۔ لیکن پوری نہ کر سکے جس کا
سوس ان کو زندگی بھر رہا، اس سلسلہ میں احسان شناسی کے جذبہ میں اپنے آقا
حسین خاں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے باپ اور بھائی کی طرح ان کی خدمت کی۔ اور
ان کے لیے برابر دعا گو رہے، اس کی مذہبیت، شجاعت، سخاوت، سادگی، انکسار
اور بے نیازی کی بڑی تعریف اپنی تاریخ میں کی ہے (ج ۲ ص ۱۴۴، ۲۲۴، ۳۴۴ و ۱۳۶-۱۳۷)
ملا صاحب نے اپنے عشق کو جو ان کے خیال میں محض شہوت و از تھا جس بے تکلفی سے بیان
کیا ہے، وہ ان کی صاف گوئی اور حق گوئی کی دلیل ہے، یہی انکی سیرت کا لازمی جز بنا رہا۔
ملا صاحب حسین خاں کے یہاں تقریباً نو سال ملازم رہے۔ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر کے
دربار سے وابستہ ہوئے، اس وابستگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں :-

"ماہ ذی الحجہ کے آخر میں یہ فقیر اپنی تقدیر سے جو تدبیر کے پاؤں کی زنجیر ہے حسین خاں کی
ملازمت سے علیحدہ ہو کر بدایوں سے آگرہ آیا، جہاں خاں قورچی اور جالینوس مرحوم
حکیم عین الملک کے وسیلہ سے شاہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان دنوں علم کی
بڑی قدر دانی تھی، پہلی ہی دفعہ شہنشاہ سے تخاطب کا شرف حاصل ہوا، اور ہم نشینوں

ملا صاحب بھی وہاں پہنچ گئے، وہ کسی کو پہچانتے نہ تھے، بحث کے موضوع سے واقف ہوئے بغیر اس وقت انھوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ اشعار پڑھ دیے:-

وکم قلت للقوم انتم علی　　　شفا حفرۃ من کتاب الشفا

فلما استہانوا بتوبیخنا　　　فرغنا الی اللہ حسبی کفا

فماتوا علی دین ارسطالیس　　　وعشنا علی ملۃ المصطفیٰ

(ہم نے کتنا کہا کہ تم لوگ کتاب الشفا کی وجہ سے ہلاکت کے گڈھے کے کنارے ہو، لیکن جب وہ لوگ ہماری سرزنش کو حقیر سمجھے تو ہم نے یہ کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، یہ لوگ تو ارسطو کے دین کی طرف مائل ہو گئے اور ہم لوگوں نے ملت مصطفوی کی زندگی بسر کی)

مزید تائید کے لیے مولانا جامی کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:

نور دل از سینۂ سینا مجوی　　　روشنی از چشم نہ بینا مجوی

یہ تمام اشعار سن کر حکیم الملک گیلانی بہت برہم ہوئے، شیخ سلیمؒ نے ملا صاحب سے فرمایا" ان لوگوں میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تونے آکر اور بھی بھڑکا دیا" (ج ۳ ص ۱۶۲، ۱۶۱)

تعلیم کی فراغت کے بعد ملا صاحب نے کچھ دنوں اکبر کے ایک امیر محمد حسین خاں کے یہاں ملازمت کی جس کو کانت وکولہ (ضلع سہارنپور) کی جاگیر دی گئی تھی، یہاں انکے سپرد صدارت اور فقرا کی خدمت کی گئی، ایک روز وہ قنوج کے مضافات میں مکن پور حضرت شاہ مدار کی زیارت کے لیے گئے، وہاں کسی معشوق کے دام میں پھنس گئے اور بقول ان کے اس شہوت و آز کو عشق سمجھ بیٹھے، اس واقعہ کو یاد کر کے لکھتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے، انسان ہی کا کچا دودھ پیا تھا، غفلت جبلی سے بالاتر نہیں ہو سکے

اس وقت تک اکبر کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہو چکی تھیں، اس کی سلطنت کے حدود میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی حکومت کا نظم و نسق اس کی مرضی کے مطابق ہوتا گیا اور جب ملک میں اس کا کوئی دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان عبادت و ریاضت کی طرف ہو گیا، اس کی صحبتیں اجمیر کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ رہنے لگیں، اس کا زیادہ تر وقت اللہ اور رسول کے تذکرہ میں گزرنے لگا، اس کی مجلسوں میں صوفیانہ یا فقہی اور علمی مباحث ہونے لگے، وہ رات کے وقت مراقبے میں بیٹھتا، "یا ہو" "یا ہادی" کا وظیفہ بھی پڑھتا، جب عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی، تو علماء اور مشائخ اس میں آکر علمی اور مذہبی مذاکرے کرتے لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ اس عبادت خانہ میں سادات، مشائخ اور علماء آپس میں جھگڑنے لگے، نشست کی تقدیم و تاخیر پر بھی لڑائی ہوئی، بالآخر بادشاہ نے سب کی جگہیں متعین کر دیں، پھر بھی ہنگامہ برپا رہتا ایک رات بڑا شور و غل ہوا تو اکبر نے ملا صاحب سے کہا جو شخص بھی نامعقول بات کرے اس کی اطلاع دو، اس کو اس مجلس سے اٹھا دیا جائے گا، یہ سن کر ملا صاحب نے کہا کہ اس طرح تو سب ہی کو اٹھوانا پڑے گا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲)

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو ہمایوں نے شیخ الاسلام بنایا تھا، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ وہ کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیاداری کی وجہ سے ذلیل سمجھے جاتے، شیخ عبدالنبی صدر الصدور تھے لیکن ان کے غرور و تکبر کی وجہ سے انکی کوئی عزت نہ تھی، ملا صاحب کا بیان ہے کہ ان ہی علماء کی حرکتوں کو دیکھ کر وہ اسلام سے برگشتہ ہوتا گیا۔

اکبر ملا صاحب کی فضیلت، مذہبیت اور خوش گلوئی سے متاثر ہوا تو اس نے امامت کی خدمت

یں داخل کر لیا گیا، علما اپنے تبحر کا ڈنکا بجاتے رہتے کسی دوسرے کو نظر میں نہ لاتے، بحث و مباحثہ کرکے اپنے کو ممتاز دکھانے کی کوشش کرتے، خداوند تعالیٰ کی عنایت سے میں اپنی قوت طبع، ذکاوت فہم اور دلیری سے جو کہ جوانی کے زمانے کی لازمی چیزیں ہیں، ان میں اکثر پر غالب آ گیا، جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو شہنشاہ نے میری تعریف کی تھی کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی سرکوبی کرے گا، شہنشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے، اس لیے میں نے بھی ان پر طرح طرح کے الزامات رکھے جن کو شہنشاہ نے پسند کیا، شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میری رسائی نہ تھی اس لیے وہ مجھ سے ناخوش رہے، مناظرہ کے وقت میرے فریق کی طرفداری کرتے اور یہ مثل صادق آئی کہ سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا لیکن رفتہ رفتہ ان کی کلفت الفت میں بدل گئی، ان ہی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل بھی باریاب ہوا، اس کی دانش اور ہوشمندی کا ستارہ خوب چمک رہا تھا، اس لیے گوناگوں نوازشوں سے ممتاز ہوا۔" (منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۱۷۳-۱۷۲)

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کے جمادی الآخر میں اکبر جب قنوج میں مقیم تھا، تو اس نے ملا صاحب سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ فارسی میں کرنے کی فرمایش کی، انھوں نے اس کا ترجمہ کیا تو اکبر کو پسند آیا، اور اس کا نام خرد افزا رکھا گیا (ص ۱۸۳)۔ لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس ترجمہ کو اپنے شاہی طبیب حکیم الملک گیلانی کو پڑھنے کے لیے دیا، اور پھر پوچھا کہ اس کی تحریر و انشا کیسی ہے، تو انھوں نے کہا کہ اس کی عبارت تو فصیح ہے، لیکن پڑھنے میں کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی، (ص ۱۹۱ ج ۳)، پرکھوتم نامی ایک برہمن نے اس کی ایک شرح بھی لکھی (ج ۲ ص ۳۲۰)

۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) شاہی عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی، ملا صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

اسی اثنا میں ملا صاحب کا بیان ہے کہ عبادت خانہ میں علماء کی زبانوں کی چھریاں ایسی بے باکی سے چلنے لگیں کہ اکبر اسلام سے دور ہوتا چلا گیا، انھوں نے اکبر کے انحراف کا بڑا اچھا تجزیہ لکھا کیا ہے :-

> درباری علماء میں کچھ اس طرف اور کچھ اس طرف ہو گئے، ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بنانے لگے، ان اختلافات کی وجہ سے اہل بدعت کو اپنے فاسد اور باطل خیالات کے ساتھ اپنے کمین گاہوں سے نکلنے کا موقع مل گیا، انھوں نے غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی، بادشاہ اخلاص کے ساتھ حق کا طالب تھا، لیکن ان پڑھ تھا، کافروں اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے محبت کرتا تھا، اس لیے ان مباحث کی وجہ سے شک میں پڑ گیا، اس کی حیرت بڑھتی گئی، اپنے اصلی مقصد سے پھر گیا، پھر تو اس کے سامنے سے شرع مبین اور دین متین کی مضبوط دیوار ٹوٹ گئی، پانچ چھ سال میں اسلام کا اثر باقی نہ رہا، سارا قضیہ الٹ کر رہ گیا، (ج ۲ ص ۲۵۵)

ملا صاحب نے اکبر کی بے دینی کا سارا الزام علماء کے باہمی اختلافات پر ڈال دیا ہے، وہ اقرار کرتے ہیں کہ اکبر شروع میں طلب حق کا سچا جذبہ رکھتا تھا، اس کی طبیعت میں تحقیق و تجسس تھا، ہر دین اور مذہب کے اعتقادات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اس کے بدعقیدہ مصاحبوں اور جھگڑالو علماء نے اس کا رخ پھیر دیا، علماء کا یہ فرض تھا کہ اس کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے، لیکن انھوں نے اپنے اعزاز و رتبہ کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنا شروع کیا، ایک ہی مسئلہ کو علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا، بادشاہ ان باتوں سے دل برداشتہ ہوتا چلا گیا، دربار میں مختلف مذاہب اور مسالک کے گمراہ کن

ان کے سپرد کی اور اسی کے ساتھ بیستی کا عہدہ دینا چاہا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:-

"بادشاہ نے مجھکو امام بنایا، اور حکم دیا کہ داغ کی خدمت بھی انجام دوں، اور کچھ خرچ دیکر فرمایا کہ بیستی عہدہ کے مطابق میں بھی گھوڑوں کا داغ کراؤں، اسی زمانہ میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں پہنچ گیا تھا، شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں، یہی حال میرا اور ابوالفضل کا تھا، لیکن وہ ہوشیار اور زمانہ ساز تھا، اس کو بھی جب بیستی کا عہدہ دیا گیا تو اس نے داغ اور محلہ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کرالی اور منصب دو ہزاری کے عہدہ اور وزارت تک پہنچ گیا، اس کے برعکس اس فقیر نے اپنی ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس نوکری کو قبول نہ کیا......

اور اس خام خیالی میں رہا کر بجائے ملازمت کے مدد معاش کے لیے کوئی آراضی وغیرہ عنایت ہو جاتی تو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر علمی خدمات میں مصروف رہے گا۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۱۶)

اکبر کے حکم سے ملا صاحب اتھربن کے ترجمے میں لگ گئے (ج ۲ ص ۲۱۲)۔ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں جہاد کے شوق میں رانا کیکا (رانا پرتاب) کے خلاف لڑنے کے لیے شاہی لشکر میں شریک ہوئے، (ج ۲ ص ۲۳۳) اور وہاں سے واپس ہوئے تو مان سنگھ کی طرف سے رانا کا ہاتھی "رام پرشاد" لاکر اکبر کی خدمت میں پیش کیا، جس سے خوش ہو کر اکبر نے ان کو مٹھی بھر اشرفیاں انعام میں دیں، جو تعداد میں ۹۶ نکلیں (ج ۲ ص ۲۳۶)، اسی سال انھوں نے دیپالپور میں اکبر کو کلام پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ اور وعظ و خطبہ کی ایک بیاض پیش کی (ج ۲ ص ۲۴۹)

۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں ملا صاحب نے دربار سے پانچ مہینے رخصت لیکر اپنے وطن بساور گئے، وہاں ایک سال رہ گئے، جس سے اکبر ان سے ایسا بدظن ہوا کہ ان کی طرف سے بے توجہ ہوتا چلا گیا جس کی کھٹک ملا صاحب زندگی بھر محسوس کرتے رہے۔ (ج ۲ ص ۲۵۳)

صاحب کے بیان کے مطابق اور علما نے کراہت کے ساتھ اس پر دستخط کیے۔ اس کے
بسی کو اکبر کی مخالفت کی مجال نہیں رہی، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر کی جسارتیں بڑھ
ہیں، اس نے قرآن کو مخلوق قرار دیدیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے
رے میں شکوک کا اظہار کیا، فرشتوں، معجزوں اور کرامتوں وغیرہ کا منکر ہو گیا،
نے کے بعد بقاے ارواح اور عذاب و ثواب کو تناسخ پر منحصر کر دیا (ج۲ ص۳۰۲-۲۰۱)
ملا صاحب نے شاید خود ہی اس بے راہ روی کی تاریخ "فتنہ ہاے امت" سے نکالی، لیکن
عجب کی بات ہے کہ اس بے دین بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر ملازمت کر لی، جب
وہ اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے پوچھا کہ کیا ضعف تھا کہ ملازمت ترک کر دی"
ان کے بجاے ایک درباری امیر غازی خاں بدخشی نے برجستہ کہا "قسمت کا ضعف تھا"
جب وہ شاہی ملازمت سے دوبارہ وابستہ ہو گئے تو ان کی جاگیر بھی بحال ہو گئی (ج۲ ص۲۷۰-۲۵۰)
دوبارہ وابستگی کے بعد اکبر کی بے دینی سے ان کا دل کڑھتا رہا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دربار کے
کمینے، ذلیل اور عالم نما جاہل علما نے اکبر کو باور کرایا کہ وہ اس عہد کے صاحب زمان ہیں"
اور بعض کتابوں سے یہ شہادت پیش کی ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور
ہوگا، اور صاحب دین حق کے کلمہ کے جمل کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں، اس کی مصداق
صرف بادشاہ کی ذات ہے (ج۲ ص ۲۸۷) ملا صاحب کے بیان کے مطابق اکبر نے اپنے
اٹھائیسویں سال جلوس میں یہ اعلان کیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے پورے ہزار سال
ہو چکے ہیں، آپ کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے وقت آ گیا ہے کہ
ایک نئے دین کا اعلان کیا جائے (ج۲ ص۳۰۱)

اس اعلان کے بعد ملا صاحب کے بیان کے مطابق جو احکام جاری کیے گئے ان میں کچھ یہ ہیں:-

عناصر موجود تھے، انھوں نے علماء کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھایا، اور دین کے معتقدات کو خلافِ عقل ثابت کرکے اکبر کے ذہن کو انکار اور انحراف کی طرف مائل کردیا۔ (ج ۲ ص ۲۵۶)

اکبر نے پھر جو مذہبی وطیرہ اختیار کیا، اس کو ملا صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اور یہ صرف ان ہی کی تاریخ منتخب التواریخ میں ملتی ہے، اس کو مختصر طریقہ پر اس طرح درج کیا جاسکتا ہے:

بادشاہ کا خیال ہوگیا تھا کہ حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے (ج ۲ ص ۲۵۰) وہ عقیدۂ تناسخ کا قائل ہوگیا (ج ۲ ص ۲۵۸) شیخ تاج الدین ولد شیخ ذکریا نے وحدۃ الوجود کی روشنی میں اس کو انسان کامل کا درجہ دیدیا، جس کے بعد اس کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام زمین بوس رکھا گیا، چہرۂ شاہی کو کعبۂ مرادات اور قبلۂ حاجات قرار دیا گیا (ج ۲ ص ۲۵۹) بیربر کے اثر سے دربار میں آفتاب پرستی کا بھی فروغ ہوا۔ اور آفتاب کو مظہر کامل، سرچشمۂ سعادت، نیر اعظم، عطیہ بخش ہمہ عالم بنایا گیا (ج ۲ ص ۲۶۰) نور وزجلالی کی تعظیم اہتمام سے کی جانے لگی، گائے کا ذبیحہ بھی بند کردیا گیا، اس کا گوبر پاک سمجھا جانے لگا گائے کا گوشت کھانا حرام ہوگیا، گاؤکشی کی سزا قتل قرار دی گئی، محل کے اندر یہ سمجھ کر آتشکدہ بنایا گیا کہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔ اکبر آفتاب کے ساتھ آگ کو سجدہ کرنے لگا۔ وہ پیشانی پر قشقہ لگاکر دربار میں آنے لگا۔ راکھی بھی بندھوانی شروع کردی، وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۲۶۱-۲۶۲)

پھر اکبر کے حقِ اجتہاد کے لیے ایک محضر تیار کیا گیا جس کے مطابق اس کو امام عادل قرار دے کر یہ حق دیا گیا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اس کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے، اس محضر کو شیخ مبارک ناگوری نے مرتب کیا،

رنی پڑھنا عیب ہوگیا، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون ہونے لگے، وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۳۰۶-۳۰۷)

شاہی دربار کا جب یہ رنگ ہوگیا تو ملا صاحب اس سے بد دل ہوئے، اپنی بددلی اور آزردگی کا حال اس طرح قلمبند کرتے ہیں:-

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو فقیر گوشۂ عزلت میں بیٹھ گیا

اذ عظم المطلوب قل المتاعب

یعنی جب خواہشات بڑی ہوجاتی ہیں تو مشکلات بڑھ جاتی ہیں،

میں قرار کی آیت کو پڑھتا، بادشاہ کی نظر سے گر گیا، ان کی آشنائی بیگانگی میں تبدیل ہوگئی، لیکن الحمدللہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں،

دل در رنگ و بو نشد نیکو شد کہ نشد	جز در تو فرو نشد نیکو شد کہ نشد
گفتی کہ بہ حجم از نیکو شد کارت	دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

اپنے کو نہ بادشاہ کی رعایت کے قابل اور نہ انکی خدمت کے لائق سمجھتا تھا،

با تا تکلف بہ یک سو نہیم	نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی کبھی صف نعال سے کورنش بجا لاتا، اور اہل محفل کا تماشا دیکھ لیتا

کرصحبت بر نیاید تا موافق نیست مشربہا

اور اس کے بعد یہ حال تھا

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است	صحبت گذاشتم ز تماشائیاں شدم

پھر اوپر دین الٰہی کی جو تصویر کھینچی ہے، اس کے بارہ میں اسی سلسلہ میں کہہ گئے ہیں کہ حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ان حالات کو نہ لکھتا، لیکن خدائے عزوجل گواہ ہے، اور اس کا گواہ ہونا کافی ہے کہ میرے ان باتوں کے لکھنے کا مقصد

سکہ پر الفی تاریخ ثبت کیا جائے، اور یہ ہزار سنہ رسول اللہؐ کی رحلت سے شروع کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱) بادشاہ کو سجدہ کرنا لازم ہے، شراب جسمانی صحت کی خاطر پی جاسکتی ہے، خاص خاص شرائط کے ساتھ طوائفوں کے یہاں جانے کی اجازت دیدی گئی، (ج ۲ ص ۳۰۲) گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کر دی گئی، داڑھی منڈانے کا عام رواج ہو گیا، داڑھی کی مذمت کی گئی، دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی (ج ۲ ص ۳۰۴) جو کوئی اس دین کو قبول کرتا، اس کو اقرار کرنا پڑتا کہ اپنے باپ دادا کے مجازی اور تقلیدی اسلام سے انکار کرتا ہوں، اور دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اخلاص کے چار گانہ مراتب یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین، کو قبول کرتا ہوں (ج ۲ ص ۳۰۴) احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دیدیا گیا، غسل جنابت ضروری نہ سمجھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۵) موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا بے معنی قرار دیا گیا، اس کے بجائے ولادت کے روز کھانا پکوا کر دعوت کرنے کی ہدایت دی گئی، اور اس کا نام آش حیات رکھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۵-۶) شیر اور جنگلی سور کا گوشت حلال کر دیا گیا، چچا، ماموں، اور قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کر دیا گیا، سونا اور ریشمی کپڑے جائز قرار دیے گئے، یہاں تک لکھتے لکھتے ملا صاحب کو غصہ آگیا ہے اور لکھتے ہیں کہ بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے نماز، روزہ اور حج کی مذمت اور تمسخر میں کئی رسالے لکھے، جو بادشاہ کی نظر میں مقبول ہوئے"

> نماز، روزہ و حج خود پیش ازاں ساقط شدہ بود، بعضی اولاد الزنا چوں پسر ملا مبارک و شاگرد رشید شیخ ابوالفضل رسائل درباب قدح و تمسخر ایں عبادات بدلائل نوشتہ و مقبول افتادہ باعث تربیت گشت (ج ۲ ص ۳۰۶)

عربی کا سنہ ہجری موقوف کر دیا گیا، اسکی جگہ بادشاہ کے سنہ جلوس کی تاریخ لکھی جانے لگی،

میں نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی، اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا نہ کرے
کسی اور کو دیکھنا نصیب ہو (ج ۳ ص ۷۶-۷۵)۔ مدد معاش کے نہ ملنے کی وجہ سے
گوشہ نشین نہ ہو سکے، لیکن ملازمت کرکے کڑھتے بھی رہے، ان کو ایک موقع پر اجمیر کی
تولیت ملنے والی تھی لیکن نہ ملی، اسی سلسلہ میں وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سلسلہ
کی ایک اولاد شیخ حسین کی ریاضت، عبادت، مجاہدہ، توکل وقناعت کا ذکر کرتے
ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی بزرگی کے طفیل میں ان کو شاہی ملازمت سے رہائی مل جاتی،
تو شاید دربار کی لایعنی گفتاری، پریشان گوئی، بیہودگی، اور دروغ نویسی سے
نجات پا جاتے، اور وطن جاکر اپنے اہل وعیال کے ساتھ اور بقیہ عمر مفید کاموں میں صرف
کرتے (ج ۲ ص ۹۰-۸۹) لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، اور وہ شاہی ملازمت
سے وابستہ رہے۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ ملا صاحب ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں پانچ مہینے کی رخصت
پر گئے تو ایک سال تک واپس نہیں ہوئے۔ ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں دربار میں حاضر
ہوئے، تو اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جب بادشاہ اجمیر کی حاضری کے بعد فتح پور
واپس ہو رہے تھے، تو انھوں نے تودہ کے مقام پر حاضر ہو کر اپنی ایک کتاب **چہل حدیث**
پیش کی جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں تھیں، اس کا نام بھی
تاریخی تھا، بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانہ میں داخل کر لی، اور رخصت میں وعدہ خلافی
کی تقصیر کا کوئی ذکر نہیں کیا، (ج ۲ ص ۲۵۴-۲۵۵)

انھوں نے ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں اکبر کے حکم سے **تاریخ الفی** کی تدوین میں شرکت کی
(ج ۲ ص ۳۱۰-۳۱۹) ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں **مہابھارت** کے فارسی ترجمہ کرنے

صرف اس دین کے ساتھ درد اور ملت مرحوم اسلام کے ساتھ دل سوزی کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے، جو عنقا کی طرح کوہ قاف میں اجنبی بن گیا ہے، اور اسکے بازو کا سایہ اس دنیا کے خاک نشینوں پر سے جاتا رہا ہے، میں تو خدا کی قسم ملامت، نفرت، حسد اور تعصب سے پناہ مانگتا ہوں (ج ۲ ص ۶۴ - ۲۶۳)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: (ج ۲ ص ۲۷۹)

میں نے ہر چند چاہا کہ میں صرف تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن میرا قلم بے اختیار ہو کر دوسری طرف بھٹک جاتا ہے، اور اس نئے مذہب اور نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے...... کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا......

خطابی با فلک کردم از تیغ جفا کشتی　　شہان مجلس آرائی وجوان مردان ترک را
زمام حل و عقد خود نہادی در کف قومی　　کہ از ردی کرم بر ابتان تشریف سگ را
ہماں در گوش جانم گفت فارغ باش خوش بنشین　　کہ سلطت برکند ایام ہر دہ روز یکیک را

ملا صاحب کی اصلی خواہش یہ رہی کہ ان کو مدد معاش کے طور پر کوئی جاگیر مل جاتی تو وہ نوکری نہ کرتے بلکہ توکل و قناعت کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علمی کاموں میں لگے رہتے (ج ۲ ص ۴، ۲۲ و ۲۰۶) لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، مجبوراً ملازمت کر لیتے پھر جس کے بدلے میں ان کو جاگیر ملتی رہتی (ج ۲ ص ۴۴ ۳) میر سید محمد میر عدلی امروہی کے ذکر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ موروثی تعلقات اور قدیم شفقت کی بنا پر وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے، میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں برابر کہا کرتے تھے مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو، صدور کی خوشامد کی ذلت نہ اٹھاؤ، بادشاہی ملازمت میں داخل ہو کر داغ کرا لو، کیونکہ شاہی ملازمین میں بڑی انانیت اور فرعونیت ہوتی ہے

کے ان کے فارسی ترجمہ کا نسخہ خرد افزا گم ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ان کو بار بار دربار میں طلب کیا گیا، پھر بھی حاضر نہ ہو سکے، لکھتے ہیں :-

شاہی کتب خانہ سے نامہ خرد افزا کا نسخہ گم ہو گیا۔ سلیمہ سلطان بیگم نے چند بار بدایوں قاصد بھیجکر طلب کیا لیکن کچھ ایسے موانع تھے کہ جا نہ سکا۔ آخر حکم ہوا کہ میری مدد معاش موقوف کر دیجائے، اور میری مرضی کے خلاف مجھکو طلب کر لیا جائے۔ اس موقع پر مرزا نظام احمد (خدا ان کو غریق رحمت کرے) نے دوستی کا پورا حق ادا کیا، شیخ ابوالفضل نے بھی بار بار بادشاہ سے کہا کہ کوئی نہ کوئی موانع ضرور درپیش ہیں جن سے میں نہیں آسکا ہوں اور وہاں رہ گیا ہوں۔ (ج ۲ ص ۳۸۸)

اس موقع پر فیضی نے بھی دکن سے بادشاہ کو ملا صاحب کی تائید میں پرزور خط لکھا، جس کا اثر اکبر پر بھی ہوا۔ ان سفارشات کے بعد ملا صاحب پھر دربار سے وابستہ ہو گئے، اور ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں جامع رشیدی کے ترجمے میں شریک ہوئے، اور ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں بحر الاسمار کا ترجمہ مکمل کیا، جس کے صلہ میں اکبر نے ان کو دس ہزار ٹنکے اور ایک گھوڑا انعام میں دیا (ج ۲ ص ۴۰۲-۴۰۱)۔ وہ برابر اپنی علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ ان کی ایک اور تصنیف نجات الرشید ہے، جس میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی تفصیل ہے (ج ۲ ص ۴۰۰) یہ کتاب انھوں نے مرزا نظام الدین احمد بخشی مؤلف طبقات اکبری کی فرمائش پر لکھی، اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ

"این تالیف سبب نجات ہر رشید و رشد ہر طالب مزید گردد۔"

ملا صاحب کے تراجم تو زیادہ تر اکبر کے شاہی کتب خانہ کے لیے زینت بن کر رہ گئے، لیکن ان کی جو تصنیف سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ ان کی منتخب التواریخ ہے،

میں بھی شریک ہوئے (ج ۳ ص ۱۱۸) ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) میں اکبر ہی کے حکم سے
رامائن کا ترجمہ کرنا شروع کیا، جو ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں ختم ہوا (ج ۲ ص ۳۳۶، ۰۲۳
۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں اکبر ہی کی فرمایش پر تاریخ کشمیر مترجمہ مولانا شاہ محمد
شاہ آبادی کی زبان کو سلیس کرکے اس کا ایک انتخاب تیار کیا (ج ۲ ص ۳۷۴)
۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں شاہی حکم کے مطابق معجم البلدان کے دس جز کا ترجمہ فارسی
زبان میں کیا (ج ۲ ص ۳۷۵)، ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا
تو دربار سے پانچ مہینے کی رخصت لی، اس سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"مجھکو پانچ مہینے کی رخصت ملی، مرزا نظام الدین احمد نے بادشاہ کی خدمت میں
میری طرف سے عرض کیا کہ میری والدہ دنیا سے کوچ کر گئی ہیں، میں اپنے بھائیوں
اور رشتہ داروں کو تسلی دلاسا دینے کے لیے رخصت چاہتا ہوں، بادشاہ نے
خفگی کے ساتھ یہ رخصت دی، اس موقع پر صدر جہاں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ
بادشاہ کو سجدہ کرو، لیکن میں نے نہیں کیا، بادشاہ نے صرف اتنا کہا کہ گذار یعنی
جانے دو، لیکن رنجیدہ ہو کر مجھکو سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا، میں مرزا کے ساتھ
شمس آباد چلا گیا، اور وہاں جاکر بیمار پڑ گیا" (ج ۲ ص ۳۷۶)

ملا صاحب کے اسی انا سے ان کی سیرت کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے، وہ اپنی خودداری
اپنے علم اور اپنی عالمانہ شان کو شاہی دربار میں گرو میں رکھ دیتے تو ان کو بھی وہی درباری
عزت اور دنیاوی وجاہت و ثروت مل سکتی تھی، جو ان کے معاصر درباری علما کو ملی،
لیکن ان چیزوں کے لیے اپنے انا کو کبھی قربان کرنا پسند نہیں کیا،

وہ وطن گئے تو وقت پر واپس نہ آسکے، اسی اثنا میں شاہی کتب خانہ سے سنگھاسن بتیسی

انھوں نے دوسرے کے ساتھ کیا، (ج ۳ ص ۹۴-۹۲-۳ ۳)۔ ان کا یہ ڈر صحیح ثابت ہوا،
موجودہ دور میں ان پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں،

ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکبر کی بہت بری تصویر پیش کرکے اسکی سطوت شکنی کی ہے، اور ان کو خود اس کا احساس رہا، اسی لیے اپنی زندگی میں اس کی اشاعت نہ کرا سکے، جہانگیر نے بھی اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی تھی، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسی کتاب میں جب وہ اکبر کی سیاسی اور حربی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی شاہانہ سطوت کو برقرار رکھتے ہیں، کہیں اس کی عظمت میں فرق نہیں آنے دیتے، جب جب وہ اس کے یہاں باریاب ہوئے، اس کے ذکر میں بھی شاہانہ آداب کا لحاظ رکھا ہے۔ البتہ اس کے مذہبی عقائد میں ان کا قلم شمشیر برہنہ ہوگیا ہے، اور پھر اکبر ہی پر کیا منحصر وہ تو علماء میں بھی نقص دیکھتے تو ان کے لیے بھی سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے رہے۔ مثلاً شیخ الاسلام عبداللہ سلطانپوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتے کہ ہر سال کے خاتمہ پر اپنا سارا مال بیوی کے نام کر دیتے، اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام واپس لے لیتے۔ وہ تو ایسے ایسے فریب کرتے کہ بنی موسیٰ یعنی بنی اسرائیل بھی سنکر شرمندہ ہو جاتے، ان کی خست، رذالت، خباثت، مکاری، دنیا داری اور ستمگاری کے بہت سے قصے مشہور ہیں، جو زیادہ تر انھوں نے پنجاب کے علماء، فقراء، اور ائمہ کے ساتھ دکھائیں، یہ سب ایک ایک کرکے ظاہر ہونے لگیں، کیونکہ ایک دن راز ظاہر ہی ہو جاتا ہے، پھر تو زبانیں کھل گئیں، ان کی اہانت، استخفاف اور مذمت میں ایک سے ایک قصے سنائے جانے لگے۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

لیکن اسی کے ساتھ وہ عبداللہ سلطانپوری کے فضائل کے بھی معترف تھے، اپنی

یہ انھوں نے گوشۂ عزلت میں بیٹھکر اپنی مرضی کے مطابق لکھی، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں اکبر سے قبل کے سلاطین ہند کی تاریخ ہے، دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علما، مشائخ، اطبا اور شعرا کا ذکر ہے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ملا صاحب نے خدا کی قسم کھاکر اعلان کیا ہے کہ انھوں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ملامت، نفرت، حسد اور تعصب کا جذبہ نہیں ہے، وہ اس کتاب کے خاتمہ پر بھی لکھتے ہیں کہ ان کے سودائی قلم نے ان کے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے، ان کا یہ جنون شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی حمایت میں ظاہر ہوا ہے، ان کو دکھ تھا کہ اسلام کے احکام میں ایسے تغیرات کیے گئے جس کی مثال گذشتہ ہزار سال میں نہیں ملتی۔ پھر اس زمانہ کے تمام کفریات اور حشویات کو مستحسنات قرار دیکر خوشامد یا دین کی ناواقفیت یا حق پوشی کی بنا پر املا اور انشا کر دیے گئے ہیں، یہ غالباً ابوالفضل کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے ملا صاحب نے اپنے مشاہدات قلمبند کرنے شروع کر دیے، تاکہ آیندہ لوگ خرافات باطل اور تطویلات لاطائل پڑھ کر تذبذب میں مبتلا نہ ہو جائیں، لکھتے ہیں کہ اور ارباب تصنیف و تالیف تقرب ملوک، استجلاب منافع اور تحصیل مقاصد کی خاطر قلم چلاتے رہے، یہ بھی شاید ابوالفضل ہی پر چوٹ ہے، اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ طمع اور توقع سے بالاتر ہو کر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتے ہیں، تاکہ جو لوگ اس زمانہ کے حالات وحقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں،

اگر شراب خوری جرعہ فشان بر خاک ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

اس کتاب کو لکھتے وقت ان کو ڈر تھا کہ ان کے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو

کے زمانہ میں ایسا صدر نہ ہوا ہوگا، انھوں نے جتنے اوقاف قائم کیے کسی اور صدر نے اس کا دسواں حصہ بھی نہ کیا ہوگا (ج ۳ ص ۸۰ - ۷۹) لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعد میں ان کا طرز عمل بدل گیا،

شریف آملی کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مردود و مطرود پاؤں چلے کتے کی طرح ایک دیار سے دوسرے دیار میں مارا پھرتا، ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا، سب سے جھگڑتا، یہاں تک کہ اس نے الحادکارات اختیار کیا، کچھ عرصہ صوفیوں کے بھیس میں ملخ جاکر مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں جو کہ شیخ حسین خوارزمی قدس اللہ سرہ کے پوتے تھے، درویشوں کے ساتھ رہا، درویشی سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے وہ درویشوں کے ساتھ ہرزہ سرائی اور ہر کار قسم کی نوک جھونک کرتا رہتا، پریشان ہوکر لوگوں نے اس کو خانقاہ سے نکال دیا، اس کے لیے یہ شعر کہا گیا،

ہست یک محدے شریف بنام　　　نا تمامی بطور خویش تمام

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ گھومتا پھرتا مالوہ پہنچا، اور اپنے کو دسویں صدی کا مجدد اعلان کرایا، اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، تو اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، اکبر اس سے خلوت میں باتیں کرتا، اس نے اپنے جہلات کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، اور اس کا نام ترشح ظہور رکھا تھا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اپنی اس مکاری کے باوجود اپنی فضیلت کا سکہ جما رکھا تھا اور ہزاری منصب تک پہنچ گیا، اور بنگالہ میں مذہب حق کا داعی مقرر ہوا، بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بادشاہ کی نیابت بھی کرتا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۴۸)

بعض حلقوں میں ان کی راسخ العقیدگی کو ان کے مذہبی تعصب اور غلو پر محمول کیا جاتا ہے،

کتاب کی تیسری جلد میں علماء کے تذکرے میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے منفرد اور یگانۂ روزگار عالم تھے، عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور علوم نقلی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں، جن میں عصمۃ انبیاء اور شرح شمائل النبیؐ بہت مشہور ہیں...... شریعت کے پھیلانے میں ہمیشہ کوشاں رہے (ج ۳ ص ۷۰)۔ اسی طرح صدر الصدور شیخ عبد النبی کی تصویر تو ایک طرف اس طرح کھینچتے ہیں کہ جب وقت وہ اپنی مسند جاہ و جلال پر بیٹھ جاتے تو بڑے بڑے امراء اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے ان کے پاس آتے۔ وہ ان کی بہت کم تعظیم کرتے، اور جب وہ حد سے زیادہ الحاح و عاجزی کرتے تو ان مدرسوں کو جو ہدایہ اور دوسری منتہی کتابیں پڑھا سکتے تھے، تقریباً سو بیگہے کی آراضی منظور کرتے، باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض ہوتے، ضبط کر دیتے، اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں کو اچھی اچھی زمینیں عطا کر دیتے تھے، اس طرح ان کی بدولت علم اور علماء دونوں کی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی، وہ اپنے دفتر میں دوپہر کے بعد نہایت غرور سے بیٹھ کر وضو کرتے تو مستعمل پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور مقربوں کے سروں اور کپڑوں پر گرتے رہتے، مگر ان کو ذرہ برابر اس کی پرواہ نہ ہوتی (ج ۲ ص ۲۰۵)۔ دوسری طرف انکے بارہ میں یہ بھی لکھ کر ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس گنگوہی کے بیٹے تھے، چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ جا کر حدیث کا علم پڑھا، وہاں سے واپس آئے تو اپنے آباء و اجداد کی روش کے مطابق سماع اور غناء کے منکر رہے، اور محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے، تقوی، طہارت، پاکبازی اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، جب منصب صدارت کو پہنچے تو ہر جگہ مدد معاش میں زمین دی، وظائف مقرر کیے، اوقاف قائم کیے، کسی اور بادشاہ

لکھا ہے، لکھتے ہیں کہ وہ مذہباً شیعہ تھے، بہت ہی منصف مزاج، عادل، نیک نفس، دار، متقی اور عفیف تھے، ان میں شرفا کی تمام خوبیاں تھیں، علم، حلم، جودت فہم، وجدت طبع صفائی قلب اور ذکاوت وغیرہ کے لیے مشہور رہے، ان کی اچھی اچھی تصانیف بھی ہیں، شیخ فیضی کی مہمل غیر منقوط تفسیر پر انھوں نے جو توقیع یعنی سرنامہ لکھا ہے وہ تعریف کے قابل ہے، شعر گوئی کا بھی ذوق تھا، اور دلنشین اشعار کہتے، حکیم ابوالفتح کے وسیلہ سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے...... انھوں نے اپنی قضات کے زمانے میں لاہور کے شرارت پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، درست کر دیا رشوت کی ساری راہیں بند کرا دیں، اس سے بڑھکر اور انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، ان کے متعلق یہ شعر صادق آتا ہے (ج ۳ ص ۳۸-۱۳۷)

قاضی آں کس کہ نکردی ہمہ عمر قبول　　در قضا ہیچ زکس جز کہ شہادت ز گواہ

ہندوؤں میں ملا صاحب راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بیربر سے خوش نہیں تھے، راجہ بیربر کے لیے تو وہ بہت ہی سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اچھے ہندوؤں کی تعریف میں ان کی تحریر شگفتہ ہوگئی ہے، جو راگدھ کے راجہ رام چندر کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہمت اور اخلاق میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بخششوں کا یہ حال تھا کہ ایک کروڑ روپے ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا، ابراہیم سور کو بہت کچھ شاہانہ ساز و سامان دیا، تان سین اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن جلال خاں قورچی وعدے وعید کر کے اس کو شاہی دربار میں اپنے ساتھ لے آیا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب رام چندر شاہی دربار میں آیا تو اس نے ایک سو بیس[۱۲۰] قیمتی لعل و جواہر نذرانے میں دیے، ان کی قیمت پچاس ہزار روپے ہوتی تھی۔ (ج ۲ ص ۳۲۵)

لیکن ان کی تصانیف میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ انھوں نے شیعوں اور ہندوؤں کی تعریف دل کھول کر کی ہے، خانخانان بیرم خاں کی فیاضی، علم پروری اور عبادت گذاری کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، اور جب اس کو ہلاک کیا گیا تو ملا صاحب اس کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ عازمِ حج تھا، کسی نے اس کی تاریخِ وفات اس مصرعہ سے نکالی تھی :

گفتا کہ شہید شد بیرام

ملا صاحب نے یہ تاریخ قلمبند کرکے لکھا ہے کہ انھوں نے خود یہ تاریخ نکالی

گفت گل گلشن خوبی نماند (ج ۲ ص ۲۷۴)

ملا صاحب اکبر کے معزز امیر فتح اللہ شیرازی کی دنیا داری اور امراپسندی کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن ان کو اعلم العلمای زماں تسلیم کرتے ہیں (ج ۳ ص ۱۵۴)، ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھاتے رہتے، دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک کے مطابق نماز پڑھا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کو تقلید پرست سمجھتا، لیکن ان کے علم و حکمت کا خیال کرکے چشم پوشی سے کام لیتا، پھر لکھتے ہیں کہ جب وہ وزارت کے عہدہ پر راجہ ٹوڈرمل کے شریک کار بنا دیے گئے تو نہایت دلیری کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کرکے وزارت کے فرائض بجا لاتے تھے، ملا صاحب ان فضائل سے متاثر ہوکر یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ جب وہ دربار میں آئے تو ان کی آمد کی تاریخ "شاہ فتح اللہ امام اولیا" سے نکالی گئی، (ج ۲ ص ۳۱۶)۔ اپنی تیسری جلد میں قاضی نور اللہ شستری کی مدح تو ایسی کی ہے جس سے زیادہ ان کا انتہائی درجہ کا عقیدت مند بھی نہیں

بدایۃ المجتہد ابن رشد

از جناب مولوی عبدالعظیم صاحب اصلاحی

ابن رشد جس درجہ کا فلسفی تھا، اسی درجہ کا فقیہ و مجتہد بھی تھا لیکن اس کی فلسفیانہ شہرت نے اس کی فقہی حیثیت کو بالکل دبا دیا، اس مضمون میں اسکی اسی حیثیت کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے تفقہ اور اجتہاد پر مورخین متفق ہیں، اسکے سوانح نگار مولانا محمد یونس مرحوم لکھتے ہیں:

"ابن رشد نے حدیث و فقہ کی تعلیم جن اساتذۂ فن سے حاصل کی تھی، ان کا مرتبہ اجتہاد ہی اس کی شہادت ہے کہ ابن رشد کا کمال فقہی اپنے ہم عصروں میں بہت زیادہ ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ دنیا سمجھتی ہے کہ ابن رشد محض ارسطو کا مقلد تھا، اسکا سوانح نگار ابن الابار کہتا ہے کہ فلسفہ وغیرہ کو نظرانداز کرکے کم ازکم فقہ میں تو اس کا کوئی نظیر نہ تھا۔"[1]

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے :-

اوحد فی علم الفقہ والخلاف[2]	وہ علم فقہ اور خلافیات میں یکتا تھے،

سلیم خوری اور سلیم شہادہ لکھتے ہیں :-

اوحد آحاد عہدہ ذکاء وعلماء اجتہاداً[3]	وہ ذکاوت اور علم و اجتہاد میں اپنے عہد میں یکتا تھے۔

ابن رشد کا فرانسیسی سوانح نگار رینان لکھتا ہے کہ

[1] ابن رشد مولانا یونس مرحوم ص ۲۵ [2] طبقات الاطباء ص ۵، [3] آثار الادھار ص ۲۲۱

وہ راجہ مان سنگھ کی خوبیوں کے بھی معترف رہے، اس کے کارناموں کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے، جب وہ رانا پرتاب کے خلاف شاہی لشکر لیکر گیا تو جس بہادری سے وہ لڑا اسکے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے ایسی ثابت قدمی دکھائی کہ جو تصور میں نہیں آسکتی ہے (ج ۲ ص ۲۳۳) اسکی حق گوئی اور سیرت کی بلندی کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ ایک رات بادشاہ نے اس کو اپنے خلوت میں بلا کر اپنے دین کی ترغیب دلائی، لیکن اس نے بڑی بے باکی سے یہ جواب دیا، اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہر وقت حاضر رہتے ہیں، آزمانے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور منشاء ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہے میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان ہو جاؤں، ان دو کے علاوہ کوئی اور تیسرا راستہ نہیں پاتا (ج ۲ ص ۳۰۴)

وہ راجہ مان سنگھ کے باپ راجہ بھگونت سنگھ کی حق گوئی کے بھی معترف تھے، اکبر جب اپنے نئے دین کے اجراء کے فکر میں تھا تو ایک روز راجہ بھگونت سنگھ نے جوش کر اس سے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں کہ ہندو بھی برے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن یہ فرمائیے کہ کون سا گروہ بہتر ہے، جس کو ہم سب اب قبول کرلیں، ملا صاحب کا بیان ہے کہ بھگونت داس کی اس بات کو سن کر اکبر کی شدت کچھ دنوں کے لیے کم ہو گئی لیکن پھر اسلام کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور اسکی تاریخ "احداث بدعت" سے نکالی گئی۔ (ج ۲ ص ۳۱۳)

(باقی)

بزم تیموریہ

بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں جو موجود ہیں یا جن کے نام معلوم ہیں وہ آٹھ یا نو ہیں، اس مضمون میں ان کا مختصر ذکر اور اس کی سب سے اہم تصنیف بدایۃ المجتہد پر تفصیلی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) **بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد** - اس کتاب کا ذکر محمد بن علی شاطبی، ابن الآبار، ابن ابی اصیبعہ[1] اور ابن فرحون مالکی[2] نے کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ اسکوریال کی لائبریری میں موجود ہے بعض نے اسی کتاب کا نام کتاب المقتصد لکھا ہے[3]، بعض نے نہایۃ المجتہد[4] بعض نے ہدایۃ المجتہد[5] بعض نے کفایۃ المجتہد[6] خود ابن رشد نے اس کتاب کا نام بدایۃ المجتہد وکفایۃ المقتصد لکھا ہے[7]، ۱۳۲۷ھ میں سلطان عبد الحفیظ سابق سلطان مراکش نے اپنے شاہی کتب خانہ کا قدیم و صحیح قلمی نسخہ شائع کرایا، فقہ میں ابن رشد کی یہ پہلی کتاب ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس کے بعد اس نسخہ کو پیش نظر رکھکر ۱۳۳۵ھ میں مصر سے اس کا دوسرا اڈیشن نکلا[8] پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۹ھ میں ایک ہندوستانی اور مصری فرم نے ملکر اس کتاب کو شائع کیا[9] اور اب ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے، ہم آیندہ صفحات میں اس پر مفصل ریویو کریں گے۔

(۲) **خلاصۃ المستصفی** - یہ ابن رشد کی دوسری کتاب ہے، اس کا نام مختصر المستصفی فی اصول الفقہ ہے[10]، یہ الغزالی کی کتاب المستصفی کا جو اصول فقہ پر ہے، اختصار ہے،

---

[1] طبقات الاطباء ص ۵، [2] الدیباج المذہب ص ۲۸۴ [3] ترجمہ رینان ص ۶، [4] نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۶
[5] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲ [6] کشف الظنون حاجی خلیفہ بحوالہ ابن رشد فرنگی محلی مرحوم ص ۱۰۲
[7] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۷۴ [8] ابن رشد فرنگی محلی مرحوم ص ۱۳۴ [9] بدایۃ المجتہد (طبع مطبعہ مصطفی البابی الحلبی واولادہ بمصر علی نفقتہم و نفقہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی فی بمبای) اس مضمون میں اسی کتاب سے حوالے دیے گئے ہیں [10] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲ -

" جس قدر اس (ابن رشد) کو فلسفہ اور طب میں عبور تھا، اس سے کم فقہ میں نہ تھا، ابن الابار فقہ میں اسکے کارناموں پر زیادہ زور دیتا ہے، اور بمقابلہ ان تصنیفات کے جو فلسفہ ارسطو پر اس نے کیں اور جو اس کی شہرت کا باعث ہوئیں، اس کے تبحر فقہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، اور ابن سعید فقہائے اندلس کی سب سے اگلی صف میں اس کو جگہ دیتا ہے، جن علماء سے اس نے علوم فقہیہ و طبیہ حاصل کیے وہ اپنے زمانہ کے بڑے لوگوں میں گذرے ہیں" [1]

اس کے تفقہ اور اجتہاد کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں قاضی القضاۃ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا، علامہ شبلی حکمائے اسلام کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

" عبد المومن کے عہد ۵۴۸ھ میں جبکہ ابن رشد کی کل عمر ستائیس برس کی تھی، وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا، یعنی اندلس سے لیکر مراکو تک کے کل علاقے اس کے قضا کے حدود میں آگئے" [2]

فرمانروائے مراکش عبد المومن کے بعد اس کے چھوٹے بھائی یوسف نے اس کو اشبیلیہ کا قاضی القضاۃ بنایا، [3]

یوسف کے بعد اس کے جانشین یعقوب منصور نے ابن رشد کی سب سے زیادہ قدر دانی کی، اس کے دور میں اس کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس عروج نے ابن رشد کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے، جن کی سازش سے ابن رشد کو بڑے مصائب میں مبتلا ہونا پڑا جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے،

ابن رشد کے فقہی کمال کا سب سے بڑا ثبوت اس کی فقہی تصانیف ہیں، اس نے فقہ میں

---

[1] ترجمہ اردو رینان ص ۱۴ [2] مقالات شبلی حصہ ہفتم ص ۱۷۱ [3] الدیباج المذہب ص ۲۸۴

یہ حصہ معلوم ہوتا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام کتاب الخراج لکھا ہے،[۱] مولانا محمد یونس مرحوم نے اس رسالہ کا ذکر نہیں کیا ہے،[۲]

(۸) فرائض السلاطین والخلفاء ۔ حاکموں اور سود خواروں کے ناجائز فوائد پر ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کو ابن رشد کی جانب منسوب کیا ہے،[۳] لطفی جمعہ نے اس سلسلہ میں ایک کتاب الکسب الحرام کا نام لکھا ہے،[۴] غالباً یہ اسی کتاب کا دوسرا نام ہے،

(۹) منہاج الادلہ ۔ اس کتاب کو مولانا محمد یونس مرحوم نے ابن ابی اصیبعہ کی روایت سے کتب فقہ کی فہرست میں داخل کیا ہے،[۵] علامہ شبلی نعمانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اصول فقہ میں اس کی مستقل تصنیف ہے،[۶] لطفی اور رینان کی فقہ کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ہے،

ابن ابی اصیبعہ نے فقہ کی دو اور کتابیں ابن رشد سے منسوب کی ہیں، کتاب التحصیل اور کتاب المقدمات ۔ کتاب التحصیل کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ابن رشد نے صحابہ و تابعین اور ائمہ کے اختلافات تحریر کیے ہیں، اور ہر ایک کے دلائل بیان کرکے محاکمہ کیا ہے،[۷] لیکن اس میں ابن ابی اصیبعہ کو دھوکا ہوا ہے، یہ دونوں کتابیں ابن رشد کے دادا ابن رشد اکبر کی ہیں ۔ غالباً یہ غلطی یہیں سے چلی ہے، جسے بعد کے مصنفین نے نقل کر دیا ہے، مثلاً سلیم میخائیل[۸] ، نواب صدیق حسن خاں[۹] اور علامہ شبلی نعمانی[۱۰] وغیرہ، الدیباج المذہب میں ابن رشد اکبر کے تذکرے میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے ۔

---

[۱] تاریخ فلاسفۃ اسلام ص ۲۱۲، رینان ص ۷۷، [۲] ابن رشد مولوی محمد یونس مرحوم ص ۱۲۷، [۳] رینان ص ۷۷، [۴] تاریخ فلاسفہ اسلام ص ۲۱۲ [۵] ابن رشد مولوی یونس مرحوم ص ۱۲۷، [۶] مقالات شبلی جلد پنجم تاریخی حصہ اول ابن رشد [۷] طبقات الاطباء ص ۷۷، رینان ص ۷۷، [۸] آثار الادہار جلد ص ۲۲۴ [۹] التاج المکلل ص ۲۰۲ [۱۰] مقالات شبلی جلد پنجم تاریخی حصہ اول

ابن الابار نے اس کا ذکر کیا ہے اور کتب خانہ اسکوریال کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے، مقری نے لکھا ہے کہ ابن سعید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے[1] ابن فرحون مالکی کتاب الدیباج المذہب اور ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء میں بھی اس کا ذکر ہے[2]۔

(۳) **النظر فی اغلاط الکتب الفقہیہ** ۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔ لاؤن افریقی نے اس کا ذکر کیا ہے[3]، رینان کی کتاب کے اردو ترجمہ میں مذکورہ نام دیا گیا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام "کتاب فی التنبیہ الی اغلاط المتون" لکھا ہے[4]۔

(۴) **اسباب الاختلاف** ۔ یہ کتاب بھی تین جلدوں میں ہے، اور اس کا ایک عربی نسخہ کتب خانہ اسکوریال میں موجود ہے[5]، معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر مولانا محمد یونس مرحوم نے ابن رشد کی جانب اس کتاب کی نسبت پر شبہہ کا اظہار کیا ہے[6]، محمد لطفی جمعہ نے الدعاوی (۳ جلدیں) نام کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے[7]، معلوم نہیں اسی کتاب کا دوسرا نام ہے، یا یہ کوئی اور کتاب ہے۔

(۵) **اصول فقہ کا نصاب کامل** ۔ کتب خانہ اسکوریال میں ہے[8]، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام دروس فی الفقہ العربی لکھا ہے[9]۔

(۶) **رسالہ اضحیہ** (منہ) شاید یہ مذکورہ بالا کتاب کے کسی حصہ کا دوسرا نسخہ ہے[10]، اس میں قربانی سے متعلق احکام ہوں گے۔

(۷) **رسالہ عشر** (منہ) یہ بھی اوپر کی کتاب کی طرح اصل کتاب دروس فی الفقہ العربی

---

[1] رینان ص ۷۷، [2] الدیباج ص ۲۸۴، طبقات الاطباء ص ۷۷، [3] رینان ص ۷۷، [4] تاریخ فلاسفۃ الاسلام ص ۲۱۲ [5] رینان ص ۷۷، [6] ابن رشد مولوی محمد یونس فرنگی محلی ص ۱۲۷ [7] تاریخ فلاسفۃ الاسلام محمد لطفی جمعہ ص ۲۱۲ [8] رینان ص ۷۷، [9] لطفی جمعہ ص ۲۱۲ [10] ترجمہ کتاب رینان ص ۷۷،

اور یہ حقیقت ہے کہ آج بھی اس کی یہ خصوصیت بجنسہ برقرار ہے، فقہ میں مبسوط امام سرخسی فتح القدیر، امام شعرانی کی فقہ جامع[1] وغیرہ، اسی طرز کی کتابیں ہیں، لیکن اختصار، جامعیت متانت استدلال میں بدایۃ المجتہد سے بہت پیچھے ہیں، مبسوط امام محمد کی کتاب کی شرح ہے فتح القدیر ہدایہ کی، ان دونوں کتابوں کا امتیاز فروع کا احاطہ ہے، ان میں ائمہ احناف امام شافعی کے اختلافات مذکور ہیں، دوسرے ائمہ اور مجتہدین کے خیالات بہت کم ملتے اور احناف کے مسلک کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے ان کو بدایۃ المجتہد طرز کی کتاب کہنا صحیح نہیں ہے،

امام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ کی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بدایۃ المجتہد سے پہلے کی ہے، اس میں فقہ اور مسائل فقہ کے ابواب کو فنی اعتبار سے درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ خود مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

اذا لغرض الاصلی والمقصود	جملہ فنون میں کسی تصنیف کا اصل مقصد
الکلی من التصنیف فی کل فن من	ونشا یہ ہوتا ہے کہ طالبین کے لیے مطلوب
فنون العلم ھو تیسیر سبیل	تک پہنچنے کی راہ آسان کی جائے اور اسکو
الوصول الی المطلوب علی الطالبین	اس سے اخذ کرنے والوں کیلئے قریب الفہم
وتقریبه الی افہام المقتبسین	کیا جائے اور یہ مقصد کسی فنی اور حکیمانہ
ولا یلتئم ھذا المراد الا بترتیب	ترتیب کے بغیر پورا نہیں ہوتا، یہ ترتیب
تقتضیه الصناعة وتوجبه	ایسی ہونی چاہئے کہ مسائل کی قسموں
الحکمة وھو التصفح عن اقسام	اور اس کی فصلوں کو الگ الگ کیا جائے

[1] ابن رشد از مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم ص ۱۵۳

الف کتاب البیان والتحصیل لما فی المستخرجة من التوجیه والتعلیل تنیف علی عشرین مجلدا وکتاب المقدمات لاوائل کتب المدونة[1]

انھوں نے "کتاب البیان والتحصیل لما فی المستخرجة من التوجیه والتعلیل" لکھی ہے، جو تقریباً بیس جلدوں پر مشتمل ہے، اور کتاب المقدمات لاوائل کتب المدونہ لکھی ہے۔

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر میں چھپ گئی ہے،

رینان نے ابن رشد کی فقہی کتابوں کے تذکرے کے بعد لکھا ہے کہ پہلی اور دوسری کتاب یعنی بدایۃ المجتہد و مختصر المستصفی کی نسبت تحقیق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابن رشد کی ہیں، لیکن کیسی رای نیر (Cacirmere) نے جو نام لکھے ہیں ان میں ایک کا بھی پتہ ابن رشد کی سوانح عمریوں میں نہیں چلتا، چونکہ ابن رشد کے نام کے تین مشہور فقیہ گذرے ہیں۔ خاص کر جو ابن رشد سنہ [illegible] میں تھا اور جس کی تصانیف اسکوریال لائبریری میں موجود ہیں اسلیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے ناموں اور تصانیف میں خلط ملط ہو گیا ہو[2]

واقعہ جو بھی ہو، ابن رشد کی جانب ان تصنیفوں کی نسبت اس بات کی بہر حال دلیل ہے کہ اس نے بہت سی کتابیں اس فن میں تصنیف کیں۔

بدایۃ المجتہد اور بعض دوسری کتب فقہ کا موازنہ

ابن رشد کی فقہی عظمت کے لیے اس کی صرف ایک کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد کافی ہے۔ الدیباج المذہب میں ہے:

ولا یعلم فی وقته انفع منه ولا احسن سیاقا[3]

اس کے عہد میں اس سے زیادہ نفع بخش اور بہتر کتاب موجود نہیں تھی،

---

[1] الدیباج المذہب لابن فرحون مالکی ص ۲۷۹ [2] کتاب رینان ص ۷۷، [3] الدیباج المذہب ص ۲۸۴

ب فقہ کی بنسبت زیادہ بہتر ہے لیکن اس کے باوجود ابن رشد کی کتاب کو نہیں پہنچتی،
ا یہ کی فنی ترتیب ہی کچھ اور ہے جس کا ہم آگے ذکر کریں گے، بدائع الصنائع میں پہلے
ب نوع کے مسائل کے لیے "کتاب" کا عنوان قائم کیا گیا ہے، مثلاً "کتاب الطہارات"
پھر "الکلام" کے عنوان سے اس "کتاب" کی مختلف قسمیں کر دی ہیں، مثلاً الکلام فی الوضوء
لکلام فی الغسل وغیرہ، اس کے بعد چھوٹی چھوٹی فصلیں قائم کر کے بہت سے بنیادی یا
روعی مسائل کا ذکر کیا ہے، مگر ان سب میں صرف ائمہ احناف یا امام شافعی کے
ختلافات کا ذکر ہے۔

مصر سے ایک کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" کے نام سے شائع ہوئی
ہے، اس کے مصنف عبدالرحمٰن الجزیری ہیں، یہ کتاب اس حیثیت سے بدایۃ المجتہد کے
طرز پر کہی جا سکتی ہے کہ اس میں متعدد مسلکوں کا ذکر ہے، مگر یہ تعدد بھی چار مذاہب میں محدود
ہے، اس کے مقابلہ میں ابن رشد نے ائمہ اربعہ کے علاوہ امام داؤد ظاہری، امام اوزاعی،
سفیان ثوری، ابو ثور، ابن حزم، ابن عبد البر وغیرہ بہت سے ائمہ کے اقوال کا ذکر کیا
ہے، عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب بہت طویل اور بڑے سائز کی چار ضخیم جلدوں میں ہے،
جزء اول قسم العبادات، جزء ثانی وثالث قسم المعاملات اور جزء رابع قسم الاحوال الشخصیہ۔
اس کتاب میں کہیں کہیں احکام کے علل بھی بیان کیے گئے ہیں، اور کہیں کہیں کتاب و سنت
سے دلائل دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے،

ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں تقلید کے عام ہونے تک پیدا ہونے والے ان تمام
مسائل کو ذکر کیا ہے، جن کا نصوص میں ذکر ہے، یا شریعت سے ان کا قریبی تعلق ہے، خواہ
یہ مسائل متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ اور ان کے اسباب اختلاف اور دلائل کا خصوصیت

المسائل وفصولہا وتخریجہا علی قواعدہا	اور انہیں ٹھیک اصول وقواعد کے مطابق
واصولہا لیکون اسرع فہما واسہل	درج کیا جائے تاکہ سمجھنے اور محفوظ کرنے
ضبطا وایسر حفظا فتکثر الفائدۃ و	میں آسانی ہو، اور اس سے منفعت
تتوفر العائدۃ فصرفت العنایۃ الی ذلک	اور فائدہ زیادہ ہو، اس لیے میں نے اس کی
وجمعت فی کتابی ہذا اجملا	جانب توجہ کی اور اپنی اس کتاب میں
من الفقہ مرتبۃ بالترتیب	فقہ کا ایک بڑا مجموعہ فنی ترتیب اور
الصناعی والتالیف الحکمی	حکیمانہ تالیف کے ساتھ جمع کیا جسے اہل فن
الذی ترتضیہ ارباب الصنعۃ	اور صاحب حکمت لوگ پسند کریں گے،
وتخضع لہ اہل الحکمۃ مع	اس کے ساتھ واضح دلائل اور مضبوط
ایراد الدلائل الجلیۃ والنکت	نکتے بھی ایسی عبارتوں میں لکھ دیئے گئے
القویۃ بعبارات محکمۃ المبانی	جن کی بنیاد مضبوط اور معانی و مطالب
مؤدیۃ المعانی وسمیتہ	کے اظہار کے لیے مناسب ہے، نام میں نے
بدائع الصنائع فی ترتیب	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع
الشرائع، اذہی صنعۃ بدیعۃ	رکھا ہے، یہ ایک انوکھی صناعی، عجیب
وترتیب عجیب وترصیف	ترتیب اور نادر مرصع کاری ہے تاکہ اس کا
غریب لتکون التسمیۃ موافقۃ	نام مسمی کے موافق اور اس کی صورت
للمسمی والصورۃ مطابقۃ للمعنی[1]	معنی کے عین مطابق ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مصنف کے دعوی کے مطابق ہے، اور اس کی ترتیب واہم

[1] مقدمۂ کتاب بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للامام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی۔

کتاب بدایۃ المجتہد کا مقصد

اس کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دوسری کتب فقہ کے برخلاف اس کی غرض و غایت اجتہاد کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، ائمۂ اربعہ اور ان کے اصحاب کے بعد تقلید کے عام رواج کی بدولت فقہاء کے صرف تین چار معمولی کام رہ گئے تھے، امام سے جو اصولی مسائل مروی ہیں ان کو پیش نظر رکھکر ابواب فقہ کے فروع کو ترتیب دینا، امام کی مختلف روایتوں کو تلاش کرکے انھیں باہم ترجیح دینا، ان کی صحت و غلطی دریافت کرنا، وقائع و نظائر ممکنہ و غیر ممکنہ کو ابواب فقہ کے مطابق ترتیب دینا، فروع مذہب کی طویل کتابوں کی مختصر شرحیں اور حاشیے لکھنا، ان کے علاوہ حنفیہ و شافعیہ کے تنازعات کی بدولت ایک خاص فن جدل و خلاف بھی پیدا ہوگیا تھا، جس میں ہر فریق اپنے امام کے آراء و مذاہب کی متعصبانہ تائید و حمایت کرتا تھا۔ اور اس کے لیے رطب و یابس، قوی و ضعیف ہر طرح کے دلائل دیے جاتے تھے۔ اس سے بحث نہیں تھی کہ درحقیقت کون مذہب حق ہے، اس لیے ان کتابوں سے استعداد فقہی تو ضرور پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کا دائرہ بہت محدود ہے، اور صرف تخریج و ترجیح اقوال اور استنباط فروع کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، اور ہر فریق یہ سمجھنے لگتا ہے کہ حق اسی کے ساتھ ہے، ملکۂ اجتہاد کا یہ فقدان مسلمانوں کے لیے ہر حیثیت سے مضر ثابت ہوا، لیکن اس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوا، جن کو ہوا ان میں ابن رشد بھی ہے، اس نے بدایۃ المجتہد اسی غرض سے لکھی، وہ لکھتا ہے :-

ان فی قوۃ ھذا الکتاب ان	جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کتاب میں یہ وصف
یبلغ بہ الانسان کما قلنا رتبۃ	ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اجتہاد کے
الاجتھاد اذا تقدم فعلم من	رتبہ کو پہنچ سکے گا، بشرطیکہ وہ لغت،
اللغۃ والعربیۃ وعلم من اصول	عربیت اور اصول فقہ سے اتنی واقفیت

کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ان مسائل کی حیثیت ایسے اصول و قواعد کی ہے جو مجتہد کو پیش آسکتے ہیں، اور جن کا ذکر شریعت میں نہیں ہے[1]۔

بدایہ کا طرز | اس کی فنی ترتیب جدید طرز کی ہے۔ کتاب الجہاد کو ابواب معاملات پر مقدم کیا ہے کیونکہ اسلام میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بعد جہاد ہی کا نمبر ہے، اسی طرح کتاب الاشربہ اور کتاب الضحایا کو معاملات کی فہرست سے جدا کر دیا ہے، کیونکہ اسلام میں ان چیزوں کی حیثیت محض تعبدی ہے[2]، مسائل کے ذکر میں سب سے پہلے کسی چیز سے متعلق بحث کو کتاب کے عنوان سے شروع کیا ہے، پھر اس کو مختلف ابواب، فصول، مسائل اور انواع میں تقسیم کیا ہے جس سے احکام کی تلاش اور یادداشت میں بڑی آسانی ہو گئی ہے، جس حکم میں جتنے فروع نکلتے ہیں، اس میں اتنے ہی درجات قائم کئے ہیں، مثلاً طلاق کی بحث میں "کتاب الطلاق" عنوان قائم کرکے اس میں چار جملے (مجموعے) متعین کیے ہیں، مجموعۂ اولیٰ انواعِ طلاق میں مجموعہ ثانی ارکان طلاق میں، مجموعہ ثالث، رجعت میں، مجموعہ رابع مطلقات کے احکام میں، پھر ہر جملہ (مجموعہ) کے ابواب قائم کیے ہیں، مثلاً جملہ اولیٰ میں پانچ باب ہیں، پھر ہر باب میں کئی کئی مسئلوں کا ذکر ہے[3]۔

جملہ اخیرہ (رابعہ) میں دو باب قائم کیے ہیں، اور باب اول کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے، اور فصل اول کی دو نوعیتیں بنائیں اور نوع ثانی میں الگ الگ مسائل لکھے ہیں[4]، بحیثیت مجموعی کتاب کی ترتیب اور طرز نگارش کے متعلق یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ دوسری کتب فقہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں،

---

[1] بدایۃ المجتہد جزء اول ص ۱ دیباچہ [2] ابن رشد مولانا محمد یونس فرنگی محلی ص ۱۴۰، [3] بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ج ۲ ص ۵۶، ۶۲ [4] ایضاً ج ۲ ص ۸۳ تا ۹۰

عنها وفی النوازل .... ویشبه ان یکون من تدرب فی هذه المسائل وفهم اصول الاسباب التی اوجبت خلاف الفقهاء ان یقول ما یجب فی نازلة من النوازل[1]

اسباب بھی ذہن میں ہوں تو انسان ہر جدید واقعہ کی بابت فتوی دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔

کتاب البیوع میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

نذکر منها اشهرها لتکون کالقانون للمجتهد النظار[2]

ہم اس فصل کے صرف مشہور مسائل لکھیں گے تاکہ وہ صاحب نظر مجتہد کیلئے قانون کا کام دیں۔

اس بات کا ابن رشد نے مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے، باب قضاء الصلوٰۃ کے آخر میں لکھتے ہیں

وفروع هذا الباب کثیرة وکلها غیر منطوق بها وقصدنا هھنا الاما یجری مجری الاصول[3]

اس باب کے فروع بہت سے ہیں لیکن سب کے سب غیر منطوق ہیں (یعنی نصوص شرعیہ میں ان کا ذکر نہیں ہے) اور ہمارا ارادہ صرف ان مسائل کے ذکر کرنے کا ہے جو اصول کے طور پر کام آئیں۔

ان تمام فقہی اختلافات کو چھ اسباب کے تحت جمع کیا ہے :

واما اسباب الاختلاف بالجنس

اختلاف کے اسباب عام طور پر چھ ہیں،

---

[1] بدایۃ المجتہد ص ۳۶۳ مجوالہ ابن رشد ص ۱۴۹ [2] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۱۴۲ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۷۵

الفقہ ما یکفیہ فی ذلک
حاصل کرلے جو اس کے لیے کافی ہو، اس لیے

ولذلک رأینا ان اخص الاسماء
ہمارے خیال میں اس کا سب سے مناسب

بھذا الکتاب ان نسمیہ بدایۃ
نام بدایۃ المجتہد و کفایۃ المقتصد

المجتھد وکفایۃ المقتصد[۱]
ہے۔

اس غرض کے حصول کے لیے ابن رشد نے جن باتوں کا التزام کیا ہے، ان سے کتاب میں امتیازی شان پیدا ہو گئی ہے، عام طور پر کتب فقہ میں فروع مسائل جمع کیے جاتے تھے، جن سے اصول کے سمجھنے میں بہت کم مدد ملتی تھی، باب اجتہاد بالکل مسدود تھا، اور فروع تک میں جزئیات کی پابندی لازمی خیال کی جاتی تھی، ابن رشد نے اس کتاب میں یہ مقلدانہ طرز ترک کر دیا تاکہ اصول سے استنباط فروع کا ملکہ پیدا ہو، اور اصول میں بھی صرف ان کو لے لیا جن کی شرع میں صراحت موجود ہے، یا ائمہ نے ان میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے[۲]

قصدنا فی ھذا الکتاب انما ھو
اس کتاب سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس میں

ان نثبت المسائل المنطوق
شرع کے متفق علیہ و مختلف فیہ مسائل

بھا فی الشرع المتفق علیھا و
درج کریں کیونکہ انہی دونوں قسموں کے

المختلف فیھا.... فان معرفۃ
مسائل مسکوت عنہ اور نئے پیدا شدہ

ھذین الصنفین من المسائل
مسائل میں بطور اصول موضوعہ کام

ھی التی تجری عند المجتھد
آتے ہیں، اور اگر ان مسائل کی واقفیت

مجری الاصول فی المسکوت
کے ساتھ فقہا کے اختلافات کے علل و

---

[۱] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۹۴ [۲] ابن رشد مولانا فرنگی محلی ص ۱۴۹

الحقیقۃ او الاستعارۃ والخامس	ایسے ہی وہ تعارض ہے جو نبیؐ کے افعال
اطلاق اللفظ تارۃ وتقییدہ	اور اقرارات میں پایا جائے یا قیاسات کا
تارۃ مثل اطلاق الرقبۃ فی	آپس میں معارض ہونا یا وہ تعارض جوان
العتق وتقییدھا بالایمان تارۃ	تین قسموں میں پیدا ہو یعنی فرمودات نبیؐ
والسادس التعارض فی الشیئین	کا آپ کے افعال سے یا اقرارات سے
فی جمیع اصناف الالفاظ التی	یا قیاس سے یا آپ کے افعال کا اقرار
یتلقی منھا الشرع الاحکام بعضھا	سے یا قیاس یا اقرار کا قیاس سے
مع بعض وکذٰلک التعارض	معارض ہونا ۔
الذی یاتی فی الافعال أو فی	
الاقرارات او تعارض القیاسات	
انفسھا او التعارض الذی	
یترکب من ھذہ الاصناف	
الثلاثۃ اعنی معارضۃ القول	
للفعل او للاقرار او للقیاس	
ومعارضۃ الفعل للاقرار[1]	
او للقیاس ومعارضۃ الاقرار للقیاس	

کتاب کے ہر مسئلہ میں ثابت کیا ہے کہ اختلافات انہی چھ اسباب کی بنا پر ہوئے ہیں اور جا بجا اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں ۔

---

[1] ہدایۃ المجتہد ج ۱ مقدمہ ص ۵

فسنة احدها تردد الالفاظ بين	اول یہ کہ الفاظ کا ان چار طریقوں میں
هذه الطرق الاربع اعنى بين	استعمال ہونا یعنی لفظ عام ہو اس سے
ان يكون عاما يراد به الخاص	خاص مراد ہو یا خاص ہو اور معنی عام
اوخاصا يراد به العام اوعاما	مراد ہو یا لفظ عام ہو اور معنی بھی عام
يراد به العام اوخاصا يراد به	مراد ہو یا لفظ خاص ہو اور معنی بھی خاص
الخاص. اويكون له دليل خطاب	مراد ہو، یا وہاں دلیل خطاب ہو یا نہ ہو،
اولا يكون له. والثانى الاشتراك	دوسرے وہ اشتراک جو الفاظ میں پایا جاتا
الذى فى الالفاظ وذلك اما فى	ہے، جیسے لفظ قرء جو طہر اور حیض دونوں
اللفظ المفرد كلفظ القرء الذى	کے لیے بولا جاتا ہے، ایسے ہی لفظ امر یا
ينطلق على الاطهار وعلى الحيض	وجوب پر محمول ہوگا، یا ندب پر، اور
وكذلك لفظ الامر هل يحمل	لفظ نہی تحریم پر محمول ہوگا یا کراہیت پر
على الوجوب اوعلى الندب ولفظ	..... تیسرے اعراب کا اختلاف، چوتھے
النهى هل يحمل على التحريم اوالكراهية	لفظ کا کبھی حقیقت پر استعمال ہونا اور کبھی مجازکی
.... والثالث اختلاف الاعراب	مختلف قسموں میں استعمال ہونا مثلاً حذف استعارہ وغیرہ،
والرابع تردد اللفظ بين حمله	پانچویں لفظ کا کبھی مطلق آنا اور کبھی مقید آنا جیسے غلام آزاد
على الحقيقة وحمله على نوع من	کرنے میں ایک بار حکم مطلق آیا ہے، اور
انواع المجاز التى هى اما الحذف	ایک بار ایمان کی قید کے ساتھ، چھٹے یہ کہ
واما الزيادة واما التقديم و	الفاظ کی ان قسموں میں جن سے احکام
اما التاخير واما تردده على	شرع اخذ ہوتے ہیں، باہم تعارض ہونا،

اس کتاب میں انھوں نے ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے بہت سے ائمہ کے اقوال اور ان کے دلائل
وضاحت کے ساتھ پیش کیے ہیں، مثلاً امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابوداؤد ظاہری، ابو ثور،
ابن ابی لیلیٰ، سفیان بن عیینہ، ابن جریج، عطاء بن دینار، اشہب، سحنون، طبری وغیرہم۔

ابن رشد کی بے تعصبی اور مجتہدانہ شان | کہنے کو تو ابن رشد مالکی تھے اور انھوں نے عموماً اپنی کتابوں میں مالکی فقہ کو ترجیح دی ہے لیکن کسی ایک امام کی تقلید و تائید کی ترغیب اس کتاب کے مقصد کے خلاف تھی اس لیے وہ اس سے الگ ہے اور اس میں انھوں نے ائمہ کے اقوال مع ان کے دلائل کے جمع کر دیے ہیں اور اس کی کوشش کی ہے کہ جس کے دلائل جس حیثیت کے ہیں اسی حیثیت سے بیان کر دیے جائیں تاکہ لوگوں میں علی وجہ البصیرت کسی رائے کے اختیار اور ترک کرنے کا ملکہ ہو، چنانچہ اکثر مقامات پر فقہاء کی رایوں کی وضاحت کے بعد "فتأمّلہ" (تم خود غور کر لو) کہہ کر فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے[1]،

بعض مسائل میں محاکمہ کیا ہے اور دلیل کی قوت کی بنا پر کسی ایک رائے کو ترجیح دی ہے اور اس کی مطلق پروا نہیں کی ہے کہ یہ رائے امام مالک کے خلاف جاتی ہے یا کسی اور کے۔
بہت سے مسائل میں امام مالک کی رایوں کی کمزوری پر تعجب ظاہر کیا ہے، اور دوسرے ائمہ کی رایوں کو سراہا ہے،

مطلقہ کے وارث ہونے کے بارے میں ائمہ کے اقوال لکھنے کے بعد آخر میں لکھا ہے،

وسوی مالک فی ذلک کلہ	اس مسئلہ میں امام مالک نے سب کو برابر
حتی لقد قال ان ماتت لا	قرار دیا ہے، اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ
یرثھا وترثہ ھی ان مات، وھذا	اگر مطلقہ عورت پہلے مرجائے تو شوہر

---

[1] بدایۃ جلد اول ص ۶۳

حدیث میں ابن رشد کا مرتبہ | ایک ماہر فقیہ کے لیے احادیث پر عبور ضروری ہے، بدایۃ المجتہد کی بعض بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث میں ابن رشد کا مقام کتنا اونچا تھا، وہ بلا تکلف احادیث کے ضعف، علل، قوت، مستخرجین اور راوین پر بحث کرتے ہیں، مثلاً مسح علی الخفین کی بحث میں کہتے ہیں :-

عربی	اردو
(قلت) اما حدیث علی فصحیح	رہی حضرت علیؓ کی حدیث تو وہ صحیح ہے
خرجہ مسلم واما حدیث ابی	اس کی تخریج امام مسلم نے کی ہے، اور ابی
بن عمارۃ فقال فیہ ابو عمر	ابن عمارۃ کی حدیث کے بارے میں ابن
ابن عبد البر انہ حدیث لا یثبت	عبد البر نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں
ولیس لہ اسناد قائم	ہے اور نہ اسکی سند ٹھیک ہے، اور
واما حدیث صفوان بن عسال	صفوان بن عسال کی حدیث کا اگرچہ
فھو وان کان لم یخرجہ البخاری	امام بخاریؒ و مسلمؒ نے نہیں ذکر کیا ہے
ولا مسلم فانہ قد صححہ قوم	لیکن اہل علم کی ایک جماعت نے اسے
من اھل العلم[1]	صحیح قرار دیا ہے۔

السجود علی الجبھۃ والانف کی بحث میں فیصلہ کن طور پر کہتے ہیں

عربی	اردو
(قال القاضی ابو الولید) وذکر	قاضی ابو الولید (ابن رشد کی کنیت)
بعضھم الجبھۃ فقط وکلا الروایتین	نے کہا کہ بعض نے صرف پیشانی کا ذکر کیا
موجود فی کتاب مسلم[2]	ہے، اور یہ دونوں روایتیں امام مسلم کی کتاب میں

فقہ میں وسعت معلومات | فقہ میں ان کی وسعت معلومات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ

---

[1] بدایہ ج ۱ ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۱۲۷

وھذا کلہ تعمق فی ھذا الباب	یہ سب اس باب میں انتہا پسندی ہے،
ودین اللہ یسر، ولقائل ان یقول	حالانکہ اللہ کا دین آسان ہے، ایک
ان ھذہ لو کانت شروطا	کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چیزیں نماز کی
فی صحۃ الصلوٰۃ لما جاز ان	صحت کے لیے شرط ہوتیں تو رسول اللہ
یسکت عنہا علیہ الصلوٰۃ	صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارہ میں سکوت
والسلام ولا ان یترک بیانہا	نہ فرماتے اور اس کی وضاحت نہ چھوڑتے،
لقولہ تعالیٰ لتبین للناس	کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے
ما نزل الیہم. ولقولہ تعالیٰ	"لتبین للناس ما نزل الیہم" اور
ولتبین لھم الذی اختلفوا	"لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ"
فیہ. واللہ المرشد للصواب[1]	اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ کتاب اسلوب تحریر، ترتیب مضامین، جمع اقوال ائمہ، قوت استدلال اور فقاہت میں بے نظیر اور مصنف کی فقہی مہارت کا واضح ثبوت ہے، اور ہر حیثیت سے دیگر کتب فقہ پر فوقیت رکھتی ہے، ابن سعید نے ان الفاظ میں اس کی تعریف کی ہے۔

کتاب جلیل معظم عند المالکیۃ[2]	یہ کتاب نہایت عظیم اور مالکیہ کیلئے معتمد علیہ ہے،

لیکن حق یہ ہے کہ صرف مالکیوں کے لیے نہیں بلکہ تمام علمائے اسلام کے لیے مفید ہے اور اسکا مطالعہ اجتہاد کی استعداد پیدا کرتا ہے[3]

گمنامی کے اسباب لیکن یہ بڑا المیہ ہے کہ تقلید و روایت پرستوں نے نہ صرف اس بے مثال کتاب کو نظر انداز کر دیا، بلکہ اس کے جلیل القدر مصنف کے فقہی کارناموں سے بھی صرف نظر

---

[1] بدایۃ المجتہد جلد اول ص ۱۰۴ [2] نفح الطیب ج ۲ ص ۱۲۷ [3] ابن رشد مولانا محمد یونس مرحوم ص ۱۵۴

مخالف للاصول جدا[1] — وارث نہیں ہوگا، اور اگر شوہر مرجائے تو عورت وارث ہوگی۔ حالانکہ یہ بات اصول کے بالکل خلاف ہے

سورکلب (کتے کے جوٹھے) کے بارے میں لکھا ہے

واما قیل فی المذھب من ھذا الکلب ھو الکلب المنھی عن اتخاذہ او الکلب الحضری فضعیف وبعید من التعلیل[2]

مذہب مالکی میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ وہ کتا ہے جس کے پالنے سے روکا گیا ہے یا شہری کتا، تو یہ کمزور بات ہے اور کسی چیز کی علت بننے سے قاصر ہے۔

اسی طرح لعان کے مسئلے میں عورت کے نکول (قسم سے انکار) کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا فتوی درج کرنے کے بعد لکھا ہے

فابوحنیفۃ فی ھذہ المسئلۃ اولی بالصواب انشاء اللہ تعالیٰ[3]

ابوحنیفہ کی رائے اس مسئلہ میں انشاء اللہ تعالیٰ حق وصواب سے زیادہ قریب ہے۔

بعض ان فروعی مسائل میں جن کے متعلق کئی حدیثیں ملتی ہیں اور ترجیح کے لیے کوئی قوی دلیل بھی نہیں، تخییر کی رائے دی ہے، یعنی نوافل اور سنن سے تعلق رکھنے والے غیر بنیادی مسائل جن میں نسخ کی کوئی دلیل نہیں ہے، آدمی کو اختیار رہنا چاہیے، جس قول پر چاہے عمل کرے۔

اسی طرح وہ فقہاء کی بعض مشکل پسندیوں کے بھی خلاف ہیں، جمعہ کی نماز کے متعلق فقہاء و مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد سے بہت سے قیود و شرائط عائد کیے ہیں جن کا مبنیٰ صرف یہ ہے کہ یہ شرطیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعہ کی نمازوں میں اتفاقی یا غیر اتفاقی طور پر برابر پائی جاتی رہی ہیں، ابن رشد جمعہ سے متعلق ائمہ کی شرطوں کے ذکر کرنے کے بعد ان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں

---

[1] بدایۃ جلد ثانی ص ۸۰، [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۸ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۱۳

مشرق میں اس کی فقہی حیثیت کی اس لیے شہرت نہیں ہوسکی کہ یہاں خود بڑے بڑے فقہاء مجتہدین موجود تھے، اس لیے وہ ایک دور دراز کے فقیہ کی طرف کیوں توجہ کرتے، دوسرے یہاں مالکی مذہب رائج نہ تھا، اور ابن رشد مالکی تھا۔

استاذ کی شہرت کا ایک بڑا ذریعہ شاگرد ہوتے ہیں، ابن رشد کے شاگرد زیادہ تر یہودی اور عیسائی تھے، جو اس سے صرف فلسفہ پڑھتے تھے، فقہ اسلامی سے ان کو کوئی تعلق نہیں تھا، مسلمان لڑکے بدعقیدگی کی شہرت کی بنا پر بہت کم پڑھتے تھے، وکان اکثر تلامذتہ الیہود والنصاری وقل من یقرء علیہ من المسلمین لانہ کان یری بضعف المعتقد[1]، اس لیے اس کے شاگرد بے دین سمجھے جاتے تھے، لوگوں نے ان کے فتوے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اگرچہ بعض شاگردوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ابن رشد کے عقائد صالح مسلمانوں سے اتنے مختلف نہیں ہیں، جتنے سمجھے جاتے ہیں[2]۔

ہندوستان میں ابن رشد کے ساتھ اعتنا	مگر آخر ایک وقت آیا جب ابن رشد کا دنیا نے اعتراف

کیا، ہندوستان میں غالباً سب سے پہلے نواب عماد الملک بلگرامی نے ابن رشد پر ایک گرانقدر مقالہ لکھ کر اس کو اہل علم میں متعارف کیا، اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے ایک مبسوط مقالہ لکھنا شروع کیا، جو نامکمل رہ گیا، پھر بھی جو کچھ مولانا نے لکھ دیا ہے وہ ابن رشد کی سوانح حیات کا بہترین مرقع ہے، مولانا حمید الدین فراہیؒ فقہ میں ابن رشد کے طرزفکر اور اس کی کتاب بدایۃ المجتہد کو بہت پسند فرماتے تھے، انھوں نے اگرچہ اس پر قلم نہیں اٹھایا لیکن مشہور دینی درسگاہ مدرستہ الاصلاح کے نصاب میں اس کو داخل کرکے تعلیمی حلقوں میں روشناس کرایا،

۱۹۲۲ء میں دارالمصنفین نے ابن رشد پر مولانا محمد یونس مرحوم کی مستقل کتاب شائع کی،

---

[1] آثار الازہار ص ۲۲۲ [2] رینان ص ۴۸ - ۴۹

کرلیا، اور اس پر کفر کے فتوے لگے، اس کے حسب ذیل اسباب ہوسکتے ہیں :

ابن رشد فقیہ کے ساتھ فلسفی بھی تھا، فلسفہ میں اسے امامت کا درجہ حاصل تھا، اور اندلس میں فلسفہ سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں تھی، علامہ مقری نفح الطیب میں لکھتے ہیں،

كلما قيل فلان يقرء الفلسفة اطلقت عليه العامة اسم الزنديق فان زل في شبهة رجموه بالحجارة وحرقوه قبل ان يصل امره الى السلطان[1]

جب کسی شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ فلسفہ پڑھتا ہے تو فوراً عوام الناس اسے زندیق کا خطاب دے ڈالتے اور اگر کسی مسئلہ میں اس سے لغزش ہوجاتی تو قبل اس کے کہ حاکم وقت تک اس کا معاملہ پہنچے اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالتے اور اس کی لاش جلا ڈالتے ،

ابن رشد نے اپنی کتاب میں اشاعرہ کے مذہب کا رد کیا ہے، اور امام غزالی کی تصنیف تہافت الفلاسفہ کا بھی رد لکھا ہے، اور امام صاحب کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں[2] یہ چیز بھی علماء کی برہمی کا باعث ہوئی، اس لیے بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے، ابن خلکان نے یوسف بن عبدالمومن کے تذکرے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ اسکے دربار میں ابن رشد بھی تھا[3] عنفدی جس کی کتاب مشاہیر اسلام کی انسائیکلوپیڈیا ہے، ایک حرف بھی ابن رشد کے متعلق نہیں لکھتا، اسی طرح جمال الدین قفطی جس نے ابن رشد کی وفات کے ایک مدت بعد اپنی تاریخ الحکماء لکھی ہے، ابن رشد کا نام تک نہیں لیا، حالانکہ اندلس کے بہت سے گمنام فلسفیوں کا تذکرہ اس نے کیا ہے[4]

---

[1] نفح الطیب مقری جلد اول ص ۱۰۲۔ [2] ایسے حملوں کیلیے ملاحظہ ہو کشف الادلہ ص ۶۲ بحوالہ ابن رشد ص ۱۸۴ اور تہافت الفلاسفہ ص ۳۳-۳۴ بحوالہ ابن رشد مولانا محمد یونس [3] تاریخ ابن خلکان ص ۵۵۷ [4] ابن رشد ص ۹۹

مولانا شبیر احمد نے صحیح مسلم کے "باب وجوب غسل الرجلین بکمالہما" کے تحت بڑی لمبی شرح لکھی ہے، اور آخر میں ابن رشد کی یہ رائے پیش کی ہے،

واما من طريق المعنى فقال ابن رشد في البداية ان الغسل اشد مناسبة للقدمين من المسح كما ان المسح اشد مناسبة للرؤوس من الغسل اذ كانت القدمان لا ينقى دنسهما غالبا الا بالغسل وينقى دنس الرأس بالمسح وذلك ايضا غالب والمصالح المعقولة لا يمتنع ان يكون اسبابا للعبادات المفروضة حتى يكون الشرع لاحظا فيهما معنيين معنى مصلحيا ومعنى عباديا اعنى بالمصلحي ما رجع الى الامور المحسوسة وبالعبادي ما رجع الى زكاة النفس (فتح الملہم شرح مسلم جزاول ص ۴۵۵)

ابن رشد کا بیان ہے کہ مقصود کے لحاظ سے قدموں کا دھونا مسح کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے، اسی طرح سر کا مسح کرنا دھونے کی بہ نسبت زیادہ مناسب ہے، کیونکہ پیروں کا میل بغیر دھوئے صاف نہیں ہوتا، اور سر کا میل صرف مسح سے صاف ہو جاتا ہے، اور یہ بات بہت عام ہے، فرض عبادتوں میں عقلی مصلحتوں کا سبب بننا کوئی انہونی بات نہیں ہے، اس طرح شریعت نے گویا دو مقصد پیش نظر رکھے، ایک مصلحی دوسرا تعبدی، مصلحی سے مراد وہ امور ہیں جن کے علل وغیرہ انسان محسوس کرے، اور عبادی سے مراد وہ امور ہیں جن کا تعلق تزکیۂ نفس سے ہوتا ہے،

اس میں مصنف نے ابن رشد کی سوانح نگاری کا پورا حق ادا کیا ہے، اس کے بعد اردو میں ابن رشد کے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے اور مستقل مقالات لکھے گئے۔ اب اردو میں بھی وافر ذخیرہ ہو گیا ہے، اور ابن رشد اہل علم میں محتاج تعارف نہیں رہ گیا ہے، ہر مکتب فکر اور ہر مسلک فقہ کے لوگ اپنی تصنیفات میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، حنفی مسلک کے علما نے بھی اپنی تصنیفات میں اس سے استفادہ شروع کر دیا ہے، ترمذی پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تقریروں کو ان کے شاگرد رشید مولانا یحییٰ کاندھلوی نے جمع کیا ہے، جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کی تعلیقات ہیں، اس میں باب ما جاء فی الوضوء من الریح کے حاشیہ میں ابن رشد کی پوری تقریر نقل کی ہے[1]،

اسی طرح حضرت شیخ الحدیث نے اوجز المسالک الی موطا مالک میں بدایۃ ابن رشد سے جا بجا اقتباسات نقل کیے ہیں، اعادۃ الصلوٰۃ مع الامام کی شرح میں لکھتے ہیں :۔

قال ابن رشد اکثر الفقہاء	ابن رشد کا بیان ہے، اکثر فقہاء
علی انہ لا یعید منہم مالک	کا یہ مسلک ہے ایسا شخص اعادہ صلوٰۃ
وابوحنیفۃ وقال بعضہم	نہیں کرے گا، ان میں امام مالک و
یعید ومن قال بہذا احمد	ابوحنیفہ بھی ہیں اور بعض اعادہ کے
وابوداؤد واہل ظاہر[2]،	قائل ہیں، ان میں احمد، داؤد اور اہل ظاہر ہیں،

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم میں ابن رشد کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے، بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے قدموں کے دھونے یا مسح کرنے کے مسئلہ میں بڑی مبسوط بحث کی ہے، جس سے اس کی ادبی و منطقی مہارت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

---

[1] الکوکب الدری ص ۹۴ [2] اوجز المسالک الی موطا امام مالک جلد ثانی ص ۱۲

حکیم علوی خاں دہلوی

از

جناب حکیم محمد زماں صاحب حسینی حسینی

ہندوستان کے اطباء میں ایسے چند ہی طبیب گذرے ہیں، جو اپنی ذات میں بجائے یک فرد کے انجمن تھے، ان ہی میں ایک ذات گرامی حکیم علوی خاں کی ہے،

نام و نسب ان کا نام محمد ہاشم ہے، والد کا اسم گرامی ہادی دادا کا مظفرالدین ہے، اصل باشندہ شیراز کے ہیں، شیراز ہی میں ۱۰۸۰ھ رمضان المبارک میں ولادت ہوئی،

تعلیم جملہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل شیراز ہی میں وہاں کے اکابر علماء سے کی، فن طب اپنے والد سے حاصل کیا، اور اُن ہی کے مطب میں عملی ممارست و تجربہ میں درجۂ کمال تک پہونچے،

سفر ہند ۱۱۱۱ھ میں دارالحکومت دہلی میں ان کا ورود ہوا، اس وقت اُن کی عمر کل اکتیس ۳۱ سال کی تھی، گویا عہد جوانی تھا، بادشاہ وقت اورنگ زیب عالمگیر نے پذیرائی کی، اور خلعت شاہی سے نوازا، اور اپنے بیٹے محمد اعظم بن عالمگیر کے ساتھ کر دیا، اس کے قتل کے بعد اس کے بھائی، شاہ عالم بن عالمگیر نے ان کو اپنا مصاحب و مقرب بنا لیا، اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف کے طور پر علوی خاں کا خطاب عطا کیا، اور اپنے خصوصی مشیروں میں انھیں خاص درجہ دیا،

اور یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ ہمارے علماء ابن رشد کی تحقیقات کو جگہ دینے لگے ہیں،

اس زمانہ میں اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ابن رشد کے طریقۂ کار کو اپنایا جائے، اور ان کے طرز پر فقہ اسلامی کی تدوین کیجائے، اس سے گروہی عصبیت اور ملی افتراق کے دور ہونے میں بڑی مدد ملے گی، اب تمام ائمہ کے اقوال کو مع ان کے دلائل کے جمع کر دینا بہت آسان ہے، اس سے فائدہ ہوگا کہ اہل علم ان اقوال اور انکے دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد جس کو چاہیں گے اختیار کر سکیں گے کسی ایک قول کی صحت پر خواہ وہ کتنا ہی ضعیف ہو، اصرار اہل علم کی شان نہیں ہے، اصل ماخذ کتاب اللہ اور حدیث رسول ہے،

قدماء میں ائمہ مجتہدین کے تلامذہ بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرتے تھے، امام شعرانیؒ نے اپنی کتاب میزان میں لکھا ہے کہ

> امام قرانی نے اس بات پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ عہد صحابہ میں جو شخص حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے فتویٰ لیتا تھا، وہ دوسرے صحابہ سے بھی فتویٰ لیکر اس پر عمل کرتا تھا اور کوئی شخص اس پر نکیر نہیں کرتا تھا[1]

امام قرانی کا یہ قول اس کا ثبوت ہے کہ جس طرح مختلف صحابہ سے فتویٰ لیکر اس پر عمل کرنا جائز تھا اسی طرح کئی ائمہ کے فتووں کو سامنے رکھکر مضبوط دلیل سے کسی معاملہ میں کسی امام کی پیروی اور دوسرے معاملہ میں دوسرے امام کی پیروی جائز ہے جبکہ تلفیق یا ہوائے نفس کی صورت نہ ہو، جو بالاجماع ناجائز ہے۔ اسکی اجازت صرف اہل علم کے لیے ہے، جو مختلف اقوال کے دلائل میں صحیح موازنہ کر سکیں۔

ابن رشد نے اپنی کتاب میں اسی صلاحیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ عامل میں خود تفقہ اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہو،

---

[1] میزان للشعرانی ص ۱۳۹

(۱) صاحب بیان الوقائع نے سنہ ۱۱۶۰ھ ماہ رجب تحریر کیا ہے،

(۲) اور صاحب مہرِ جہاں تاب نے رجب سنہ ۱۱۶۲ھ،

سـ۵ "برفلک رفت مسیحائے جدید" مادۂ تاریخ ہے، وصیت کے مطابق حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیا کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

علی اختلاف القولین حکیم علوی خاں کی عمر ۸۰ یا ۸۲ اسی یا بیاسی سال ہوئی،

تصنیفات | حکیم صاحب نے اپنے پیچھے نہایت ہی مفید اور اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو ایک زمانہ تک مخلوقِ خدا کو فیوضِ علمی سے بہرہ ور کرتی رہیں، مگر اب یہ تمام کتابیں ناپید ہیں، مگر بعد کے اربابِ فن نے اپنی اپنی کتابوں میں حکیم صاحب کی جستہ جستہ عبارتیں نقل کرکے ان ذخائرِ علمی کا خلاصہ محفوظ کر دیا ہے، اس طرح آج بھی علوی خاں کے علمی فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہے، اور شائقین علم اس سے مستفید ہو رہے ہیں،

مندرجہ ذیل کتابیں اُن کی تصنیفات میں شمار کی جاتی ہیں،

(۱)۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ للمیبذی پر مفید حاشیہ،

(۲) تحریر اقلیدس کی شرح۔

(۳) مجسطی کی شرح۔

(۴) موجز القانون کی شرح،

(۵) شرح اسباب و علامات پر قیمتی حواشی،

(۶) احوال اعضائے نفس پر ایک کتاب،

(۷) فنِ موسیقی پر ایک رسالہ،

(۸) التحفۃ العلویہ والایضاح العقلیہ،

اس کے عہد سلطنت میں علوی خاں برابر درجہ بدرجہ ترقی کرتے رہے، محمد شاہ کا دور آیا، تو اُس نے بھی ان کو اپنا خاص مصاحب بنایا، اور ان کو معتمد الملوک کا خطاب عطا کیا، اور اب وہ حکیم محمد ہاشم کے بجائے معتمد الملوک حکیم محمد ہاشم علوی خاں کے معزز لقب سے مشہور ہوئے، بعد کو عوام نے "نواب" کا اس میں اضافہ کر دیا،

محمد شاہ نے اسی پر بس نہیں کیا، ان کا پچھلا منصب شاہی بڑھا کر شش ہزاری منصب پر انھیں فائز کیا، اور تین ہزار روپے نقد ماہوار وظیفہ مقرر کیا، اس اکرام و اعزاز کے ساتھ حکیم صاحب کی زندگی گذر رہی تھی کہ نادر شاہ کی دہلی میں آمد ہوگئی، وہ علوی خاں کو باصرار اپنے ساتھ ایران لے گیا،

نادر شاہ نے دہلی میں حکیم صاحب سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ ان کو حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے اپنے خرچ سے بھیجے گا، ایران پہونچ کر نادر شاہ نے یہ وعدہ پورا کیا، اور حکیم صاحب کو اعزاز و اکرام کے ساتھ سفر حرمین شریفین پر روانہ کیا، اور وہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے، مگر حکیم علوی خاں کے دل میں ہندوستان کی محبت و کشش ایسی جاگزیں تھی، کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد ایران جانے کے بجائے پھر دہلی واپس آئے، یہ واقعہ ۱۱۵۶ھ کا ہے،

دہلی پہونچکر بدستور اپنے طبی مشاغل درس و تدریس، اور علاج و معالجہ میں مصروف ہوگئے، اور مخلوقِ خدا کو اُن کی ذات سے فیض پہنچنے لگا، پانچ سال کے بعد حکیم صاحب کو شدید قسم کا مرض استسقا لاحق ہوگیا، ہر چند بہتر سے بہتر تدبیریں کی گئیں، مگر شفا نہیں ہوئی، اور حکیم صاحب نے اسی مرض میں وفات پائی، سنہ وفات کے متعلق دو روایتیں ہیں،

حصہ دو ورق سے زیادہ نہیں ہوگا، جس میں طبی اوزان وغیرہ کا بیان ہے، اس لئے کہ پیش نظر کتاب کی آخری سطروں میں درج ہے کہ "باب بست و پنجم در بیان بعضے الفاظ غریبہ کہ متعارف اطباء است" و "اوزان مذکورہ در طب خصوصاً آنچہ درین کتاب آوردہ شدہ"۔

اس کے قبل بالترتیب اور کتب طب کی طرح جن مسائل کے بیان پر کتابیں ختم ہوتی ہیں، یہ بھی اسی طرح ختم ہوئی ہے، مسائل فن کے بعد اوزان کی بحث ہوتی ہے، جو ایک ضمنی دو ورقی مسئلہ ہے، اس قرینہ کی بنا پر میرا خیال ہے، کہ زیادہ سے زیادہ دو ورق اخیر سے ضائع ہوئے ہیں، جو حصہ موجود ہے، وہ چھ سو چھتیس صفحات ڈبل کراؤن سائز پر مشتمل ہے، کتاب کے لوح پر سنہ طباعت درج نہیں ہے، ممکن ہے اخیر کتاب میں ہو، جو شکستہ ورق کے ساتھ ضائع ہوگیا،

اسی طرح خاتمہ کتاب میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا علم نہیں ہو سکا، شروع کتاب میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق حمد نعت، مصنف کا نام سنہ تصنیف وغیرہ کا ذکر ہے، لوح کتاب پر پریس کی جانب سے درج ہے، "مجربات حکیم علوی خاں دہلوی موسوم بخلاصۃ التجارب" اسی کتاب کا ایک اشتہار مطبوعہ نولکشور کی ایک کتاب مطب علوی خاں کے کور پر اس طرح درج ہے،

"خلاصۃ التجارب، مجربات طبیہ حکیم علوی خاں مدونہ حکیم بہاء الدولہ بہادر"

اس اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حکیم بہاء الدولہ کی سعی کا نتیجہ ہے، اور مضامین علوی خان کے ہیں، لیکن درحقیقت واقعہ اس کے خلاف ہے، اس کی کئی وجہیں ہیں،

۱۔ دیباچہ کتاب میں بحیثیت مصنف بہاء الدولہ کا نام درج ہے، اس میں اشارۃً کنایۃً بھی اس کا تذکرہ نہیں، یہ کتاب ان معلومات طبیہ پر مشتمل ہے، جو حکیم علوی خاں کے

(۹) جامع الجوامع، صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں :- فن طب میں اس کی مماثل دوسری کتاب نہیں ہے، (نزہۃ) صاحب اکسیر اعظم نے کتاب کا نام بجائے جامع کے جمع الجوامع لکھا ہے، اور اپنی کتاب اکسیر اعظم میں اس سے استفادہ کیا ہے، دیباچہ میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن رموز اعظم میں قرابادین جمع الجوامع لکھا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ادویہ مرکبہ کی یہ کتاب جامع قرابادین ہے۔

(۱۰) آثار باقیہ، یہ کتاب بھی فن طب میں ہے، صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ ترکیب ادویہ کے بیان میں یہ کتاب حکیم علوی خاں کی عظمت علمی کے لئے "دلائل الاعجاز" کی حیثیت رکھتی ہے۔ (نزہۃ الخواطر)

(۱۱) عشرۂ کاملہ - اس کتاب کا تذکرہ صرف حکیم محمد اعظم خاں نے اکسیر اعظم جلد اوّل کے دیباچہ میں کیا ہے، یہ بھی فن طب کی کتاب ہے،

(۱۲) قرابادین علوی خانی، فن طب میں ہے، (دیباچہ اکسیر اعظم)

(۱۳) بیاض علوی خاں طب میں، (علاج الامراض ص ۸)

یہ ان کتابوں کی فہرست ہے جو بالکل نایاب ہیں، میری نظر سے دو اور ایسی کتابیں گذری ہیں جو گو ان کی جانب منسوب ہیں، مگر میری تحقیق یہ ہے کہ ان میں سے ایک تو قطعی ان کی نہیں ہے، اور دوسری کا ان کی جانب انتساب مشکوک ہے۔

(۱) خلاصۃ التجارب، یہ کتاب فارسی میں طب کے ایسے علمی وفنی معلومات پر مشتمل ہے جس سے مصنف کی علمی عظمت کا پتہ چلتا ہے، اس کتاب میں مریضوں کے ایسے حکایاتِ احوال بھی مذکور ہیں جو طب کے طلبہ کے لئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں، نولکشور پریس کانپور کی طبع شدہ ہے، میرے پیش نظر نسخہ اخیر سے ناقص ہے، اندازہ ہے کہ ضائع شدہ

چھٹا اڈیشن ہے، اس کے اخیر میں ۵ صفحات کا ایک رسالہ مسئلہ بحران پر مصنفہ حکیم علی حسین مرحوم لگا ہوا ہے، مطب علوی خاں میں اس موضوع کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں کوئی خاص ندرت علمی نہیں ہے، جس سے مصنف کتاب کے بارے میں، کوئی خصوصی علمی تصور قائم کیا جائے، عجیب بات یہ ہے کہ شروع رسالہ میں نہ کوئی تمہید ہے، نہ حمد و نعت ہی، ورنہ مصنف ہی کا نام مذکور ہے، اخیر میں بھی نہ کوئی خاتمہ، نہ کلمۂ خاتم، نہ نام مصنف اسی طرح کتاب کے مضامین میں بھی کہیں نہ مصنف کا نام ملتا ہے، نہ کسی شاگرد کا، البتہ صفحہ پانچ پر دو جگہ یہ درج ہے،

(۱) ضماد مستعمل حضرت قبلہ گاہی صاحب (۲) دوا معمول قدوۃ الاطباء والد ماجد

ان دونوں عبارتوں سے شخصیت کی تعیین مشکل ہے، البتہ نولکشور پریس کی طرف سے لوح کتاب پر "مطب علوی خاں" تحریر ہے، میرا خیال ہے کہ پریس سے اس رسالہ کے انتساب میں بھی غلطی ہوئی ہے، اس خیال کو اس قرینہ سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ حکیم محمد اعظم خاں مرحوم جیسا وسیع النظر محقق اپنی تصنیفات کے "کتب آخذ" میں کہیں بھی مطب علوی خاں کا تذکرہ نہیں کرتا، جب کہ علوی خاں کی دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُن کی بعض غیر مشہور کتابوں تک کا پتہ دیا ہے، مثلاً عشرہ کاملہ، بلاشبہ عدم ذکر سے عدم نفی گو لازم نہیں آتا، مگر حکیم محمد اعظم خاں کی نظر سے علوی خاں کی کسی معتبر کتاب کا اوجھل رہنا بظاہر ناقابلِ یقین ہے، اس لئے اپنے خیال کی تائید کا اس کو قرینہ ضرور سمجھتا ہوں، البتہ حکیم محمد اعظم خاں مرحوم نے اکسیر اعظم کے دیباچہ ص ۵ میں حکیم علوی خاں کے شاگرد حکیم میر حسن صاحب کی ایک کتاب "مطب میر حسن" کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ اس کو پریس والوں نے مطب علوی خاں کے نام چھاپ دیا ہو، اس لئے مطب علوی کی صحت انتساب

فیض کا ثمرہ ہیں، اور وہ صرف جامع اور مرتب ہیں،

(۲) بلکہ حکیم بہاء الدولہ نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے، کہ "ایں بیچارہ را بعضے از تجارب طبی کہ مشتمل است بر فوائد بدنی حاصل بود" جو اس کا ثبوت ہے، کہ یہ مجموعہ خود ان کے ذاتی تجربات کا مجموعہ ہے،

(۳) حکیم بہاء الدولہ نے دیباچہ کتاب میں سالِ تصنیف ۹۰۷ھ ہجری کی تصریح کی ہے "ایں رسالہ موسومہ بخلاصۃ التجارب دراوان سنۃ سبع و تسعمائۃ" اور حکیم علوی خاں اُس کے ایک سو بہتر سال بعد ۱۰۸۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے، (ولد بشیراز فی شہر رمضان سنۃ ثمانین والف) ایسی صورت میں اس کا انتساب حکیم علوی خاں کی جانب کیسے درست ہو سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس حقیقت کے باوجود لوحِ کتاب پر نولکشور پریس کی جانب سے علوی خاں کے نام کی صراحت موجود ہے جس سے بعض اربابِ علم کو بھی تو اس کتاب کے بارے میں دھوکہ ہو گیا ہے، چنانچہ مشہور فاضل اور بالغ نظر مصنف حکیم علی احمد نیر واسطی نے اپنے رسالہ نباض کے ایک شمارہ میں اور حکیم کوثر چاند پوری نے اپنی کتاب "اطباء عہدِ مغلیہ" میں خلاصۃ التجارب کو علوی خاں کی کتابوں میں شمار کیا ہے، لیکن یہ خوشی کی بات ہے، کہ مشہور طبیب اور مصنف حکیم محمد اعظم خاں رامپوری مرحوم کو یہ مغالطہ نہیں ہوا، انھوں نے اکسیر اعظم کے دیباچہ میں کتب ماخذ کے فہرست کے سلسلہ میں خلاصۃ التجارب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مگر کتاب کی نسبت میر بہاء الدین کی طرف کی ہے، جن کا لقب "بہاء الدولہ" ہے، حکیم صاحب نے علوی خاں مرحوم کی جانب اس کی نسبت نہیں کی ہے،

(۲) مطب علوی خاں۔ یہ ۹۱ صفحات کا ایک مختصر طبی رسالہ ہے، جس میں معمول مطب نسخہ جات درج ہیں، نولکشور پریس کانپور میں چھپا ہے، میرے پیش نظر ۱۹۱۰ء کا

معمولات سے استفادہ کیا ہے، اس طرح اس بلبل شیراز نے دبستان ہند کو اپنی علمی نغمہ سرائیوں سے ہمیشہ کے لئے زندہ کردیا،

اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب پیش نظر تھیں،

(۱) نزہتہ الخواطر مصنفہ حکیم عبدالحئی لکھنوی مرحوم ج ۶ ص ۴۳۶،
(۲) اکسیر اعظم جلد اول ص ۵،
(۳) رموز اعظم جلد اول ص ۳،
(۴) علاج الامراض مصنفہ حکیم محمد شریف خاں دہلوی ص ۱۰،
(۵) شرح اسباب و علامات یوسفی لکھنو،
(۶) خلاصتہ التجارب،
(۷) مطب علوی خاں،
(۸) اطباء عہد مغلیہ، کوثر چاند پوری،
(۹) رسالہ نباض لاہور حکیم نیر واسطی،

مشکوک ہے،

حکیم علوی خاں مرحوم نے ان بیش قیمت کتابوں کے علاوہ لائق و فائق تلامذہ کا بھی ایک بڑا حلقہ چھوڑا ہے، ان سے مخلوقِ خدا کو جو فیض پہنچا اس کا حصّہ بھی حکیم علوی خاں کے نامۂ اعمالِ خیر میں درج ہوگا۔

ان تلامذہ میں سے صرف چند کے نام مجھے معلوم ہو سکے،

(۱) حکیم نوراللہ صاحب مرحوم مصنّف "انوار العلاج"،

(۲) حکیم ثناءاللہ صاحب مصنّف طب اثنائی، ساکن بریلی،

(۳) حکیم میر حسن صاحب مرحوم مصنّف "طب میر حسن"،

(۴) حکیم اسد علی مرحوم

حکیم محمد اعظم خاں رام پوری مرحوم نے اکسیرِ اعظم رموزِ اعظم کے دیباچوں میں اسمارِ اطبا کے عنوان سے ان کا ذکر کیا ہے، تلاش سے ان ناموں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے،

یہ ان شاگردوں کے نام ہیں جنھوں نے براہِ راست حکیم علوی خاں مرحوم کے فیضِ صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے، ایسے تلامذہ جو ان کے شاگرد در شاگرد کے سلسلۂ تعلیم سے وابستہ ہیں ان کا حلقہ بہت وسیع ہے، ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے طبی خانوادے علوی خاں کے فیوضِ طبی کے خوشہ چیں ہیں، خاندانِ اجملی دہلوی کے مورثِ اعلیٰ حکیم محمد شریف خاں جو خود استاذ الاساتذہ ہیں، اور حکیم محمد اعظم خاں رامپوری صاحبِ اکسیرِ اعظم وغیرہ اور حکیم اعظم خاں رام پوری مرحوم کے بھانجے حکیم نجم الغنی اور دیگر قابلِ ذکر اطبا حکیم علوی خاں مرحوم کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہیں،

علوی خاں کے بعد ہر محقق و مصنّف نے اپنی طبی تصنیفات میں حکیم علوی خاں کے مجرّبات

آپس میں جنگیں رہتی ہیں، اس کے ساتھ بڑے خلیق اور عربوں جیسے مہمان نواز بھی ہیں، یہ اُن کی عادت میں شامل ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں قریب کی کسی مسجد میں لاکر کھاتے ہیں، اور اس میں ہر وارد و صادر کو شریک کرتے ہیں، اُن کے دسترخوان پر پالتو گدھے کا گوشت بھی ہوتا ہے، اور بازاروں میں عام طور پر فروخت ہوتا ہے، کیونکہ یہاں کے لوگ اس کو حلال سمجھتے ہیں، ان کا بادشاہ عرب کے مشہور قبیلہ ازد بن الغوث کا ہے، جو اپنے مکان کے سامنے دربار منعقد کرتا ہے، نہ کوئی حاجب اور وزیر ہوتا ہے اور نہ کسی کے آنے سے روکا جاتا ہے، بادشاہ خود شکایتیں سنتا اور فیصلہ کرتا ہے،

ابن بطوطہ سے تقریباً ایک صدی قبل عرب کے ایک دوسرے سیاح یاقوت حموی کا اس شہر میں گذر ہوا تھا جس نے یہاں کی پارچہ بافی کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ اس قسم کے ریشم کے کام اور زر بافی کی شان دوسرے عرب ملکوں میں نہیں ملتی، لیکن یہ کپڑے بہت گراں فروخت ہوتے ہیں،

یہ تو چھ سو سال پہلے کا عمان تھا، لیکن آج بھی وہاں قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ غریبی جہالت اور بدحالی بدستور قائم ہے، اور صدیوں پہلے کا عمان آج بھی وہی عمان ہے، قدامت پسندی، اور بے کاری نے اُس کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے زرخیز زمینوں نہروں اور وادیوں کے باوجود اب تک اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا، عمان کی سرحد سے مغرب جانب نزوی کی سمت میں شمالی مغرب کے پچاس کیلومیٹر کے بعد تقریباً ڈھائی سو کیلومیٹر کا وسیع اور سرسبز و شاداب علاقہ جو وادی سمایل کے نام سے مشہور ہے، بالکل بیکار پڑا ہوا ہے، اور دور دور تک آبادی کا

تلخیص و تبصرہ

عُمان

"عمان ~~[illegible]~~ میں ایک چھوٹی سی عرب ریاست ہے سلطان قابوس یہاں کے حکمراں ہیں، عرب دنیا کی سیاست میں عمان کا نام بھی آتا ہے اس کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، حال کے ایک عرب سیاح نے اس کے چشم دید حالات لکھے ہیں جو مفید معلومات پر مشتمل ہیں، اس لئے اس کی تلخیص درج کی جاتی ہے"

اسلامی ممالک میں عمان غیر متمدن اور قدامت پسند ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے یہاں صدیوں تک خارجیوں کا تسلط رہا، جو بالعموم اباضی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن اب عمان ~~شرقی اردن کا دستور حکومت~~ سیاسی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے ایک مسقط اور اس کے قرب وجوار کا علاقہ دوسرا عمان جو اندرون ملک کے علاقوں پر مشتمل ہے اور اب اس پر ہاشمی خاندان حکومت کرتا ہے، خارجیوں کا تسلط صدیوں پہلے ختم ہو چکا ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں عمان بالخصوص اس کے ایک خوبصورت شہر نزوی کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا ہے، کہ عمان سرسبز و شاداب نہروں درختوں کھجوروں کے باغات اور مختلف قسم کے پھل پھلواریوں پر مشتمل ہے جس کا ایک شہر نزوہ پہاڑ پر آباد ہے جو باغات سے گھرا ہوا ہے، یہاں کے لوگ بڑے باہمت اور بہادر ہیں، ان میں اکثر

اور عدن وغیرہ ملکوں میں رہتے ہیں، اور وہیں ملازمت اور دوسرے پیشوں کے ذریعے اپنی زندگی گذارتے ہیں۔

یہی حال پورے عمان کا ہے، تمام شہروں خصوصاً دیہی علاقوں کی اقتصادی و معاشی حالت کا انحصار زراعت اور کاشت پر ہے، ان کی اکثریت کاشت کار ہے لیکن زراعت کے جدید آلات اور کیمیاوی کھاد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زراعت میں کامیاب نہیں ہیں، اور جہاں صدیوں پہلے تھے، وہیں آج بھی ہیں، وہ قدامت پسندی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے، اور اپنے آبا و اجداد کے طریقے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، بونے جوتنے کے لئے وہی پرانے ہل اور کدال استعمال کرتے ہیں۔

ملکی پیداوار کی کمی کی وجہ سے بیرونی برآمد بہت کم ہے، چیزیں انتہا گراں ہیں جسکو ایک معمولی شخص جو کاشت نہ کرتا ہو، نہیں خرید سکتا، عمان کی اقتصادی بدحالی اور غربت نے وہاں کے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا ہے، عمان میں دو کروڑ آبادی کی گنجایش ہے، مگر موجودہ آبادی بیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے، ان کا بڑا حصہ بھی دوسرے ملکوں میں رہتا ہے، عمان میں طرح طرح کی متعدی بیماریاں پھیلی رہتی ہیں، عموماً لوگ آنکھوں اور دانتوں کے امراض میں مبتلا رہتے ہیں، سل اور ملیریا کی بیماریاں وبائی طور پر پھیلی رہتی ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ آبادیوں میں گندگی بکثرت ہے، صفائی کا معقول انتظام نہیں ہے، سمائل کے ایک حاکم نے بتایا کہ صفائی کے انتظامات کی ذمہ داری وزارت صحت پر ہے جو بہت تھوڑے علاقوں میں محدود ہے، اس کے اخراجات وزارت اوقاف برداشت کرتی ہے، جہاں صفائی کا کچھ انتظام ہے، وہ بھی ناقابلِ اطمینان ہے، ہر جگہ سڑکوں اور بازاروں

کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔ کسی زمانہ میں یہاں آبادیاں تھیں، جن کے نشانات آج بھی جا بجا ملتے ہیں، لیکن اب ان آبادیوں کی جگہ خاردار درخت اور بوسیدہ مکانات کے ٹیلے، اور قابلِ کاشت افتادہ زمینیں ہیں، جو انسانی قدم کی منتظر ہیں، اگر ان طویل وادیوں میں انسانی آبادی کے نشانات ملتے بھی ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں، جو میلوں کے بعد ایک دو نظر آجاتے ہیں، اُن کے مکانات اس قدر خستہ ہیں کہ ان سے ویرانی برستی ہے مٹی کے کچے مکانات ہیں، جن کی چھتیں کھجور کی پتیوں اور ٹہنیوں پر قائم ہیں یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، جہاں میٹھے پانی کی نہروں اور باصلاحیت زمینوں کی کثرت کے باوجود وہاں کے لوگ غربت کی زندگی گذار رہے ہیں،

سمائل کی سرسبز و شاداب وادیاں اپنی خوبصورتی اور زرخیزی کے اعتبار سے بے مثال ہیں، جگہ جگہ صاف و شفاف پانی کے چشمے، گھنے سایہ دار درخت اور بلند پہاڑوں پر پھیلے ہوئے باغات نہایت دلکش منظر پیش کرتے ہیں، یہاں کی شاعری میں سمائل کی وادیوں کا ذکر ضرور آتا ہے، یہ وادیاں فطری حُسن کے ساتھ اپنے دامن میں تاریخی واقعات بھی رکھتی ہیں، بڑے بڑے علماء صوفیہ اور امراء اکابر کی یادیں ان سے وابستہ ہیں، یہاں کی روایت کے مطابق عمان میں دعوتِ اسلام پہنچنے سے قبل سمائل ہی کے ایک شخص مازن ابن غضوبہ السعدی نے مدینہ جاکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا تھا، یہاں کے والی نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہاں کے سبھی لوگ کاشت کرنا جانتے ہیں، بتایا کہ ہر شخص تو زراعت نہیں کرتا، عموماً یہاں کے باشندے کویت سعودی عرب بحرین زنجبار

کے مختلف حصوں میں باائیس ۲۴ مدرسوں کے قیام کا منصوبہ ہے، جن میں دس لڑکیوں کے لیے خاص ہوں گے،

عمان کے بڑے شہروں میں نزوی، فہود، میناء الفحل اور صحار مشہور ہیں، صحار ساحلی علاقہ ہے، اور عمان کا سب سے زیادہ متمدن اور خود کفیل شہر شمار کیا جاتا ہے، یہ تاریخی بندرگاہ بھی ہے جہاں سے چینی تجارتی سامان درآمد برآمد ہوتا تھا، اس لیے اس کو خزانۂ مشرق بھی کہتے ہیں، ابو اسحاق اصطخری نے اس کو بلاد اسلامیہ میں سب سے زیادہ متمول اور تجارتی بندرگاہ بتایا ہے، آج بھی یہ بہت آباد اور پر رونق اور ساحل باطنہ کے تمام علاقوں میں ممتاز ہے یہاں کا ذریعہ معاش زراعت مچھلی اور موتیوں کی تجارت ہے،

میناء الفحل بھی ساحلی علاقہ ہے، اور عمان کے تیل کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے، فہود میں تیل کی دریافت کے بعد سے روز بروز آبادی بڑھتی جارہی ہے اور جدید طرز کے مکانات بنتے جارہے ہیں،

عمان میں تیل کی دریافت اس کی ترقی کا پہلا زینہ اور اس کی اقتصادی تاریخ میں بہت بڑا انقلاب ہے، فروری ۱۹۵۴ء میں ماہرین ارضیات کی ایک جماعت نے الربع الخالی کے نشیبی علاقوں میں تیل کی تلاش شروع کی اور اسی سال اکتوبر میں پٹرولیم کی تلاش کے لیے کھدائی بھی شروع ہوگئی، لیکن چھ مہینہ کی مسلسل جدوجہد کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اس مدت میں چار کنوئیں کھودے گئے، جن پر ایک کروڑ بیس لاکھ اسٹرلنگ صرف ہوا، بالآخر اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے پانچ کمپنیوں نے آپس میں معاہدہ کیا، لیکن اس کام میں ناکامی کے بعد ان میں سے

میں گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں، ان گندگیوں کی وجہ سے آئے دن وبائی امراض پھیلتے رہتے ہیں، خصوصاً نزوی کے باشندے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اتنے بڑے شہر میں طبیبوں کی کمی ہے، اور کوئی ایسا سول اسپتال نہیں ہے جو یہاں کے شہریوں کے لیے کافی ہو، ایک ہندوستانی طبیب بڑی محنت اور دلچسپی سے مطب کرتے ہیں، ان کو وزارت صحت کی طرف سے سہولتیں بھی ملی ہوئی ہیں، جن میں ایک پختہ عمارت بھی شامل ہے، جو اس شہر کا گویا اسپتال ہے، انھوں نے بتایا کہ یہاں آنکھوں کی بیماریاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہیں، سل ملیریا، اور اسہال کا مرض عام طور پر ہوتا ہے، ایسی حالت میں یہاں کم سے کم دس بارہ اطبا کی ضرورت ہے، اس لیے کہ نزوی عمان کا مرکزی شہر ہے جہاں دوسرے مقامات کے مریض بھی پہنچتے رہتے ہیں،

عمان میں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، بچوں کی ابتدائی تعلیم عموماً کھجور کے باغوں میں کسی فقیہ کی سرپرستی میں ہوتی تھی جو معلم کے لیے وقف ہوتا تھا، مگر ادھر چند سالوں سے کئی مدرسے قائم ہو چکے ہیں، اس وقت نزوی میں تقریباً پانچ مکاتب قائم ہیں، ان مکاتب میں گذشتہ سال سات سے سترہ سال تک کی عمر کے تقریباً پانچ سو طلبہ داخل ہوئے، اسی طرح سمائل میں متعدد ابتدائی مدرسے قائم ہیں، جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے حکومت بھی اس میں دلچسپی لے رہی ہے، چنانچہ سمائل کی ایک نامور شخصیت شیخ سعود خلیلی کو تمام عمان کے مدرسوں کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے، جنھوں نے عمان کی تعلیمی مہم کے لیے مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا ہے، اب آئندہ سال عمان

مکتوب حمید

از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس

پیرس کے رومانی کلیسا کے ایک پادری کرنسٹان ورنزیل جارج نے فرانسیسی زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی، اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا تھا، فارسی سے مولانا وارث علی ایم، اے فاضل دیوبند نے اردو میں منتقل کیا، مئی ۱۹۷۱ء میں معارف میں اس پر ریویو ہوا، اس میں مترجم نے مصنف کا جو تعارف اور کتاب کے متعلق جو رائے لکھی تھی، ریویو میں اس کو نقل کر دیا گیا تھا، اور کتاب میں جو غلطیاں نظر آئی تھیں، ان کو ظاہر کر دیا تھا،

مشہور فاضل ڈاکٹر حمید اللہ کتاب کے مصنف سے پوری طرح واقف ہیں اور فرنچ میں اصل کتاب ان کی نظر سے گذر چکی ہے، ان کے بارہ میں انکی رائے اس سے بالکل مختلف ہے، جو اردو کے مترجم نے ظاہر کی ہے، اس لیے ان کی نظر سے جب معارف کا ریویو گذرا تو انھوں نے مصنف اور تصنیف کی اصل حقیقت لکھ کر بھیجی،

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جن قابل اعتراض باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کو فارسی کے مترجم نے حذف کر دیا تھا، یہ کتاب

تین کمپنیوں نے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ جن میں فرانس کے ساتھ برطانیہ کی بی پی اور نیوجرسی کی اسٹینڈرڈ موبل کمپنی شامل تھے۔ باقی دو کمپنیوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور فروری ۱۹۶۴ء میں گذشتہ کنوؤں سے کچھ دور ہٹ کر کھدائی شروع کی، اس طرح تیل کا بہت بڑا چشمہ ابل پڑا، اب یہ تیل کا ذخیرہ شیل اور بارٹلکس کے ٹھیکہ میں ہے، جس میں شیل کی کمپنی ۸۵ فی صد کی حصہ دار ہے، اور دوسری پندرہ فی صد کی۔ موجودہ چشمے سے تین لاکھ تیس ہزار ڈرام یومیہ تیل حاصل ہوتا ہے، جب کہ ۱۹۶۷ء میں اس کی مقدار ایک لاکھ چالیس ہزار ڈرام تھی۔ فی الحال فہود سے ملوتک تین سو کیلومیٹر کے پائپ بچھا دیے گئے ہیں۔ اور دوسرے چشموں کی تلاش جاری ہے۔ اس طرح عمان بہت جلد خوشحال ہو جائے گا اور اس کی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی، یہاں کی حکومت نے شفاخانوں اسکولوں اور سڑکوں کے بنانے کا پروگرام بنایا ہے، وہ حتی الامکان ترقی کے لیے کوشاں ہے، چنانچہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے دو بڑے پیمانہ پر ہوٹل بن چکے ہیں اور دیگر تعمیری کاموں میں ہاتھ لگا ہوا ہے، دو رسالے بھی شائع ہوتے ہیں جو ملک کی ذہنی تعمیر اور سیاسی مباحث میں حصہ لیتے ہیں، دوسرے ملکوں میں سرکاری سطح پر خیرسگالی کے لیے وفد بھی بھیجے جا رہے ہیں، جن کے اب تک اثرات ملک کی تعمیر اور استحکام کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ عمان کے ایک حاکم نے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا کہ ہم جن مشکلات سے دوچار ہیں، دنیا کو اس کی خبر نہیں، لیکن آئندہ پانچ سال کے اندر ہم وہ نہیں رہیں گے جو آج ہیں،

مولف کی دیانتداری کا اس سے اندازہ لگایا جائے کہ اسے عربی رسم الخط بھی نہیں آتا لیکن کتاب میں عربی کتابوں کے راست حوالوں میں نہ صرف مطبوعات ہیں بلکہ ایسے مخطوطات بھی جن کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ہے اور مولف نے ان کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی،

پارس کے ایک مسلمان نے مولف ہی کی درخواست پر کتاب کی تاریخی اغلاط کی ایک فہرست مرتب کر دی جو ۴۲ صفحوں میں تھی۔ چند ماہ بعد مولف نے ایک اخبار میں ایک مضمون اپنی کتاب کی تعریف اور خلاصے میں چھاپا اور اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ فلاں فاضل و ممتاز مولف نے اس کتاب کو غور سے دیکھکر اس میں جو غلطیاں پائیں وہ "نہایت قلیل وحقیر صرف املا کی غلطیوں پر مشتمل ہیں"۔

مولف کا انداز یہ ہے کہ کسی انتہائی نامناسب (اور غلط) چیز کا رسول اکرمؐ کی طرف انتساب کرے، پھر اس کی تائید میں کہے: "مگر وہ اللہ کا پیغامبر تھا، اسے قطعاً حق تھا کہ جو چاہے کرے"۔ انتہائی فحش اور پاجی پن کی چیزیں بھی اصل کتاب میں ہیں،

چونکہ شکر میں لپیٹ کر اسلام اور رسول اکرمؐ کے متعلق رکیک باتیں لکھی گئی ہیں مشنری اس کتاب کو خوب پھیلا رہے ہیں، اور ہمارے بھولے مسلمان بھی نادانستہ اس کے ترجمے کر کے (جو ممکن ہے۔ حذف و اضافہ و تحریف کے بعد ہی ہوں) اس گناہ میں شریک ہو رہے ہیں۔

اگر مناسب ہو تو اسے بھی چھاپ دیجئے

المفتقر الی اللہ

محمد حمید اللہ

ہماری نظر سے گذری ہے، بعض غلطیوں کے سوا جن کی مترجم نے حاشیہ میں تصحیح و
تردید کر دی ہے، کوئی اہم قابل اعتراض بات نظر میں نہیں آئی، مصنف کے
متعلق اردو کے مترجم کو فارسی ترجمہ سے جو حالات معلوم ہوئے، وہی انھوں نے
اپنے مقدمہ میں نقل کر دیے، اس لیے وہ اس میں بھی بے قصور ہیں، لیکن ڈاکٹر
حمید اللہ صاحب کے سامنے اصل فرانسیسی کتاب ہے، اور مصنف کے حالات سے
پوری طرح واقف ہیں، اس لیے ان کا بیان بھی صحیح ہے، بہرحال ان کے
خط سے دونوں کے متعلق غلط فہمیوں کی تصحیح ہوتی ہے، اس لیے ان کا خط
شائع کیا جاتا ہے۔ م

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مئی کا رسالۂ معارف آج ۲۹ جولائی کو یہاں پہنچا، سارے کام چھوڑ کر اس کا
مطالعہ کیا، چشم بد دور۔

اگر اجازت مرحمت ہو تو عرض کروں کہ مطبوعاتِ جدیدہ کی تنقید میں "پیغمبر اسلام"
مترجمہ وارث علی صاحب کے متعلق "ص" کے معلومات اصلاح طلب ہیں،

وِرژیل جارج کا صحیح تلفظ ورجیل گیورگیو ہے، یہ نہ کبھی مسلمان ہوا اور نہ "بائیس
سال کے مطالعہ و تحقیق" کے بعد یہ کتاب لکھی، یہ شخص ابھی زندہ ہے، پارس میں رومانوی
کلیسا میں پادری اور راہب ہے، زندگی افسانہ نویسی میں گذری اور کئی ناولوں پر
ادبی انعام بھی ملے، سیرت نبویہؐ پر بھی ایک افسانہ لکھا ہے، اور غالبًا بائیس ہفتوں
میں نہ کہ بائیس سال میں۔

آج تو مٹتی ہے پاکیزگیٔ حسن و جمال   آج تو آبروئے اہلِ نظر جاتی ہے
نشۂ نکہتِ گل لے کے گلستاں سے ولیؔ
پھر اسیروں کی طرف بادِ سحر جاتی ہے

غزل

جناب عروج زیدی

بہ تقصہ نظر کے سامنے ہو سود و حاصل تک   نہ سعیِ طلب محدود کب ہو ایک منزل تک
[illegible] پہنچی نزاعِ حق و باطل تک   تلاشِ دوست میں جانا پڑا مجھکو درِ دل تک
خوشا وقت پسندی سخت جانی، حوصلہ مندی   مرے ہاتھوں پریشاں ہو گئی ہر میری مشکل تک
یہاں تو فاصلے ہی فاصلے، دوری ہی دوری ہے   وفا آشنائیت پہنچا [illegible] دل تک
[illegible] کے چھالے اور کانٹے، یہ حقیقت ہے   ترے قدموں پہ لے [illegible] پہنچا ہر گردِ منزل تک
ذرا سی جنبشِ پردہ سے نظمِ ہوش برہم ہے   بکھر سکتا ہے وقت دید تو شیرازۂ دل تک
مری نظریں بلند و پست کا معیار ہیں شاید   ہزاروں محفلیں تھیں راستہ میں تیری محفل تک
[illegible] موجیں میری کشتی کو ڈبو دینے پہ کوشاں تھیں   وہ موجیں کیوں پلٹ کر آ گئی ہیں یاروں ساحل تک
طرب نا آشنا آغازِ محبت بھی مسلّم ہے   مگر یہ بات پہنچے گی شکستِ شیشۂ دل تک
[illegible] رنگینیٔ محفل دیکھنے سے قبل کیوں اٹھوں   اگرچہ میرے دشمن ہیں در و دیوارِ محفل تک
نہ [illegible] فروزِ نظر ہیں یہ تصور، خود بصورت ہے   یہ دنیا بھی حسیں ہے فطرتِ رنگینیٔ دل تک
خدا کی شان ہیں وہ جانِ محفل، شانِ محفل ہیں   جنھیں آتے نہیں اے دوستو! آدابِ محفل تک

عروجؔ! ان سرفروشانِ وفا پر رشک آتا ہے
خراج داد دیتا ہے جنھیں شورِ سلاسل تک

ادبیات

بیانِ حقیقت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

ماہ و انجم سے پرے فکرِ بشر جاتی ہے
عقلِ اول کے جہاں جلتے ہیں پر جاتی ہے

سقفِ افلاک سے بھی ہو کے گذر جاتی ہے
کیا بتاؤں میں کہاں تک یہ نظر جاتی ہے

منزلِ شوق کو جو راہ گزر جاتی ہے
اپنے دامن میں لیے تحفۂ سر جاتی ہے

کیا خبر آتی ہے کس سمت سے یہ جوئے حیات
کیا پتہ ہو کے یہاں سے یہ کدھر جاتی ہے

خنجر و تیغ سے بھی ہو نہیں سکتا ہے کبھی
ایک معصوم نظر کام جو کر جاتی ہے

جو ہر ذات مصائب سے نہیں ہوتے فنا
خاک میں ملنے سے کب آب گہر جاتی ہے

آبرو دل کی بہت ہم نے بچائی تھی مگر
اب وہ تیرے سبب اے دیدۂ تر جاتی ہے

جبرِ قدرت کو سمجھ بیٹھے ہیں جو دراجل
دستِ قاتل کی جفا تیغ کے سر جاتی ہے

روحِ انساں کا سکوں خواہ مٹے اسکے سبب
قلبِ انساں سے کہیں خواہشِ زر جاتی ہے

گاہ شعلوں میں نمو پاتی ہے یہ روح حیات
اور کبھی لمس سے شبنم کے بھی مر جاتی ہے

رخ پہ تا حشر رہے گا یہ ترے داغِ ستم
ہم پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے گزر جاتی ہے

فن و فنکار تو بکتے ہی رہے ہیں لیکن
آج تو حرمتِ ناموسِ بشر جاتی ہے

مطبوعات جدیدہ

فریب تمدن: از جناب اکرام اللہ صاحب ایم اے، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات: ۵۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت: عہ، پتہ:- اقبال پبلشنگ فتح گنج، امین آباد روڈ لکھنؤ

یورپ نے سائنسی اور صنعتی حیثیت سے جیسی حیرت انگیز ترقی کی ہے، اسی قدر وہ اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے زوال و انحطاط کا شکار ہوا ہے، اور اب وہاں جنسی بے راہ روی اور جرائم اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انسانیت و بہیمیت میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا ہے، لائق مصنف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کے اسی پہلو کا مفصل جائزہ لیا ہے، اور اس کی سفلیت و بہیمیت کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے، یہ کتاب چار حصوں اور بارہ ابواب میں منقسم ہے، پہلے حصہ کے ابواب میں انسانی جذبات اور شہوانیت کو برانگیختہ کرنے والے محرکات فحش نگاری، عریانیت، مے نوشی، قماربازی، رقص و سرود، فلموں، اور ڈراموں کی کثرت اور دوسرے حصہ میں یورپ کی فحش کاری، صنفی آوارگی کے واقعات کی تفصیل پیش کی گئی ہے تیسرے حصہ میں اس حیوانی زندگی کے سنگین نتائج اور اس سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل یعنی منع حمل، اسقاط، ناجائز ولادت، جرائم و تشدد کی کثرت، اور مادی جسمانی اور طبی نقصانات کا ذکر ہے، آخری حصہ مغربی دانشوروں کے اُن بیانات پر مشتمل ہے، جن میں مغربی تہذیب و تمدن کی ناکامی کا اعتراف، اور اس پر سخت بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے

فریب سکوں

از

جناب بدر الزماں صاحب ایڈوکیٹ

گل کو تجدید رنگ و بو کی خلش　　دل کو اظہار آرزو کی خلش

حسن کو بے نیاز کیوں کہئے　　شکنِ زلفِ مشکبو کی خلش

ہمہ عالم فریب نقش خیال　　عقل کو ریزہ ماد تو کی خلش

ہمہ طاعت اسیر حور و قصور　　رند کو ساغر و سبو کی خلش

چشم کو اضطراب دید جمال　　ذوق کو کیفِ گفتگو کی خلش

کس کو حاصل ہوا فراغ سکوں　　خلوت وصل میں عدو کی خلش

وصل کو منزلِ سکوں نہ کہو　　دامن زخم کو رفو کی خلش

رند مصروف شغل پردہ دری　　چشم ساغر کو آبرو کی خلش

نفس بیگانۂ خلوص و نیاز　　پھر بھی پیراہن نکو کی خلش

تو، ہے اک پیکر تغافل کیش

اور مجھے تیری جستجو کی خلس

حیات شبلی

مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

جدید اڈیشن　　قیمت عہ

اہم مسجدوں کے متعلق مفید اور مستند معلومات پر مشتمل ہے، اور ہندوستانی تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاص طور پر لائق مطالعہ ہے۔

سچے نبی کی سچی باتیں مرتبہ شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب مرحوم لکھنوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۸۲، مجلد قیمت عہ، ناشر کتاب آزاد گھر کلاں محل دہلی نمبر ۶۔

اس میں حدیث کی مشہور معتبر کتاب صحیح بخاری کی ان حدیثوں کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے جن کا تعلق عورتوں اور بچوں سے ہے، ان کے متعلق ہدایات بیان کی گئی ہیں، اس طرح اس میں طہارت، عبادات، معاشرت، اخلاق اور معاملات وآداب وغیرہ مختلف النوع ابواب کی حدیثوں کا ترجمہ اگیا ہے، اگر ان کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہوتا، اور بعض تشریح طلب حدیثوں کی تشریح بھی کی گئی ہوتی تو اس کا افادہ بڑھ جاتا، شروع میں ایک مفید مقدمہ بھی ہے لیکن اس میں علماء ومشائخ کے بارہ میں جس رائے کا اظہار کیا گیا ہے اس میں انتہا پسندی اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، یہ مجموعہ عورتوں اور بچوں کی اصلاح وتربیت کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس دینی خدمت کا صلہ عطا فرمائے۔

مقدمہ شعر وشاعری (حالی) مرتبہ نمبر ۱ تا ۳ جناب رشید حسن خاں صاحب **موازنۂ انیس ودبیر (شبلی)** نمبر ۴ و ۵ ڈاکٹر محمد حسن صاحب و نمبر ۶ **دیوان درد، انتخاب میر** صدیق الرحمن صاحب قدوائی چھوٹی تقطیع **انتخاب سراج اورنگ آبادی** کاغذ، کتابت وطباعت بلند پایہ صفحات **وانتخاب اکبر الہ آبادی** بالترتیب ۲۲۵ مجلد، ۲۴۰ غیر مجلد، ۱۰۰ مجلد ۲۰۷ نمبر غیر مجلد، ۹۹ مجلد، ۱۰۰ غیر مجلد قیمت بالترتیب ۱؎، ۵؎، ۱؎، ۲؎

اس سلسلہ میں اس کے مرض کی تشخیص اور طریقۂ علاج وغیرہ کے متعلق مغربی و مشرقی مفکرین کے خیالات بھی درج کیے گئے ہیں، مصنف نے یہ سب باتیں مستند حوالوں سے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں، اور اعداد و شمار کا نقشہ بھی دیا ہے، اس داستان کی حکایت کا مقصد ایشیائی و اذتی ملک کو متنبہ اور خبردار کرنا ہے جو یورپ کی اصل خوبیوں کے بجائے انہی لعنتوں کا طوق اپنی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں حالانکہ بقول اقبال

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

مصنف کا جذبہ نہایت نیک اور بڑا قابل قدر ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بارآور بنائے

ہندوستان کی مسجدیں مرتبہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب ایم اے ڈی لٹ، متوسط تقطیع، کاغذ بہتر طباعت ٹائپ صفحات ۴۰ مصور قیمت ۵ روپے ۸ آنے پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند اولڈ سیکریٹریٹ دہلی، نمبر ۸۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے جو حکومت ہند کے فارسی و عربی کتبات محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، اس کتاب میں ہندوستان کی چند اہم اور ممتاز مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے شروع میں اسلام میں مسجد کے مقام، اس کی تعمیر کے آغاز و ارتقاء کا پھر خاص ہندوستان میں مسجدوں کی تعمیر کی ابتدا، طرز تعمیر کی نوعیت اور ترقی وغیرہ دکھائی گئی ہے، آخر میں دلی بنگال، جونپور، گجرات، احمد آباد، بیجاپور، حیدرآباد، سری نگر، آگرہ، فتحپور سیکری، اور سرنگاپٹن کی خاص خاص مساجد کے متعلق ضروری معلومات بانیوں اور سنہ تعمیر کی تعیین، ان کے وسعت، رقبہ، عام کوائف اور اہم خصوصیات وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، اور ان کے عکسی فوٹو دیئے گئے ہیں، غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے، جو ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد کی نہایت

ہندو اصحاب قلم کے ہیں، شروع کے دو مضامین خود جگر صاحب کے ہیں، ایک میں ان کے خود نوشت اور دوسرے میں اُن کی اہلیہ کے حالات ہیں، ایک مضمون میں ان کی صاحبزادی نے اُن کی گھریلو زندگی دکھائی ہے، یہ تینوں مضامین دلچسپ ہیں، باقی مضامین میں اُن کی شاعری کے مختلف اصناف اور پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک اہل کمال اور صاحب فن کی یہ قدر دانی لائق تحسین ہے،

ندائے ملت رسول نمبر مرتبہ جناب محمد عبد القدوس، حکیم عبد القوی نور عظیم

(حصہ اول و دوم) ندوی، نذر الحفیظ ندوی صاحبان تقطیع بڑی، ضخامت مجموعی صفحات

۳۸۰ و ضمیمہ ۱۳۲ قیمت: عا روپیہ قیمت ضمیمہ ۷۰ پیسے، پتہ:- دفتر ندائے ملت ۹۹ گوئن روڈ، لکھنؤ،

ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ ملی و قومی مسائل پر سنجیدہ و باوقار مضامین بے لاگ اور جرأتمندانہ تبصروں کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت مقبول ہے، اس کے سال میں بعض خاص نمبر بھی شائع ہوتے ہیں، اس سال ربیع الاول کے موقع پر "رسول نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، جو تعلیم نمبر کی طرح وقیع اور پُر از معلومات ہے، اس کے اکثر مضامین ہیں تو پرانے اور ماخوذ لیکن ان کو اس سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، کہ نئے معلوم ہوتے ہیں "اوراق زریں" کے عنوان سے رسول اللہؐ کی سیرت و ارشادات کی تلخیص کی گئی ہے، جو خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، جس کے بعد سابق و موجود اکابر علماء و اصحاب قلم کے اصل مضامین یا ان کے ترجمے مختلف جاذب نظر اور دلآویز عنوان کے تحت شامل کئے گئے ہیں، شروع میں قدیم و جدید شعراء کی عربی، فارسی، اور اردو نعتوں کا گلدستہ بھی ہے، نمبر کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے بعد میں اس کا ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے، یہ بھی سیرت پر مفید مضامین پر مشتمل ہے یہ رسول نمبر اور اخبار و

عہ، دعار، پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، نمبر ۲۵،

مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں وکشمیر کی مالی امداد سے قدیم معیاری اور کلاسیکل کتابوں کے جواب کمیاب ہیں نئے اڈیشن شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، مذکورۂ بالا کتابیں اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، ان میں اول الذکر دو میں اردو تنقید کی وہ اہم اور بنیادی کتابیں ہیں جن سے فن تنقید کے غیر معمولی ارتقا کے باوجود ناقدین فن بے نیاز نہیں ہو سکے ہیں، دوسری چاروں کتابیں اردو شعر و سخن کے نامور اساتذہ کے دواوین ہیں، ان میں دیوان درد کے علاوہ جو خود سراپا انتخاب ہے، سب منتخب کلام پر مشتمل ہیں، ہر کتاب کے شروع میں فاضل مرتبین کے قلم سے مختصر تعارف بھی شامل ہے جس میں مصنفین کے فنی کمالات، ادبی مرتبہ کتابوں کی اہمیت، اور فنی حیثیت وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ سب کتابیں متن کی صحت، طباعت کی نفاست اور حسن آرائش کے ظاہری لوازم کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہیں ان کی اشاعت، ادبی خوش مذاقی بھی ہے، اور مفید ادبی خدمت بھی، اس کے لئے مکتبہ جامعہ اور مرتبین اردو زبان وادب کے قدر دانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں،

جگر بریلوی شخصیت اور فن مرتبہ جناب مالک رام صاحب وسیفی پریمی صاحب متوسط تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۹۶، مجلد قیمت سے، ناشر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ دہلی، نمبر ۶،

جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اردو زبان کے نامور شاعر اور نکتہ سنج ادیب ہیں اس کے باوجود ان کو جیسی شہرت ملنی چاہئے تھی نہیں ملی، زیر نظر کتاب جگر صاحب کے کمالات کے اظہار کے لئے شائع کی گئی ہے، جو ان کے حالات، سیرت وشخصیت، ادبی خدمات اور فنی کمالات پر مشتمل ہے، یہ کتاب درحقیقت مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے اکثر مضامین

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے اہم مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین، قیمت: للعہ

صاحب المثنوی۔

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:- عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی اعظمی ایم اے، قیمت: للعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

کے رسول نمبروں سے زیادہ بلند پایہ، جامع اور سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہے۔

جنرل سائنس مرتبہ مولانا عزیز احمد قاسمی بی اے، جامعہ، تقطیع کلاں، کاغذ و کتابت و طباعت اچھی، صفحات: ۱۴۰۔ قیمت:۔ للعہ ر پتہ بک ڈپو دیوبند۔ یو۔ پی۔

لائق مصنف دارالعلوم دیوبند میں جنرل سائنس اور انگریزی کے استاذ ہیں، یہ کتاب انھوں نے مبتدیوں اور عربی خواں طلبہ کی جنرل سائنس کے مبادیات اور بنیادی مسائل سے واقفیت کے لئے لکھی ہے، اس میں پہلے طبعیات وکیمیا کے سلسلہ میں مادہ کی حقیقت و اقسام، ہوا، بجلی، پانی، اور نور کی ماہیت، ان کے اجزاء و عناصر اور آخر میں حیاتیات (حیوانات اور نباتات) کی خصوصیات، کیفیات، اور قسموں کے بارہ میں بنیادی اور ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں، اور جا بجا سائنسی مسائل کے ساتھ دینیاتی مباحث بھی لاکر دونوں میں تطبیق کی گئی ہے، یہ موضوع خشک تھا، لیکن مصنف کے انداز تحریر نے اس کو دلچسپ بنا دیا ہے، آخر میں جنرل سائنس کے اصطلاحی انگریزی الفاظ کے اردو تلفظ و معنی دیئے گئے ہیں، عربی مدارس میں جدید علوم و مضامین کے مبادی کی تعلیم دینے کا اہتمام، اور دارالعلوم دیوبند کی طرح اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ض)

بسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) ستمبر ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

۱- بزمِ تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۶۴ صفحے قیمت

۲- بزمِ مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات وادبی وشعری کارنامے۔ ۳۵۰ صفحے قیمت

۳- بزمِ صوفیہ: عہدِ تیموریہ سے پہلے کے اہلِ قلم و صاحبِ ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۶ صفحے، قیمت

۵- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰ صفحے قیمت

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰ صفحے، قیمت

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت:

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت

۹- ہندوستان کے بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت:

۱۰- عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان و ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۸ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۱ء عدد ۳

مضامین

مقالات

آثار تاریخیہ

باب التقریظ والانتقاد

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۶؎

ان کے بزرگوں اور استادوں کی جو دُرگت بنتی رہتی ہے اور تعلیم گاہوں میں جو ہنگامے بپا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب کے سامنے ہے۔

حالانکہ آزادی اگر ایک طرف انسانوں کو اپنے ہم جنسوں کی غلامی سے آزاد کرتی ہے تو دوسری طرف قانون اور اخلاق کی پابندیوں سے جکڑ دیتی ہے۔ ورنہ معاشرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، بے لگام آزادی نری حیوانیت ہے، بلکہ حیوان بھی جبلّی قوانین کے پابند ہوتے ہیں اور اشرف المخلوقات ان سے بھی آزادی چاہتا ہے، جس پر یورپ اور امریکہ کی حیوانی تحریکیں شاہد ہیں۔ تہذیب و شائستگی مطلق آزادی کا نہیں بلکہ پابندیوں کا نام ہے، جو انسان جس قدر ذمہ دار ہوگا، اسی قدر پابندیوں سے گرانبار ہوگا۔

یہی حال قومیت اور وطنیت کے موجودہ تصور کا ہے، اپنی قوم اور وطن سے محبت بالکل فطری اور ان کے حقوق کی ادائیگی ایک فریضہ ہے، اس لیے مذہب نے بھی اس کی تعلیم دی ہے۔ لیکن یورپ نے جس قومیت اور وطنیت کا صور پھونکا ہے اور اس کو پرستش کی جس حد تک پہنچا دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ جارحیت ہے، یہ قومیت اور وطنیت محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت و ہواخواہی تک محدود نہیں، بلکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کی سیاسی و معاشی برتری بھی ضروری ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ اقوام عالم میں کشمکش اور کمزور قوموں کی پامالی ہے کہ اس کے بغیر برتری حاصل نہیں ہو سکتی، خود یورپ میں اس نیشنلزم نے کیسی کیسی لڑائیاں برپا کیں، موجودہ بڑی قوموں کی ساری کشمکش اسی کا نتیجہ ہے، اور اب یہ دیو اتنا بے قابو ہو گیا ہے کہ "بقائے باہم" اور "پنچ شیل" کی کمزور زنجیروں سے قابو میں نہیں آتا۔

یورپ جہاں چھوٹے چھوٹے ملک اور چھوٹی چھوٹی قومیں آباد ہیں جن کی نسل، مذہب، زبان اور تہذیب ایک ہے، ایک حد تک قومیت اور وطنیت مفید اور قومی وحدت کا ذریعہ ہے، لیکن بڑے ملکوں کے لیے جن کی نسلیں، زبانیں، مذہب اور کلچر مختلف ہیں، قومیت اور وطنیت دو دھاری تلوار ہے۔ جس سے قومی وحدت کم پیدا ہوتی ہے، اختلاف و افتراق زیادہ بڑھتا ہے،

شذرات

بعض چیزیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور حقیقت ہوتی ہیں، اگر ان کو دائرے میں رکھا جائے تو ان سے بڑے مفید کام لیے جا سکتے ہیں لیکن انکے غلط استعمال سے اسی قدر ھلاک نتائج بھی نکلتے ہیں اسکی مثال آزادی، وطنیت اور قومیت ہے، آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جس سے اسکو کوئی طاقت محروم نہیں کر سکتی، اسلام میں انسانی آزادی کی اتنی اہمیت ہے کہ اس نے اس کو خدا کی بندگی کے سوا ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا، اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا، لیکن اگر آزادی، مذہب، قانون، اخلاق، انسانی شرافت اور تہذیب و شائستگی سے آزادی کا نام ہے تو یہ انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت اور اس کی تباہی کا پیام ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آجکل آزادی محض سیاسی آزادی کا نہیں بلکہ ہر قید و بند سے آزادی کا نام ہے جس سے زندگی کا کوئی شعبہ بھی مستثنیٰ نہیں، گھر کی چار دیواری سے لیکر سیاست کے میدان اور حکومت کے ایوانوں تک آزادی کا ایک طوفان بپا ہے، مذہب و اخلاق تو فرسودہ ہو چکے، ان کا تو سوال ہی نہیں، ملکی قوانین کا بھی احترام باقی نہیں ہے، قانون شکنی اور ہنگامہ آرائی کا نام آزادی بن گیا ہے، اور یہ لعنت سب سے زیادہ نو آزاد ایشیائی ملکوں میں ہے، جہاں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں، اشخاص اور افراد میں اس کو شخصی آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اولاد ماں باپ سے، بیوی شوہر سے اور شاگرد استاد سے آزاد ہے، کسی کو ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں کہ یہ شخصی آزادی میں مداخلت ہے، آزادی کے اس تصور نے یورپ کی خانگی زندگی اور وہاں کے نوجوانوں کے اخلاق کو جس قدر تباہ کیا ہے اس سے سب واقف ہیں، اب ہندوستان کے سپوت بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں آئے دن

مقالات

ملا عبدالقادر بدایونی

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

ملا صاحب کا قلم علمائے سو، اکبر کے دین الٰہی، اور اس کے مریدوں اور معتقدوں کے خلاف ضرور تیغ برہنہ ہو گیا ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ ابوالفضل نے اپنی انشاء پردازی کے زور سے اکبر کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی جو گنگا بہائی تھی، اس کے پانی کو ملا صاحب نے اپنی تحریر کی قوت سے تلخ بلکہ زہرناک بنا دیا، اس لحاظ سے ابوالفضل کا قلم ملا صاحب کے قلم سے شکست کھا گیا ہے، اکبر کا دین الٰہی زیادہ تر ملا صاحب کی تحریروں ہی کے ذریعہ سمجھا گیا، کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ پورے وثوق کے ساتھ لکھا، ابوالفضل کے گومگو طرز بیان کے مقابلہ میں ان کے بیانات میں کوئی شک کی گنجایش نظر نہیں آتی، دونوں کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل کا ضمیر اکبر کے دین الٰہی پر خوبصورت الفاظ کا ایک پردہ ڈالنا چاہتا ہے، اور ملا صاحب اسی پردے کو چاک کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں،

اگر دین الٰہی اور اس کے مریدوں سے متعلق تحریروں کی تلخی اور صاف گوئی کو نظر انداز کرکے منتخب التواریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملا صاحب نے اس دور

جب قومیت نسل میں اور وطنیت جغرافی حدود میں محدود ہوگی تو ان ملکوں میں جنکی حیثیت ایک براعظم کی ہے، جن کی آب و ہوا، مذاہب، نسلیں، زبانیں اور تہذیب جدا جدا ہیں ان کے لحاظ سے ان کی قومیت اور وطنیت بھی سمٹتی اور محدود ہوتی جائے گی، اور ہر خطہ اپنی زبان اور تہذیب وغیرہ کے لحاظ سے اپنی جداگانہ حیثیت کا طالب ہوگا، جس کی ابتدا حقوق کی طلب سے ہوتی ہے، اور انتہا مرکز سے علیحدگی پر، پاکستان کا انقلاب اس پر شاہد ہے، مشرقی و مغربی پاکستان کی جنگ خواہ مغربی پاکستان کی اقتدار پسندی اور احساس برتری کا نتیجہ ہو یا مشرقی بنگال کی لسانی اور نسلی عصبیت کا، بنیاد دونوں کی قومیت و وطنیت ہے، ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بھی اس کی صدا بلند ہونے لگی ہے، اور اندیشہ ہے کہ آئندہ چل کر یہاں بھی یہ صورت پیش نہ آئے۔

چھوٹے ملکوں میں بھی اگر نسلی قومیت ایک ہو اور جغرافی وطنیت الگ الگ ہو تو قومیت کا اشتراک واتحاد نہیں پیدا کرسکتا، اس کی مثال عرب ملک ہیں، ان سب کی نسل ایک ہے، زبان ایک ہے، مذہب ایک ہے، تہذیب ایک ہے، مگر جغرافی وطنیت نے انکا شیرازہ بکھیر کر رکھدیا ہے، اور اتحاد کی کوئی کوشش آجتک کامیاب نہ ہوسکی، یہ سب آزادی، نسلی قومیت اور جغرافی وطنیت کے غلط تصور کا نتیجہ ہے، جب قومیت اور وطنیت کی بنیاد نسل پرستی اور وطن پرستی پر ہوگی اسکو قومیت اور وطنیت کے وسیع تصور اور اخلاقی اصولوں کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، اسکا دائرہ برابر سمٹتا جائیگا، اور آئندہ چل کر بڑے بڑے ملک مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائینگے اور انکی وحدت ختم ہوجائیگی، اسلیے جبتک قومیت اور وطنیت کے اس غلط تصور کو ختم نہیں کیا جائیگا اسوقت تک انسانی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، اسکا احساس ہر ملک کے مفکرین کو ہے، اور اسکی آوازیں بھی بلند ہوتی رہتی ہیں، اسی لئے اسلام نے ابتدا ہی سے اس قسم کی قومیت اور وطنیت کی جڑ کاٹ دی تھی اور اس کو ایک حد کے اندر محدود کردیا تھا۔

افسوس ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی نے وفات پائی، وہ ادب کے استاد تھے، عربی زبان ولغت پر انکی نظر بڑی گہری و وسیع تھی، انھوں نے لغت کی کئی کتابیں لکھیں، ان میں مصباح اللغات اور اردو عربی ڈکشنری چھپ گئی ہیں، بعض مسودے کی شکل میں ہیں، دینی علوم میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، انکی پوری زندگی عربی زبان کی تلاش و تحقیق میں گذری، انکی وفات سے عربی زبان کا ایک بڑا ماہر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کی مغفرت فرمائے۔

کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے

ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں۔" (الیٹ جلد ۵ ص ۴۸۱)

یہ صحیح ہے کہ اس میں تعریف و توصیف کے ساتھ ہجو و ذم بھی ہے ہم اس کی تھوڑی سی

مثالیں دے چکے ہیں، لیکن پوری کتاب میں ہجو و ذم کا پہلو کم نکلے گا، تیسری جلد جو چار سو صفحے پر

مشتمل ہے، مشائخ، علماء، اطبا اور شعراء کی مدح ہی مدح ہے۔ ملا صاحب کی تینوں

جلدوں کے ماخذ ان کے ذاتی مشاہدات کے علاوہ ان کے بیان کے مطابق صرف دو[۲]

کتابیں ہیں، ایک تو خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی تاریخ طبقات اکبری ہے، جس کو وہ

نظام التواریخ لکھتے ہیں، اور دوسری بخشی ابن احمد بن عبد اللہ سرہندی کی تاریخ مبارک

شاہی ہے، (دیکھو دیباچہ منتخب التواریخ)، لیکن ان ہی دو کتابوں کے سہارے انھوں نے

اپنی ضخیم جلدیں تیار کر دیں، جن میں ان کی قوت آخذہ کے طرح طرح کے جلوے نظر آتے ہیں،

وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ تاریخ لکھتے وقت اختصار سے کام لیا ہے، اور عبارتی تکلفات

اور استعارات سے پرہیز کیا ہے (ج ۲ ص ۶) یہ گویا ابوالفضل کی انشاء پردازی پر ایک قسم

کی ضرب ہے، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کے قلمبند کرنے میں انشاء پردازی کا سہارا

نہیں لیا، بلکہ ان کی انشاء پردازی خود تاریخی واقعات کو قلمبند کرنے میں سہارا بنتی چلی گئی، جس سے

ان کی قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر الفاظ لاکر اپنی تحریروں

کو سجانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی کتاب زمانہ کی زبان (زبان روزگار)

میں لکھ کر عام آدمیوں کے لیے بھی مائدہ افضال بچھایا ہے، جس کو ابوالفضل پسند

نہیں کرتا تھا، (جلد دوم ص ۴۸۱)

وہ دربار کے امراء اور علماء کو ذکر کرتے وقت ان سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی

میں بیٹھ کر جو تاریخ لکھی وہ موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہے، اس بے تکلف انداز میں اس زمانہ میں کوئی اور تاریخ نہیں لکھی گئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں ملا صاحب کی جابجا چٹکیاں لی ہیں، لیکن ان کی منتخب التواریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ انھوں نے اس میں غیر کی یا اپنی کوئی بات نہیں چھپائی ہے (دربار اکبری ص ۳۴۴) صاف گوئی اور حق پسندی ان کی فطرت میں تھی، اسی لیے انھوں نے جب اپنے عشق کا ذکر کیا ہے تو اس پر بھی کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے، اور اس عشق کو شہوت دانی سے تعبیر کرکے اپنے اوپر بھی لعنت بھیجی ہے، اس سلسلہ میں ان کی جو درگت بنی اس کو بھی صاف صاف لکھدیا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

تاریخ نویسی میں ان کی یہ صاف گوئی جہانگیر کو پسند نہ آئی تھی، کیونکہ اس سے اکبر کی ایک بری تصویر سامنے آتی تھی، اس لیے اس نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کردی تھی[1] لیکن اس کتاب پر سب سے اچھا تبصرہ الیٹ کا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جس کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا لیکن اس کے لیے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ معصر تاریخوں سے کامل واقفیت بھی چاہیے، کیونکہ مصنف نہ صرف الفاظ استعمال کرتا ہے، بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف و توصیف، ہجو و ذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں، بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کا نو

[1] ماثرالامرا ج ۱ [illegible] ص ۲۹

خود جستہ بر فیل از انشست، و کاری کرد کہ ہیچ کس نکند و از مشاہدہ ا
تاب نتوانست آورد و علیا مانده روان شد و تذبذب در افواہ
و جوانان یکہ کہ ... ادعائے ... می نمودند، پیش در آمدند بہ حقیقتی کردند و ... بود
بود و از سرداری مان سنگھ آں روز معلوم شد کہ ایں مصرع ملا شیری چہ معنی داشت
کہ ہندو می زند شمشیر اسلام (ج ۲ ص ۳۳۳)

بزم کی تصویر بھی کھینچنے میں ان کے قلم میں بڑا زور آجاتا ہے، اکبر کے عبادت خانہ کی مرقع آرائی تو طرح طرح سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں اس مباحثہ میں نبوت، کلام، رویت، تکوین، حشر، نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے، طرح طرح کے شبہات وارد کیے جاتے، ہر ایک کا تمسخر اور استہزا کیا جاتا، اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تو اس کو روک دیا جاتا ... طرح مناظرہ میں ثابت کرنے والے کے مقابلہ میں انکار کرنے والے کا پلہ بھاری رہتا، پھر اسی سلسلہ میں سارے مناظرے کو یہ لکھکر باطل قرار دیدیتے ہیں :-

خانہا بر سر ایں مباحثہ رفت و حاشا کہ ایں مباحثہ باشد بلکہ مکابرہ و مشاغبہ بود و دین فروشاں برائے خوش آمد و شکوک متروک را از ہر جا پیدا کردہ بہ تحفہ می آوردند" (ج ۲ ص ۳۰۷)

اور پھر اس عبادت خانہ کے آخری نتائج کی نقشہ آرائی اس طرح کرتے ہیں، جس میں دردناکی بھی ہے اور دل سوزی بھی (ج ۲ ص ۳-۸-۹)

سفیان مغلوب و اخبار ہمہ جا خائف و اشرار امین بودند . ہر روز حکمے تازہ و قدحی جدید و شبہۂ نو بروی کار می آمد : اثبات خود در نفی دیگراں دیدند، و ازین نکتہ کہ

کا بھی اظہار کرتے جاتے ہیں، خواہ ناظرین ان کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن انکے اس ناقدانہ انداز بیان سے اُن کا طرز دلچسپ ہو جاتا ہے، کہیں کہیں تو ان کا اتنا استعال آگیا ہے کہ وہ ہرزہ سرائی پر بھی اتر آتے ہیں، وہ تو اپنی اس جھلاہٹ کو دینی درد اور دلسوزی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن موجودہ دور کے ناقدین اس کو ان کے مذہبی تعصب کی شدت پر محمول کرتے ہیں، مگر ان کا یہ غصہ بلکہ ان کے قلم کا کچھ کا پن ان کی تحریروں کو بعض اوقات جاندار بھی بناتا رہتا ہے۔

وہ تصنع اور آورد سے دور رہ کر بے تکلفانہ انداز میں واقعات کی ترتیب دیتے چلے جاتے ہیں، جس سے رزم اور بزم دونوں کی مرقع آرائی میں جان پڑتی نظر آتی ہے، اکبر کی فوج اور میواڑ کے رانا سے جو لڑائی ہوئی، وہ اس دور کی بڑی اہم معرکہ آرائی تھی، اکبر کی طرف سے مان سنگھ اس کی فوج کی سربراہی کر رہا تھا، ملا صاحب خود اس مہم میں شریک رہے، انھوں نے میدان جنگ کی جو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی جنگی نامہ نگار تمام واقعات کو قلمبند کر رہا ہے، اس سلسلہ میں ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

> فیلان رانا مقابل فیلان افواج بادشاہی در آمدہ از ان جملہ دو فیل قوی مست نامی با مکید لگیر در افتادند، و حسین خان فوجدار فیلان کہ عقب مان سنگھ بر فیل دیگر سوار بود نیز افتاد و مان سنگھ بجائے مہاوت بر ان فیل خود سوار شدہ و ثبات قدمی ورزید کہ فوق آن متصور نباشد و یکے از ان دو فیل کہ یکے خاصہ بادشاہی بود..... جنگ عظیم کردہ ہر دو مکید لگیر را می راندند، از قضا بہ تفنگ فیلبان فیل رانا تیر رسید واز صدمۂ حملۂ فیلان بر زمین افتاد فیل بان فیل بادشاہی بہ چستی و چالاکی از فیل

وخطاب منحصر بایشان بود

پئے در زنجیر پیش دوستاں   بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

این پشتۂ مفرور و این نفثۂ مصدور را عتراز داغ حرمان و نالۂ پنہا

چہ درمان غفر اللہ الماضین ورحم الباقین

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند   در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر   یک لحظہ زما پیشتر مست شدند

ملا صاحب عربی کے بھی بہت بڑے عالم تھے، اس لیے اپنی تحریروں میں بکثرت عربی الفاظ، فقرے، ترکیبیں حتیٰ کہ اشعار استعمال کرتے جاتے ہیں جن کو سمجھ کر وہی لطف لے سکتا ہے جو عربی بھی اچھی طرح جانتا ہو، اسی لیے الیٹ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ نامانوس الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، کبھی کبھی تو وہ ایسی عبارت بھی لکھ جاتے ہیں جو صرف فارسی جاننے والوں کے لیے بڑی گراں گزرتی ہے، مثلاً

این را بواعث و دواعی بسیار بود، وبموجب القلیل یدل علی الکثیر
والخلیفۃ تدل علی الغدیر انموذجی ازان در سلک تقریر وتحریر می آورد
وباللہ المستعان حاصل آنکہ دانایان از ہر دیار وارباب ادیان ومذاہب
بدربار جمع شدہ بشرف ہم زبانی مخصوص بودند (ج ۲ ص ۲۵۶)

ان کی تحریروں میں "قوادح"، "مطاعن"، "ملت سہلۂ بیضا"، "حنیفہ غرا"، "مظہر اسم المضل"، "مظہر اسم الہادی"، "ضال ومضل"، "علماً نافعاً وعملاً متقبلاً" وغیرہ جیسے الفاظ بہت آتے ہیں، لیکن اس قسم کے الفاظ مذہبی مباحث کے سلسلہ ہی میں عموماً استعمال ہوتے ہیں، ان کو جب کسی سے جھلاہٹ آتی ہے تو اس کے لیے "ملعون"

بزمانی منفی می باشد واہل بنابران مقبولاں مردود و مردودان مقبول ونزدیکاں دور و دوراں نزدیک بودند سبحان من تصرف فی ملکہ کیف یشاء بزبان عام کالانعام جز در و الله اکبر چیزے دیگر نبود و غوغائے عظیم برخاست و ملا شیری دراں وقت قطعہ گفتہ مشتمل برده بیت و ایں ازاں جملہ است

تا بزاید ہر زماں کشور برآند از آفتی ۔ فتنہ در کوی حوادث کدخدا خواہد شدن

با عتاب قریش خواہ تیغ دار ارباب شرک ۔ بار سرا ز ذمہ گردن ادا خواہد شدن

شورش معزاست اگر در خاطر آرد جاہلی ۔ کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن

خندہ می آید مرا زیں بیت لیکن کز ظرافتی ۔ نقل بزم منعم و درد گدا خواہد شدن

پادشاہ امسال دعوی نبوت کرده است ۔ گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

لیکن کچھ دنوں کے بعد ان مباحثہ کرنے والوں کو یاد کرتے ہیں تو پھر ان کی تحریر میں بڑی خستگی اور شکستگی پیدا ہو جاتی ہے اور بڑے درد و گداز کے ساتھ لکھتے ہیں (ج ۲ ص ۸۹ ...)

مدت دہ سال ازاں تاریخ الی الیوم گذشتہ و آں جماعۂ مباحثین و مناظرین محقق و چہ مقلد کہ از صد نفر متجاوز بودند، یک کس نمی بیند، وہمہ روی در نقاب کل نفس ذائقۃ الموت ماندند

جرت الریاح علی مکان دیارھم ۔ فکانھم کانوا علی میعاد

زخیل درد کشاں غیر ما نماند کسی ۔ بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسی

حالا کہ بمقتضای النعمۃ اذا فقدت عرفت ان ہم صحبتان را یاد می کنند خونابۂ حسرت از دیدۂ غم دیدہ فرو می بارد و می زارد و می نالد و می گوید کہ دریں حسرت آباد کاشکی روزی چند دیگر ہم اقامت می نمودند کہ بہر حال مغتنم بودند

میں بھی بڑا نمک ہے،، وہاں کا سارا نمک اس کے کلام میں چلا آیا ہے،

منوہر نام دارد ولد لون کرن راجہ سانبر است کہ نمک زار مشہور است

واین ہمہ نمک در سخن او تاثیر آں سرزمین است (ج ۳ ص ۲۰۱)

بیرم خاں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک رات کی مجلس میں وہ ہمایوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی، ہمایوں نے اس سے کہا ہاں بیرم تم سے کچھ کہہ رہا ہوں، بیرم نے جواب دیا، ہاں بادشاہ سلامت، میں حاضر ہوں، لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے حضور میں آنکھوں کی حفاظت، درویشوں کے نزدیک دل کی نگہداشت، اور عالموں کے سامنے زبان کی احتیاط کرنی چاہیے، میں یہی سوچ رہا تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی ہیں، عالم بھی ہیں، کن کن چیزوں پر نگاہ رکھوں، بادشاہ کو یہ جواب پسند آیا، اور تعریف کی۔

شبے ہمایوں بادشاہ مخاطبہ با بیرم خاں داشتند او را بطا ہر غنودگی دست داد بادشاہ بہ تنبیہ فرمودند کہ ہان بیرم با تو می گویم، گفت بلے بادشاہم حاضرم اما چوں شنیدہ ام کہ در ملازمت پادشاہاں محافظت چشم و پیش درویشان نگاہداشت دل و نزد عالماں حفظ زبان باید کرد، بنا براں دریں فکر بودم کہ چوں حضرت ہم بادشاہ وہم درویش وہم عالمند کدام کدام را نگاہ تواند داشت بادشاہ مغفرت پناہ را ایں ادا از و خوش آمد و تحسین فرمودند (ج ۳ ص ۱۹۲)

ایک شاعر سلطان سیلکی کے متعلق لکھتے ہیں، سیالک قندھار کا ایک گاؤں ہے، وہ وہیں کا رہنے والا تھا، اس لیے لوگ اس کو سیلکی کہتے، مگر ہندوستان میں سیلکی ایک گھناونا جانور ہے، اس لیے اس تخاطب سے وہ بڑا تنگ آجاتا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ

سگ ملعون، ملاعین، ولدالزنا، بدبخت، ناسق، فاجر، ملحد، بے دین، بے حیا، پاجی طبیعت، پاجیاں، مردود، مطرود، مکار، دنیا ساز، رذیل، خبیث، مردم ارذل و سفلہ وغیرہ جیسے الفاظ لکھنے پر اتر آتے ہیں،

منتخب التواریخ کی تیسری جلد ان کی تحریر کا شاہکار ہے، اس میں ان کے طرز بیان میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس سے انشراحی کیفیت بھی محسوس کرتے جاتے ہیں، خصوصاً مشائخ اور علماء کے توکل، قناعت، عبادت، ریاضت، زہد، تقویٰ، معرفت الٰہی، استغنا، گوشہ نشینی، علمی تبحر وغیرہ کے ذکر میں تو ان کے قلم میں بڑی گرمی اور ان کے قلب میں بڑی حرارت پیدا ہوتی نظر آتی ہے، ان کی ہر سطر سے ان کے ادب و احترام کا اظہار بھی ہوتا ہے، انکی کتاب کا یہ حصہ اس دور کی علمی و مذہبی تاریخ کا بڑا بیش بہا خزانہ ہے۔

وہ شعر و ادب کے بڑے اچھے نقاد بھی تھے، جیسا کہ ان کی اس تیسری جلد کے اس حصہ سے اندازہ ہوگا جہاں وہ اپنے زمانہ کے شعراء کا ذکر کرتے ہیں، اس نقد و تبصرہ میں کچھ چٹکیلی باتیں لکھ کر مزاحیہ رنگ بھی پیدا کر دیا ہے، مثلاً قاسم کاہی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس کو کتوں سے بڑا پیار تھا، غالباً کتے سے پیار ملک الشعرائی کا لازمی شیوہ ہے، یہ اشارہ ملک الشعراء فیضی کی طرف ہے، اس کو بھی کتوں سے بڑا لگاؤ تھا،

اختلاط با سگاں بے تحاشی داشت، غالباً ایں شیوہ لازمۂ ملک الشعراء بودہ۔ (ج ۳ ص ۱۷۳)

سانبر کے راجہ لون کرن کا بیٹا منوہر تھا، فارسی میں شاعری بھی کرتا، اس کا تخلص توسنی تھا، ملا صاحب اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ سانبر کا نمک زار مشہور ہے، توسنی کے کلام

ایسا کوئی التزام نہیں کرتا ہوں کہ یہ سب اشعار میرے ہی ہوں، اگر تم کو پسند نہیں آتے ہیں تو قلم تراش لو اور میرے دیوان سے تراش کران کو نکال دو۔

ہمہ مضمون دیگراں...... چوں ملا قاسم راحی گفتند کہ اکثر اشعار شما مضمون دیگراں دیگران است، می گفت کہ من التزام نکردہ ام کہ ہمہ اشعار من باشد، اگر شما را خوش نیاید، قلم تراش بگیرید واز دیوان من تراشید۔ (ج ۳ ص ۱۷۵)

ثنائی مشہدی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ جب تک وہ ہندوستان نہیں آیا تھا، یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو طرح بنا کر بزم آراستہ کرتے، اور ہر مجلس میں اس کے اشعار تبرک کے طور پر پڑھے جاتے، اور بالاتفاق اس کی استادی کے معترف رہے، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد سے اس کی عقیدت افسردگی میں تبدیل ہوگئی، وہ گوشۂ گمنامی میں پڑ گیا، اس پر اعتراضات کے تیر برسائے جانے لگے اور وہ حیرت کی وادی میں پڑ گیا۔

پیش از آنکہ بہ ہندوستان بیاید بزرگان ایں دیار بہ بیتے از و غائبانہ بزمی می آراستند و در ہر مجلس شعراو را بہ تبرک می خواندند و متفق الکلام والاقلام برات دری او خط می نوشتند چوں آمد آن ہمہ شوق از حسد بہ فسردگی مبدل شد و در گوشۂ مجہولی افتاد و نشانہ صد تیر اعتراض بودہ حیران وادی سائر لناسی گردید (ج ۳ ص ۲۰۸)

فیضی جیسے باکمال شاعر کی شعر گوئی پر ملا صاحب کے تبصرے کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس سے ناظرین کو اتفاق کرنا ضروری نہیں، لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کا قلم باغ و بہار بن کر جب قلم تراش بن جاتا...... پھر اس سے اپنی قلم تراشی کس کس طرح کرتے رہے،

ملا صاحب کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی بڑی مہارت تھی، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

ان کے والد صاحب کی وفات ۹۶۹ھ میں ہوئی، تو یہ تاریخ نکالی: (ج ۱ ص ۵۳)

ایک دن اس نے قاسم کاہی سے پوچھا کہ تمہاری کیا عمر ہوگی ؛ اس نے جواب دیا "خدا سے دو سال چھوٹا ہوں" سلطان سیلکی نے کہا "میرے مخدوم ! میں تو سمجھتا تھا کہ آپ دو سال بڑے ہیں ، آپ اپنی عمر کم بتا رہے ہیں ، قاسم کاہی یہ سن کر ہنس پڑا اور کہا کہ تم ہماری صحبت کے لائق ہو ،

روزیکہ ملا قاسم کاہی را دیدہ پرسیدہ کہ سن شریف چند باشد ، قاسم گفتہ کہ از خدا دو سال خوردم ، سلطان گفتہ کہ مخدوم ماشما را دو سال زیادہ می دانستیم طولیت عمر خود را کم می فرمائید ، ملا قاسم خندہ زدہ وگفتہ تو قابل صحبتِ مائی ۔

(ج ۳ ص ۲۳۶)

فیضی اور عرفی کے ایک مشہور لطیفہ کو ملا صاحب کے قلم ہی نے مشتہر کیا ، لکھتے ہیں ، ایک دن عرفی شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا ، فیضی اپنے کتے کے ایک پلہ سے کھیل رہا تھا ، عرفی نے پوچھا کہ اس مخدوم زادہ کا کیا نام ہے ، فیضی نے جواب دیا 'عرفی' ، عرفی نے فی البدیہہ کہا "مبارک باشد" . فیضی کے والد کا نام مبارک تھا ، اسلیے تلملا گیا لیکن خاموش رہا ۔

(عرفی) روزے بخانہ شیخ فیضی آمد ، چوں سگ بچہ را با شیخ مخلوط دید پرسید کہ ایں مخدوم زادہ را چہ نام است ، شیخ گفت عرفی ، او در بدیہہ گفت "مبارک باشد" و شیخ بسیار برہم و درہم شد ، اما چہ فائدہ " (ج ۳ ص ۲۸۵)

انھوں نے بعض شعرا کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے بہت ہی دلچسپ اور چبھتے ہوئے فقرے بھی لکھے ہیں ، مثلاً قاسم کاہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا سارا مضمون دوسرے شعراء کے یہاں سے لیا ہوا ہوتا ہے ، لوگوں نے جب اس سے پوچھا کہ تمھارے اشعار کے اکثر مضامین دوسرے شاعروں سے ملتے ہیں ، تو اس نے جواب دیا کہ میں شعر کہتے وقت

بشمر حرفے و شمر حرفے بہر تاریخ ز خیر المقدم

خیر المقدم سے ۱۰۲۵ ہوتے ہیں۔ میم کے ۹۰ نکال دیے جائیں تو ۹۳۵ ہوں گے اور پھر
دال کے ۳۵ جوڑ دیے جائیں تو ۹۷۰ھ ہوتے ہیں، پھر بھی تاریخ درست نہیں ہوئی۔

۹۷۵ھ میں ملا صاحب کی دوسری شادی ہوئی تو اس کے لیے یہ تاریخ کہی (ج ۲ ص ۱۰۵)

چوں مرا از عنایت ازلی اتصالے بہ ماہ چہرے شد
عقل تاریخ کد خدائی را گفت ماہی قرین مہرے شد

۹۷۹ھ میں فتح پور سیکری میں اکبر نے شیخ سلیم چشتی کے لیے مسجد اور خانقاہ بنوائی تو ملا صاحب
نے عربی میں ان کی یہ تاریخ نکالی (ج ۲ ص ۱۰۹)

هذه البقعة قبة الاسلام رفع الله قدر بانيها
قال روح الامين تاريخه لا يرى فى البلاد ثانيها

یعنی یہ مسجد قبۃ الاسلام ہے، خدا اس کے بنانے والے کے رتبہ کو بلند کرے، روح الامین
نے اس کی تاریخ یہ کہی، اس کا ثانی دوسرے ملکوں میں نہیں۔

ایک دوسری تاریخ یہ کہہ کر بھی نکالی۔

بیت معمور آمدہ از آسماں

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں پٹنہ فتح ہوا۔ تو ملا صاحب نے یہ تاریخ اکبر کی خدمت میں
گذرانی (ج ۲ ص ۱۸۰)

چتر شہ دیں بہر کشاد پٹنہ انداخت چو سایہ بر سواد پٹنہ
فی الحال رقم زد از پئے تاریخش منشی خرد فتح بلاد پٹنہ

ملا صاحب اپنے زمانے کے ایک زاہد، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ شیخ

سرو فتر افاضل دوران ملوک شاہ　　آں بحر علم و معدن احسان و کان فضل
چوں بود در زمانہ جہانی ز فضل ازاں　　تاریخ سال فوت ولے آمد جہانِ فضل

۹۶۸ھ میں بیرم خاں کی شہادت کے موقع پر انھوں نے بہ لحاظ تعمیہ یہ تاریخ نکالی:

گفت گل گلشن خوبی نماند

گلشن خوبی کے اعداد ۱۰۱۸ ہوتے ہیں، اس میں گل کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۹۶۸ ہو جاتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۴۸)

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ۹۷۱ھ میں خواجہ مظفر علی تربتی کو خاں کا خطاب دے کر وکیل کل کے عہدہ پر مامور کیا گیا، اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ "ظالم" ہے، غالباً یہ تاریخ انھوں نے خود نکالی۔ (ج ۲ ص ۶۵)

شیخ سلیم چشتیؒ ۹۷۱ھ میں حرمین شریفین سے ہندوستان واپس تشریف لائے، تو ملا صاحب نے اس موقع پر دو تاریخیں کہیں۔ (ج ۲ ص ۷۳)

شیخِ اسلام مقتدائے انام　　رفع اللہ قدرہ السامی
از مدینہ چوں سوئے ہند آمد　　آں ہدایت پناہِ نامی
ہند از مقدم ہمایونش　　یافت از سر خجستہ فرجامی
گیر حرفے ز ترک کن حرفے　　بہر سالش ز شیخ الاسلامی

اسلامی میں سے ل نکالنے کے بعد ۹۷۱ھ ہو جاتا ہے، دوسری تاریخ یہ ہے:

شیخ اسلام ولی کامل　　آں مسیحا نفس و خضر قدم
لامع از جبہۂ او سر ازل　　طالع از چہرۂ او نور قدم
از مدینہ چو سوئے ہند شتافت　　آں مسیحا نفس و خضر قدم

آخر میں لکھتے ہیں کہ اسی مضمون کا ان کا بھی ایک شعر یہ ہے

اوست مغز جہاں جہاں ہمہ پوست — خود چہ مغز و چہ پوست چوں ہمہ اوست

ملا صاحب کے ہم عصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے، شیخ ابن حجر سے درس حدیث کی سند لی تھی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، شعر بھی کہا کرتے ملا صاحب سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، ان کو ایک خط لکھا، تو اس میں ان کی تعریف میں یہ اشعار لکھ بھیجے، (ج ۳ ص ۱۴۴)

از دوانی بدا ونی بیشک — در فنون فضیلت است فزول

پس دلیل زیادت معنیش — کہ بنایش بصورت است فزوں

ملا صاحب نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا:

اے زبانت کلید نامۂ غیب — دلِ پاکت نتیجۂ لاریب

دادہ اعجاز کلک تو بیروں — گنج ہائے نہاں کن فیکون

گفتی از منطق گہر پرور — کز دوانی بداونی خوشتر

گر دوانی و گر بداونیند — ہمہ از گنج فضل تو غنیند

دلم آئینہ جمال تو شد — مظہر فیض لایزال تو شد

چہ عجب گر ز روئے حق بینی — خویشتن را دلم دہمی بینی

اپنی منتخب التواریخ کے خاتمہ پر اپنی ایک مناجات بھی لکھی ہے جس سے انکی قلبی اور دینی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے، اس مناجات کے کچھ اشعار یہ ہیں، گو یا ان بہت ہی سلیس اور رواں ہے:

سراپا ز عصیاں مرا بیش بیں — مبیں جرم ما رحمتِ خویش بیں

بر ان سے بہت متاثر تھے، ان کی وفات ۹۷۰ھ میں ہوئی، تو یہ مادۂ تاریخ نکالا

دل گفت کہ شیخ اولیا بود (ج ۳ ص ۷)

۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں اپنی کتاب منتخب التواریخ ختم کی تو اس کا یہ مادۂ تاریخ کہا

شکر للہ کہ با تمام رسید منتخب از کرم ربانی

سال تاریخ ز دل جستم گفت انتخابی کہ ندارد ثانی

لفظ 'انتخاب' سے ۱۰۵۴ ہوتا ہے، لیکن 'ن' کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۱۰۰۴ ہوجاتا ہے۔

ملا صاحب کو تاریخ گوئی سے بڑا ذوق رہا، اس لیے اپنی منتخب التواریخ میں دوسروں کے مادۂ تاریخ کو جا بجا درج کرتے گئے ہیں۔

ملا صاحب شاعر بھی تھے، اس لیے اسی شاعرانہ کمال کی بدولت شعر میں بھی مادہ نکال لیا کرتے تھے۔ ان کا تخلص قادری تھا، انھوں نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں شعراء کے تذکرہ میں اپنی شاعری کی تفصیل نہیں لکھی ہے، البتہ کہیں کہیں اپنے کچھ اشعار نقل کر دیے ہیں، مثلاً اپنے زمانہ کے ایک عالی مقام بزرگ میر سید علاء الدین اودھی کے ذکر (ج ۳ ص ۶۲) میں لکھتے ہیں کہ ان کی ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے:

کہ بچشمان دل مبیں جز دوست ہرچہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اس سلسلہ میں وہ عرفی کا یہ شعر بھی نقل کرتے ہیں:

کہ جہان صورت است و معنی دوست در بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

پھر کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی درج کرتے ہیں:

کہ جہان پرتویست از رخ دوست جملہ کائنات سایۂ اوست

حضرت غوث الانامی مرشدی ملاذی میاں شیخ داؤد جہنی وال قدس سرہٗ ساخت

امید کہ کفارت گناہہای گذشتہ کہ چوں نامۂ اعمال بندہ سیاہ است گردیدہ

مونس ایام حیات و شفیع بعد ممات گردد ۔ (ج ۲ ص ۴ ۳۹)

وہ قرأت بہت اچھی کرتے تھے، اس لیے موسیقی کے بھی ماہر ہو گئے تھے، وہ خود تو اس فن میں اپنی مہارت کا ذکر منتخب التواریخ میں نہیں کرتے، لیکن پہلے ذکر آیا ہے کہ فیضی نے ولایتی اور ہندی موسیقی میں ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے (ج ۳ ص ۳۰۴) اس فن میں اپنی بلندی کا اظہار یہ لکھ کر کیا ہے کہ جب اکبر نے شیخ بنجھو، میاں تان سین اور دوسرے ارباب غنا کو شیخ مبارک ناگوری کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے فن کا جائزہ لیں تو شیخ مبارک ناگوری نے میاں تان سین سے کہا، ہم نے سنا ہے کہ تم بھی کچھ گا لیتے ہو، اور جب اس نے اپنا گانا سنایا تو اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دے کر اس کی کوئی اہمیت نہیں دی۔ (ج ۳ ص ۲۶۵)، ملا صاحب کے اس فن لطیف کے ذوق کے بعد یہ لکھنا نامناسب نہیں کہ ان کو غالباً حسن و جمال کا بھی غیر معمولی احساس رہا، اپنے عاشق و دلگیر ہونے کا حال خود بیان کیا ہے، اور منتخب التواریخ میں توغاں زماں اور شاہم بیگ (ج ۲ ص ۲۰) سید موسیٰ اور موہنی (ج ۲ ص ۱۱۸-۱۰۹) ایک شیخ زادہ اور ایک طوائف (ج ۲ ص ۱۱۹) وغیرہ کے معاشقہ کی تفصیل بڑے لطف ولذت کے ساتھ قلمبند کی ہے، سید موسیٰ اور موہنی کے عشق و عاشقی کا حال لکھنے میں تو ان کا قلم بہت بے قابو ہو گیا ہے، لکھتے ہیں

الحمد للہ علی نعمۃ الایمان والاسلام، بہ اذکیا معروض می دارد کہ اگرچہ بمقتضائے

وعدۂ اختصار، جائے اطناب دریں واقعہ نبود اماں چوں تواں کرد کہ سخن عشق

نگہدار از من بد روزگار　　ز ہر بد کہ باشد مرا دور دار
چناں کار دنیا و دینم بساز　　کہ از ہر دو عالم شوم بے نیاز
بالطاف خود داریم در امان　　ز آفات و آشوب آخر زمان
برآری مراد من مستمند　　ز دنیا و دین سازیم بہرہ مند
مکن در کف نفس بیچارہ ام　　اماں بخش از نفس امارہ ام
تمنا کنانم مبر پیش کس　　تمنای من از در تست بس
ز کسب حلالم بدہ توشۂ　　ز خلق جہاں گیریم گوشۂ
گنہ ہم بیامرز و پوشیدہ دار　　کہ ہم ستر پوشی ہم آمرزگار
ز فیض ازل بخش آگاہیم　　خلاصی دہ از جہل و گمراہیم
نگہدارم از صحبت ناکساں　　بہ صاحب دلے اہل دردی رساں
سوئے خویش کن روی بردہ مرا　　خلاصی دہ از ماسوی اللہ مرا
مکن بر مرادے مرا کامگار　　کہ خجلت مرا در سر انجام کار
نداند کسے جز تو بہبود من　　تو دانی زیان من و سود من
غنی کن ز گنج قناعت مرا　　حضوری دہ از ذوق طاعت مرا

ملا صاحب بڑے اچھے خطاط بھی تھے، ۱۰۰۲ھ میں کلام پاک کا ایک نسخہ خط نسخ میں لکھ کر شیخ داؤد جہنی وال کے روضہ میں رکھوا دیا، اور اس کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتے تھے، لکھتے ہیں:

ہم دریں سال حق سبحانہ عز شانہ کاتب را توفیق کتابت کلام مجید رفیق گردانید
تا نسخۂ روشن و خوانا نوشتہ و باتمام رسانیدہ ملوح بہ جدول مکمل وقف روضۂ منورہ

رب العزت کی قسم اس واقعہ کو سترہ سال گذر گئے، لیکن دل سے اس کی لذت اب تک نہیں گئی ہے، جب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو رونے لگتا ہوں، کاش میں اسی وقت دنیا سے بالکل خالی ہوکر چلا جاتا، تو سارے جھگڑے سے پاک ہو جاتا۔

خوش آنکہ دیدہ روئے ترا و سپرد جاں | آگاہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھکو کوئی چیز معلوم ہوئی یعنی معرفت حاصل ہوگئی تھی، اور میرے دل تک ایسا فیض پہنچ گیا تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں اور شکر بجا لاؤں تو بھی اس کا عشر عشیر حق ادا نہ ہو سکے گا۔

در گوش دلم بخواند یک زمزمۂ عشق | زاں زمزمہ زپائی تا سر ہمہ عشق

حقا کہ بعہدہا نیایم بیروں | از عہدۂ حق گذاری یک دمۂ عشق

ان سطروں سے ظاہر ہے کہ وہ راہ سلوک پر بھی گامزن رہے، شیخ داؤد جہنی وال کے ذکر کے سلسلہ میں ایک جگہ انھوں نے ان کے نام کے آگے غوث الانامی مرشدی ملاذی بھی لکھا ہے (ج ۲ ص ۳۹۴)، پھر تیسری جلد میں ان کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے بیعت بھی ہوگئے تھے، جہنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، شیخ داؤد کے آبا و اجداد عرب سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوگئے تھے، شیخ داؤد کو حضرت غلام الثقلین سے ایک باطنی مناسبت ہوگئی تھی، جب سلوک وارشاد کی طرف مائل ہوئے تو بیس سال تک صحرا نوردی میں گذار دی، پھر شیر گڈھ میں آکر رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے، حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر ان کی خانقاہ میں ایک لاکھ آدمی جمع ہو جاتے اور وہ ان کی میزبانی کرتے، لیکن خود ان کے حجرے میں مٹی کے ایک پیالہ اور ایک بوریا کے سوا کچھ نہ ہوتا، ملا صاحب نے ان سے اپنے تعلقات

بے اختیار عنان قلم از قبضۂ اقتدار بیروں برد و در از نفسی واقع شد

(ج ۲ ص ۱۱۸)

یہ لکھکر اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

بشنو اے گوش بر فسانۂ عشق　　از صریر قلم ترانۂ عشق

کار من عشق و یار من عشق ست　　حاصل روزگار من عشق است

چہ کنم در سرشت من این ست　　وز ازل سرنوشت من این است

بہر این آفریدہ اند مرا　　جانب این کشیدہ اند مرا

لیکن وہ کبھی کبھی عشق الٰہی میں سرشار ہوکر بدمست بھی ہوجاتے، ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء)

میں ان کو ایک بندۂ خدا مظہر سے تعلق خاطر ہوگیا،

"تعلق خاطری عظیم بمظہری نام از مظاہر الٰہی و آزادی و وارستگی ....." (ج ۲ ص ۲۹۶)

اس لگاؤ کی وجہ سے ان پر بڑی مستی طاری رہی، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں (ج ۲ ص ۹۰-۹۷)

"میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ

وارفع معلوم ہوتا تھا، عاقبت اندیشی، نفع اور نقصان کی بالکل فکر نہیں رہی اور

افوض امری الی اللہ (میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتا ہوں) میرے لیے پورا ہوتا نظر آتا،

تو باخدائے خود انداز کار و خوشدل باش

کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

میں اس عالم میں نیند میں اشعار کہتا، ایک رات نیند میں یہ شعر کہا، جب بیدار

ہونے کے بعد اس کو یاد کرکے بیقرار اور روتا رہا،

آئینۂ ما روئے ترا عکس پذیر است　　گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

دور ہو جاتی اور وہ منور ہو جاتا ہ اور معرفت کا راز عیاں ہوتا نظر آتا، میں نے
اپنی فانی زندگی کے تین چار دن وہاں گذارے، کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ سو سو اور
پچاس پچاس ہندو اپنے خاندان کے ساتھ آکر مشرف با اسلام نہ ہوتے، اور
ان کی تلقین نہ ہوتی ۔ اس شہر کے در و دیوار، شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے
ہوئے معلوم ہوتے انھوں نے مجھکو ایک کلاہ مبارک عنایت کی اور حکم دیا کہ میری طرف
سے اپنے اہل و عیال میں تم نائب بن کر رہو، میرا بھی یہی طریقہ ہے ۔ اور اپنی اہلیہ کی
طرف سے میرے متعلقین اور لڑکوں کے لیے دوپٹہ اور رومال بھجوائے، میں نے عرض
کیا کہ اگر ایک کرتہ بھی عطا ہو تو میرے لیے نور علی نور ہے ، بڑے تامل کے بعد فرمایا
کہ وہ بھی وقت پر مل جائے گا، میں نے ان سے اپنی پوشیدہ باتیں اور دلی مقاصد
بیان کیے، اور ان کے جوابات سنے، میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی،
اس اثنا میں وہ بھی کمزوری کی وجہ سے ایک محافہ میں بیٹھکر مسجد سے گھر کی طرف
روانہ ہوئے ۔ میں نے ان کے محافہ کے پایہ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا، اور چند قدم چلا،
اس وقت مجھ پر بڑا گریہ طاری ہوگیا، وہ رک گئے اور محافہ سے اتر کر بیٹھ گئے ،
اور خدا تعالی کی معرفت و محبت کی ایسی باتیں سنائیں کہ میرے دل کی کیفیت
اور بھی تیز ہوگئی .... میں لاہور پہنچکر حسین خاں کے لشکریوں کے ساتھ
ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا ۔ ایک روز میں سہارنپور میں ایک باغ میں
بیٹھا تھا کہ میرا دل حضرت کی جدائی سے کباب ہو رہا تھا کہ ایک مسافر تا دری
پیرہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا، اور کہنے لگا یہ لے لو، یہ مجھکو ایک بڑے
بزرگ سے ملا ہے، اور مجھکو راستہ کا خرچ دے دو، میں نے اس سے حقیقت حال

کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

"بیرم خاں کا عہد بہترین تھا، اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا، میں آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا، اس وقت میں نے ان (یعنی شیخ داؤد جہنی وال) کی عظمت وجلالت کا حال بعض درویشوں کی زبانی سنا تھا، ان کی عقیدت و محبت کا بیج میرے دل میں پڑ گیا تھا، اور غائبانہ طور پر ان سے ملنے کی ہوس پیدا ہوئی،

آری آری گوش پیش از چشم عاشق می شود

ان دنوں میں نے چند بار شیرگڈھ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے آستان ملایک مطاف کا طواف کرنے کا ارادہ کیا لیکن کبھی والد مرحوم مغفور مانع ہوئے اور راستے سے لوٹا لیا، بعض اوقات کچھ اور موانع ہوئے کہ وہاں پہنچکر دولت حاصل کرنے سے محروم رہا، اس انتظار میں بارہ سال گذر گئے، ان ایک مرید شیخ کا لو میری غائبانہ عقیدت سے واقف تھا، ایک روز اس نے ہما کی طرح اپنا سایہ مجھ پر ڈالا۔ اور اس نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ حضرت میاں زندہ ہیں اور تم وہاں تک پہنچکر ان کے دیدار سے ابتک محروم ہو، یہ بات میرے اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی، اس کے بعد حق تعالی نے ایک اچھا سبب پیدا کر دیا، ان دنوں میں محمد حسین خاں کا ملازم تھا، وہ میرزا حسین کے تعاقب میں کانت کور (ضلع سہارنپور) سے پنجاب کی طرف گیا، تو مجھکو اس سعادت کے حاصل کرنے کا موقع مل گیا، میں لاہور سے شیرگڈھ پہنچا، میں نے ان جمال میں ایسی چیز پائی جو کسی اور صاحب حسن میں نہیں پائی جا سکتی تھی، وہ باتیں کرتے یا مسکراتے تو ان کے دانتوں سے نور برستا جس سے دل کی تاریکی

میاں کمال الدین حسین شیرازی بھی ان سے بڑی محبت رکھتے اور ان کے خطوط کو بڑے شوق سے پڑھتے، وہ ملا صاحب کو لکھتے ہیں کہ آپ کے متعدد خطوط یکے بعد دیگرے پہنچے، خدا گواہ ہے کہ ان سے بڑی تسلی اور تسکین ہوئی، کئی روز تک ان خطوط کو برابر پڑھتا رہا، اور صبح و شام ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعائیں کیں۔

الٰہی تا قیامت زندہ باشی (ج ۳ ص ۱۲۸-۱۲۷)

بزم صوفیہ

(طبع ثانی)

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصانیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی، شیخ بو علی قلندر، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید محمد گیسو دراز، حضرت شیخ احمد عبد الحق توشہ ردولوی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل ان کے ملفوظات و تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس اڈیشن میں، ان تمام بزرگوں کے حالات میں بکثرت اضافوں کے ساتھ، شیخ احمد عبد الحق توشہ ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کا مستقل اضافہ ہے۔ قیمت للعہ ۱۴ر

مزید افادہ کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تعلیمات و ملفوظات الگ رسالہ کی صورت میں بھی چھپ گئے ہیں۔ قیمت عہر

مصنفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"مینجر"

دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ "میرزا ابراہیم حسین کو شکست ہوئی، تو اس کے لشکریوں پر بھی مصیبت آئی، میں بھی ان لشکریوں میں تھا، یہ لشکری لٹ لٹا کر ننگے اور برہنے شیر گڑھ حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عطا کیا، جب میری باری آئی تو یہ کرتہ اپنے بدن مبارک سے اتار کر مجھکو مرحمت کیا، میں نے اس کو پہننا بے ادبی جانا، اور اس کو تحفہ کے طور پر امانت رکھ چھوڑا تھا، اب میں تم کو دے رہا ہوں" میں نے اس کو ہدیۂ غیبی تصور کیا، ایسا معلوم ہوا کہ ہوا نے ایک خزانہ لاکر دیدیا ہے، اور میں نے اس کو تبرک سمجھ کر لے لیا،

نکہت پیراہنت آمد بہ من | لذتِ جاں یافتم زاں رانجہ
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا | شد قبول الحمد للہ فاتحہ

مجھکو ان کی وہ بات یاد آگئی کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ پیراہن بھی وقت پر مل جائیگا، اس کو میں نے ان کی کرامت تصور کیا، اور اب اس پیراہنِ یوسف کو اپنی جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں۔ (ج ۳ ص ۷۸-۷۸)

ان تفصیلات کے معلوم ہونے کے بعد کیا عجب کہ ملا صاحب کے دل میں آتش عشق الٰہی بھی فروزاں رہتی ہو، اسی لیے اس زمانہ کے علما و صلحا بھی ان کی طرف مائل رہے، مثلاً ملا صاحب کے معاصر بزرگوں میں میاں کمال الدین حسین شیرازی اپنی عبادت، ریاضت ذکر الٰہی کے لیے مشہور تھے۔ ان سے ملا صاحب کے روابط چالیس برس تک رہے اور ان کو اعتراف ہے کہ وہ ان سے اپنی مہربانیوں کے ساتھ ملتے رہے کہ ان سے زیادہ کی گنجایش نہ تھی، ان کے لیے یہ شعر لکھا ہے:

بس عشق کہ آں کم شد و بس حسن کہ آں کاست | عشق من و حسن تو ہماں بلکہ فزوں ہم

"میں نے ایسی عمدہ اور بے نظیر شرح نہیں دیکھی، اس میں حدیث و فقہ کے مباحث پر جس طرح بحث و کلام کیا گیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی، اس سے عمدہ اور بہتر کا کیا سوال ہے" (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱)

علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں :-

"ابن عبد البر سے پہلے کسی نے ایسی عمدہ اور عظیم الشان کتاب نہیں لکھی" (تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸)

شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں :-

"یہ کتاب فقہ حدیث میں نادرۂ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے"

(بستان المحدثین ص ۶۹)

مولانا محمد سورتی مرحوم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ شروح حدیث میں ابن عبد البر کی قابل قدر اور بہترین کتاب ہے جس کی نظیر اب تک کوئی شرح نہیں دیکھی گئی، ابن حزم نے اس کتاب کی بیحد تعریف کی ہے، اور یہ اس کا استحقاق بھی رکھتی ہے...... یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے اس کا انتخاب ازبس ضروری ہے،، (معارف فروری ۱۹۳۲ء)

افسوس ہے کہ یہ عظیم الشان اور گرانمایہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے، یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا مکمل نسخہ کہیں موجود ہے یا نہیں؟ حجاز، مصر اور ہندوستان کے بعض کتبخانوں میں جو قلمی نسخے ہیں وہ غالباً ناقص ہیں۔

۱۳۵۰ھ میں ان کی تصنیف تجرید قاہرہ سے شائع ہوئی تو اس کے آخر میں مصری نسخے سے تمہید کے چند صفحے بھی شامل کر دیے گئے جو موطا کی بعض حدیثوں کی شرح و توجیہ پر مشتمل ہیں، ان ہی متفرق صفحات میں مشہور حدیث "کل مولود یولد علی الفطرۃ" کی مفصل

کل مولود یولد علی الفطرۃ (الحدیث) کا مفہوم

(علامہ ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کا ایک ورق)

از ضیاء الدین اصلاحی

علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی (متوفی ۴۶۳ھ) نامور محدث و فقیہ اور جامع کمالات علمائے اسلام میں تھے، احادیث کی شرح و توجیہ میں وہ زیادہ ممتاز تھے، غالباً مالکیہ میں اس پایہ کا شارح حدیث نہیں گذرا ہے، اس حیثیت سے مالکیہ میں ان کو وہی درجہ اور مرتبہ حاصل ہے جو شافعیہ میں امام خطابی صاحب معالم السنن، حافظ نووی اور محی السنۃ بغوی کو، اور حنفیہ میں امام ابو جعفر طحاوی کو حاصل ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:

ابن عبدالبر از مالکیہ مقدم این جماعت — مالکیہ میں اس جماعت (شارحین حدیث)
(عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱) — میں ان کو سب پر تقدم حاصل ہے

حافظ ابن عبدالبر کی مختلف فنون میں بلند پایہ کتابیں ہیں، ان کی زیادہ مایہ ناز اور اہم کتاب "تمہید" ہے، جو مؤطا امام مالکؒ کی ایک مبسوط اور ضخیم شرح ہے۔

انھوں نے مؤطا کی شرح میں استذکار، التقصی اور تجرید کے نام سے بھی کتابیں لکھیں، ان کی اہمیت بھی مسلم ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تمہید اور استذکار دونوں کو خاص اور یادگار تصنیف قرار دیا ہے، لیکن یہ سب شرحیں تمہید کا خلاصہ یا مقدمہ ہیں،

علامہ ابن حزمؒ کا بیان ہے:

قالوا یا رسول اللہ ارأیت الذی یموت وھو صغیر قال ﷺ اللہ اعلم بما کانوا عاملین[1]

اور سالم جانور پیدا ہوتا ہے، کیا تم اس میں کوئی ایسا جانور دیکھتے ہو جس کے ناک یا کان کٹے ہوئے (ناقص الاعضاء) ہوں صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ اسکے متعلق کیا فرماتے ہیں جو بچپن ہی میں فوت ہو جاتا ہے، آپ نے فرمایا: اللہ زیادہ جانتا ہے اس کو جو وہ کرنے والے تھے۔

یہ حدیث جس کو حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ نے بھی روایت کیا ہے[2]، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحیح و ثابت طرق سے مروی ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے اس کی روایت کرنے والے اصحاب کے نام یہ ہیں:

عبدالرحمٰن اعرج، سعید بن مسیب، ابوسلمہ، حمید (یہ دونوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحبزادے ہیں)، ابوصالح سمان، سعید بن ابی سعید، محمد بن سیرین[3]۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجنائز ص ۸۵ بعینہ اسی سند سے امام ابوداؤد نے بھی اس حدیث کی اپنی سنن میں تخریج کی ہے۔ انکے اور امام مالک کے درمیان صرف ایک راوی قعنبی کا واسطہ ہے لیکن انکے یہاں ارأیت الذی یموت کی جگہ افرأیت من یموت ہے (ج ۲ ص ۲۹۳ باب فی ذراری المشرکین [2] غالباً صحاح میں یہ صرف حضرت ابوہریرہؓ ہی سے مروی ہے۔ البتہ امام احمد نے انکے علاوہ حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت اسود بن سریعؓ سے بھی اسکی روایت کی ہے، ملاحظہ ہو مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۳ و ۳۵ ج ۴ ص ۲۴) [3] حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن ابی سعید اور محمد بن سیرین کے علاوہ سب کی حدیثیں صحاح، مسند احمد و مسند طیالسی میں مذکور ہیں، حمید کی روایت کی تخریج ابن عبدالبر نے ہیں کی ہے اور سعید و محمد کی روایات آگے نقل کی ہیں، اس فہرست میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والے چند لوگوں کے نام رہ گئے ہیں جو یہ ہیں: ہمام بن منبہ، عبدالرحمٰن بن یعقوب حرقی، طاؤس اور ذکوان، ہمام کی روایت صحیحین اور مسند احمد میں عبدالرحمٰن حرقی کی صرف صحیح مسلم میں اور طاؤس و ذکوان کی صرف مسند احمد میں ہے۔

شرح؛ توجیہہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے آخر میں ان تمام حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو صغر سنی میں مرنے والے بچوں کے متعلق وارد ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر نے اس بحث میں اپنی جو رائے ظاہر کی ہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر ان کی بحث بڑی جامع اور پرمغز ہونے کے علاوہ بعض حیثیتوں سے نہایت اہم اور منفرد نوعیت کی ہے۔ اس حدیث پر ایسی بسیط بحث اور کہیں نہیں ملتی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے حوالے دیے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے قضا وقدر کے مسائل پر شفاء العلیل کے نام سے ایک بڑی اہم اور عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے آخر میں اس حدیث پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ لیکن اولاً تو اس کا موضوع ہی دوسرا ہے اور مصنف کا اصل مقصد قدریہ وغیرہ منکرین تقدیر کا رد و ابطال ہے۔ دوسرے علامہ ابن عبدالبر کی بحث و تشریح اس سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے۔ اسی بنا پر علامہ ابن قیم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ اس مضمون میں اسی پر از معلومات شرح کا ملخص درج کیا جاتا ہے۔ اور حواشی میں بعض ضروری باتوں کا اضافہ اور حوالوں وغیرہ کی تخریج کر دی گئی ہے۔

امام مالکؒ نے اس حدیث کی تخریج اس طرح کی ہے۔

مالکؒ عن ابی الزناد عن الاعرج	امام مالکؒ ابوالزناد سے وہ اعرج سے
عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ	اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے
صلی اللہ علیہ وسلم قال کل مولود	ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ	کہ "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے
او ینصرانہ کما تناتج الابل	والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں،
من بھیمۃ جمعاء ھل تحس من جدعاء"	جس طرح کہ اونٹنی کے پیٹ سے کامل الخلقت

حتی یکونوا ھم یجدعونھا	جننا ہے، کیا تم کو اس میں کوئی ناک یا کان کٹا (ناقص الاعضاء) جانور نظر آتا ہے یہانتک کہ لوگ خود ہی اسکے ناک اور کان

اس میں صحابہ کے سوال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا جو امام مالکؒ کی روایت کے آخر میں ہے، ذکر نہیں ہے، اور یجسانہ کا اضافہ ہے جو امام مالکؒ کی روایت میں نہیں ہے۔ ابن شہاب کی روایتوں میں بھی یہ سوال وجواب مذکور نہیں ہے، لیکن انھوں نے عطاء بن یزید کے واسطہ سے اس حدیث کی جو روایت کی ہے، اس میں سوال وجواب کا اس طرح ذکر ہے:۔

انہ سئل عن اولاد المشرکین فقال اللہ اعلم بما کانوا عاملین[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپنے فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتا ہے اسکو جو وہ کرنے

اس حدیث کے مفہوم میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک جماعت کے نزدیک یہاں "کل" کے لفظ میں عموم نہیں ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ بچہ جو فطرت پر غیر مسلم والدین کے یہاں پیدا ہوتا ہے، اس کو اس کے والدین یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ بنی آدم کے تمام بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں، بلکہ صرف کافر والدین کے یہاں جو بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں ان کو وہ کافر بنا دیتے ہیں، درحقیقت بچوں کا حکم انکے

---

[1] جن بزرگوں سے یہ حدیث مروی ہے ان سب کے یہاں الفاظ وغیرہ کا معمولی فرق ہے، علامہ ابن عبد البر نے گو تمام روایات کا استقصار نہیں کیا ہے، تاہم آگے کچھ حدیثیں نقل کی ہیں، ان سے اس فرق و خلاف کا پتہ چلتا ہے۔

ابن شہابؒ نے بھی اس کی روایت کی ہے، لیکن ان کے تلامذہ کا اسناد میں اختلاف ہے، چنانچہ معمر اور زبیدی نے زہری سے جو روایت کی ہے اس کو ان سے سعید بن مسیبؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے، اور یونس بن ابی ذئب کی زہری سے جو روایت ہے اس کو ان سے ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے، امام اوزاعی نے امام زہری سے جو حدیث بیان کی ہے اس کو ان سے حمید بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے،

محمد بن یحییٰ ذہلی نے ان سب طرق کو صحیح اور محفوظ قرار دیا ہے، لیکن امام مالکؒ نے ابن شہاب زہری کے بجائے یہ حدیث ابوالزناد کے واسطہ سے مؤطا میں درج کی ہے، ان کے شیخ عبداللہ بن فضل ہاشمی نے امام مالک کی مذکورہ بالا سند ہی سے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے،

کل مولود یولد علی الفطرۃ	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے بعد ازاں
فابواہ یہودانہ وینصرانہ	اسکے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی
ویمجسانہ کالبھیمۃ تنتج البھیمۃ	اور مجوسی بنا دیتے ہیں جانور کی طرح
ھل تحس فیھا من جدعاء	جو (سالم اور تام الاعضاء) جانور

[1] یعنی محمد بن مسلم زہری جو نامور تابعی عالم ہیں، انھوں نے اگرچہ بعض صحابہ سے روایتیں کی ہیں لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے ان کے روایت کرنے کی صراحت نہیں ملتی، حافظ ابن حجر نے حضرت ابوہریرہؓ سے انکے ارسال کی تصریح کی ہے (تہذیب ج ۹ ص ۴۴۷) یہ حدیث بھی جیسا کہ آگے متن کی تفصیل سے ظاہر ہے، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے براہ راست نہیں بیان کیا ہے بلکہ بالواسطہ [2] معمر بن راشد ازدی اور محمد بن ولید بن عامر زبیدی کی حدیثیں صحیح مسلم اور مسند احمد میں اور ابن ابی ذئب کی صحیحین، مسند احمد اور مسند طیالسی میں ہیں

یموت کافرا ومنھم من یولد	اور مرتے ہیں بعض لوگ پیدا تو مومن ہوتے
مومنا ویحیا مومنا ویموت کافرا	ہیں اور مومن ہی ہو کر زندہ بھی رہتے ہیں
ومنھم من یولد کافرا ویحیا کافرا	لیکن کافر ہو کر مرتے ہیں، اور بعض لوگ
ویموت مومنا[1]	کافر پیدا ہوتے اور زندہ رہتے ہیں، مگر
	مومن ہو کر مرتے ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے ارشاد مبارک "کل مولود یولد الخ" میں [illegible] نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین یہودی [illegible] نصرانی ہوتے ہیں اس کو اس کے والدین یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں لیکن یہ صورت سن [illegible] سے پہلے کی ہے، سن بلوغ کے بعد تو وہ خود اپنے لیے جس راہ عمل کو چاہیگا اسے اختیار کریگا۔

عام محدثین کے الفاظ قریب قریب امام مالک کی حدیث کے مطابق ہیں، جن لوگوں نے "کل بنی آدم الخ" کے الفاظ کی روایت کی ہے وہ اولاً تو ثابت اور مسلم نہیں ہیں، ثانیاً اگر انکا ثابت ہونا مسلم بھی ہو جائے تو اس سے اس مفہوم پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، کیونکہ "کل" کا خصوص کے لیے آنا کلام عرب میں روا ہے، قرآن مجید میں ہے:

تدمر کل شیء بامر ربھا (احقاف ۲۵)	وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے اکھاڑ پھینکے گی۔

یہاں ہوا کے ہر چیز کو اکھیڑ دینے کا ذکر ہے، مگر یہ مطلق نہیں ہے، کیونکہ اس نے آسمان اور زمین کو نہیں اکھاڑ پھینکا تھا، دوسری جگہ ہے:

فتحنا علیھم ابواب کل شیء (انعام ۴۴)	ہم نے کھول دیے ان پر ہر چیز کے دروازے

---

[1] یہ ایک طویل حدیث کا جو حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے ٹکڑا ہے، امام احمد نے مسند ابی سعید میں دو جگہ اس کی تخریج کی ہے (ج ۳ ص ۱۹، ۶۱)

والدین کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر وہ مسلمان ہیں تو بچوں کا حکم بھی مسلمانوں جیسا ہوگا، اور اگر وہ یہودی ہیں تو بچہ بھی یہودی سمجھا جائے گا۔ اور اسی اعتبار سے وہ اپنے والدین کا وارث ہوگا، اسی طرح اگر والدین نصرانی یا مجوسی ہیں تو بچے کا حال بھی ان ہی جیسا ہوگا، تا آنکہ وہ سن رشد و تمیز کو پہنچ کر اپنے متعلق خود کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے، کیونکہ جب وہ اپنی عمر کے اس مرحلہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو خود ذمہ دار سمجھا جائے گا۔ اور اس وقت اس کے ساتھ وہ حکم اور معاملہ کیا جائیگا، جو وہ خود اپنے لیے پسند اور تجویز کرے گا، اور بچپن میں والدین کی رعایت اور اعتبار سے جو معاملہ اس کے ساتھ کیا جاتا تھا، وہ اب نہیں کیا جائے گا۔

ان لوگوں نے اپنے مفہوم کی تائید میں حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے:

ان الغلام الذی قتلہ الخضر طبعہ اللہ یوم طبعہ کافرا[1]	بیشک اس غلام کو جسے حضرت خضرؑ نے قتل کیا اس کو خدا نے اس کی پیدائش ہی کے روز کافر بنایا تھا۔

ان لوگوں کا دوسرا استدلال اس روایت سے ہے:-

الا ان بنی آدم خلقوا طبقات فمنھم من یولد مومنا ویحیا مومنا ویموت مومنا ومنھم من یولد کافرا ویحیی کافرا	بنی آدم کو مختلف حالتوں میں پیدا کیا گیا ہے ان میں سے بعض لوگ مومن پیدا ہوتے ہیں اور مومن ہی جیتے اور مرتے ہیں، اور بعض لوگ کافر پیدا ہو کر کافر ہی زندہ رہتے

---

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں الفاظ کے فرق کے ساتھ ملتی ہے، صحیح مسلم (کتاب القدر ج ۲ ص ۱۳۱۴) اور سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۲۹۱) کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں (ان الغلام الذی قتلہ الخضر طبع کافرا ولو عاش لارھق ابویہ طغیانا وکفرا)

نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرۃؓ نے فرمایا کہ :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود[1] یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ کما تنتج الابل من بھیمۃ جمعاء ھل تحس من جدعاء قال افرأیت من یموت صغیراً یا رسول اللہ قال اللہ اعلم بما کانوا عاملین۔

ابو الزناد نے اعرج سے اور وہ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل بنی آدم یولد علی الفطرۃ الخ

ابن وہب نے یونس بن یزید سے، وہ ابن شہاب سے، وہ ابو سلمہ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :-

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ ثم قرء "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ"

عبد اللہ بن صالح یونس سے، وہ ابن شہاب سے، روایت کرتے ہیں کہ انکو ابو سلمہ ابن عبد الرحمٰن نے بتایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کما تنتج البھیمۃ جمعاء ھل تحسون فیھا من جدعاء ثم قال ابو ھریرۃ اقرؤا (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم)

سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں جو حدیث "رؤیا" کے نام سے مشہور ہے، مروی ہے کہ

---

[1] جعفر بن ربیعہ کی حدیث میں "کل مولود الخ" کے بجائے "کل بنی آدم" کا لفظ آیا ہے، یہ نقل و کتابت کی غلطی ہے ورنہ یہاں اس کا نقل کرنا ہی بے موقع ہے، آگے اس کی مزید توضیح کیجائے گی،

یہاں بھی موقع کلام سے ظاہر ہے کہ خدا نے ان پر اپنی رحمت کے دروازے وا نہیں کیے تھے۔
اوپر گذر چکا ہے کہ اس حدیث کے الفاظ تقریباً وہی ہیں جو امام مالکؒ کے ہیں، چنانچہ امام اوزاعیؒ کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

اسی قسم کے الفاظ معمر کی حدیث کے بھی ہیں، ملاحظہ ہو،

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ جمعاء ھل تحسون من جدعاء ثم یقول ابوھریرۃ اقرؤا ان شئتم (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا)

یہ حدیث عبدالرزاق سے بھی مروی ہے اور جہاں تک ہم کو علم ہے، ان کا معمر سے ان الفاظ (کل مولود الخ) میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان الفاظ کے متعلق ابن ابی ذئب کی روایت کا بھی یہی حال ہے، البتہ اس میں حضرت ابوہریرۃؓ کا قول (اقرؤا ان شئتم) مذکور نہیں ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "کل" کے لفظ میں عموم ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام بچے فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود سن رشد و بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ان کے معاملہ میں ان کے والدین کا اعتبار کیا جائے گا، اور ان ہی کے مطابق ان پر احکام بھی لگائے جائیں گے، البتہ سن رشد و تمیز کے بعد وہ خود مختار ہوں گے اور اپنے متعلق فیصلے کریں گے۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اس نوعیت کے کلام کا حق واقتضا یہی ہے کہ اس کو عموم پر محمول کیا جائے، علاوہ ازیں کئی حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں جن سے اس کو خصوص پر محمول کرنے کی گنجایش ہی نہیں رہتی، مثلاً عبدالرحمٰن بن ہرمز سے جعفر بن ربیعہ

گریز کرنا چاہیے۔

امام محمد کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ یا تو انھوں نے مسئلہ کی نزاکت اور اشکال کی بنا پر جواب دینے سے گریز کیا ہے، یا ان کو اس سے واقفیت ہی نہ رہی ہو یا پھر یہ وجہ رہی ہو کہ وہ اس طرح کے مسئلہ میں غور و خوض کو ناپسند کرتے اور خلاف احتیاط سمجھتے رہے ہوں، ان تینوں میں سے جو وجہ بھی رہی ہو لیکن درحقیقت ان کا یہ کہنا خلاف واقعہ ہے[1] کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد کے

---

[1] نووی اور ابن حجر نے امام محمدؒ کے قول کی ابوعبید ہی کے حوالہ سے وضاحت کی ہے کہ اگر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوا ہوتا تو بچپن ہی میں مر جانے کے بعد اس کے والدین اس کے وارث نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس کے وارث ہوتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات احکام کے باقاعدہ نازل ہونے اور فرض کیے جانے سے پہلے آپ نے فرمائی تھی، اور احکام کی فرضیت کے بعد یہ صورت تبدیل ہو گئی، اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بچے اپنے آباء کے دین پر پیدا ہوتے ہیں، ورنہ وارث ہونے کے کیا معنی ہوں گے (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۳۰۸ و فتح الباری ج ۳ ص ۱۹۰)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے قول کا مقصد یہ ہے کہ شریعت میں یہ طے ہے کہ یہودی و نصرانی کے بچے دنیا کے احکام میں اپنے والدین کے دین کے تابع ہیں، اس لیے ان کے بارہ میں کفر کا حکم لگایا جائے گا اور انکے جنازہ کی نماز وغیرہ نہیں پڑھی جائے گی اور نہ مسلمان ان کے وارث ہو سکیں گے، تاآنکہ وہ سن رشد و بلوغ کو نہ پہنچ جائیں، اور یہ بالکل حق ہے، لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اس حدیث کا اقتضاء یہ ہے کہ بچوں کے لیے دنیا میں مسلمانوں کے احکام ہوں گے، اس لیے انھوں نے فرمایا کہ یہ منسوخ اور جہاد کے حکم سے پہلے کی حدیث ہے، کیونکہ جہاد کا حکم آجانے کے بعد بچوں کا استرقاق مباح ہو گیا، جب کہ مسلمان کا استرقاق نہیں ہوتا۔ حالانکہ بچے کا دنیوی احکام میں اپنے والدین کے دین کا تابع ہونا ایک ایسا امر شرعی ہے جو دائمی ہے، رہی یہ حدیث تو اس کا مقصد انکے متعلق اس طرح کے احکام بیان کرنے کے بجائے اس فطرت کا بیان ہے جس پر بچے پیدا کیے جاتے ہیں۔ (شفاء العلیل ص ۲۸۸)

واذا الشیخ الذی فی اصل الشجرۃ	اور جس ضعیف اور بوڑھے شخص کو تم نے
ابراھیم والولدان حولہ اولاد	درخت کی جڑ میں دیکھا وہ حضرت ابراہیمؑ
الناس[۱]	تھے اور ان کے ارد گرد لوگوں کے بچے تھے۔

ان حدیثوں کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی حدیث اور اسکے ہم معنی حدیثوں کی وہ تاویل درست نہیں ہو سکتی، جو فریق اول نے بیان کی ہے کہ والدین صرف اپنے فطرت پر پیدا ہونے والے بچوں ہی کو یہودی اور نصرانی وغیرہ بناتے ہیں، کیونکہ بچے تو سب کے سب فطرت ہی پر پیدا ہوتے ہیں[۲]۔

امام ابوحنیفہؒ کے نامور شاگرد اور مشہور فقیہ امام محمد بن حسنؒ شیبانی سے ابوعبید نے اس حدیث کا مفہوم دریافت کیا تو انھوں نے اس سے زیادہ کچھ جواب نہیں دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جہاد کا حکم دیے جانے سے پہلے یہ فرمایا تھا۔ ابوعبید کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن مبارک نے فرمایا کہ اس کی تفسیر حدیث کے آخری حصہ میں "اللہ اعلم بما کانوا عاملین" کہہ کر کی گئی ہے[۳]۔ اس سلسلہ میں تقریباً امام مالکؒ کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کافی و واضح نہیں ہے۔ اس سے تو محض یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کے باب میں توقف کرنا چاہئے اور جب تک وہ عاقل و بالغ نہ ہو جائیں، ان کے کفر و ایمان کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنے

---

[۱] یہ بخاری کی طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو کتاب الجنائز میں ہے لیکن اس میں والولدان کے بجائے والصبیان کا لفظ ہے اس میں استدلال کا پہلو یہ ہے کہ تمام بچے فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے وہ بچپن میں مرجانے کی صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس جنت میں ہوں گے [۲] حافظ ابن حجرؒ نے اسی مفہوم کو مرجح قرار دیا ہے (فتح الباری ج ۳ ص ۱۹۵)

[۳] امام خطابی اور علامہ نووی نے ابن مبارک کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک بچہ سعادت و شقاوت پر پیدا کیا جاتا ہے۔

لفظ فطرت کے مفہوم میں علماء کا شدید اختلاف ہے، اب ہم علماء کے اختلافات اور ان کے دلائل کی تفصیل نقل کرتے ہیں:۔

اہل فقہ و نظر کی ایک جماعت کے نزدیک فطرت سے خلقت مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بچہ کی خلقت کے اندر اللہ کی معرفت کی صلاحیت و استعداد ودیعت کی گئی ہے، گویا آپ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ چونکہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس لیے جب وہ سن رشد کو پہنچ جائے گا اور اس کے اندر علم و معرفت کی استعداد پیدا ہو جائے گی تو وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ نے اس کی خلقت ان بہائم سے مختلف بنائی ہے جن کی معرفت رسائی تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی، فطرت کے خلقت اور فاطر کے خالق کے معنی میں ہونے کی دلیل ان آیات سے ملتی ہے،

الحمد للّٰہ فاطر السمٰوات والارض	سارا شکر اللہ کو ہے جس نے بنا نکالے
(فاطر-۱)	آسمانوں اور زمین کو

یہاں آسمانوں اور زمین کے فاطر سے ان کا خالق مراد ہے، دوسری آیت میں ہے:

وما لی لا اعبد الذی فطرنی	اور مجھکو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں
(یٰس - ۲۲)	اس کی جس نے مجھکو پیدا کیا۔

اس میں "فطرنی" خلقنی کے معنی میں ہے۔ اس قسم کی آیتیں اور بھی ہیں،

ان لوگوں نے بچوں کے کفر و انکار یا معرفت و ایمان پر پیدا کیے جانے کی تردید کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ ان کی خلقت اور بناوٹ صحت و سلامتی پر کی گئی ہے، کسی شخص کو طبعی (پیدائشی) طور پر ایمان و کفر یا معرفت و

حکم سے پہلے یہ فرمایا تھا، کیونکہ اسود بن سریع کی درج ذیل روایت سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے جہاد کا حکم دیے جانے کے بعد یہ فرمایا تھا،

ما بال قوم بلغوا فی القتل حتی	جو لوگ قتل و خونریزی میں اسقدر تجاوز
قتلوا الولدان فقال رجل اولیس	کر جائیں کہ بچوں تک کو قتل کر ڈالیں،
انما ھم اولاد المشرکین انہ	ان کا انجام کیا ہوگا، ایک شخص نے کہا کہ
لیس من مولود الا وھو یولد	کیا یہ مشرکین کے بچے نہیں تھے، آپؐ نے فرمایا
علی الفطرۃ[1]	کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا

یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہے۔ اور سمرہ بن جندبؓ سے ابو رجاء عطاردی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [کل مولود یولد علی الفطرۃ فناداہ الناس یا رسول اللہ واولاد المشرکین قال واولاد الناس][2]

---

[1] امام احمدؒ نے مسند میں کئی جگہ اس کی تخریج کی ہے (ج ۳ ص ۴۳۵ وحلیہ ۴ ص ۲۴) لیکن الفاظ قدرے مختلف ہیں، بعض حدیثوں میں تصریح ہے کہ یہ بات آپؐ نے غزوۂ حنین کے موقع پر فرمائی تھی، ایسی صورت میں ابن عبدالبر کے نقد کی قوت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔ [2] یہ حدیث بھی اسی موقع اور سلسلہ کی ہے، دوسرے اس کے راوی سمرہ بن جندبؓ ہیں جو اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ہمراہ جب مدینہ تشریف لائے تو اس قدر کمسن تھے کہ ایک غزوہ میں شرکت کے لیے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا، تو آپ نے ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہیں کیا، گو اس کے بعد وہ دوسرے غزوات میں شریک ہوئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی روایت جہاد کا حکم آ جانے کے بعد ہی کی ہو سکتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے وہ روایت کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔

لا تعلمون شیئا (نحل - ۷۸) اس حال میں نکالا کہ تم کسی چیز کو جانتے نہیں تھے،

اور جب وہ اس وقت کچھ جانتے ہی نہیں تو ان کو کفر و ایمان کی تمیز یا معرفت و انکار کا شعور کس طرح ہو جائے گا۔[1]

ہمارے نزدیک حدیث میں لوگوں کے جس فطرت پر پیدا کیے جانے کا ذکر ہے، اس کی تاویل کے سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح و صائب مفہوم یہی ہے،[2] اس کی تفصیل یہ ہے کہ فطرت

---

[1] علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ "حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بچہ پیدائش کے وقت ہی دین کو جانتا اور سمجھتا ہے کیونکہ اللہ نے تو خود فرمایا ہے (و اللہ اخرجکم من بطون امہاتکم الخ) بلکہ یہ مراد ہے کہ اسکی فطرت دین اسلام کی معرفت و محبت کی مقتضی ہوتی ہے، پس نفس فطرت دین کے اقرار و محبت کو مستلزم ہے نہ کہ قبولیت دین کو، کیونکہ اگر یہ ہوتا تو والدین کے یہودی و نصرانی بنانے سے اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، اور نہ ان کی تلقین و ترغیب فطرت کی قبولیت دین کے لیے مانع بن سکتی تھی پس حدیث کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہوگا کہ ہر بچہ اقرار ربوبیت کے "مقتضا" پر پیدا کیا جاتا ہے اس لیے اگر وہ اسی حال پر چھوڑ دیا گیا اور اس کے مخالف معارض سے اس کا سابقہ نہ ہوا تو وہ اس سے منحرف نہیں ہوگا جس طرح کہ بچہ کے اندر اپنے جسم و بدن کے لائق غذا یعنی دودھ سے فطرۃً رغبت و محبت ہوتی ہے، اور جب تک اس سے اسکو منحرف کرنے والی کوئی اور خاص چیز نہ ہو وہ دودھ سے بیزار نہیں ہوتا، اسی لیے حدیث میں فطرت کو لبن (دودھ) کے مشابہ بتایا گیا ہے (شفاء العلیل صفحہ ۱۶۹)

[2] امام نووی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اسی مفہوم کو ترجیح دیا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں: "اس حدیث کا سب سے زیادہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ فطرت سلیم دین حق کا سبب و وسیلہ ہے، بچہ اس سلیم طبیعت اور جبلت پر پیدا ہوتا ہے جس میں دین حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد ہوتی ہے پس اگر بچہ کو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس پر قائم رہے گا اور اس کو ترک کرکے کوئی اور راہ اختیار نہیں کریگا جو لوگ اس فطری راہ عمل کو چھوڑ دیتے ہیں وہ دراصل احول کے بگاڑ، نشو و نما کی خرابی اور تقلید وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے، اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بچہ کے اندر

(باقی حاشیہ ص ۲۰۴ پر)

انکار سے کوئی اضافت اور نسبت نہیں ہوتی، البتہ جب سن بلوغ و تمیز کو پہنچ جاتا ہے تب اس کے اندر کفر و ایمان کا عقیدہ اور معرفت و انکار سے تعلق پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ خود اسی حدیث میں کہا گیا ہے کہ [کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء یعنی سالمۃ ھل تحسون فیھا من جدعاء یعنی مقطوعۃ الاذن] یعنی بچہ اسی طرح صحیح و سالم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، جس طرح کہ جانور سالم اور بلا کان کٹا ہوا پیدا ہوتا ہے، پس اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی آدم کے قلوب کو بہائم کے مماثل و مشابہ قرار دیا ہے، کیونکہ وہ کامل الخلقت، بلا عیب اور ہر نقص و کمی سے پاک پیدا ہوتے ہیں، لیکن جب لوگ ان کے ناک اور کان کاٹ دیتے ہیں تو وہ بحائر و سوائب وغیرہ کہلاتے ہیں، انسان کی پیدائش کے وقت اس کے قلوب کا حال بھی ان ہی صحیح و سالم پیدا ہونے والے چوپایوں کی طرح ہوتا ہے وہ کفر و ایمان اور انکار و معرفت وغیرہ کی نسبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں لیکن سن بلوغ کے بعد ان پر شیاطین حاوی اور غالب ہو جاتے ہیں، اس لیے اکثر لوگ تو کفر و انکار کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور کم لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، ورنہ اگر ابتدا ہی میں بچے کفر و ایمان پر پیدا کئے جاتے تو وہ اپنی اس اولین حالت کو چھوڑ کر کسی اور حالت میں کبھی منتقل نہیں ہو سکتے تھے۔ حالانکہ اس کے بالکل برعکس ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ ایمان کے بعد کفر اور کفر کے بعد ایمان کو اختیار کرتے رہتے ہیں، اس لیے پیدائش کے وقت بچوں میں کفر و ایمان کی فہم و تمیز یا معرفت و انکار کا شعور و ادراک ہونا بالکل عقلاً محال ہے، کیونکہ اس وقت تو وہ اللہ کی طرف سے ایک ایسے حال میں ہوتے ہیں جس میں نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں اور نہ کوئی بات ہی جان سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم — اور اللہ نے تم لوگوں کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے

انما تجزون ما کنتم تعملون ‏ (تحریم - ۷) تم کو وہی بدلہ دیا جائے گا جو کرتے تھے۔

دوسری جگہ ہے :-

کل نفس بما کسبت رھینۃ ‏ (مدثر - ۳۸) ہر ایک جی اپنے کیے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔

غور کرو ایک بچہ جس سے نہ کوئی عمل سرزد ہوا اور نہ جس کے اندر ابھی اس کی استعداد ہی ہے، وہ کسی چیز کا مکلف اور ذمہ دار کیسے ہو جائیگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا ‏ (بنی اسرائیل - ۱۵) اور ہم بلا نہیں ڈالتے جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول۔

اور جب دنیوی زندگی میں بچوں پر حدود، قصاص اور عقوبات کے جاری نہ کیے جانے پر علماء کا اتفاق ہے، تو آخرت میں تو وہ اس کے بدرجۂ اولیٰ مستحق ہوں گے۔

اب آپ کے ارشاد [کما تنتج الابل من بھیمۃ جمعاء ہل تحس من جدعاء] پر غور کرو تو ہمارا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے گا، "البھیمۃ الجمعاء" سے وہ جامع خلقت اور سالم جسم والا جانور مراد ہے جو بالکل بے عیب اور ہر لحاظ سے کامل و سالم ہو، جدع کے معنی نقصان کے ہیں، یعنی جس وقت جانور پیدا ہوتا ہے، وہ بالکل صحیح و سالم ہوتا ہے، تم کو اس کے اندر کوئی نقص اور عیب نظر نہیں آسکتا، عیوب و نقائص تو بعد میں پیدا ہو جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بچے کا بھی ہے کہ وہ بالکل سالم ہوتا ہے، کفر و ایمان کے عوارض بعد میں اس پر طاری ہوتے ہیں۔

(باقی)

دراصل سلامت و استقامت کا نام ہے، جیسا کہ عیاض بن حماد نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

انی خلقت عبادی حنفاءؑ — بیشک میں نے اپنے بندوں کو حنیف

(یعنی علی استقامۃ و سلامۃ) — یعنی استقامت اور سلامتی پر پیدا کیا ہے،

کلام عرب میں حنیف مستقیم و سالم کے معنی میں آتا ہے۔ اعرج (لنگڑا) کو بطور شگون احنف کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا منشا یہ بتانا ہے کہ لوگ پیدائش کے وقت تمام آفات و عوارض سے پاک اور معاصی و طاعات کے کاموں سے خالی ہوتے ہیں، اس لیے اس وقت نہ ان سے کسی معصیت کا ظہور ہوتا ہے اور نہ طاعت کا، کیونکہ اس وقت تو ان کو اس کا کوئی علم و شعور ہی نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس غلام کے بارہ میں جس کو حضرت خضرؑ نے قتل کیا تھا، یہ فرمایا کہ

أقتلت نفساً زکیۃً بغیر — کیا تو نے ایک ستھری جان کو بغیر کسی

نفس (کہف) — جان کے عوض مار ڈالا۔

کیونکہ یہ ابھی عمر کے اس مرحلہ میں داخل نہیں ہوا تھا جس میں عمل کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اس کی تائید مندرجہ ذیل آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۳) لازمی طور پر ایمان موجود رہتا ہے، اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ دین حق کو قبول کرنے کے لیے فطرت کوئی واقعی علت ہے، اس حدیث کی غرض و غایت دین کی تعریف اور یہ بتانا ہے کہ طبائع میں فی الواقع اس کی جگہ ہوتی ہے اور نفوس اس کو واقعۃً پسند کرتے ہیں، (مصنفہ ج ۲ ص ۲۴۲) نووی نے بھی قریب قریب یہی بات لکھی ہے۔

ؑ رواہ مسلم فی صحیحہ

ان کے کمال میں فرق نہیں آتا، اور آزاد بلگرامی، قاضی عبد المقتدر، شاہ ولی اللہ کا

کلام کسی عربی شاعر کے کلام سے کم نہیں ہے،

'م'

ہندوستانی باشندوں کی مختلف علاقوں میں مختلف مادری زبانیں تھیں، مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں طالبانِ علم کو فارسی زبان کی تحصیل و تعلیم کی طرف متوجہ ہونا پڑا، کیونکہ ان کی دفتری اور کاروباری زبان فارسی تھی، اس لیے عربی علوم کی تحصیل کے شائقین کو بھی پہلے فارسی میں عمدہ استعداد و لیاقت بہم پہنچانا ضروری تھا، فارسی میں استعداد پیدا کرنے کے بعد ہی طلبہ عربی زبان اور عربی علوم کی تحصیل کی طرف توجہ کرتے تھے، ان کی سہولت کے پیش نظر عربی صرف، نحو، فلسفہ اور منطق وغیرہ کی مختصر اور ابتدائی کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ اور اساتذہ و طلبہ کی علمی رہنمائی کے لیے سیکڑوں عربی کتابوں کے حواشی، شروح اور تلخیصات وغیرہ کا کام فارسی زبان میں انجام دیا گیا، اس کے علاوہ لاتعداد عربی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے گئے، اور مسلم تعلیم و تہذیب کے تمام پہلوؤں پر فارسی زبان میں خامہ فرسائی کی گئی، فارسی کی تعلیم سے لغت فارسی کے محاورے، کہاوتیں، قصص اور تلمیحات وغیرہ ذہنوں پر گہرے نقوش چھوڑتے تھے، جن کا اثر قدرتی طور پر ہندوستان کے عربی گو شعرا کے کلام میں بھی نمایاں ہونا چاہیے تھا، اسی طرح مادری اور مقامی ہندی اثرات سے بھی یہاں کی عربی شاعری کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، ہندوستان کی عربی شاعری میں یہ بھی اثرات کچھ تو ہندی یا فارسی محاوروں کے ترجمے ہیں اور کچھ قواعد کی غلطیاں، اس مضمون میں ہندوستان کے عربی شعراء کے کچھ اشعار نقل کرکے انھی غیر عربی اثرات دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت

از جناب ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب لکچرار عربی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی

اس مضمون کی پہلی قسطیں جو "ہندوستان کے عربی شعرا" پر تھیں، بہت پہلے شائع ہو چکی تھیں، آخری قسط اب شائع ہو رہی ہے۔ ہر زبان کی شاعری اپنے گرد و پیش کے حالات کا آئینہ ہوتی ہے، جس میں اس کے ماحول اور اس دور کے خیالات و رجحانات اور تہذیب و تمدن کا عکس نظر آتا ہے، اس لیے ایک ہی زبان کی شاعری کا رنگ مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے، اور دوسرے ملکوں میں جاکر تو اور بھی بدل جاتا ہے، ہندوستان کے بہت سے فارسی شعرا، ایرانی شعراء کے ٹکر کے تھے، اس کے باوجود ان کے طرز نے سبک ہندی کا نام پایا، عربی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، وہ بھی عرب سے نکلنے کے بعد دوسرے ملکوں کے اثرات سے متاثر ہوئی، بلکہ عباسی دور ہی میں جب عربوں کی حکومت تھی، حکومت کی زبان عربی تھی، عراق، عرب سے بالکل متصل تھا، عربی شاعری بہت بدل گئی تھی، اور اس میں عجمی اثرات اتنے غالب ہوگئے تھے کہ بعض شعرا فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں تک استعمال کرنے لگے تھے، اور عرب جاہلی کی شاعری پر تنقیدیں کرتے تھے، اس لیے ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت حالات کا قدرتی نتیجہ ہے، جس کا اعتراف خود مضمون نگار نے بھی کیا ہے، اور مضمون کا عنوان "ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت" رکھا ہے، انھوں نے انکے کلام میں جس قسم کی خامیاں دکھائی ہیں ان سے عرب شعرا کا کلام بھی خالی نہیں ہے، اس سے

دام ظلکم، وامت اظلالکم" وغیرہ کو عربی مرکبات بنا کر استعمال کیا ہے،

حتی علا فوق السماء سریرہ ورؤسھم غابت بہ تحت الثریٰ[1]

(اس کا تخت شاہی رتبے میں آسمان سے بلند ہے، اور اسکے اعدا کے سر زمین کے اندر غائب ہوگئے)

پہلے مصرعے میں فارسی خیال ہے، دوسرے مصرعے میں "رؤس" کے ساتھ "غابت" کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے، عربی میں ایسے موقع پر باب مفاعلہ" وادی، یداری، مواراۃ" کا استعمال کیا جاتا ہے۔

شیخ رکن الدین ملتانی

ثم الصلوٰۃ علی المختار من مضر خیر البریۃ من باک ومتبسم

(پھر قبیلہ مضر کی برگزیدہ ہستی پر رحمت کاملہ نازل ہو، وہ ہر خنداں اور گریاں مخلوق سے بہتر ہیں)

مخلوق کو "باک ومتبسم" میں منحصر کرنا لغت عربی کے موافق نہیں ہے، ہاں فارسی زبان میں "خنداں وگریاں" رائج ہے، بظاہر اسی فارسی ترکیب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

قاضی عبد المقتدر شریحی

ثم اغتنم فرصۃ من قبل ان ضعفت قواک من سطوۃ الامراض والعلل[2]

(امراض وعلل کے غلبے کے باعث اپنے قویٰ کمزور ہو جانے سے پہلے ہی اس فرصت کو غنیمت سمجھو)

"من قبل ان ضعفت" میں "أن" مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے، جو عربی قواعد کی صریح خلاف ورزی ہے، اور تاویل کی کوئی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ یہاں "أن" نہ مخففہ ہو سکتا ہے، اور نہ حرف تفسیر، البتہ "ان" زائدہ قرار دیا جا سکتا

---

[1] اعجاز خسروی ۱: ۱۵ [2] القصیدۃ الشوقیہ (قلمی): ۱۲ [3] ثقافۃ الہند، ج ۱۰ عدد ۳: ۵

سمندر توحید

لولا سهول جمالكم في ذاتي ما كنت ارضى ساعة بحياتي[1]

(اگر آپ کے جمال کی بے پایاں وسعتیں میری ذات میں موجود نہ ہوتیں، تو میں اپنی زندگی سے ایک گھڑی کے لیے بھی راضی نہ ہوتا)

عربی میں جمال اور ذات کا استعمال ایک ساتھ نہیں ہوتا، نیز 'ذات' کے ساتھ جمال کا استعمال بمعنی خوبصورتی درست نہیں ہے، عربی میں ایسے مقام پر لفظ 'حسن' بولا جاتا ہے، لغت عربی میں لفظ 'ذات' کے معنی 'والی' و 'صاحبہ' ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں "ذات الجنب" اور "ذات الشمال" مذکور ہے، یونانی منطق و فلسفہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "نفس شئے، ذات شئے، فی نفسہ، فی ذاتہ، فی حد ذاتہ" وغیرہ الفاظ عربی زبان میں رائج ہوئے اور فارسی زبان میں لفظ ذات بمعنی حقیقت استعمال ہوا، اس شعر میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

امیر خسرو

يدعو البرايا مد ظل محمد وعدا لاعدام مثل ظل محمد[2]

(تمام مخلوق دعا کیا کرتی ہے کہ "سلطان محمد کا سایۂ عاطفت ان پر دراز رہے، اور حضرت محمد ﷺ کے سایہ کے مانند اس کے دشمن نیست و نابود ہو جائیں!")

اس شعر میں امیر خسرو نے اگرچہ ذو معنی لفظ 'محمد' کا استعمال کرکے فن بدیع کی صنعت دکھائی ہے، مگر 'مد ظل محمد' فارسی محاورہ ہے، عربی میں سایے کی درازی کے لیے 'اظل' بمعنی 'صار ذا ظل' رائج ہے، فارسی دانوں نے ہی 'مد ظلہ'، 'مد ظلکم'، 'دام ظلہ'،

---

[1] مکتوب سید نقی حسن بلخی [2] اعجاز خسروی ا: ۱۴۰

بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے اس شعر میں استعمال کی تھی ،

احلف بالمروۃ حقا والصفا	انک خیر من تفاریق العصا

اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ لاٹھی سے بہت سے فائدے حاصل کیے جاتے ہیں، کمزور انسانوں کا لاٹھی کے ذریعے سہارا لینا، مویشی کے لیے درختوں سے پتے جھاڑنا اور معمولی لڑائی میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا وغیرہ، لیکن لکڑی کو توڑ دینے کے بعد اس کے فوائد میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، اس سے میخیں اور کھونٹیاں وغیرہ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا کر فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اس شعر میں شاعر نے اپنے الفاظ میں عربی مثل کا ترجمہ کر کے نہ صرف ناجائز تصرف کیا ہے بلکہ عربی اسلوب کی بھی مخالفت کی ہے، اور مدح نبوی کو بھی بھونڈا بنا دیا۔

یا اعظم الناس من حاج ومعتمر	واکرم الخلق من حاف ومنتعل[1]

(اے سارے حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں سے بڑے، اور تمام ننگے پاؤں پھرنے والے اور جوتہ پہننے والوں سے زیادہ بزرگ!)

"من حاج ومعتمر" میں 'الحاج' کی مشدد جیم کو ضرورت شعری کی وجہ سے مخفف کر دیا گیا ہے، جو ناپسندیدہ ہے، اس کے علاوہ "الناس" کو حج کرنے والوں اور عمرہ ادا کرنے والوں میں منحصر کرنا اور مخلوق کو 'برہنہ پا و جوتہ پوش' میں محدود کر دینا اگرچہ عقلاً درست ہے مگر عربی محاورے کے خلاف ہے۔

بعثت بالملۃ البیضاء راسخۃ	عفا بہا سائر الادیان والملل[2]

(آپ محکم اور واضح و روشن مذہب کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں، آپ نے اس مذہب کے ذریعے تمام ادیان و مذاہب کو مٹا دیا)

---

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث : ۸ [2] ایضاً : ۸

دیا جا سکتا ہے، اہل عرب نے حروف زوائد میں 'اُن' کو بھی بتایا ہے، اس صورت میں اگرچہ عجمیت کا اعتراض رفع ہوجاتا ہے، لیکن کم از کم شاعر حرف زائد کے استعمال پر مجبور ہوا ہے، جو قادر الکلامی اور زبان پر عبور کے خلاف ہے،

لا تغترر بزمانٍ کان شیمته ان غَوَّ غِرّاً بعتّ منه منتقل[1]

(زمانہ سے دھوکا نہ کھانا۔ اس کی ریت یہی ہے کہ ناتجربہ کار جوان کو ناپائدار عزت کے غرور میں مبتلا کر دیتا ہے)

اس شعر میں صنائع کا تو ضرور استعمال ہوا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں جن الفاظ اور تراکیب سے مفہوم ادا کیا گیا ہے، وہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔

له المکارم ابهیٰ من نجوم دجیً له العزائم امضیٰ من قنا البطل[2]

(آپ کے فضائل ظلمتوں اور تاریکیوں کے تاروں سے زیادہ روشن ہیں اور آپ کے عزائم بہادر کے نیزوں سے بھی زیادہ تیز و موثر ہیں)

عربی میں 'رمح' اور 'قناۃ' کی صفت 'ذبول' ہے اور 'ذابلہ' کی جمع 'ذوابل' رماح (نیزوں) کے لیے صفت غالبہ کے طور پر مستعمل ہے، اس لیے 'قنا' کی اضافت 'بطل' کی طرف عربی زبان کے خلاف ہے، غالباً 'بطل' کا استعمال ضرورت قافیہ کے ماتحت کیا گیا ہے۔

له الفضائل أجدیٰ من عصا کسرت له الشمائل احلیٰ من جنی العسل[3]

(آپ کی خوبیاں ٹوٹی لاٹھی سے زیادہ منفعت بخش ہیں اور آپ کے خصائل چنے ہوئے شہد سے زیادہ شیریں ہیں)

اہل عرب کی مشہور مثل "انك خیر من تفاریق العصا" ہے جو غنیہ اعرابیہ نے اپنے

---

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۵ [2] ایضاً: ۷ [3] ایضاً: ۷

لغت عربی میں 'عفا' کا صلہ 'عن' اور 'لام' آتا ہے، چنانچہ "عفی عنہ" اور "عفی لہ" بولا جاتا ہے یہاں 'عفا' کا صلہ 'ب' لایا گیا ہے، عربی زبان کے مطابق صحیح ترکیب "عفت علی سائر الادیان والملل" ہے، اگر صیغہ 'عفا' مونث استعمال ہوتا تو یہ جملہ ملت کی صفت قرار پاتا اور معنویت میں زیادہ حسن پیدا ہوجاتا۔

ندالک اکثر امینتھی ابداً لکن ادناہ اندی من ندی السبل [1]

(آپ کی سخاوت کبھی بھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ آپ کی ادنیٰ بخشش بارش کی سخاوت سے کہیں زیادہ ہے)

"ندی السبل" نہ تو محاورۂ عرب ہے اور نہ اس میں کوئی بلند پروازی ہے۔

شیخ احمد تھانیسری

ما نار طرفی غمضۃ بعد بعدکم ولا خیال سرور دار فی خلدی [2]

(تم لوگوں کے فراق اور جدائی کے بعد میری آنکھ نے نیند کا لطف نہیں اٹھایا، اور نہ میرے دل میں مسرت کا کوئی خیال بھٹکا)

دوسرے مصرعے میں 'خیال سرور' فارسی کا اثر ہے، عربی میں 'خیال' محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے۔

فضیل بن جلال کالپوی

عجیب غریب معجز اھل عالم صنیع بدیع ما تحداہ ذو الفہم [3]

(فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" عجیب و غریب اور اہل عالم کو عاجز بنا دینے والی ہے، تفسیر ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ کوئی انسان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا)

'اہل عالم' فارسی ترکیب ہے، اسی طرح انسان کے لیے "ذو الفہم" محاورۂ عرب کے

---

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۹ [2] ایضاً، جلد ثالث عدد اول: ۱۸ [3] سواطع الالہام ص ۴۳

محبوبہ کا حسن ذاتی ہے، اور دوسرے مصرعے سے واضح ہوتا ہے کہ تصنع کو بھی دخل ہے، علاوہ ازیں حسن خسا، کا یہ انداز بیان بھی عربی نہیں،

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

هناك رسول الله يَنجو لربه شفيعاً وفتاحاً لباب المواهب[۱]

(اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے مناجات کر رہے ہیں، دراں حالے کہ وہ خود شفیع اور بخششوں کا دروازہ کھولنے والے ہیں)

مصرعہ اول میں 'ینجو' کا صلہ 'ل' لغت عرب کے خلاف ہے، البتہ یہ توجیہ ممکن ہے کہ تصحیف کی وجہ سے 'یدعو' کی جگہ 'ینجو' تحریر ہو گیا۔

وعندي علوم لا يكاد يحيطها سماء وأرض وبحر وساحل[۲]

(میرے پاس علوم و فنون کا اتنا عظیم خزانہ ہے کہ ارض و سما اور سمندر و ساحل ان کا احاطہ نہیں کر سکتے)

'یحیط' کے بعد 'ب' صلہ نہ لانا محاورۂ عرب کے خلاف ہے، کیونکہ اس فعل کا مفعول براہ راست نہیں آتا۔ کلام مجید میں بھی "ولا یحیطون بشیٔ" ہے۔

میر عبد الجلیل بلگرامی

حبيبي قوس حاجبه كنون وصاد يد ابن مقلة شكل عينه[۳]

(میرے محبوب کے ابرو کی کمان حرف 'ن' کی طرح ہے اور مشہور خوشنویس ابن مقلہ کا تحریر کردہ حرف 'ص' اس کی آنکھ کی شکل ہے)

لعمري انه نص جلي على ان الرماية حق عينه

(اپنی زندگی کی قسم! معشوق اس امر کی نص صریح ہے کہ تیر اندازی اسی کی چشم کا حق ہے)

---

[۱] اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم: ۶ [۲] دیوان شاہ ولی اللہ (قلمی): ۱،۲ [۳] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: ۸۱

(عشق کا راستہ صرف ایک ہے ، زاہد! اُس راستے پر چلا چل)

یہ مصنف کی مثنوی کا شعر ہے ، پوری مثنوی کا اسلوب ، تعبیر ، وزن اور ترکیبیں وغیرہ سب فارسی ہیں ، صرف خیالات کو عربی الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے ۔

غلام نقشبند لکھنوی

اربع الحبيبة صار للوحش موطنا فيا عجبا من صنع دار محول[1]

(محبوبہ کی منزل وحشی جانوروں کا مسکن بن چکی ہے ، سامعین! جائے تعجب ہے کہ مکان ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف کس طرح منتقل ہو گیا ہے)

پہلے مصرع میں 'الحبیبۃ' سے وزن میں انکسار پیدا ہوتا ہے ، اگر 'الحبیب' پڑھا جائے تو وزن درست ہو جائے گا ، مگر وہ سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے ، دوسرے مصرعے میں نحوی قوانین کے خلاف 'دار' کی صفت 'محول' مذکر لائی گئی ہے ، اگر صفت کو مونث قرار دیا جائے تو قصیدے کا وزن اور یکسانیتِ قافیہ دونوں فوت ہو جاتے ہیں ۔

لها عارض تبريقه غير عارض اسيل صقيل حسنه كالسجنجل[2]

(محبوبہ کے رخسار کی چمک عارضی نہیں ہے ، نیز اس کا رخسار نرم و نازک ہے اور اس کا حسن آئینے کے مانند چمکدار ہے)

اس شعر کا پہلا مصرعہ محتاج تشریح ہے ، نیز 'عارض' کی صفت 'اسیل' مصرعۂ دوم میں واقع ہے ، اس لیے صفت و موصوف کے درمیان فاصلہ ہو جانے کے باعث تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا ہے ، پھر 'صقیل' کا فاعل 'حسنہ' ہے ، اور اس ترکیب کے ماتحت یہ معنی ہو گئے کہ محبوبہ کے رخسار کی خوبصورتی آئینے کی طرح پالش کی ہوئی ہے ، حالانکہ پہلے مصرعہ میں صراحت ہو کہ

---

[1] نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر ۶ : ۲۱۳ [2] ایضاً ۶ : ۲۱۴

اوکا فوان یشادزان لیرقعا آما لنا فی موقع الحرمان[1]

(یہ دو کافر ہیں، جنھوں نے باہم مشورہ کیا ہے کہ وہ ہماری تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیں گے)

ابروؤں کو کافروں سے تشبیہ دینا اور ان دونوں کا امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے باہم مشورہ کرنا عجمی اندازِ فکر ہے۔

طال التجنب فاسمحی بنظرة وعلیك واجبة زكوة جمال[2]

(بے رخی اور بے التفاتی تو بہت ہو چکی، اب ذرا نظرِ کرم کیجئے، آپ پر تو حسن و جمال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے)

اس شعر میں فارسی زبان کے مفہوم کو عربی نظم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

فنّ الصبابة ما ادقّ بیانه تحیّر فیه الامام الرازی[3]

(عشق کے فن کا بیان کس قدر دقیق ہے کہ امام رازی بھی اس میں حیران و ششدر رہیں)

اہل عرب عشق کے لیے لفظ 'فن' نہیں بولتے۔ فارسی اثر کے ماتحت 'فن' استعمال کیا گیا ہے۔

باقر آگاہ

یا من خیال خدودها فی مهجتی حرّ الجحیم وفی عیونی الماء[4]

(اے محبوبہ، تیرے رخساروں کے تصور سے میرے دل میں جہنم کی گرمی بھر گئی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں)

---

[1] نشوۃ السکران : ۹۸ [2] حدیقۃ الافراح لازاحۃ الاتراح : ۳۴۴ [3] ایضاً : ۲۴۲

[4] النفحۃ العنبریہ فی مدح خیر البریہ (قلمی) : ۴۵

حبیبی ثغرہ کالسین شکلا وکالمیم المدور شکل فیہ

(میرے معشوق کے دانت اپنی ترتیب وحسن میں حرف 'س' کے دندانوں کے مانند ہیں اور اس کے دہن کی شکل ٹھیک ٹھیک گول 'م' کی طرح ہے)

ھما سم ویا عجباً حیاتی اذا ماذقتہ لاشک فیہ

(معشوق کے دانت اور دہن دونوں زہر ہیں جس میں ذرا شک کی گنجایش نہیں، بس مجھے تعجب ہے کہ اسے دیکھ کر میں زندہ کیسے رہا؟)

مذکورۂ بالا اشعار کا انداز فکر عربی نہیں ہے، ان کو پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی ماہر فن خطاط یا فقیہ کے ہیں،

آزاد بلگرامی

اضفیرتان علی بیاض خدودھا او فی کتاب الحسن سلسلتان[1]

(آیا محبوبہ کے سفید رخساروں پر دو گیسو ہیں یا کتاب حسن میں دو سلسلے (مسلسل روایتیں) ہیں)

کتاب حسن خالص فارسی ترکیب ہے، عربی میں اس کا وجود نہیں،

ابصر حواجبھا وادرک کنھھا غصنان منحنیان وسط البان[2]

(محبوبہ کے ابروؤں کو دیکھو اور ان کی حقیقت سمجھو، بید کے (ملائم، لچکدار اور چھریرے تنے کے) درمیان میں دو پتلی پتلی ٹہنیاں سی نظر آتی ہیں)

پہلے مصرعے میں 'حاجب' کی جمع 'حواجب' استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ تثنیہ ہونا چاہیے، پھر دوسرے مصرعے میں ابروؤں کو 'غصان' بہ صیغہ تثنیہ استعمال کیا گیا ہے جو صحیح ہے، مگر اس سے ایک ہی شعر کے دو مصرعوں میں یکسانیت مفقود ہو گئی،

---

[1] نشوۃ السکران من صہباء تذکار الغزلان: ۹۷ [2] ایضاً: ۹۸

(تمام انبیاء و رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے پر حاضر ہیں، اور سب ہی آپ کے فیض سے منصب کے خواہاں ہیں)

مصرعۂ دوم میں 'فیض' اور 'منصب' عربی لفظوں کو فارسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

یلوح فی فرعھا قلبی الاسیر کما یبدو الحباحب بین السنبل الغض[1]

(میرا اسیر دل معشوقہ کی چوٹی میں اس طرح چمکتا ہے جیسا کہ سرسبز خوشۂ گندم میں جگنو)

پہلے مصرعے میں فارسی خیال کو عربی الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وزیر علی سندیلوی

اذا القیتُ نفسی فی الھواء لقد علیّ انواع البلاء[2]

(جب میں نے اپنے دل میں عشق کو جگہ دی تو انواع و اقسام کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا)

اس شعر میں 'الھواء' کے 'ہمزہ' مقصورہ کو ممدودہ بنا دیا گیا ہے، اہل عرب 'الھویٰ' ہمزہ مقصورہ کے ساتھ بولتے ہیں۔

قاضی عمر بلنکوتی

جفتنی، فذ بتنی، فغظت بغیظة فذ بت بشجن بین جنبی یشفق[3]

(محبوبہ بدسلوکی کے ساتھ مجھ سے پیش آئی، اور مجھے دھکے دیے، پھر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا، بعد ازاں ایسا غم و اندوہ دیکر نکال دیا، جو میرے پہلوؤں کے درمیان کسک پیدا کرتا رہتا ہے)

عربی میں جھنڈوں اور ستاروں وغیرہ کے اضطراب کے لیے 'خفق' استعمال ہوتا ہے 'شجن' کی صفت عربی محاورے کے مطابق نہیں ہے۔

---

[1] دیوان غزلیات آگاہ (مخطوطہ) [2] دیوان وزیر علی سندیلوی (قلمی) [3] جواہر الاشعار فی غرائب الحکایات والاخبار : ۲۸۲

شیخ احمد تھانیسری کی طرح باقر آگاہ نے بھی 'خیال' کو فارسی معنی کے مطابق استعمال کیا ہے،

وسریت نحوی کالنسیم تلطفاً — فهتفت من طرب: أفاح ذکاء [1]

(اے محبوب! تو جو میری طرف از راہ لطف و کرم بادِ نسیم کی مانند چل کر آئی تو میں نے فرطِ شوق سے بہ آواز بلند کہا: کیا آفتاب طلوع ہوا؟)

'ذکاء' عربی زبان میں مونث ہے، اس لیے 'فاح ذکاء' کی جگہ 'فاحت ذکاء' ہونا چاہیے تھا۔ اس سے عروض کے قواعد کی خلاف ورزی ہوتی، اس کے علاوہ "فاح یفوح، فوحاً" کے معنی خوشبو دینا ہے۔ اور آفتاب و خوشبو میں دور کی بھی مناسبت نہیں ہے، محبوب کو چمک دمک اور آب و تاب کے لحاظ سے ہی آفتاب سے تشبیہ دی جاتی ہے، اس لیے 'فاح' کا استعمال غلط طور پر کیا گیا ہے۔

هو روح کل الکائنات فکیف لا — یصبوالی امداده الاشیاء [2]

(محمد ہی ساری کائناتِ عالم کی روحِ رواں ہیں، اس لیے کائنات کی تمام اشیاء کا آپ کی امداد و اعانت کی طرف مائل نہ ہونا کس طرح ممکن ہے؟)

یہاں فارسی کے زیر اثر 'کائنات' کو استعمال کیا گیا ہے، عربی میں اس مفہوم کو 'عالم' اور عالمین سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح 'امداد' کو بھی نصرت و اعانت کے معنی میں استعمال کرنا فارسی کا اثر ہے، عربی میں امداد کے معنی دراز کرنا ہیں۔ [3]

لقد قامت الرسل فی بابه — یرومون من فیضه منصباً [4]

---

[1] النفحة العنبریه فی مدح خیر البریه (قلمی): ۴۵ [2] ایضاً: ۴۶ [3] معارف: یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، خود کلام مجید میں امداد نصرت کے معنی میں آیا ہے: "الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثة آلاف من الملٰئکة"

[4] النفحة العنبریه: ۶۲

"جلسۂ انتظامیہ میں آپ کی اڈیٹری اور مولوی حبیب الرحمن صاحب کی اڈیٹری اور مولوی سید عبد الحئی صاحب کی ہمتی طے ہوگئی، چنانچہ اول منشی صاحب ہی سے رائے لی گئی، ان کو بجز اقبال کے کوئی چارہ نہ تھا، بعد کو باتفاق پاس ہوا، اب فقط سرکار سے اجازت طلب کرنا چاہیے، میرے نزدیک جلسہ سے قبل اشتہارات شائع ہو جائیں اور جلسہ میں رسالہ تیار ہو کر موجود رہے تو اور بھی بہتر ہوگا، ورنہ اشتہار تو ضرور اس وقت تک طبع ہو جائیں۔"

اب فوراً ٹائٹل پیج بھیجئے اور مولوی عبد الحئی صاحب کو لکھئے، گورنمنٹ میں درخواست دیدیں۔

کیا اشتہار بھی بغیر وصولی حکم اجازت نہیں چھاپا جا سکتا۔ پہلے پرچہ میں آپ کا کوئی مضمون بھی ضروری ہے، ورنہ ایک دو پرچہ کے لیے تو خود میرے مضامین ہی موجود ہیں، جلدی فرمائیں۔

شبلی - ۱۵ر نومبر ۱۹۰۳ء

(۲)

مکرمی!

براہ کرم مولانا خلیل الرحمن صاحب کو راضی کر دیجئے کہ مولوی فضل حق مدرس مدرسۂ عالیہ رامپور کی پرنسپلی پر راضی ہو جائیں، ٹونکی صاحب کو مفصل اور نہایت عاجزانہ خط لکھے گئے، جواب ندارد، مولوی فضل حق صاحب، مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پروفیسر رہ چکے ہیں، شاہ سلیمان صاحب، مولوی عبد الحئی صاحب ان کے معترف اور اس عہدہ کے لیے ان کو موزوں تر سمجھتے ہیں، صرف منشی احتشام علی اور مولوی خلیل الرحمن صاحب، مولوی

آثار تاریخیہ

مکاتیب شبلیؒ

بنام

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے اپنے نام مولانا شبلی کے وہ خطوط جو ندوہ کے اختلافات سے متعلق تھے، مکاتیب شبلی میں اشاعت کے لیے نہیں دیے تھے اس لیے وہ اس میں شامل نہیں ہوسکے، اس کی نقل ان کے پوتے ڈاکٹر ریاض الرحمن خاں شروانی نے عرصہ ہوا ہمارے پاس بھیجی تھی، ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جن کی اشاعت نامناسب ہو، مولانا شروانیؒ نے محض اپنی محتاط طبیعت کی بناپر ان کو روک لیا تھا، مولانا شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر تبرک کی حیثیت رکھتی ہے، اور ان خطوط سے ندوہ سے ان کی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، اور اس دور کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ان تاریخی خطوط کو شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ "م"

(۱)

مکرمی!

آج کی ڈاک میں آپ کے خط کے ساتھ ناظم صاحب کا بھی خط آیا، اسکے الفاظ یہ ہیں:

(۴) آپ خود اپنا نام بھی پیش کر سکتے ہیں،

(۵) مدت نامزدگی کم رہ گئی ہے، اس لیے فوراً دفتر میں منتخب اشخاص کے نام بھیجدینے چاہئیں،

(۶) دستور العمل کی رو سے انتخاب ارکان کا جو جلسہ ہوگا، اس میں صرف زبانی ووٹ (رائے) لیجائے گی، تحریری ووٹ کافی نہیں، اس لیے جب جلسہ کی تاریخ کی اطلاع دیجائے، تو جلسہ میں آپ کو خود تکلیف فرمانا چاہیے، یا بصورت مجبوری وہاں کے کسی معزز صاحب کو بھیجنا چاہیے،

(۷) انتخاب ارکان کے لیے ووٹ دینا ارکان انتظامی پر محدود نہیں، بلکہ ہر ممتاز شخص ووٹ دے سکتا ہے، صرف یہ شرط ہے کہ ۱ عہ بھیجکر وہ کا ممبر بنجائے اور موقعۂ انتخاب پر موجود ہو،

شبلی۔ ۱۰ رجنوری ۱۹۱۱ء

علماء میں حضرات ذیل قابل انتخاب ہیں:

مولانا لطف اللہ مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن، مولانا عبد الجبار غزنوی، مولوی عبد اللہ غازیپوری، مولوی ثناء اللہ امرتسری، ابوبکر شہاب عرب حیدرآباد، مولوی حمید الدین پروفیسر عربی یونیورسٹی الہ آباد۔

(۴)

مکرمی!

وہ کارڈ سرسری تھا، آپ غور اور سنجیدگی کے ساتھ سنیے کہ کام کیونکر چل سکتا ہے، ایک ایک امر کو لیجئے۔

عمارت | (۱) عمارت کا کام یوں شروع ہو سکتا ہے کہ تعمیر اور حدا گانہ کمروں کیلئے جو روپئے آئے تھے، جن کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے، پہلے ان سے کام شروع کیا جائے،

حفیظ اللہ صاحب کو دوبارہ بلانے کے . . . . . مخالف ہیں . پورے چھ مہینے ہوئے کہ عہدہ خالی اور تمام پڑھائی غارت ہے ، اب فرمائیں میں کیا کروں ، آپ بطور خود لکھئے اور اس مہم کو سر کیجئے ، پرنسپل لائق آجاتا تو میں اور کاموں کی طرف متوجہ ہوتا ،

شبلی - ۳۰ / اپریل ۱۹۱۰ء

(۳)

جناب من ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کو معلوم ہوگا کہ ارکانِ انتظامیۂ ندوہ کی میعاد ممبری ختم ہوگئی ، اور ۸ ۴ ارکان کے انتخاب کی ضرورت ہے ، میرا خیال ہے کہ آپ نے ابتک لوگوں کے نام انتخاب کرکے دفتر میں نہیں بھیجے ہیں ، اس لیے امور ذیل گذارش ہیں :-

(۱) آپ ۴۸ آدمیوں کے نام پیش کرسکتے ہیں ،

(۲) فہرست ارکان سابق مرسلہ مولوی عبدالحیٰ صاحب آپ کے پاس موجود ہوگی ، اس کو پیش نظر رکھکر ، جو بزرگ قابل انتخاب ہوں ، ان کے نام انتخاب کیجئے ، یہ انتخاب یا ان بزرگوں کی قابلیت علمی اور وجاہت دنیوی کے لحاظ سے ہو ، یا اس لحاظ سے ہو کہ اُن لوگوں نے زمانہ ممبری میں عمدہ کارگزاری اور ہمدردی کا اظہار کیا ،

(۳) جدید ارکان انتخاب کیجئے ، یعنی ہر صوبہ کے مشاہیر اور ذی اثر اشخاص کو لیجئے ، مثلاً مدراس میں مولانا عبدالسبحان ، نواب غلام احمد خاں ، بمبئی میں قاضی کبیرالدین ، مولوی رفیع الدین بیرسٹر ، حاجی یوسف شعبانی ، کلکتہ میں مولوی شمس الہدیٰ ، مولوی یوسف پنجاب میں مسٹر محمد شفیع ، شیخ غلام صادق ، بابو نظام الدین ، ممالکِ متحدہ میں بہت لوگ ہیں ، جن کو آپ خود جانتے ہیں ،

تعلیم کا بھی یہی حال ہے، لیکن کون اس داستان کو سنائے۔

شبلی - ۱۴ مئی ۱۹۱۱ء

(۵)

مکرمی! تسلیم

خط اور ترجمہ پہنچا، اس میں تو کہیں کہیں جوڑ ہیں، مارگیولس کا تو ایک حرف بھی خالی نہیں،

ندوہ کا معاملہ اس قدر مشکل نہیں جتنا آپ کے خیال میں ہے، آپ اپنی آمادگی تو ہمیشہ ظاہر کرتے ہیں، لیکن آپ کو کبھی یاد ہے کہ آپ ایک ہفتہ ٹھہرے، آپ ہر دفعہ کی مجموعی تعداد کو ملا کر دیکھتے ہیں، اور میں ایک دفعہ چاہتا ہوں، تو کی بات تو صرف اس قدر ہے کہ ایک صرف مولوی خلیل الرحمٰن صاحب بیچ میں نہ ہوں تو کچھ دشواری نہیں، منشی احتشام علی دو فقرے میں رام ہوتے ہیں، آخر میرا بھی تو ان سے سابقہ رہا، خیر ضابطہ کی یہ بات ہے کہ صرف دو تین امور ہیں،

(۱) پرنسپل کو وہ اختیار کامل دیدیے جائیں جو عموماً پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کو ہوتے ہیں، اب تو یہ حالت ہے کہ وہ ایک آنہ کا جرمانہ تک نہیں کر سکتے یا کسی مدرس کے متعلق کوئی حکم ان کا نافذ نہیں،

(۲) انگریزی اسٹاف کی حالت نہایت خراب ہے، ہیڈ ماسٹر بہرے اور سخت کاہل ہیں، لیکن چونکہ دوسری پارٹی ان کی حمایت میں ہے، وہ کچھ نہیں سنتے، تین دفعہ تین شخصوں نے ان کے کلاسوں کا معائنہ کیا، یعنی مولوی ظہور احمد وکیل، مولوی عزیز مرزا، ڈاکٹر ناظر الدین حسن، تینوں نے سخت شکایت کی، پہلی دو شخصیتوں کی تحریری رپورٹ

اور دوسرے لوگوں کو ترغیب دیجائے، آٹھ سات ہزار کے مستحکم وعدے ہیں، وہ فوراً مل سکتے ہیں، اگر ان کو یقین ہو کہ کام شروع ہو رہا ہے، لیکن یہ اس پر موقوف ہے کہ جمع شدہ رقم کا پہلے ٹھکانا لگے، میں نے چند دفعہ کہا کوئی جواب نہیں ملا، تعمیرات کا کوئی بجٹ نہ شائع ہوا نہ جلسہ میں کبھی پیش ہوا، کچھ معلوم نہیں کہ وہ رقمیں موجودہ تعمیر میں صرف ہو گئیں یا جمع ہیں، اور جمع ہیں تو ان سے کام کیوں نہیں شروع ہوتا، ان حالات کے سوا کیا میں لوگوں سے چندہ مانگ سکتا ہوں، اور کیا موعودہ رقمیں مل سکتی ہیں،

(۲) دو دفعہ جلسۂ انتظامیہ مدرسہ وغیرہ میں یہ طے ہو چکا کہ موجودہ عمارت فروخت کر دیجائے، میں نے خریدار ٹھہرایا اور بہت زیادہ قیمت پر، لیکن منشی صاحب نے انکار کیا کہ مجلس انتظامیہ کو بھی جائداد کے فروخت کرنے کا اختیار ہی نہیں،

تین چار مراسلات کے بعد میں چپ ہو گیا، وہ رقم ملتی تو موجودہ عمارت پوری ہو جاتی اور طلبہ کی بھی بقدر حالت گنجائش نکل آتی،

(۳) راجہ جہانگیر آباد کو ہر طرح منہ پھوڑ کر کہہ چکے، ان سے کچھ ملنے والا نہیں، محمود آباد سے قوی امید ہے لیکن ان کو کوئی عہدہ دیا جائے، دستور العمل میں سرپرست ہر شخص ہو سکتا ہے، لیکن مولوی خلیل الرحمٰن صاحب نے انکار کیا کہ وہ شیعہ ہیں ......(؟) دونوں کو بنا سکتے ہیں لیکن یہ بھی منظور نہیں، راجہ صاحب محمود آباد بورڈنگ کا پورا یا بڑا حصہ بنوا دیتے،

اب جب ہر طرف سے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں تو یہ اعجاز صرف آپ کر سکتے ہیں کہ کام ہی کریں، باقی یہ کہ عام چندہ کھولو، تو کہنا آسان ہے، لیکن کامیابی حاصل کرنا آسان نہیں،

باہم آخر جینا مرنا، کھانا پینا تو نہیں چھوٹ سکتا، ندوہ کا ایک مقصد ہے جسکو کوشش گذار کرتا ہوں،
آپ کا اور ہم سب لوگوں کا ندوہ سے ایک معمولی مدرسہ مقصود نہ تھا، مگر خانہ جنگیوں
نے وہ سب منصوبے غلط کر دیے،

میرے سامنے جو خاکہ ہے اس کو بہ تفصیل آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ معقول
شورہ اور تدبیر سے قائم ہو سکیں، اس کے لیے یا تو کانفرنس سے ۵ دن پہلے یہاں آئیے، میں نے
اپنے کمرہ کے برابر کا کمرہ بھی لے لیا ہے، نہایت آرام اور سکون سے آپ رہ سکیں گے۔

جو خاکہ ہے اس کی کامیابی اس پر موقوف ہے کہ تمام ہندوستان کو ندوہ میں عملاً شریک
کیا جائے، اس کے لیے ضرورت ہے:

(۱) ارکان کے دائرہ کی وسعت، اس کے ساتھ شعبۂ دینی وغیرہ کی قید سے سبکدوشی
جیسا کہ ندوہ کے پچھلے سالوں میں تھی،

(۲) تعلیم کے مختلف شعبے قائم کرنے، جیسا کہ آپنے وقار الملک کی مجوزہ نیشنل یونیورسٹی
کے پروگرام میں دیکھا ہوگا، یعنی جس کی بدولت وہ امرا، و تجار بھی مذہبی اور دنیوی علوم
پاسکیں، جو یونیورسٹی کے امتحانات کے شایق نہیں۔

(۳) اشاعت اسلام کا عملی کام۔

اس بات سے آپ مطمئن رہیں کہ کوئی چیز عسیر الحصول نہیں، اور نہ میری کوشش کی
دستگاہ سے باہر ہے، آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اچھا خاکہ مرتب ہو جائے اور نیز یہ کہ
وہ صاحب خلل انداز نہ ہوں، اصل مصیبت یہی ہے،

آپ نہ آسکیں تو میں آؤں، ۲۰ کو ہز آنر نے ملنے کا وقت مقرر کیا ہے، ورنہ میں ابھی
سے آجاتا، بہرحال تسلی بخش جواب دیجئے۔

شبلی۔ ۹ دسمبر ۱۹۱۲ء

موجود ہے، مجلس دار العلوم میں یہ مسئلہ پیش ہوا، اور ان کے ایماء سے دونوں رپورٹیں ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیجی گئیں، تین مہینے ہوئے جواب ندارد،

اس کا انتظام ہونا چاہیے، ورنہ جو کچھ انگریزی پر خرچ ہو رہا ہے، سب بیکار جاتا ہے، اور ایک دن ایڈ بند ہو جائے گی،

(۳) باقی میرا اور معتمد مال کا معاملہ ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ دونوں کے اختیارات کی تعیین ہو جائے، وہ ہر مہینہ میں جس کی تنخواہ یا وظیفہ چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علاوہ اور نقصانات کے، مدرسین پر ڈسپلن قائم نہیں رہا اور دو گروہ ہو گئے،

یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ کچھ آشتی اور کچھ پابندی قاعدہ طے ہو جائیں گی، آپ اور مولوی عبد الحیٔ صاحب اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب تم دونوں، تین شخص حکم بن جائیے، سب باتیں سنیے، کچھ فیصلہ کرکے دونوں فریق کو سنائیں، دونوں کے عذرات سنیے، غور تو کیجئے، ہزاروں لاکھوں روپے کی بربادی، کام کی ابتری، عام بدنامی، ترقی کی روک، ان سب کاموں کی قیمت آپ کا ایک ہفتہ بھی نہیں ہے، کام کرنے سے ہوتا ہے نہ ہمت ہارنے سے۔

شبلی ۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۲ء

بمبئی

(۶)

مکرمی ۔ تسلیم

ترکی کے واقعات نے تو اس قدر دل بٹھا دیا ہے کہ کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔

کام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں کہ اصل کارکن کوئی اور ہے اور آپ صرف مامور ہیں، یہی چیز ہے جس نے آج تک ندوہ کو عضو معطل رکھا ہے،

اجازت اس میں لیجاتی ہے جو ناطے شدہ مسئلہ ہو، رسالہ کا نکلنا، روپیہ کی منظوری، آپ کی اڈیٹری بسبب طے شدہ اجلاس سابق ہے، ورنہ اجازت نہیں لیجاتی، البتہ میرا اڈیٹر ہونا طے شدہ نہیں ہے، اس کو جانے دیجئے، یوں ہی سہی، آپ کو خود ہی اختیار ہے کہ کسی اور کو شریک اڈیٹری کرلیں، اس کے لیے کام اجازت مانگیے تو سب دیدینگے، ہاں خاص میرا نام لیجئے گا تو روڑے اٹکائینگے، اچھا تو کیا اس غلامی سے ندوہ کا کام چلے گا۔

مکرمی! اب مداہنت اور جھوٹی رعایت کا وقت نہیں ہے، انگریزی تعلیم چھاتی جاتی ہے، اس دفعہ یہاں یہ تجربہ ہوا کہ کانفرنس کے آگے لوگ ندوہ کا نام لینے والوں کو دشمن سمجھنے لگے، حیدرآباد میں کالج کی ایک بڑی پارٹی ہے، ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ دونوں کے ڈپوٹیشن کی موجودگی میں میں ندوہ سے بالکل الگ رہوں، دو عام جلسوں میں مجھے اس مسئلے پر بولنا پڑا، لوگ ناراض بھی ہوئے اور میری مقبولیت میں فرق آیا، لیکن بیدریغ اور بے جھجک سچ کہا گیا، میں نے صاف کہدیا کہ کالج اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ہماری مذہبی ضرورتوں کو بھی پورا کردیگا تو محض جھوٹ ہے، سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کے سامنے یہ الفاظ کہے گئے، ندوہ کی بیکاری جس قدر ثابت ہوتی جاتی ہے، اسی قدر مخالفوں کو صریح شہادت ہاتھ آتی جاتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ندوہ قوتوں کو پراگندہ کرتا ہے، اس لیے صرف ایک کالج کو مرکز بنانا چاہیے،

ایسی حالت میں آپ ایسے کمزوریات سے کام لیتے ہیں اور ایسا سست ہات آپ کا [illegible] نصاب کی متفق علیہ کتب کو فوراً جاری کردیجئے، مختلف فیہ کو رہنے دیجئے، تو کچھ [illegible] رسالہ بالکل اختیاری ہے، اس میں بھی دفتر کا منہ دیکھنا کیا معنی، آپ اگر کرتے پڑتے [illegible] ثابت قدم رہے گا۔

شبلی - ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

(۷)

مکرمی!

اگرچہ تین چار دن کی متصل محنت اور ہنگامہ کے بعد دماغ تھک چکا ہوگا، تاہم خیر آپ آئیں تو سہی اور دو چار دن قیام کریں، لیکن جو امور فیصلہ کن ہیں ان کے صرف اتفاق رائے سے کچھ فائدہ نہیں، بلکہ استعدادی اور پامردی کی ضرورت ہے، امور فیصلہ کن یہ ہیں:

(۱) عمارت کی تکمیل، اس میں تمام تر دقت یہ ہے کہ سکریٹری تعمیرات کا دفتر ایسا ہے کہ نہ کوئی حساب شائع ہوتا ہے، نہ کچھ پتہ لگتا ہے، نہ پوچھنے سے جواب ملتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مقامی اشخاص اپنا چندہ ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اور سلسلہ بسلسلہ باہر تک یہ اثر جاتا ہے، ماسٹر شاہد حسین نے ڈائرکٹر سے کہا کہ گورنمنٹ نے مدد دی ہے، انھوں نے اسٹمنٹ اور حساب مانگا، معتمد صاحب تعمیرات نے یہ جواب لکھا ہے اور میرے پاس آیا ہے، اس کو دیکھئے گا، انکار اور کیا ہے، فروخت مکانات کا معاملہ بھی اسی میں ہے۔

(۲) آئندہ ۰۰۰،۵ کا، مجلس تعمیرات کا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، نہ کبھی ہوگا،

(۳) ندوہ کی عام ملک کا رجحان اس پر موقوف ہے کہ ہر حصہ کے لوگ ممبر بنائے جائیں، یہ اس سے نہیں ہوتا کہ پرائیویٹ کوششوں سے ممبری انہی پچھلے اشخاص میں محدود رکھی جاتی ہے،

(۴) غرض تمام اسکیم میں مقدم یہ ہے کہ کچھ پامردی اور استقلال دکھائیے، صرف ایک ہفتہ کافی ہوگا، پھر برسوں کے لیے کام چل پڑے گا۔

شبلی - ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۲ء

(۸)

مکرمی!

ابھی آپ کے نام ایک خط لکھ چکا تھا، کہ آپ کا خط ملا، افسوس ہے کہ آپ اس حیثیت سے

و ادبیات فارسی، مولانا آزاد کالج کلکتہ نے ایڈٹ کیا ہے، اور وہ اس کا انگریزی ترجمہ
بھی غالباً کر چکے ہیں، اس محنت کے صلہ میں ان کو کلکتہ یونیورسٹی سے ڈی، فل کی ڈگری
بھی ملی ہے، انھوں نے اس پر انگریزی میں ۴۷ صفحے کی ایک تمہید لکھی ہے، جس میں اس کتاب
کی اہمیت دکھائی گئی ہے، شروع میں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر اے، جے، آربری
کا ایک مختصر پیش لفظ بھی ہے،

اس کتاب میں بنگال کے نواب مہابت جنگ علی وردی خاں (۱۷۵۶ - ۱۷۴۰)
اور نواب سراج الدولہ (المتوفی ۱۷۵۷ء) کے تاریخی حالات ہیں، اس کی اہمیت اسلیے
ہے کہ اس کا مصنف یوسف علی خاں دونوں نوابوں کا معاصر ہے، اس کا باپ مہابت جنگ
علی وردی کا بڑا معتمد اور وفادار ہمجلیس رہا، اس کی شادی علی وردی خاں کے آقا اور پیشرو
نواب شجاع الدولہ کے لڑکے نواب سرفراز خاں کی لڑکی سے ہوئی،

یہ کتاب اس لحاظ سے تو ہندوستان کے تاریخی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے کہ اس سے
اٹھارہویں صدی کے بنگال کے بہت کچھ واقعات معلوم ہو جاتے ہیں لیکن یوسف علی خاں
کو ایک غیر جانبدار مورخ کہنا صحیح نہیں ہوگا، راقم نے اس کتاب کے اس حصہ کو زیادہ دلچسپی
سے پڑھا جس میں سراج الدولہ کے حالات ہیں، بنگال کا یہ جانباز نواب جب ہلاک کیا گیا تو
اس وقت اس کی عمر کل ۲۶ سال کی تھی لیکن وہ اپنا نام ہندوستان کی تاریخ میں زریں
حروف میں لکھنے کے لیے چھوڑ گیا ہے، اس نے کل ایک سال تین مہینے تک بنگال میں حکومت
کی، اس قلیل مدت میں اس کی رزمیہ داستان اچھی خاصی طویل ہے، وہ جانکی رام، شوکت جنگ
قاسم بازار اور کلکتہ کے انگریز تاجروں سے لڑا، علی نگر کی صلح کی، پھر پلاسی کی جنگ کی،
اس کی جنگی کارروائیوں میں غاصب انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا قابل قدر

باب التقریظ والانتقاد

"تاریخ بنگالۂ مہابت جنگی"

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مذکورۂ بالا تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہوئی ہے، اس سے پہلے اس سوسائٹی نے بہت سی فارسی اور عربی کتابیں شائع کر کے بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی بہت سی فارسی تاریخیں اس سوسائٹی کی وجہ سے اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچیں، جن میں تاریخ بیہقی، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی (برنی) تاریخ فیروز شاہی (عفیف)، ظفر نامہ، تاریخ مبارک شاہی، اکبر نامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، مآثر رحیمی، شاہجہاں نامہ، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری، منتخب اللباب مآثر الامراء، اور ریاض السلاطین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی مفید حواشی کے ساتھ شائع ہوئے، دو چار کو چھوڑ کر یہ کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی نہیں رہ گئی ہیں، ان کے نہ ملنے کی وجہ سے ان مطبوعات کی حیثیت مخطوطات کی ہو گئی ہے، اور جہاں ہیں وہاں انکے اوراق ایسے بوسیدہ اور خستہ ہو گئے ہیں کہ ان کا الٹنا بھی مشکل ہو گیا ہے، یہ ایشیاٹک سوسائٹی ہی کی ملکیت ہیں، اگر اسکی طرف سے ان کا نیا اڈیشن شائع ہو، تو یہ نئی کتابوں کی اشاعت سے کم مفید علمی خدمت نہ ہوگی، امید کہ سوسائٹی کے ارکان اس کی طرف توجہ کریں گے۔

"تاریخ بنگالۂ مہابت جنگی" مصنفہ یوسف علی خاں کو ڈاکٹر عبد السبحان استاد زبان و

اس کے مصنف کے تعلقات یورپین حکام سے دوستانہ تھے (ص ۲۵)، غالباً اس دوستی کا حق یہ کتاب لکھ کر ادا کیا۔ ڈاکٹر عبد السبحان کو بھی مصنف کی غیر جانبداری پر زیادہ اعتماد نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنی تمہید (ص ۳۰) میں اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے، مگر اس اجمال کو تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، انھوں نے معلوم نہیں اس کتاب کے متعلق یہ کیسے لکھدیا ہے کہ

It helps us to broaden our estimate of The Nawab's (Siraj-ud Dawlah's) Character
(p. 8)

حالانکہ اس کتاب کے مطالعہ سے نواب سراج الدولہ کی بہت بری تصویر سامنے آتی ہے مثلاً

"سراج الدولہ کہ چشم طمع بر اموال و ذخائر کلکتہ دوختہ بود" (ص ۱۵۷)

در ... الذ لوحی می کرد تمامی شہر کلکتہ بباد غارت و تاراج رفتہ ... و ... اطراف و اکناف بلاد و امصار ہزارہا دلکہا کہ از قریب صدل سال در آں شہر از حوادث روزگار مصون و محروس بود، بہ نہب و تاراج آمد (ص ۱۵۸)

و قریب صد نفر فرنگان کہ دراں روز اسیر پنجۂ تقدیر شدہ بودند ہمہ انہارا در حجرہ محبوس نمود و ضبط و نسق کوٹھی را بہ بعضی از سرداران رجوع کردہ و از کوٹھی برآمدہ در یکے از خانہ ہای فرنگان قرار گرفت از قضا در حجرہ کہ فرنگان رفتہ بودند، تمامی آنہا مخنوق گشتہ رو بوادی عدم آوردند و قریب بیست و سی نفر دیگر کہ در ایام محاصرہ بضرب بندوق وغیرہ کشتہ شدہ بودند نفرمان پا چہ را بر روی یکدیگر در خندق کوٹھی انداختند (ص ۱۵۸)

جذبہ بھی شامل رہا، جو اس کو ظالم، سفاک، غایت بدزبان کہکر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔
یوسف علی خاں نے اس کی موت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

سراج الدولہ کہ بحکومت عالمی اکتفا نداشت و راضی نمی گشت و از سیاست ظلم و کمال سفاکی و غایت بدزبانی او زہرۂ ہزبران آں دیار آب می گشت با کلاہی بہ ہرو آزاری در پا و یک لائی بردوش داشتہ در آں حال تمنای محفر گوشۂ دنیا از اہل دنیا نمود و چون وجود نابود او باعث مفاسد عظیمہ می شد یاآں تمنا نیز ہم آغوش نگشتہ بحکم حاکم شدید الانتقام شمشیر قضا قطع سررشتۂ جمیع تمنیات او فرمود، بفرمان میر محمد جعفرخاں بہادر نزد مہابت جنگ مرحوم مدفون ساختہ" (ص ۱۷۰ - ۱۶۹)

مذکورۂ بالا اقتباس میں سراج الدولہ کی ایک بری تصویر پیش کی گئی ہے۔
میر جعفر کو ننگ قوم و ننگ دین و ننگ وطن قرار دیا گیا ہے، وہ اپنے زمانے میں
کلائیو کے گدھے کے نام سے مشہور ہے، اس کی غداری اب ضرب المثل بن گئی ہے
اسی نے سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دلائی، اور آخر میں اس کو قتل
کرایا، اس کے صلہ میں انگریزوں سے بنگال کی نظامت پائی، لیکن اس کتاب میں ان سب
پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، ایک جگہ تو اس کی حرمت و عزت کی پاسداری بھی کی گئی ہے
(ص ۱۲۶)، اس کے مقابلہ میں کلکتہ میں سراج الدولہ کی حرکت مذبوحی، نہب و تاراج
غارت گری، آتش زنی، سو انگریزوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں محبوس
کرنے کا ذکر بہت طمطراق سے کیا گیا ہے (ص ۱۸۵)۔ یہ تمام باتیں شہادت دے رہی
ہیں کہ یہ کتاب انگریزوں کے زیر اثر لکھی گئی، ڈاکٹر عبدالسبحان نے تمہید میں لکھا ہے کہ

اسکے بعد جو بھی تاریخ لکھی گئی اس میں انگریزوں کی مزاحداری ضرور کی گئی، پھر بھی ریاض السلاطین میں ہے کہ میر محمد جعفر خاں نے انگریزوں اور جگت سیٹھ کے اشارہ سے قتل کیا، اور اسکی لاش کو ہودج میں ڈال کر شہر میں گشت کرایا، پھر اس کے چھوٹے بھائی کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا،

سراج الدولہ را از خانۂ دانشاہ گرفتار کردہ به اکبر نگر بردند، وازاں جا کسان داؤد علی خاں و میر محمد قاسم خاں ہمراہ خود گرفتہ به مرشد آباد بردند، میر محمد جعفر خاں او را آں روز محبوس داشتہ روز دیگر بصوابدید سرداران انگریز و اصرار و استبداد جگت سیٹھ مقتولش ساختہ۔ لاش آں مظلوم را از ہودج آویزاں کردہ در شہر گردانیدہ، در خوش باغ بمقبرۂ نواب مہابت جنگ مدفون ساختند و بعد چندے مرزا مہدی علی خاں برادر خورد سراج الدولہ را نیز در تختہ کشیدہ از جان کشتند و بہ پہلوی برادرش بخاک سپردند (ص ۲۷۳-۷۴)

سیر المتاخرین کے مصنف نے بھی انگریزوں سے متاثر ہو کر اپنی تاریخ لکھی ہے، اس نے تو سراج الدولہ کے قتل کا ذکر کرنے ہی سے گریز کیا ہے بعض انگریز اہل قلم نے سراج الدولہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ یوسف علی خاں سے مختلف ہے، مثلاً کرنل میلسن نے لکھا ہے،

"سراج الدولہ کا قصور کچھ بھی رہا ہو لیکن اس نے اپنے آقا سے غداری نہیں کی، اپنے ملک کو فروخت نہیں کیا، جو بھی غیر جانبدار انگریز ہوگا وہ انصاف کرنے کے لیے بیٹھے گا تو وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا ہے کہ ۹ر فروری سے ۲۳ر جون تک جو واقعات ہوئے ان میں سراج الدولہ کا نام عزت کے ترازو کے پلڑے میں کلائیو کے نام سے زیادہ بھاری ہے، اس المناک ڈرامہ کے تمام اہم کرداروں میں وہ نمایاں ہے، کہ اس نے فریب دینے کی کوشش نہیں کی، (بحوالہ رائیز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا از بی۔ ڈی باسو جلد اول، ص ۲۰۶)

سراج الدولہ کہ از فتوح سابق مخمور بادۂ غرور بود اصلا التفات و اعتناء بالحاح مطالب فرنگان کردہ (ص ۱۶۲)

و از رقدۂ جہالت و نوم غفلت متنبہ نگشتہ بر صفات ذمیمہ خودکہ باعث تنفر خاص و عام می شد اصرار نمود .... درخشونت مزاج و اذیت خاص و عام از طبقہ سپاہ و ارباب کرام ولیام بیشتر از بیشتر افزود.. (ص ۱۶۴)

سراج الدولہ حواس باختہ و دست و پاگم کردہ درفکر این بلیۂ نازلہ افتاد (ص ۱۶۶) و اذکردار ناہنجار خویش کہ در طی این حالات نسبت بخان مشار الیہ یعنی میر محمد جعفر خان بعمل آوردہ بود اظہار ندامت و انفعال کردہ (ص ۱۶۶)

گردۂ تو شیا بہ میر مدن کہ بختی دوم سراج الدولہ محل اعتمادش بود رسید از کشتہ شدن او سراسیمگی سراج الدولہ اضعاف مضاعف گشتہ سرتکبر را کہ بہ فلک افلاک می سود در گریبان خمول نسید (ص ۱۶۷)

سراج الدولہ کی موت کے ذکر کے سلسلہ میں مصنف کی رائے کا اقتباس اوپر گذر چکا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انگریز تاجروں کے کمال جرأت، پایداری (ص ۱۶۲) جلادت (ص ۱۹۵) بلکہ ان کی مظلومیت و معصومیت (۱۴۴، ۱۵۰) کا ذکر جابجا آیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسبحان لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب چھ نسخوں کے موازنہ کے بعد اڈیٹ کی ہے۔ ان میں سے برٹش میوزیم ہی کے نسخہ میں سراج الدولہ کا باب ہے، کسی اور نسخہ میں نہیں، اس سے یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کا یہ باب الحاقی تو نہیں؟ اس کھٹک کو مفصل بحث کے ذریعہ سے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے قطع نظر سراج الدولہ کے ہلاک کیے جانے کا ذکر ریاض السلاطین میں کچھ مختلف ہے، ظاہر ہے کہ پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کا نقشہ بدل گیا تھا،

مطبوعات جدیدہ

مرزا غالب مرحوم کی صد سالہ یادگار کے موقع پر شائع ہونے والے اردو رسالوں کے خاص نمبروں اور کتابوں کا ان صفحات میں پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس کے بعد جو کتابیں اور خاص نمبر آئے ہیں، ان کا اس اشاعت میں تعارف کرایا جاتا ہے، ان میں سے بعض بہت پہلے کے آئے ہوئے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان پر ریویو میں تاخیر ہو گئی۔

العلم غالب نمبر۔ مرتبہ جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی تقطیع کلاں کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۲ قیمت عنہ ناشر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۸

یہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے سہ ماہی رسالہ العلم کا غالب نمبر ہے، اس ضخامت اور حجم کے چند ہی غالب نمبر شائع ہوئے ہیں، اس میں غالب کی زندگی، حالات، فضل و کمال، شاعری انشاء پردازی، طرز بیان، جدت ادا، تلامذہ، احباب و معاصرین اور دیوان وغیرہ کے متعلق مختلف عنوانات کے تحت ہندوستان و پاکستان کے ممتاز اہل قلم کے مضامین ہیں، غالب کی عظمت اور شاعرانہ کمالات کے بارہ میں پرانی تحریروں کے اقتباسات اور بعض قدیم کمیاب مضامین بھی درج کیے گئے ہیں، ڈاکٹر ممتاز حسن، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پیر حسام الدین راشدی اور سید ہاشم رضا کے انٹرویو کو ایوب قادری صاحب نے مضامین کا جامہ پہنایا ہے، اتنے ضخیم نمبر میں ناہمواری کا ہونا تعجب انگیز نہیں ہے، چنانچہ بعض لوگوں نے مرزا کو قومی شاعر

یہ خراج ایک دشمن قوم کے ہم وطن کی طرف سے ادا کیا گیا ہے لیکن یوسف علی خاں سراج الدولہ کا نہ صرف ہم وطن تھا بلکہ اس سے خاندانی لگاؤ بھی رکھتا تھا، وہ اس کے وجود نابود کو باعثِ مفاسد عظیمہ قرار دیتا ہے، مورخ کے قلم میں بھی عجیب بوقلمونی ہوتی ہے، جو اس کی تاریخ کے پڑھنے والے کے ذہن کو آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔

زیر نظر کتاب کی جانبدارانہ نوعیت کا سوال الگ ہے، اس کے لائق مرتب ڈاکٹر عبدالسبحان کی محنت پر حرف نہیں آتا، انھوں نے مختلف نسخوں سے اس کو پوری مشقت سے ایڈٹ کیا ہے۔ وہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی غالباً کر چکے ہیں، اسکی زبان اکبر نامہ، شاہجہاں نامہ اور عالمگیر نامہ کی طرح مشکل نہیں، اس لیے اس کا ترجمہ کرنا زیادہ مشکل نہیں، اگر انھوں نے اس کے ترجمہ کرنے اور اسی کے ساتھ اسکے حواشی لکھنے میں وہی عرق ریزی کی جو ایشیاٹک سوسائٹی کی گذشتہ مطبوعات کے انگریزی ترجموں میں کی گئی ہے تو یہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہوگا،

کتاب کی ضخامت تقریباً ۲۵۲ صفحے ہے، قیمت ۲۵ روپے رکھی گئی ہے، ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۔ پارک اسٹریٹ کلکتہ سے مل سکتی ہے۔

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم

(طبع دوم)

یعنی مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قومی و اخباری مضامین کا مجموعہ جو الندوہ، مسلم گزٹ اور دوسرے رسائل و اخبارات سے اکٹھا کیے گئے، اس میں مولانا کا پولیٹیکل کروٹ والا مضمون بھی آگیا ہے جس نے مسلمانوں کی سیاست کا اس زمانہ میں رخ بدل دیا تھا، یہ مولانا کا بڑا پسندیدہ اور انقلاب آفریں مضمون ہے۔ (زیر طبع)

منیجر

ان کے پختہ قلم اور اردو و فارسی شعر و ادب میں انکی بصیرت کے شاہد ہیں۔ "مسائل تصوف" (مکین اکبرآبادی) اور "غالب کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے مآخذ" (شبیر احمد خاں غوری) فاضلانہ اور محققانہ مضامین ہیں، پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کا دلچسپ مضمون لطف زبان کا نمونہ ہے۔ فاضل مرتب نے بڑے دلآویز طرز میں غالب کی شخصیت و شاعری میں ترکی و ایرانی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ "غالب کی مابعد الطبیعاتی شاعری" (ڈاکٹر نریش چندر) گو اپنی نوعیت کا نرالا مضمون ہے، مگر وہ خود ماورائی بن گیا ہے، آخر میں غالب کے متعلق غیر مطبوعہ اور کمیاب مطبوعہ کتابوں کے چند اقتباسات اور خود غالب کے تصحیح کیے ہوئے دیوان کے چند صفحے کا عکس ہے، یہ نمبر مواد و معلومات کے لحاظ سے غالبیات میں قابل قدر اضافہ ہے۔

سب رس غالب نمبر۔ مرتبہ جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۸، قیمت درج نہیں، پتہ ایوان اردو، خیریت آباد، حیدرآباد ۴۔

یہ دکن کے مشہور ماہنامہ رسالہ "سب رس" کا غالب نمبر ہے، اسکے حصۂ نثر میں دو مزاحیہ اور غالب کے بعض دکنی تلامذہ کے متعلق بھی مضامین ہیں، صاحبزادے شوکت علی خاں نے اپنے مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ غالب اردو شعراء میں سب سے زیادہ میر ممنون سے متاثر تھے، "خطوط نگاری میں غالب کے ایک پیش رو" (اطہر علی فاروقی) میں خواجہ غلام غوث بیخبر کا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے غالب سے بھی پہلے اردو خطوط لکھنا شروع کر دیے تھے، تذکرہ اور انکی خطوط نگاری کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، "لغات غالب" (احمد علی خاں) میں غالب کے چند مخصوص الفاظ، محاورات اور ترکیبوں کا خاکہ دیا گیا ہے، ان کے علاوہ "گنجینۂ معنی کا طلسم اور مانی الضمیر" (ڈاکٹر ابو محمد سحر) "سید ہاشمی اور نسخۂ حمیدیہ" (عبد القوی دسنوی) "حیات غالب" (محی الدین قادری زور)

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اس زمانہ میں قومیت کا کوئی تصور ہی نہ تھا، اس سے قطع نظر یہ نمبر کیفیت و کمیت دونوں حیثیتوں سے اہم اور غالب کے بارہ میں متنوع معلومات کا عمدہ ذخیرہ ہے۔

اردوئے معلی غالب نمبر حصہ سوم ۔ مرتبہ جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت نفیس، صفحات ۲۹۲، قیمت معہ، ناشر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۷۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ششماہی "رسالہ اردوئے معلی" نے یکے بعد دیگرے تین غالب نمبر نکالے تھے، زیر نظر تیسرا نمبر غالب صدی کی تقریبات کے سلسلہ میں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے جو دوسرے رسالوں کے غالب نمبروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس میں غالب کے عہد، شخصیت، شاعری، دیوان و معاصرین وغیرہ کے متعلق ہندوستان کے متعدد نامور اہل قلم اور یورپ و امریکہ کے کئی دانشوروں کے بلند پایہ محققانہ مضامین ہیں، ابتدا ہی میں قاری کو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطبے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، جو انھوں نے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں دیے تھے، یہ خطبے نہایت متوازن، دلکش اور بصیرت افروز ہیں، ان میں غالب کی سیرت و شخصیت اور شاعری کا بڑی بالغ نظری اور حقیقت پسندی سے جائزہ لیا ہے، اور ان کی بعض لغزشوں کا اس انداز سے تذکرہ کیا ہے جس سے ان کی فنی عظمت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اور ان نقادوں سے اختلاف بھی کیا ہے جو مرزا کو "رندان قدح خوار" کے بجائے "طبقۂ زہاد" میں شامل کرتے اور ان کی شاعری کو ہر قسم کے حقائق اور ہر عہد کے واقعات کا مخزن قرار دیتے ہیں، خواجہ غلام السیدین کا مضمون بھی خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے، پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے تینوں مضامین

مرحوم وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں، "غالب کی ایک سعی لاحاصل" (حامد اللہ ندوی) میں غالب کی فارسی شاعری کو لاحاصل قرار دینے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے، آخر میں حصہ نظم اور رسالوں کے بعض غالب نمبروں اور غالب سے متعلق کتابوں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، اور شروع میں غالب، ان کے مزار، دیوان کے سرورق، اندرونی صفحے اور بعض تحریروں کا عکس اور چند تلامذہ کے فوٹو ہیں، یہ نمبر محنت و کاوش کا نتیجہ اور لائق مطالعہ ہے۔

غالب فکر و فن ۔ مرتبہ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰ قیمت تحریر نہیں، ناشر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۶۹ء میں غالب پر ایک سیمنار منعقد ہوا تھا، اس میں یونیورسٹی کے ملحقہ ڈگری کالجوں کے اردو اساتذہ کے علاوہ حیدر آباد، دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، بنارس اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں کے اساتذہ نے شرکت کی تھی، زیر نظر کتاب میں اس سمینار میں پڑھے جانے والے مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، اس میں بالترتیب خواجہ احمد فاروقی، احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے مقالات ہیں، یہ سب مضامین غالب کے بارہ میں مفید معلومات پر مشتمل ہیں، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مغنی تبسم کے مضامین زیادہ مبسوط ہیں، خواجہ احمد فاروقی کا افتتاحی خطبہ وہی مضمون ہے جو اردوئے معلی (رسوم) میں ہے، شروع میں مجاہد حسین رضوی نے دلچسپ انداز میں سمینار کی روداد سنائی ہے، اس مجموعہ کی اشاعت پر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی خصوصاً اس کے لائق صدر قابل مبارکباد ہیں۔

"ض"

نمبر (۵۲۰) اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتابت سید اقبال احمد)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱۔ بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت للعہ

۲۔ بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادبا کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۲۵۰ صفحے قیمت معہ

۳۔ بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۶ صفحے قیمت: عہ ۲۵

۵۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ... ۵ صفحے قیمت: عہ

۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۰ ۵ صفحے، قیمت: معہ

۷۔ ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت: صہ

۸۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: عہ

۹۔ ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۲ صفحے، قیمت: صہ

۱۰۔ عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۲۶ ۵ صفحے، قیمت: لعہ ۵۰

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۸۔ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب، ملت، نسل و رنگ، زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اُسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور اُن سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۵ روپے

کے مسائل کا حل اکثریت سے مل کر اور ان کی مدد ہی سے ہوسکتا تھا، مجلس مشاورت کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا، جو پورا نہ ہوسکا۔ وہ عملاً پابند مذہب تھے، ان کو مولانا آسی سکندرپوری سے عقیدت تھی، بلکہ شاید ان سے بیعت بھی تھے، اس لیے ابتداء ان پر مذہب کا اثر اور تصوف کا ذوق تھا، اور آخر میں یہ رنگ اور گہرا ہوگیا تھا، مولانا آسی کا کلام بڑے تاثر سے پڑھا کرتے تھے، بزرگوں سے عقیدت رکھتے اور ان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔

اس مختصر تحریر میں ان کے اوصاف و کمالات اور سیاسی و قومی خدمات کی تفصیل کی گنجائش نہیں، اس پر بہت سے لکھنے والے لکھیں گے، معارف میں بھی انشاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا، اس وقت دارالمصنفین سے ان کا تعلق دکھانا مقصود ہے۔ ان کے اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، وہ علمی ذوق بھی رکھتے تھے، اس لیے دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا لگاؤ تھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن تھے، پھر اس کے صدر ہوگئے تھے، اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، پھر چونکہ ضلع اعظم گڑھ میں ان کی قرابت اور جائداد تھی، اس سلسلہ میں بھی ان کا اعظم گڑھ آنا جانا ہوتا رہتا تھا اور قیام دارالمصنفین میں رہتا تھا، جب تک رہتے بڑی پرلطف صحبت رہتی، سیاسی، علمی، مذہبی ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی، ان میں ان کے بعض تفردات بھی تھے، ان کا حافظہ بڑا قوی تھا، ان کا دماغ پرانی یادوں کا خزانہ تھا، اس سے ہم لوگوں کے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا، سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب کے بعد ان کی حیثیت دارالمصنفین کے بزرگ خاندان کی ہوگئی تھی، اور وہ ہم لوگوں سے اپنے عزیزوں ہی کی طرح محبت کرتے تھے۔

ان کی ذات سے دارالمصنفین کو بڑے فوائد پہنچے، انھوں نے اپنے اثر سے ایک مرتبہ دس ہزار اور دوسری مرتبہ پچاس ہزار سعودی عربیہ سے دلوائے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین مالی حیثیت سے اس قدر مضبوط ہوجائے کہ پھر اس کو کسی کی

شذرات

افسوس ہے کہ ملک وملت کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ۲۸ ستمبر کی صبح کو اس جہان فانی کو الوداع کہا، ڈاکٹر صاحب جیسی جامع صفات شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں، ان میں مذہب وسیاست، علم وفن اور تہذیب وشرافت کا نہایت متناسب اجتماع تھا، شرافت اور وضعداری کا تو مجسم پیکر تھے، آخر کے چند برسوں کو چھوڑ کر جب وہ بالکل معذور ہوگئے تھے، ان کی پوری زندگی ملک ووطن اور قوم وملت کی خدمت میں گذری، وہ ابتدا سے کانگریسی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پرانے رفیق تھے، ان دونوں کے تعلقات اتنے عزیزانہ تھے کہ ڈاکٹر صاحب پنڈت جی کے گھر کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے، جنگ آزادی میں ان کے دوش بدوش حصہ لیا، اور ان کے ساتھ قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، آزادی کے بعد صوبہ بہار کے وزیر تعلیم، پھر مرکزی حکومت میں وزیر مملکت برائے امور خارجہ ہوئے، چند سال پہلے تک راجیہ سبھا کے ممبر تھے، پھر اپنی معذوریوں کی وجہ سے الگ ہوگئے تھے، ان کا آخری کارنامہ مجلس مشاورت کا قیام ہے، اس کو انھوں نے ہندو مسلم اتحاد، ان دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کے ازالہ اور ملک وملت کی مشترک خدمت کے لیے قائم کیا تھا، اور ابتدا میں بڑی سرگرمی سے اس کے کاموں میں حصہ لیا، اور ضعف پیری کے باوجود ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، جس کا ملک کی فضا پر بہت اچھا اثر پڑا، لیکن پھر مجلس مشاورت کی پالیسی میں بعض ارکان سے اختلاف کی بنا پر اس سے الگ ہوگئے، اور چند دنوں سے شیعہ سنی اتحاد کی کوشش میں تھے۔

وہ اگرچہ ابتدا سے کانگریسی اور اس کے نہایت ممتاز رہنما تھے، اور آخر تک اس پر قائم رہے، لیکن اس سے ان کے مذہبی وملی جذبہ میں فرق نہیں آیا تھا، ان کے دل میں مذہب وملت کے لیے بھی وہی تڑپ تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے تھی، مگر ان کی رائے میں مسلمانوں

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

اقبال مفکر اور فلسفی بھی تھے اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی، ارکانِ اسلام کے بارہ میں ان کے عقائد بالکل ایک ٹھیٹھ مسلمان کے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا حکمائے اسلام پر طنز و تعریض کی ہے، لیکن ان کے مخاطب عوام و خواص دونوں تھے ان کا مقصد تہذیب کے متعلق مغربی افکار و تصورات کے طلسم کو توڑنا اور مسلمانوں کی مغرب زدہ نئی نسل میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی روح پیدا کرنا تھا، اس لیے انھوں نے دونوں کی زبان میں گفتگو کی ہے ٹھیٹھ اسلام بھی پیش کیا ہے اور اس کی تعلیمات کی حکیمانہ تعبیریں بھی کی ہیں، ان کی حکیمانہ تعلیمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ٹھیٹھ اسلامی تعلیمات پر کم لکھا گیا ہے، اس لیے اس مقالہ میں ان کی دوسری تعلیمات کے ساتھ اسلام کے بنیادی ارکان توحید، رسالت، وحی، قرآن اور اسلامی شریعت وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، یہ مقالہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے توسیعی خطبات کے سلسلہ

امداد کی احتیاج باقی نہ رہی، اس کے لیے انھوں نے کویت جانے کا پروگرام بنایا تھا، ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اس عمر میں آپ سے اتنا لمبا سفر کیسے ہو سکے گا، فرمایا تبدیلی آب و ہوا سے میری صحت زیادہ ٹھیک رہتی ہے، اور زیادہ تر و تازہ رہتا ہوں، ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ دارالمصنفین میں قیام کر کے اپنے پیش نظر علمی کاموں کو پورا کریں گے، دارالمصنفین کے متعلق اور بھی منصوبے تھے، مگر یہ سارے منصوبے دل ہی میں رہ گئے، اور ان کا وقت آخر ہو گیا، وہ پرانی یادگاروں میں تھے، اس لیے کانگریس اور مرکزی حکومت کے ارکان دونوں ان کا احترام کرتے اور ان کی باتوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے، مسز اندرا گاندھی خاص طور سے ان کو اپنا بزرگ سمجھتی تھیں، اس اثر سے انھوں نے دارالمصنفین کو بڑا فائدہ پہنچایا، افسوس کہ یہ سہارا ختم ہو گیا، لیکن اصلی اور حقیقی سہارا تو باقی ہی ہے۔ و علیہ التکلان۔

اس ضعف پیری میں بھی جب کہ ان کے قوی جواب دے چکے تھے، ان کا دماغ پورا کام کرتا تھا، اور ان کی ہمت، حوصلے اور قوت عمل کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی، مگر ان کے سارے ہم نوا و ہم صفیر اٹھ چکے تھے اور وہ اس انجمن میں اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے، ہندوستان کے حالات سے بھی بہت شکستہ خاطر تھے اور حسرت و افسوس کے ساتھ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ادھر کئی مہینوں سے ان کی حالت خراب تھی، جولائی میں تو زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی، ان کی حالت سنکر راقم اور صباح الدین صاحب ان کو دیکھنے کے لیے دلی گئے تھے، مگر ہمارے دوران قیام میں برابر بیہوش رہے، اور ہوش میں ان سے ملاقات نہ ہو سکی، مگر اس کے بعد پھر حالت سنبھل گئی تھی، لوگوں کو پہچاننے اور باتیں کرنے لگے تھے، شروع اکتوبر میں بعض ضرورتوں سے پھر ہم دونوں کا دلی سفر ہونے والا تھا، خیال تھا کہ اس مرتبہ ہوش میں ملاقات ہو گی کہ ۲۸ ستمبر کی صبح کو دلی ریڈیو اسٹیشن نے ان کی وفات کی غمناک خبر سنائی اور یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی، البتہ ان کے مزار پر حاضری ہو گی، انکی وفات دارالمصنفین کے لیے تنہا قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ملک و وطن کے اس خادم اور قوم و ملت کے اس غمخوار کی مغفرت اور عالم آخرت میں مقام محمود عطا فرمائے

والبقاء للہ وحدہٗ

کے ایک طبقہ میں بدعات اور مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہوگیا، اور جہاد کی تحریک نے ان میں احیائے دین کے لیے جانبازی کی روح پیدا کردی، جن کو ان کے پیروؤں نے عرصۂ دراز تک جاری رکھا، تاآنکہ انگریزوں نے اپنے تسلط کے بعد ظالمانہ طریقہ سے اس کا خاتمہ کیا، اس لیے آج بھی ہندوستان میں توحید اور دین خالص کی جو کرن نظر آتی ہے وہ انہی نفوسِ قدسیہ کا فیض ہے۔

اس زمانہ میں انگریزوں کی قوت ابھر چکی تھی، جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک تھی، وہ علم و سائنس کے اسلحہ سے مسلح اور اس کے جلو میں مغربی علوم کی فوج اور ایک نظر فریب تہذیب تھی، اس نے محض سیاسی نہیں بلکہ ذہنی اور دماغی حیثیت سے بھی مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی، مسلمانوں کے زوال و پستی اور جمود و بے عملی کے باوجود ان میں اپنے مذہب اور اپنی تہذیبی برتری کا پورا احساس باقی تھا، لیکن مغربی علوم اور مغربی تہذیب نے ان میں ایسا احساس کمتری پیدا کردیا کہ ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و روایات بھی خطرہ میں پڑ گئے۔ اس کا مقابلہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء، مولانا شبلی اور علماء کی ایک جماعت نے اپنے اپنے طریقہ پر کیا اور بعض حیثیتوں سے اس میں کامیابی بھی ہوئی، لیکن مغربی علوم کا حملہ مختلف سمتوں سے تھا، اور ہر محاذ پر مقابلہ کی صلاحیت ان میں سے کسی میں نہ تھی اس لیے مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی یلغار کا پورا مقابلہ نہ ہوسکا، سرسید احمد خاں اور ان کی جماعت میں اخلاص اور مسلمانوں کی ہواخواہی کے باوجود دینی بصیرت نہ تھی، انھوں نے صرف تعلیم جدید اور جدید خیالات اور مغربی تہذیب سے ہم آہنگی اور انگریزوں سے مفاہمت کو مسلمانوں کے مرض کا مداوا سمجھا، اس سے مسلمانوں کو دنیاوی فوائد تو ضرور حاصل ہوئے،

میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی صدارت میں آخر ستمبر ۱۹۷۱ء میں پڑھا گیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ اُن پر دینی و اخلاقی انحطاط بھی طاری ہو گیا تھا، آخری دور کے تیموری سلاطین میں کوئی دم باقی نہ رہ گیا تھا، پورے ملک میں بدنظمی اور انقلاب برپا تھا، صوبوں میں نئی نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں، اور بعض میں آزاد حکومتیں قائم ہو گئی تھیں، تیموری سطوت دم توڑ چکی تھی، یہی حال مذہب و اخلاق کا بھی تھا مسلمانوں سے مذہبی روح ختم ہو چکی تھی، مذہب کے نام پر اوہام اور بدعات کا دور دورہ تھا، پوری قوم فکر فردا سے غافل تعیشات و تفریحات میں غرق تھی، علماء پر جمود طاری تھا، علم و فن کے وہ سرچشمے جن سے ملت کی کشت حیات سیراب ہوتی ہے خشک ہو چکے تھے، اور اس کا پورا شیرازہ برہم ہو رہا تھا، علماء میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کو اس کا احساس ہوا، انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کی، مگر اس کا کوئی فوری نتیجہ نہ نکلا، مگر آیندہ چل کر ان کے لگائے ہوئے پودے نے برگ و بار پیدا کیے، ان کے پوتے مولانا اسماعیل شہیدؒ اور شاہ عبد العزیزؒ کے شاگرد مولانا سید احمد بریلویؒ نے دینی اصلاح و تجدید کے ساتھ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سیاسی عظمت کے قیام کے لیے علم جہاد بلند کیا، اور چند دنوں کے اندر بنگال سے لیکر صوبہ سرحد تک اس کا پورا نظام قائم کر دیا، اس وقت پنجاب میں سکھوں کا اقتدار تھا جنھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، اس لیے پہلی ٹکر اُن ہی سے ہوئی، اور کئی سال تک ان سے مقابلہ کا سلسلہ جاری رہا، اور مولانا اسماعیل اور مولانا سید احمد بریلوی نے اس راہ میں شہادت حاصل کی، اس تحریک کا خاتمہ بظاہر ناکامی پر ہوا، مگر دینی حیثیت سے اس کے بڑے مفید نتائج نکلے، مولانا اسماعیل شہید کی تصانیف و مواعظ سے مسلمانوں

پر تیشہ چلایا، اس کے ایک ایک عیب کو بے نقاب کیا، اسلام کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا، دین سے مسلمانوں (کا) رشتہ جوڑا، ان کی مردہ رگوں میں زندگی کی روح اور دین کی حرارت پیدا کی، ان کے ایک ایک مرض کی نشاندہی کی، اس کا علاج بتایا، ملت اسلامیہ کو اس کے اصل منصب سے آگاہ کیا کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، اس کا کام دوسروں کی تقلید نہیں بلکہ پوری دنیا کی امامت اور ہدایت و رہنمائی ہے، ان میں اولوالعزمی اور حوصلہ مندی پیدا کرنے کی کوشش کی، جس نے ان کو ایک زمانہ میں اقوام عالم کا معلم بنا دیا تھا۔ اور مغربی دنیا کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عالم انسانیت کا اصل مذہب اسلام ہے، اور اسی پر اس کی فلاح منحصر ہے۔

ان کی حکیمانہ شاعری نے ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا، مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اس کے برے اثرات کو روکا، ان میں اپنی دینی و ملی برتری کا احساس پیدا کیا، اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ مسلمانوں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی و فکری اصلاح و تجدید میں دور جدید کے تمام مصلحین میں سب سے بڑا حصہ اقبال کا ہے۔ یوں تو ہر صنف کے مصلحین نے اپنی اپنی صنف میں مفید اصلاحیں کیں، اور اس کے اچھے نتائج نکلے لیکن جو گیرائی اور جامعیت اقبال میں ہے، اس کی مثال دور جدید کے کسی مصلح میں نہیں ملتی، انھوں نے مسلمانوں کے تمام قابل اصلاح پہلوؤں اور اسلامی تعلیمات کو ایسے حکیمانہ اور رنگا رنگ انداز میں پیش کیا کہ ان کا انتخاب دشوار اور اس کی تفصیل کے لیے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہے، اس لیے اس مقالہ میں صرف بنیادی امور و مسائل پر اجمالی گفتگو کی جائے گی، اس سے پہلے چند باتیں پس منظر کے طور پر کہدینا ضروری ہے۔

اور ان کی گرتی ہوئی حالت سنبھل گئی، مگر مذہبی حیثیت سے نقصان پہنچا، علماء نے صرف مروجہ دینی تعلیم کے ذریعہ جو بڑی حد تک بیجان ہوچکی تھی، اور مغربی تعلیم کے اثرات ونتائج کے مقابلہ سے قاصر تھی، اس سیلاب کو روکنا چاہا، مگر اب دین کی حفاظت جدید علوم اور نئے خیالات ورجحانات سے واقفیت کے بغیر ممکن نہ تھی، جس سے دینی طبقہ تہی دامن تھا، اس لیے ان کی کوششوں سے ایک حلقہ میں تو دین کی حفاظت ہوگئی، لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر اس کا اثر نہ ہوسکا، اور اس میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب کے اثرات پوری طرح پھیل گئے، علماء کی جماعت میں مولانا شبلی کی تصانیف نے ایک حد تک ان اثرات کو روکا اور مسلمانوں میں ان کی دینی اور تہذیبی برتری کا احساس پیدا کیا،

مصلحین کے اس سلسلہ کی ایک زریں کڑی اقبال ہیں، وہ راسخ العقیدہ مومن تھے، اگرچہ وہ رسمی طور سے عالم نہ تھے، لیکن مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے ہر پہلو پر ان کی نظر بہت سے علماء سے زیادہ گہری اور وسیع اور حکیمانہ و فلسفیانہ تھی، وہ مغربی علوم وافکار اور اس کے فلسفوں سے پوری طرح واقف اور ان میں ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے، جدید تعلیم و تہذیب کے عیب وہنر سے پوری طرح آگاہ تھے، اس لیے اس دور میں جتنے مصلحین پیدا ہوئے، ان میں سب سے زیادہ جامعیت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ کی صلاحیت اقبال میں تھی۔

اس جامعیت کے ساتھ ان کو اللہ تعالیٰ نے دین میں رسوخ، مذہب و ملت کی سچی تڑپ اور شاعری کی الہامی زبان عطا فرمائی تھی، اور وہ صحیح معنوں میں "الشعراء تلامذۃ الرحمٰن" اور ان کی شاعری "ان من الشعر لحکمۃ" کی مصداق تھی، انھوں نے اپنی شاعری سے "عصائے موسیٰ" اور "ید بیضا" دونوں کا کام لیا، اور مغربی تہذیب اور جدید افکار کی ہر

جو اقوام عالم کے لیے نمونہ اور اس کی ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری سے گرانبار تھی،

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	مسلمانو! تم بہترین امت ہو، جو لوگوں
تامرون بالمعروف وتنھون	کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیدا کیے گئے،
عن المنکر وتومنون باللہ	تم اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو، بری باتوں
	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً	اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت
لتکونوا شھداء علی الناس ویکون	بنایا تاکہ تم لوگوں کے (اعمال) کے گواہ رہو
الرسول علیکم شھیداً	اور رسول تمھارے (اعمال) گواہ رہیں۔

اقبال نے اسلام کے اس پیام اور امت اسلامیہ کے عناصر ترکیبی اور اس کے اوصاف و خصوصیات اور منصب و مقام کو بڑے حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے، جن کے بدولت وہ خیر امت کے لقب سے ملقب ہوئی، اور جنھوں نے ایک زمانہ میں اس کو ساری دنیا کا معلم و امام بنا دیا تھا، اور آیندہ بھی اس کو اسی کے ذریعہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

ملت اسلامیہ کا سنگ اساس توحید و رسالت ہے	دوسری تمام قوموں اور ملتوں کی بنیاد نسل و وطن پر ہے، اس لیے قومی اور جغرافیائی دائروں میں محدود ہیں، لیکن

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، وہ ساری دنیا کی ہدایت کے لیے آیا ہے، اس لیے اس نے ملت اسلامیہ کی بنیاد نسل و وطن کے بجائے چند بنیادی صداقتوں پر رکھی، ان میں سب سے مقدم توحید و رسالت ہیں، مسلمان کسی وطن کا پابند نہیں، اس کا وطن ساری دنیا ہے،

جوہر ما با مقامے بستہ نیست ۔۔۔ بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

دنیا کے تمام الہامی مذاہب کا مقصد، خداشناسی کی تعلیم اور انسانوں کی ہدایت و رہنمائی تھی، اور ان سب نے اپنے اپنے زمانہ کے حالات و ضروریات کے مطابق اس فرض کو انجام دیا، لیکن ان مذاہب کا دائرہ اور ان کی تعلیمات محدود تھیں، اور امتداد زمانہ سے ان سب کا اثر ختم ہو چکا تھا، ظہور اسلام سے پہلے سچی خداشناسی کا کہیں وجود نہ رہ گیا تھا، کہیں ستاروں کی پوجا تھی، کہیں دیوی دیوتاؤں کی، کہیں انسانی دولت و قوت کی، حیوانات اور شجر و حجر تک مسجود ملائک کے معبود بن گئے تھے، اخلاق و روحانیت کا چراغ گل ہو چکا تھا، نفس پرستی اور وحشیانہ طاقتوں کا دور دورہ اور ہر کمزور اور ادنیٰ طبقہ اپنے سے اعلیٰ اور طاقتور طبقہ کا غلام تھا، انسانی شرافت کا بالکل خاتمہ ہو چکا تھا، خالص دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی انسانوں کے لیے کہیں جائے پناہ نہ رہ گئی تھی، اگر کہیں اخلاق و روحانیت کی کوئی کرن نظر آتی تھی تو ترکِ دنیا، نفس کشی اور جسمانی اذیت کی شکل میں جس کا تحمل انسانی طاقت سے باہر ہے

انسانیت کی اس شب تار میں اسلام کا ظہور ہوا، اس کا مقصد بھی خداشناسی کو زندہ کرنا، خدا سے انسانوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنا اور سیکڑوں آستانوں پر جھکنے والی گردنوں کو ایک خدائے واحد کے سامنے جھکانا اور پورے عالم انسانیت کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اخلاق و روحانیت کے نور سے منور کرنا تھا، اس کی دعوت "کافۃ للناس" یعنی سارے عالمِ انسانیت کے لیے تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلا امتیاز نسل و رنگ اور ملک و وطن دنیا کی تمام قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے تھے، "بُعِثتُ الی الاسود والاحمر"، آپ کی ذات رحمۃ للعالمین تھی، "وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین" اس لیے اسلام کی تعلیمات میں بھی وہی آفاقیت اور ہمہ گیری ہے، اس نے ایک ایسی امت پیدا کی

زور، قوت اور غلبہ و اقتدار سب کا سرچشمہ توحید ہے، اسی کے بدولت پست، بلند اور حقیر خاک اکسیر کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے، اس کی طاقت سے غلام معزز و محترم اور بالکل دوسرا انسان بنجاتا ہے، حق کی راہ میں اس کی جد و جہد تیز اور اس کے خون میں بجلی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، خوف اور شک و شبہات کافور ہو جاتے ہیں، زندگی سراسر عمل بنجاتی ہے، انسانی نگاہ کائنات کے اسرار کا مشاہدہ کرنے لگتی ہے، جب انسان کی عبدیت کا مقام مستحکم ہو جاتا ہے تو گدا گری کا کاسہ بھی جام جم بنجاتا ہے، اس لیے ملت بیضا جسم ہے اور لاالہٰ اس کی جان ہے، مسلمان کے ساز کا مضراب، اس کے اسرار کا سرمایہ اور اس کا شعلۂ افکار لاالہٰ ہی ہے، جب توحید زبان سے دل میں اترتی ہے، تو طاقت و توانائی بن جاتی ہے، ملت کا وجود دلوں کی وحدت و یکجہتی سے وابستہ اور اس کا سینہ اسی ایک جلوہ سے روشن ہے، اس لیے اس کے افکار و تصورات، جذبات و خیالات، مدعا و مقصود اور خوب و زشت کے معیار میں وحدت ضروری ہے، توحید ہی کی نعمت سے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور ایک دل، ایک زبان اور ایک جان بن گئے،

در جہانِ کیف و کم گردید عقل	پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست	کشتیِ ادراک را ساحل کجاست
دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو	زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند	خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
قدرت او برگزیند بندہ را	نوعِ دیگر آفریند بندہ را
در رہِ حق تیز تر گردد تگش	گرم تر از برق، خوں اندر رگش
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات	چشم می بیند ضمیرِ کائنات

ہندی و چینی سفال جام ماست — رومی و شامی گلِ اندام ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطان دیں — مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
ہر کہ از قید جہات آزاد شد — چوں فلک در شش جہت آباد شد

توحید | ملت اسلامیہ کا سنگ اساس اور اس کی طاقت کا سرچشمہ توحید ہے، اسکی ساری تاب و تواں اسی سے وابستہ ہے۔ توحید کامل یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی کسی صفت میں دوسری طاقتوں کو شریک نہ کیا جائے، صرف اسی کو قادر مطلق اور متصرف فی الکائنات یقین کیا جائے، یعنی ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے، وہی ساری احتیاجوں کا پورا کرنے والا ہے، اس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں، حتی کہ اولیاء و انبیاء تک عاجز و درماندہ ہیں۔ اس یقین کے بعد انسان کی نگاہ میں دنیا کی کسی طاقت کی وقعت باقی نہیں رہتی، ان کا خوف اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس کی نگاہ بلند ہو جاتی ہے، اور وہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، اس کی گردن خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتی اور اس میں اتنی طاقت اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مافوق الفطرت کارنامے انجام دینے لگتا ہے، اس لیے توحید ملتِ اسلامیہ کی جان اور اس کی شیرازہ بند ہے، اسی سے اس میں وحدت و یکرنگی پیدا ہوتی ہے۔

اقبال کے نزدیک عقل کو بھی توحید ہی سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اس کے بغیر وہ گم کردہ راہ رہتی ہے، اور منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتی، دین و حکمت، آئین و قوانین،

لیکن ان کا دل ایک ہوتا ہے، نگاہ کی وحدت سے ذرے آفتاب بن جاتے ہیں، اسلیے وحدت نگاہ پیدا کرو، اسی سے حق کا چہرہ بھی بے نقاب ہوتا ہے، یک نگاہی کو حقیر اور معمولی چیز نہ سمجھو، یہ توحید کی تجلی کا کرشمہ ہے، جب کوئی ملت بادۂ توحید سے سرشار ہوجاتی ہے تو قوت وجبروت اس کے قبضۂ قدرت میں آجاتے ہیں، تم مردہ ہو یک نگاہی کے آب حیات سے زندگی اور لامرکزیت کو چھوڑ کر مرکز وحدت کے ذریعہ دوام و استحکام حاصل کرو، وحدت افکار ہی کردار آفریں ہے، اسی کے ذریعہ دنیا کو زیرنگیں کرسکتے ہو، توحید برق جہاں سوز بھی ہے اور باران رحمت بھی، ایک طرف وہ ہر باطل کو پاش پاش اور ہر فتنہ و شر کا قلع وقمع کردیتی ہے، دوسری طرف عالم انسانیت کو خیر وصلاح سے معمور اور علم وعرفان کی روشنی سے منور کرکے ایک دنیا بساتی ہے۔

نکتہ می گویم از مردانِ حال		امتاں را "لا" جلال "الا" جمال
تا ز رمزِ لا الٰہ آید بدست		بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست		ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
ملتے کز سوزِ او یکدم تپید		از گلِ خود خویش را باز آفرید
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات		تازہ از ہنگامۂ او کائنات
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر		ہوش از ہولِ قیامت بیشتر
ضربِ او ہر بود را سازد نبود		تا بروں آئی ز گردابِ وجود

اسی توحید کی بدولت مسلمانوں نے پرانی بوسیدہ دنیا کو زیر وزبر کرکے نیا جہان پیدا کیا تھا۔

ریزہ ریزہ از ضربِ او لات ومنات		در جہاں آزاد از بندِ جہات

چوں مقام عہد مستحکم شود کاسۂ دریوزہ جام جم شود
ملت بیضا تن و جاں لا الہٰ ساز ما را پردہ گرداں لا الہٰ
لا الہٰ سرمایۂ اسرار ما پردہ بند از شعلۂ افکار ما
حرفش از لب چوں بدل آید ہمی زندگی را قوت افزاید ہمی
ملت از یک رنگی دلہاستے روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم (رموز بیخودی)

ایک دوسرے مقام پر توحید اور ملت اسلامیہ کی وحدت اور اس کے فوائد کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہٰ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
اہل حق را حجت و دعوی یکیست جسمہائے ما جدا دلہا یکیست
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب
یک نگاہی را بچشم کم مبیں از تجلی ہائے توحید است ایں
ملتے چوں می شود توحید مست قوت و جبروت می آید بدست
مردۂ از یک نگاہی زندہ شو بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وحدت افکار کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

یعنی ملت نام ہے لا الہٰ کے اقرار اور آنکھوں کی کثرت کے باوجود وحدت نگاہ کا، اہل حق کے دعوی اور دلیل میں یکسانیت ہوتی ہے، گو ان کے جسم جدا جدا ہوتے ہیں،

رسالت ہے، وہی خدا کے دین کو عملی شکل میں پیش کرتی ہے، اس لیے توحید کے بعد اسلام [illegible] رکن رسالت ہے، اسی سے ملت اسلامیہ وجود میں آئی، اور اس کے پیکر میں [illegible]، اسی سے اس کا دین آئین بنا، اس کی لائی ہوئی کتاب مومن کی قوت کا سرچشمہ [illegible] اس کی حکمت ملت کے لیے رگ جاں ہے، اسی کے نفس گرم کی تاثیر سے اس میں زندگی کی روح اور اس کے افراد [illegible] معتقدات اور مقصد و مدعا میں وحدت و یک رنگی پیدا ہوئی، اور ملت نے نبی سے دین فطرت سیکھ کر دنیا کی شب تار میں حق کی شمع روشن کی، دنیا کی ہر کثرت وحدت کی بنیاد پر زندہ ہے، ملت اسلامیہ کی وحدت کی بنیاد دین فطرت پر ہے، جب تک یہ وحدت قائم ہے، اس کی ہستی نہیں مٹ سکتی۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید ۔۔۔ وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

از رسالت در جہاں تکوینِ ما ۔۔۔ از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزار ما یک است ۔۔۔ جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم ۔۔۔ اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

قلبِ مومن را کتابش قوت است ۔۔۔ حکمتش حبل الورید ملت است

زندگیِ قوم از دمِ او یافت است ۔۔۔ ایں سحر از آفتابش روشن است

[illegible]سالت ہم نوا گشتیم ما ۔۔۔ ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

[illegible]ن فطرت از نبی آموختیم ۔۔۔ در رہِ حق مشعلے افروختیم

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است ۔۔۔ وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود

ہستیِ ما تا ابد ہمدم شود (رموزِ بیخودی)

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ اوست
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ اوست

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زور طوفانش بدرد

عالمے در آتشِ او مثلِ خس
ایں ہمہ ہنگامہ لا بود و بس

اندریں دیرِ کہن ہیہم تپید
تا جہانے تازۂ آمد پدید

بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست
ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

یعنی توحید نے مسلمانوں میں وہ قوت پیدا کر دی کہ ان کی ایک ضرب سے لات و منات ریزہ ریزہ ہو گئے، اور وہ دنیا میں رہ کر بند جہات سے آزاد ہو گئے، ہر پرانی اور فرسودہ قبا کو انھوں نے چاک کر دیا اور قیصر و کسریٰ کی شہنشاہی کو مٹا دیا، دشت و صحرا ان کے برق و باران کی ہیبت اور سمندر ان کے زور طوفان سے لرز اٹھے، ایک عالم ان کی آتشِ سوزان کے مقابلہ میں خس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور یہ سارا انقلاب و ہنگامہ صرف کلمۂ توحید کا نتیجہ تھا، اس دیر کہن میں اپنی جانکاہی اور تڑپ سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا، حق کا آوازہ ان کی سحر خیزی اور دعائے صبح گاہی کا اور دنیا میں جو خیر نظر آتا ہے، ان کی تخم ریزی کا نتیجہ ہے، انھوں نے غیر اللہ کا نقش دل سے مٹا دیا، اس سے ان کی کفِ خاک سے سیکڑوں انقلاب برپا ہو گئے۔

دوسرا رکن رسالت | اللہ تعالیٰ کی قوت تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، لیکن انسانوں نے اس کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ پہچانا، اور جنھوں نے انبیاءؑ کے وسیلہ کے بغیر پہچاننے کی کوشش کی، انھوں نے ٹھوکر کھائی یا متحیر ہو کر خدا کا انکار کر بیٹھے، یا کائنات کی تمام قوتوں کو خدا مان لیا، یا فلسفیانہ خیالات میں الجھ کر رہ گئے، اس لیے خداشناسی کا صحیح وسیلہ

نیا انقلاب برپا کرتا ہے، وہ اللہ بس باقی ہوس کا درس دیتا ہے، تاکہ خدا کا پابند پھر کسی کے دام میں نہ آسکے، اس کی حکمت کا درجہ عقل و فن سے کہیں بلند ہے، اس کی تعلیم کے اثر سے ایک امت کا ظہور ہوتا ہے، اس کی آہ صبح گاہی سے زندگی پیدا ہوتی ہے، اور اس کی نمود سے کائنات میں جان پڑتی ہے، اس کی نگاہ انقلاب کی پیامبر ہوتی ہے اس کے زور طوفان سے بحر و بر میں زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ "لا خوف علیہم" کے درس سے بنی آدم کے سینہ میں دل زندہ کر دیتا ہے، اور ایسا سحر کرتا ہے کہ روح کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے، اس کی صحبت خزف ریزوں کو موتی بنا دیتی ہے، اور اس کی حکمت ہر خلا کو پر کر دیتی ہے۔

ملت اسلامیہ کا وجود ایک آئین سے وابستہ ہے اور وہ قرآن مجید ہے

ملت اسلامیہ کی ہستی ایک آئین سے وابستہ ہے، دین کی اصل روح اور دنیا میں مسلمانوں کے استحکام اور ان کی سربلندی کا راز یہی آئین ہے، یہ آئین زندۂ جاوید کتاب قرآن حکیم ہے، اس کی حکمت لازوال ہے، وہ انسانوں کی حیات کا ایک نسخہ ہے، اس کی قوت سے ناپائیدار انسانوں کو زندگی ملتی ہے، وہ پوری نوع انسانی کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے اور حامل قرآن کی ذات گرامی سارے عالم کے لیے رحمت ہے، اس کتاب کے ذریعہ پست اور ذلیل انسان بلند و برتر ہو جاتا ہے وہ خدا کے سجدہ سے انسان کو اتنا بلند کر دیتا ہے کہ پھر اس کا سر کسی کے سامنے نہیں جھکتا، اس پر عمل کے طفیل میں جو قوم رہزن تھی، دنیا کی رہبر اور ایک کتاب سے صاحب دفتر بن گئی، آج مسلمانوں نے رسم و رواج کو دین بنا لیا ہے، اور کافروں کے طور طریقے اختیار کر لیے ہیں، اگر وہ مسلمان رہ کر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو قرآن پر عمل کیے بغیر ممکن نہیں۔

نبوت کی اہمیت | دنیا کی ہر قوم میں مصلحین، مجددین اور صلحاء و اخیار پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اپنے دور میں اپنی قوم کی بعض جزوی اصلاحیں کیں، مگر ان کی حیثیت ایک شعلہ سے زیادہ نہ تھی، جو عارضی چمک دکھا کر بجھ گیا، اور اب ان کا نام صرف تاریخوں میں ملتا ہے، ان کی اصلاحات کا کہیں وجود باقی نہیں ہے، ہمہ گیر اور دیرپا انقلاب صرف انبیاء علیہم السلام کا حصہ رہا ہے، اور آج دنیا میں اخلاق و روحانیت اور خیر و صلاح کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے، وہ صرف انہی نفوس قدسیہ کا فیض ہے، نبی خدا کا پیامبر ہوتا ہے، اس کی نصرت و حمایت اس کے ساتھ ہوتی ہے، اس لیے وہ جیسا ہمہ گیر اور دیرپا انقلاب برپا کرتا ہے، وہ تنہا طاقت بشری سے ممکن نہیں ہے، اقبال نے نبوت کی اس اہمیت کو ان الفاظ میں دکھایا ہے:-

تا نبوت حکم حق جاری کند | پشت پا بر حکم سلطانی زند
پختہ سازد صحبتش ہر خام را | تازہ غوغائے دہد ایام را
درس او اللّٰہ بس باقی ہوس | تا نیفتد بندِ حق در بندِ کس
حکمتش برتر ز عقلِ ذو فنون | از ضمیرش امتے آید بروں
اندر آہ صبح گاہی او حیات | در نگاہِ او پیامِ انقلاب
درس لاخوفٌ علیہم می دہد | تا دلے در سینۂ آدم نہد
من نمی دانم چہ افسوں می کند | روح را در تن دگرگوں می کند
صحبت او ہر خزف را دُر کند | حکمت او ہر تہی را پُر کند
(مسافر)

یعنی نبی جب خدا کا حکم جاری کرتا ہے تو دنیاوی بادشاہوں اور حکمرانوں کو پیروں سے مسل ڈالتا ہے، اس کی صحبت ہر خام کو پختہ بنا دیتی ہے، وہ زمانہ میں ایک

حاصل ہے، اسلامی حکومت کا کام صرف قانون الٰہی کا نفاذ ہے، اقبال نے اس کی یہ حکیمانہ توجیہ کی ہے، جو حقیقت بھی ہے کہ انسانی عقل محدود اور انسانی فطرت خود غرض واقع ہوئی ہے، وہ انسانوں کی حال و مستقبل کی تمام ضروریات کا ادراک نہیں کر سکتی، اس لیے ایسا جامع قانون نہیں بنا سکتی جو ان کی جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہو، اس لیے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ انسان کی فطرت خود غرض ہے، اس لیے اسکے قوانین بھی خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں، ہر قوم اپنے مفاد کے مطابق قانون بناتی ہے، اس کو دوسرے انسانوں کے فائدے اور نقصان سے کوئی بحث نہیں ہوتی بعض مذاہب میں تو ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کیلیے الگ الگ قوانین ہوتے تھے جس کی زندہ مثال ہندوستان ہے، آزادی اور جمہوریت کے اس دور میں بھی بین الاقوامی معاملات میں قانون کی نہیں، بلکہ طاقت کی حکومت ہے۔ اور طاقتور خود غرض قوموں کے ہاتھوں بین الاقوامی قوانین اور اس کی مجالس کا جو حشر ہو رہا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، پھر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف دنیاوی معاملات تک محدود ہوتے ہیں، ان کو اخلاقی و روحانی ضروریات سے کوئی بحث نہیں ہوتی،

مگر اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور سمیع و بصیر بھی، اس کی نظر حال و مستقبل سب پر ہے، اس کی نگاہ میں سارے انسان برابر ہیں، اس لیے وہی ایسا قانون بنا سکتا ہے، جو تمام انسانوں کے لیے منصفانہ بھی ہو اور ان کی جملہ ضروریات پر حاوی بھی، اس قانون کی بنیاد وحی پر ہے، جس کا نام شریعت ہے، اور اس کی قوتِ نافذہ کا نام حکومتِ الٰہیہ ہے۔

ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس
باطنِ دینِ نبی این است و بس

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست
زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد حیات

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ

اوج می گیرد از و نا ارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سربلند

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند
از کتابے صاحبِ دفتر شدند

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو
شیوہ ہائے کافری زندانِ تو

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(رموزِ بیخودی)

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دہد ما را پیامِ لاتخف
می رساند بر مقامِ لاتخف

قوتِ سلطان و میر از لاالٰہ
ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ

تا دو تیغِ لا و الا داشتیم
ماسوا اللہ را نشاں نگذاشتیم

اگر دنیا میں ثبات چاہتے ہو تو قرآن سے فائدہ اٹھاؤ، اس میں آبِ حیات پوشیدہ ہے، وہ مسلمانوں کو لاتخف کا پیام دیکر ساری دنیا سے بے خوف کر دیتا ہے، سلاطین و امرا کی قوت اور مردِ فقیر دونوں کی ہیبت کا سرچشمہ لا الٰہ ہے، جب تک ہمارے ہاتھ میں لا و الا کی تلواریں رہیں ہم نے ماسویٰ اللہ کا نام و نشان مٹا دیا۔

شریعتِ اسلامیہ | اسلام میں اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کو اقتدارِ اعلیٰ

ہے کہ انسان حلال وحرام میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔ اور
در ہو جاتی ہے، اگر دنیا کے لوگ اس کی حرام کی ہوئی
تک اس کا نظام مستحکم ہو جائے، اس کے احکام عدل و
ہیں، اور اس کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
سکے اس کے حکم سے سرتابی نہ کرو تاکہ دوسرے تمہارے
ت کے ذریعہ احسن التقویم اور حضرت ابراہیمؑ کے

حیات | روشن از نورش ظلامِ کائنات
احرام | تا قیامت پختہ ماند این نظام
ضاست | بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰ است
پیچ | تا نہ پیچد گردن از حکم تو ہیچ
یم شو | وارثِ ایمانِ ابراہیمؑ شو

(مسافر)

سلامیہ کی حقیقت اور اس کے حکم و مصالح کو ان الفاظ

جہ مجو | غیر ضو در باطنِ گوہر مجو
است | ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
نیست | اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
یقیں | پختہ تر از وے مقاماتِ یقیں
سام | از نظامے محکمے خیزد دوام

بندۂ حق مرد آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

عقلِ خود بیں غافل از بہبود غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سود غیر

وحیِ حق بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

غیر حق چوں ناہی و آمر شود
زور ور بر ناتواں قاہر شود

(جاوید نامہ)

ایک دوسرے موقع پر ایک اور حکیمانہ توجیہ کی ہے کہ خود غرضی کی بنا پر انسان میں اپنے حقیقی نفع و نقصان کا احساس بہت کم ہوتا ہے، وہ اچھے برے کاموں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ انقلاب کے ہنگامے سے ڈرتا ہے، آقا غریب مزدور کی روزی پر قبضہ کر لیتا اور اس کی عزت و آبرو تک اتار لیتا ہے، اس کے ظلم و ستم سے غریب مزدور نالاں ہیں ان کے جام و سبو بادۂ عیش و مسرت سے خالی ہیں، انھوں نے دوسروں کے لیے بڑے بڑے محل تعمیر کیے ہیں، مگر خود گلی گلی کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

کس نداند زشت و خوب کار چیست
جادہ ہموار و ناہموار چیست

در نگاہش ناصواب آمد صواب
ترسد از ہنگامہائے انقلاب

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد
آبروے دخترِ مزدور برد

در حضورش بندہ می نالد چو نے
بر لبِ او نالہائے پے بہ پے

نے بجامش بادہ و نے در سبو
کاخہا تعمیر کرد و خود بکو

اس کے مقابلہ میں شریعت اسلامیہ دل کی گہرائی سے ابھرتی ہے، اور ایسا

جو گرے ہوئے پست و پامال کو آسمان کا ہم دوش اور اپنی جلا سے لوہے میں پیوست زنگ کو دور اور پتھر کو آئینہ بنا دیتی ہے۔

خدا کا یہ آخری پیغام تنہا مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کی ساری قوموں کے لیے تھا، اس کی دعوت عام تھی، اس کا مقصد پورے عالمِ انسانیت کی اصلاح تھی، اسلیے ملت اسلامیہ اس پیام کی حامل و مبلغ قرار پائی، اور جس طرح اسلام پر خدا نے سلسلۂ ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ کر دیا، اسی طرح دنیا کی ہدایت و رہنمائی کا منصب مسلمانوں کے سپرد کرکے ہمیشہ کے لیے نئی ملتوں کا خاتمہ کر دیا، اور اب خدا کے کسی نئے پیغام کی حامل کوئی قوم پیدا نہ ہوگی۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را اُو رسل را ختم و ما اقوام را

خدمت ساقی گری با ما گذاشت داد ما را آخریں جامے کہ داشت

مسلم از مینائے حق صہبا کشد نعرۂ "لا قوم بعدی" می زند

(رموزِ بیخودی)

اس انقلاب انگیز پیغام کے نتائج اسلام کے ظہور کے وقت ساری دنیا ظلمت کدہ تھی، توحید و خدا شناسی کا نام مٹ چکا تھا، اشرف المخلوقات کی جبین نیاز شجر و حجر تک کے سامنے سجدہ ریز تھی، اخلاق و روحانیت کی شمعیں گل ہو چکی تھیں، اگر کسی راہب کی جھونپڑی میں کوئی چراغ ٹمٹماتا تھا تو دوسروں کو روشنی پہنچانے سے قاصر تھا، عدل و انصاف ختم ہو چکا تھا، دنیا میں صرف قوت اور ظلم کی حکومت تھی، خدا کی مخلوق نسل و نسب اور دولت و غربت کے اعتبار سے ادنیٰ و اعلیٰ طبقوں میں بٹی ہوئی تھی، ہر ادنیٰ اور کمزور اپنے سے اعلیٰ اور طاقتور طبقہ کا غلام تھا، فسق و فجور کی گرم بازاری تھی، اسلام

قدرت اندر علم او پیدا استے — ہم عصا و ہم ید بیضا ستے

با تو گویم سرِّ اسلام است شرع — شرع آغاز است و انجام است شرع

شارعِ آئین شناسِ خوب و زشت — بہر تو یک نسخۂ قدرت نوشت

از عمل آہن عصب می سازدت — جائے خوبے در جہاں اندازدت

خستہ باشی استوارت می کند — پختہ مثل کوہسارت می کند

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات — شرع او تفسیر آئینِ حیات

گر زمینی آسماں سازد ترا — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را — از دل آہن رباید زنگ را

(رموز بیخودی)

یعنی شریعت کا ظاہر و باطن ایک ہے، گوہر کی طرح شریعت کے ظاہر و باطن میں صرف روشنی ہی روشنی ہے۔ اس گوہر کا جوہری خود خدائے قدوس ہے، اس کا ظاہر بھی گوہر تاب ہے اور باطن بھی، علم حق، شریعت کے سوا اور کوئی چیز نہیں، اور سنت رسول صرف آپ کی محبت و اتباع کا نام ہے، شریعت ہی یقین کا ذریعہ ہے، اسی سے ایمان و یقین میں پختگی آتی ہے، ملت اسلامیہ میں اسی آئین حق سے نظام قائم ہوتا ہے، اور ایک محکم نظام ہی سے اس کو استحکام و دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علم میں یہ قدرت ہے کہ وہ عصائے موسیٰ بھی ہے اور ید بیضا بھی، اسلام کا راز صرف شریعت میں پوشیدہ ہے، اس کی ابتدا و انتہا سب شریعت ہے، خوب و زشت اور خیر و شر کے آئین شناس نے مسلمانوں کے لیے یہ نسخہ لکھا ہے، اس پر عمل اعصاب کو فولاد بنا دیتا ہے اور دنیا میں سربلند کرتا ہے، کمزور کو طاقتور، اور پہاڑ کی طرح مضبوط کر دیتا ہے، دین مصطفیٰ ایک حیات بخش دین ہے اور اس کی شریعت اس آئین حیات کی تفسیر ہے،

حمد بے حد مر رسولِؐ پاک را		آنکہ ایمان داد مشتِ خاک را

خدا نے توحید کا رمز کس کو سکھایا اور سب سے پہلے یہ چراغ کہاں روشن کیا، علم و حکمت کس کے دسترخوان کا ریزہ ہے، "آیۂ فاصبحتم" کس کی شان میں نازل ہوئی ہے، اسی لقب کی آبیاری سے ریگستان عرب میں لالہ کا چمن کھل گیا، آزادی و حریت آپ کے آغوش کی پروردہ ہے، آج جس انسانی آزادی کی صدا بلند ہے وہ بہت پہلے عرب میں بلند ہو چکی ہے، آپ نے آدم کے پیکر میں ایک نیا دل رکھ دیا اور اسکے جمال کی پردہ کشائی کی، پرانے سارے دیوتاؤں کا طلسم توڑ دیا، خشک پرانی شاخوں میں غنچے پھوٹنے لگے، علم و حکمت، دین و شریعت، نظم و انتظام، الحمراء و تاج جیسی عمارتیں جو قدسیوں سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں، ان کی سیکڑوں تجلیوں میں سے ایک تجلی ہیں، یہ دلفریب جلوے تو اس کا ظاہر ہیں، اس کا باطن عارفوں کی نگاہ سے بھی پوشیدہ ہے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر ابوجہل کے نوحہ میں نظر آتی ہے، وہ حرم کعبہ میں فریاد کرتا ہے:

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ		از دمِ اُو کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود		نوجوانان را ز دستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است		این دو حرف لا الٰہ خود کافری است
پاش پاش از ضربتش لات و مناۃ		انتقام از وے بگیر اے کائنات
دل بغائب بست و از حاضر گسست		نقشِ حاضر را فسونِ اُو شکست
دیدہ بر غائب فروبستن خطاست		آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست

ان سب کے خلاف اعلان جنگ تھا، اس کا مقصد توحید و خدا شناسی اور اخلاق و روحانیت کا احیاء، عدل و مساوات اور انسانی شرف و عظمت کا قیام تھا۔ اسلام کی سحر آفرینی نے چند برسوں کے اندر گمراہ انسانوں کی کایا پلٹ دی، اس کے ابر کرم سے انسانیت کی سوکھی کھیتی ہری ہو گئی، اس نے نہ صرف دینی و اخلاقی حیثیت سے انسانیت کی اصلاح کی، بلکہ اس کو تہذیب و تمدن کا بھی سبق پڑھایا اور امت اسلامیہ پوری دنیا کی معلم و امام بن گئی، اور اس کو علم و عرفان کے نور سے معمور کر دیا، اقبال نے اسلام کے برپا کیے ہوئے اس انقلاب اور دنیا میں اس کی برکتوں کو متعدد نظموں میں بیان کیا ہے، بعض نظموں کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ایک نظم میں عربوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

رمز الا اللہ کرا آموختند ۔۔۔ ایں چراغ اول کجا افروختند
علم و حکمت، ریزۂ از خوان کیست ۔۔۔ آیۂ فاصبحتم اندر شان کیست
از دم سیراب آں امی لقب ۔۔۔ لالہ رست از ریگ صحرائے عرب
حریت پرورده آغوش اوست ۔۔۔ یعنی امروز امم از دوش اوست
او دلے در پیکر آدم نہاد ۔۔۔ او نقاب از طلعت آدم کشاد
ہر خداوند کہن را او شکست ۔۔۔ ہر کہن شاخ از نم او غنچہ گشت
علم و حکمت، شرع و دیں، نظم امور ۔۔۔ اندرون سینہ دلہا ناصبور
حسن عالم سوز الحمرا و تاج ۔۔۔ آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست ۔۔۔ یک تجلی از تجلیات اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز ۔۔۔ باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

انہراسلام کی قدر نہ پہچانی اور حبشہ کے وحشیوں کو سرچڑھایا، کالے کلوٹوں اور سرخ وسپید کو برابر کرکے اونچے خاندانوں کی آبرو برباد کی، یہ مساوات و اخوت تو سراسر عجمی ہے، سلمان تو مزدکی ہے، ابن عبداللہ نے اس کے فریب میں آکر عربوں میں حشر برپا کر دیا، عجمی شرف نسب میں عرب کو کہاں پہنچ سکتے ہیں، کج مج زبانوں میں سحبان کی طلاقت لسانی کہاں سے آسکتی ہے۔ اے ہبل اے اپنے بندوں کی معذرت قبول کرنے والے ان لاندہبوں سے اپنا گھر چھین لے، اے مناۃ! اے لات! اس گھر سے نہ نکلو، اور اگر گھر سے نکلتے ہو تو دلوں سے نہ نکلو۔

اگرچہ اس نوحہ میں اسلام کی اہم انقلابی تعلیمات آگئی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ اس کا سب سے جامع مرقع مولانا حالی نے دکھایا ہے۔ اس موقع پر اس کو نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی　　　پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی　　　جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا　　　ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا　　　ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا

زمانے میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں　　　پڑی کھلبلی کفر کی سرحدوں میں

خم شدن پیش خدائے بے جہات | بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰۃ
مذہب او قاطع ملک و نسب | از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست | با غلام خویش بر یک خوان نشست
قدر احرار عرب نشناختہ | با کلفتان حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند | آبروے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمیست | خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است
ابن عبد اللہ فریبش خوردہ است | رستخیزے بر عرب آوردہ است
اعجمی را اصل عدنانی کجاست | گنگ را گفتار سحبانی کجاست
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر | خانہ خود را ز بے کیشاں بگیر
اے مناۃ اے لات ازیں منزل مرو | گر ز منزل می روی از دل مرو

یعنی ہمارا سینہ محمد کی وجہ سے داغ داغ ہے، انھوں نے کعبہ کا چراغ گل کر دیا، قیصر کسریٰ کی ہلاکت کی صدا بلند کی ہائے نوجوانوں کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا، وہ ساحر ہیں، انکی باتوں میں ساحری ہے، کلمۂ لا الہ خود کافری ہے، ان کی ضرب سے لاۃ و مناۃ پاش پاش ہوگئے، کائنات اس کا انتقام لے، دلوں کا رشتہ حاضر سے توڑ کر غائب سے جوڑا، ان کے افسوں نے حاضر کا نقش توڑ دیا، غائب سے دل لگانا بہت بڑی غلطی ہے، جو چیز دکھنے میں نہ آئے اس کا وجود کہاں ؟ خدائے بے جہات کے سامنے سر جھکانے سے کیا حاصل، ایسی نماز سے کوئی ذوق پیدا نہیں ہو سکتا، ان کا مذہب ملک و نسب کا قاطع اور قریش اور عرب کی فضیلت کا منکر ہے، ان کی نگاہ میں ادنیٰ و اعلیٰ سب ایک ہیں، وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھکر کھانا کھاتے ہیں، افسوس انھوں نے عرب کے

کُلّ مَولُودٍ یُولَدُ عَلَی الفِطرَۃِ (الحدیث) کامفہوم

(علامہ ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کا ایک ورق)

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

دوسرا مفہوم دوسری جماعت کے نزدیک فطرت سے اسلام مراد ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ علمائے سلف سے اس کی یہی توجیہ مشہور و معروف ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد (فِطرَۃَ اللہِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیھَا) کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس میں "فطرۃ اللہ" سے دین اللہ یعنی الاسلام مراد ہے، خود راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے اس کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ (اقرؤا ان شئتم فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا) عکرمہ، مجاہد، حسن، ابراہیم، ضحاک، اور قتادہ رحمھم اللہ سے اس کی یہی تاویل منقول ہے، نیز ان حضرات نے (لا تبدیل لخلق اللہ) کی تفسیر لا تَبدِیلَ لِدِینِ اللہ سے کی ہے،

ان لوگوں نے اپنی رائے کے ثبوت میں عیاض بن حماد مجاشعی کی وہ حدیث بھی پیش کی ہے، جو اوپر گذری ہے کہ آپ نے فرمایا،

(الا احدثکم بما حدثنی اللہ فی الکتاب ان اللہ خلق آدم و بنیہ

ہوئی آتش افسردہ آتشکدوں میں لگی خاک سی اڑنی سب معبدوں میں

ہوا کعبہ آباد سب گھر اجڑ کر
جمے ایک جا سارے دنگل بچھڑ کر

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں نے کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریے کو یوناں بنایا مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانہ کو خواب گراں سے

ہر اک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں مہیا کیے سب کے راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں انھیں کر دیا رشک صحن گلستاں

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

(باقی)

عرب نرعی اللہ فی اموالنا　　حق الزکوٰۃ منزلاً تنزیلا

(ترجمہ) "اے خدائے رحمان کے خلیفہ! ہم حنفاء (مسلمانوں) کی جماعت ہیں، جو صبح و شام خدا کی عبادت کرتے ہیں، اور ہم عربی ہیں، جو اپنے مالوں میں زکوٰۃ کو برحق اور منزل من اللہ فریضہ سمجھتے ہیں"

حضرت ابراہیمؑ کو حنیف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد اور قوم کے معبودوں سے برگشتہ ہو کر خدائے واحد کی عبادت اور بندگی کی طرف یکسو ہو کر مائل ہو گئے تھے، کیونکہ "حنف" کے اصلی معنی میل ہی کے ہیں،

فطرت سے اسلام مراد لینے والوں کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے،

خمس من الفطرۃ فذکر	پانچ چیزیں امور فطرت میں شامل
منھن قص الشوارب و	ہیں، پھر آپ نے اس سلسلہ میں
الاختتان[۱]	مونچھیں کاٹنے اور ختنہ کرانے کا
	ذکر کیا،

کیونکہ یہ سب امور اسلام کے سنن و آداب میں داخل ہیں:۔

جن لوگوں نے فطرت سے اسلام مراد لیا ہے، ان میں حضرت ابوہریرہؓ اور ابن شہاب زہری بھی ہیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک ایسے آدمی کے متعلق جس پر ایک مومن غلام آزاد کرنا لازم تھا پوچھا گیا کہ کیا ایک دودھ پینے والے بچے کو آزاد کر دینا کافی ہوگا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ہاں کافی ہو جائے گا، اس لئے کہ وہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوا ہے،[۲] اس

---

[۱] یہ حدیث صحیحین اور مسند احمد وغیرہ میں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ وارد ہے، بعض روایتوں میں خمس (پانچ) کے بجائے عشر (دس) چیزوں کو خصائل فطرت میں گنایا گیا ہے، [۲] زہری سے یہاں تک

حُنفاء مُسلمین)

یہ ایک طویل حدیث ہے، متعدد لوگوں نے اُس کی روایت کی ہے لیکن اکثر روایتوں میں صرف "حنفاء" کا لفظ ہے، اور "مسلمین" کا ذکر نہیں ہے[1]

اہلِ تفسیر نے حنفاء کی مختلف تفسیریں کی ہیں، لیکن درحقیقت یہ صرف لفظی اختلاف ہے ورنہ سب کا ماحصل یہ ہے کہ حنیفیت سے مراد اسلام ہے، اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ

ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مُسلمًا. (آل عمران ۶۷)	ابراہیم یہودی اور نصرانی نہیں تھا، بلکہ حنیف (سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور خدائے تعالیٰ کا) حکم بردار تھا،

دوسری جگہ فرمایا:-

ھو سماکم المسلمین، (حج - ۸۰)	اسی (اللہ یا ابراہیمؑ) نے تم لوگوں کا نام مسلمان (تابعدار) رکھا؛

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے "حنفاء مسلمین" کی روایت کی ہے وہ بھی درست ہے، اس پر رد و انکار کے کوئی معنی نہیں، راعی کا شعر ہے:-

أخلیفة الرّحمٰن انّا معشر　　حنفاء نسجد بکرۃ واصیلا

---

[1] علامہ ابن عبد البر نے اس موقع پر اس حدیث کے متعلق طویل فنی بحث کی ہے، اور دونوں قسم کی روایتوں کو صحیح قرار دیا ہے

کے معنی بدأت کے ہوئے، جیسا کہ اس آیت میں ہے،

کما بدأکم تعودون فریقاً ھدیٰ وفریقاً حق علیھم الضلالۃ،	اللہ نے جیسا تمہارا آغاز کیا ہے، ویسے ہی دوبارہ پلٹو گے، ایک فرقہ کو ہدایت کی، اور ایک فرقہ پر ضلالت مقرر کی،

(اعراف، ۲۹)

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں فرماتے تھے،

اللھم جبار القلوب علی فطرتھا شقیھا وسعیدھا.	اے دلوں کو اُس کی ابتدا، یعنی شقاوت وسعادت پر مجبور کرنے والے خداوند!

اس معنی کی رو سے حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ شقاوت وسعادت میں سے جس چیز پر اللہ نے بچے کی ابتدا کی ہے، اسی پر وہ پیدا ہوتا ہے، ابوعبد اللہ محمد بن نصر مروزی کا بیان ہے کہ امام احمد بھی پہلے اسی کے قائل تھے، مگر بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کرلیا تھا،[1] موسیٰ بن عبیدہ کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن کعب سے (کما بدأکم تعودون الخ) کی یہ تشریح سُنی ہے کہ

---

[1] علامہ ابن قیم نے امام احمد سے اس بارہ میں تین روایتیں نقل کی ہیں، (۱) اس سے معرفت الٰہی کا اقرار اور وہ عہد مراد ہے جو اللہ نے بنی آدم سے اُن کی اولین تخلیق کے موقع پر لیا تھا، ہر بچہ اسی اقرار اول پر پیدا ہوتا ہے، (۲) دوسری روایت کے مطابق اس سے مراد شکم مادر میں انسان کی ابتدا خلقت ہے، علی بن سعید نے امام صاحب سے "کل مولود یولد" کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ شقاوت وسعادت پر بچے کی تخلیق ہوتی ہے، (۳) امام صاحب سے تیسرا قول توقف

قول کے مطابق حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ بچہ کفر و شرک سے بالکل محفوظ و مصئون اور روز ازل کے میثاق کے مطابق مومن و مسلم پیدا ہوتا ہے،

ہمارے نزدیک فطرت سے اسلام مراد لینا صحیح نہیں ہے[1] اس لئے کہ ایمان و اسلام درحقیقت قلب کے اعتقاد و اذعان زبان کے اقرار اور اعضاء و جوارح کے عمل و فعل کا نام ہے، لہذا ایک بچے کے اندر یہ صلاحیت بالکل معدوم ہوتی ہے،

فطرت کا تیسرا مفہوم کچھ لوگوں نے فطرت کے معنی بدائت (آغاز، ابتداء) کے لئے ہیں[2]، ان کے نزدیک بچہ اس بدائت پر پیدا ہوتا ہے جس کو اول اول اللہ نے اس کے لئے مقرر کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کے لئے ابتداء ہی میں شقاوت و سعادت، موت و حیات اور اس چیز کو جس کو وہ آئندہ اختیار کرنے والی ہے متعین کر دیتا ہے، اور جس چیز پر اس کی ابتداء کر دی گئی ہے، اس سے اس کو کوئی مفر نہیں،

کلام عرب میں فطرت بدائت کو اور فاطر بدی، و مبتدی کو کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مجھے فاطر السمٰوات والارض کے معنی اس وقت معلوم ہوئے جب دو بدو ایک کنوئیں کے بارے میں جھگڑا کرتے ہوئے میرے پاس آئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ انا فطرتھا ای ابتدأتھا (میں نے اس کو پہلے کھودا اور بنایا تھا) پس فطرت

(بقیہ حاشیہ ص) منقول ہے کہ ہر بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس لئے کہ وہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوا ہے (فتح الباری ج ۳ ص ۲۹۰) وشفاء العلیل ص ۲۸۵، [1] علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک فطرت سے اسلام مراد ہے، اور انھوں نے علامہ ابن عبدالبر کے مفہوم کی پرزور تردید کی ہے، (شفاء العلیل ص) [2] امام خطابی اور علامہ ابن قتیبہ نے اسی معنی کو مرجح قرار دیا ہے (معالم السنن ج ۴ ص ۳۲۷ و تاویل مختلف الحدیث ص ۱۵۹)

اس کے مقابلہ میں ساحرین مصر کی تخلیق کی ابتدا رہدایت پر ہوئی تھی، اورگو انھوں نے ضلالت کے کام کئے مگر آخر میں اللہ نے ان کو ہدایت وسعادت کی توفیق عطا فرمائی، اور وہ مومن ہو کر مرے، "کما بدأکم تعودون" کا یہ مفہوم متعدد کبار تابعین سے مروی ہے،

فطرت کا یہ مفہوم بیان کرنے والے اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ

عن ابی محمد رجل من اھل	مدینہ کے ایک شخص ابو محمد نے بیان
المدینۃ قال سألت عمر	کیا کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب
بن الخطاب عن قولہ عزوجل	سے واذ اخذ ربک الخ کے متعلق
(واذ اخذ ربک من بنی	سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ جس طرح
آدم الخ) فقال سألت رسول	تم نے مجھ سے اس کے متعلق سوال
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کیا ہے، اسی طرح میں نے بھی رسول
کما سألتنی فقال: خلق	اللہ سے اس کے بارہ میں سوال
اللہ آدم بیدہ ونفخ فیہ	کیا تھا، توآپ نے فرمایا کہ اللہ
من روحہ ثم اجلسہ	نے حضرت آدم کو پیدا کیا، اور
ومسح ظھرہ فاخرج منہ	اُن کے اندر اپنی روح پھونکی پھر
ذروا قال ذرو ذرأتھم	اُن کو بٹھایا، اور اُن کی پشت

[1] یہ حدیث حضرت عمرؓ کے علاوہ، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عائشہؓ، انس بن مالکؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، عبادہ بن صامتؓ وغیرہ مشاہیر صحابہؓ اور بعض غیر مشاہیر صحابہ سے مروی ہے،

(شفا، ص ۱۰)

"اللہ نے جس شخص کی خلقت کی ابتدا ضلالت پر کی ہے وہ بالآخر ضلالت ہی کی طرف جائے گا، خواہ وہ ہدایت ہی کے کام کیوں نہ کرے، اور جس کی تخلیق کی ابتدا ہدایت پر کی ہے، اُس کو (آخر کار) اللہ ہدایت کی جانب لے جائے گا، خواہ وہ ضلالت ہی کے کام کیوں نہ کرے"

چنانچہ ابلیس کی خلقت کی ابتدا ضلالت پر کی گئی تھی، اور باوجود یکہ اُس نے دوسرے ملائکہ کی طرح نیکی کے کام کئے تھے لیکن بالآخر وہ ضلالت کی جانب پھیر دیا گیا، کیونکہ اسی پر ابتداءً اس کی تخلیق ہوئی تھی، اسی لئے اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ :-

وکان من الکافرین ،

(بقرہ - ۳۴) اور وہ ابلیس کافروں میں سے تھا

(بقیہ حاشیہ ص سابق) کا مروی ہے ،

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور خود حافظ ابن قیم کا رجحان یہ ہے کہ امام احمد کے نزدیک فطرت سے دینِ اسلام مراد ہے ، گویا یہ وہی بات ہے جس کا پہلی روایت میں ذکر ہے، اور اگر اس سے مختلف بات ہے تو امام صاحب کی اس سلسلہ میں چار روایتیں ہو جائیں گی ،

اس سلسلہ میں امام ابن قیم نے ایک لطیف نکتہ کی نشاندہی کی ہے ، وہ فرماتے ہیں :-

فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس میں محض بچوں کے دنیا کے احکام کا ذکر ہے، اور والدین کی فطرت میں تبدیلی کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے ، درست نہیں ہے ، یہ بات حدیث کے منشاء و مدلول کے بالکل خلاف ہے کیونکہ آپ نے والدین کی بچوں کی تکفیر کو جدع بہائم کے مشابہ قرار دیا ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک تغیر دوسری تغیر کے مماثل ہے ، (شفاء العلیل) ص ۲۹۶)

مطلب یہ ہے کہ آیندہ وہ مومن و کافر ہوں گے. جیسا کہ اُن کے متعلق اللہ کا سابق علم ہے
اسی طرح (خلقت ھٰؤلاء للجنۃ وخلقت ھٰؤلاء للنار) سے بجز لوگوں
کے خاتمہ کے اور کسی بات کا ثبوت نہیں ملتا، پہلے ہم تحریر کر چکے ہیں کہ طفولیت کے زمانہ
میں بچہ جنت یا دوزخ کے استحقاق کے لائق یا کفر و ایمان کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا،

چوتھا مفہوم | ایک جماعت کے نزدیک (کُلّ مولود یولد علی الفطرۃ) کا مفہوم
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو کفر و ایمان اور معرفت وانکار پر پیدا کیا ہے، چنانچہ ذریت
آدم سے اس کی پیدایش ہی کے وقت اس کا عہد لیا گیا تھا کہ

الست بربکم،	کیا میں تم لوگوں کا رب نہیں
(اعراف)	ہوں،

تو لوگوں نے جواب میں بلےٰ کہا یعنی کیوں نہیں؟ بیشک تو ہمارا رب ہے، لیکن
اہلِ سعادت نے طوعاً اور اہلِ شقاوت نے کرہاً (بلیٰ) کہا تھا، جیسا کہ اس آیت سے
معلوم ہوتا ہے،

ولہ اسلم من فی السّمٰوات	اور اسی کے حکم میں خوشی یا لاچاری
والارض طوعاً وکرھا،	سے ہے، جو آسمانوں اور زمین میں
(آل عمران ۸۳)	ہے،

اور یہی بات (کما بدأکم تعودون) میں بھی کہی گئی ہے، مروزی کا بیان ہے
کہ اسحٰق بن راہویہ کا یہی قول ہے، اور وہ استدلال میں حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول
کو پیش کرتے ہیں، جو حدیث کے آخر میں مذکور ہے، اسحٰق فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کا

(بقیہ حاشیہ ص ... کی تضعیف منقول ہے، ملاحظہ ہو، (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۲۲ تا ۲۲۴)

الجنۃ یعملون بما شئت من عمل ثم اختم لھم باحسن اعمالھم وادخلھم الجنۃ. ثم مسح ظھرہ فاخرج ذریۃ فقال ذرء ذرأتھم للنار، یعملون بما شئت من عمل ثم اختم لھم بشر اعمالھم فادخلھم النار،

پھیری، پھر پشت سے ایک جماعت کو پیدا کرکے کہا کہ میں نے اس کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے، یہ میری مشیت سے عمل کریں گے، پھر میں اُن کا خاتمہ بالخیر کروں گا، اور جنت میں داخل کروں گا، پھر اللہ اُن کی پشت پھیر کر ایک اور جماعت کو نکال کرکے کہا کہ ان کو میں نے جہنم کے لئے بنایا ہے، یہ بھی میری مشیت سے کام کریں گے۔

[illegible]

اس قسم کی حدیث موطا میں مرفوعاً مروی ہے[۱]، لیکن درحقیقت (کما بدأکم تعودون) یا مذکورۂ بالا حدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ بچہ مومن یا کافر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ یہ بداہتہً عقل کے منافی ہے، پیدائش کے وقت بچوں میں کفر و ایمان کی فہم و تمیز کی بالکل صلاحیت نہیں ہوتی، رہی وہ حدیث جس میں لوگوں کے مختلف طبقوں میں [illegible] کا ذکر ہے، وہ قدح و طعن سے خالی نہیں ہے علی بن زید بن جدعان [illegible] کرنے میں منفرد ہیں، شعبہ نے ان کے متعلق کلام کیا ہے[۲]، علاوہ ازیں [illegible] یوں کی جاسکتی ہے کہ مومن و کافر پیدا کئے جانے

---

[۱] موطا کی روایت میں ابو محمد کے بجائے مسلم بن یسار جہنی کے حضرت عمرؓ سے سوال کرنے کا ذکر ہے، نیز اس کے آخر میں بعض اضافے ہیں، [۲] امام احمد اور دوسرے ائمۂ فن سے بھی اُن

ان سب سے عہد و میثاق لے کر اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا، پہلی جماعت نے طوعاً اور دوسری جماعت نے کرہاً بطور تقیہ اقرار کیا، پھر اللہ نے اس پر اپنے کو اور ملائکہ کو گواہ بناتے ہوئے کہا شہدنا ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین او تقولوا انما اشرک آباؤنا من قبل وکنا ذریۃ من بعدھم افتھلکنا بما فعل المبطلون، (اعراف ۱۷۱-۱۷۲)

اس مفہوم کو ماننے والے کہتے ہیں کہ تمام اولاد آدم کو اللہ کے رب ہونے کا علم و معرفت حاصل ہے، جیسا کہ ولہ اسلم من فی السمٰوات والارض) سے ظاہر ہے، نیز یہی بات اس آیت میں کہی گئی ہے کہ

قل فللہ الحجۃ البالغۃ فلو شاء تم کہدو کہ بس اللہ کا الزام پورا ہے سو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۰) ... کی روایت کو حسن قرار دیا ہے،

(جامع صغیر ج ۱ ص ۵۳۳)

[1] شہدنا کے فاعل کے متعلق علامہ ابن عبد البر کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اللہ اور ملائکہ فاعل ہیں، آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب اللہ اولاد آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرائے گا، اور وہ اس کا اقرار کر لیں گے، تو اس کے بعد خدا اور ملائکہ کہیں گے کہ ہم تمہارے اس قول و قرار کے گواہ ہیں، تاکہ تم قیامت کے روز کوئی حیلہ و حجت نہ کر سکو، لیکن عام مفسرین نے ذریت آدم کو فاعل مانا ہے، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے استفسار (الست بربکم) کے جواب میں بنی آدم (بلی شہدنا) کہیں گے، یعنی ہاں! تو ہمارا رب ہے اور ہم اپنے اس اقرار کے شاہد و گواہ ہیں، اس کے بعد خدا تعالیٰ کہے گا کہ یہ اقرار و شہادت ہم نے اس لئے تم سے لی ... قیامت کے روز کوئی عذر لنگ نہ کر سکو، یہ دونوں ہی

آیت لا تبدیل لخلق اللہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ نے کفر و ایمان اور معرفت و انکار میں سے جس حالت میں بھی اولادِ آدم کو پیدا کیا ہے، اُس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، وہ واذ اخذ ربک من بنی آدم الخ سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ اجساد سے پہلے اللہ نے ارواح کو گویائی عطا کر کے اُن سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا تھا اور اس کی پوری تاکید کر دی تھی تاکہ کوئی عذر و حیلہ نہ کیا جا سکے، چنانچہ فرمایا،

ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین او تقولوا انما اشرک آباؤنا من قبل وکنا ذریۃ من بعدھم (اعراف ۱۷۱، ۱۷۲)

(یہ قول و قرار اس بنا پر ہے کہ) تم قیامت کے دن یہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی، یا کہنے لگو کہ ہمارے باپ دادوں نے تو ہم سے پہلے شرک کیا اور ہم تو ان کے پیچھے ان کی اولاد ہیں،

ہمارے نزدیک اس آیت کی سب سے عمدہ تاویل وہ ہے جو عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے مروی ہے کہ جب اللہ نے حضرت آدم کو جنت سے نکالنے سے پہلے ان کی پشت کے دائیں جانب سے موتی کی طرح سفید ایک ذریت نکالی، اور اس سے کہا کہ میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ اور پھر ان کی پشت کے بائیں جانب سے ایک سیاہ ذریت نکالی، اور اس سے کہا کہ تم لوگ جہنم میں داخل ہو جاؤ مجھے تمہاری پروا نہیں[1]، اسی حقیقت کی تعبیر دوسری جگہ اصحاب الیمین و اصحاب الشمال سے کی گئی ہے

[1] اس معنی کی روایت امام احمد نے اور ابن عساکر نے حضرت ابو درداءؓ سے کی ہے، امام سیوطی

کے والدین کا ہے، اُن کے کفر و ایمان کی تمیز کا ذریعہ اُن کے والدین ہوں گے، اگر وہ بچپن میں کافر ماں باپ کے درمیان ہے۔ تو ان کو بھی ان ہی میں شامل سمجھا جائے گا، اور اُن کے آیندہ کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا، غلام کے واقعہ سے حضرت موسیٰؑ پر حضرت خضر کی یک گونہ فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اللہ نے جس علم خاص سے ان کو نوازا تھا، اس کا حضرت موسیٰؑ کو علم نہیں تھا،

اسحٰق بن راہویہ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلعم نے بچوں کے معاملہ کو لوگوں سے بیان کر دیا ہے، اس باب میں روایات مختلف ہیں، آگے ہم اُن کو بتفصیل تحریر کریں گے،

اسحٰق کی دلیل یہ بھی ہے کہ ایک انصاری بچہ کا انتقال ہوا، تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس کو مبارک ہو، یہ جنت کی کنجشک ہے لیکن رسول اللہؐ نے ان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "تم کو کیا خبر؟ اللہ نے تو جنت اور دوزخ کے اہل پیدا کئے ہیں"[1]

غور کرنے سے اسحٰق اور ان کے ہمنوا لوگوں کی رائے کی دو نوعیتیں سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ [illegible] نے جب بچوں کو پیدا کیا تو اس وقت اس کو اُن کے مومن و کافر ہونے کا علم تھا [illegible] عقیدۂ قضا و قدر کا اقتضاء ہے کہ ہر چیز کی طرح بچوں کا معاملہ بھی علم الٰہی میں ہے۔ [illegible] تمیز کو پہنچ جانے کے بعد جب اُن میں معرفت و انکار یا کفر و ایمان کے اعتقاد کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی، تو یہ جس کو چاہیں گے، اختیار کریں گے، اگر اسحٰق کے قول کا یہی مطلب ہے تو دراصل یہ وہی بات ہے جو ہم نے کہی ہے

---

[1] صحاح میں امام بخاری و ترمذی کے علاوہ سب نے اور امام احمد نے الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

لھدٰکم اجمعین، اگر وہ چاہتا تو سب لوگوں کو

(انعام - ۱۴۹) ہدایت دیدیتا،

غلام خضر کے متعلق جو حدیث گذری ہے، اس سے بھی اسحٰق نے استدلال کیا ہے، کہ ایک ظاہر بین شخص کو تو اس میں وہی بات نظر آئے گی، جو حضرت موسیٰؑ نے فرمائی تھی، کہ (اَقتلت نفسا زکیۃ) لیکن اللہ نے حضرت خضر کو غلام کی اس فطرت سے آگاہ کر دیا تھا، جس پر وہ پیدا کیا گیا تھا، اسی لئے وہ جانتے تھے کہ اس کی تخلیق کفر پر کی گئی ہے اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے،

واما الغلام فکان کافرا و اور وہ جو لڑکا تھا سو کافر تھا، اور اس کے

کان ابواہ مومنین[1]، ماں باپ مسلمان تھے،

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بچوں کا حکم نہ بتلا دیا ہوتا تو لوگوں پر ان کا معاملہ مشتبہ رہ جاتا، اور وہ مومن و کافر بچوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کو بچوں کی اس اصل جبلت کے متعلق کوئی واقفیت اور علم نہیں ہے، جس پر وہ پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے آپ نے دنیا کے اندر بچوں کا معاملہ یہ کہکر کہ (فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ) بالکل واضح کر دیا،

اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو بچوں کی اس اولین فطرت کی کوئی خبر نہیں ہے جس پر وہ پیدا کئے گئے ہیں، اسی لئے دنیا میں ان کا وہی حکم ہوگا جو ان

---

[1] یہ غالباً قراۃ نہ ہوگی، بلکہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہوگی، اور اگر یہ قرأت ہے تو شاذ و ضعیف ہے، ظاہر ہے کہ اس کو مشہور و معروف قرأت پر ترجیح نہیں [illegible] (واما الغلام فکان ابواہ مومنین)

سمجھا ہے، اور نہ علماے اہلسنت نے اس کو پسند کیا ہے، بلکہ یہ جبریہ کا قول ہے، ایک اور جماعت کے نزدیک فطرت اس میثاق کا نام ہے جو اللہ نے ذریت آدم سے اس کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے اور آدم کی پشت سے نکالے جانے کے دن لیا تھا، اور جس کا ذکر الست بربکم میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب نے علم و معرفت کے ساتھ ربوبیت الٰہی کا اقرار کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسی معرفت و اقرار پر ان کو ان کے آبا کی صلب سے نکال کر دنیا میں بھیجا، لیکن یہ ایمان کی معرفت و اقرار کے بجائے اللہ کا وہ طبعی و فطری اقرار تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قلوب میں جاگزیں کر دیا ہے، پھر جب اس نے اپنے رسولوں کو ان کے پاس بھیجا، اور انھوں نے ربوبیت الٰہی کے اعتراف و قبول اور اپنی رسالت کی تصدیق کی دعوت دی تو معرفت کے باوجود بعض لوگوں نے کفر و جحود کا رویہ اختیار کیا، ان لوگوں کے نزدیک یہ چیز ناممکن ہے، کہ اللہ اپنی مخلوق کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت تو دے، لیکن ان کو اس کی معرفت و واقفیت نہ ہو، اس کو ماننے کی معنی یہ ہوتے، کہ اللہ ان کو اس چیز پر ایمان لانے کا مکلف بنا رہا ہے

لہ علامہ ابن قتیبہ نے جن کے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے فطرت سے ابتدا ر و انشا کے معنی مراد لئے ہیں، اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :۔"دنیا میں ہر بچہ اسی عہد و اقرار یعنی حنیفیت پر پیدا کیا جاتا ہے جو خلقت کی ابتدا میں ظہور میں آیا تھا، اور جو عقول و طبائع میں جاری و ساری ہے، .... لیکن اس اولین اقرار سے کوئی حکم یا ثواب نہیں مترتب ... ہوتا، کیونکہ مشرکین کے بچے اگر اپنے والدین کے درمیان ہوں، تو وہ انہی کے دین پر متصور سمجھے جائیں گے، اور اگر مرجائیں تو ان کی جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جائے گی،

لیکن اگر اُن کا منشا یہ ہو کہ بچہ مومن و مسلم یا جاحد و منکر اور مشرک و کافر پیدا ہوتا ہے تو یہ سراسر عقل و مشاہدہ کے خلاف ہے، اور عقل و مشاہدہ سے بڑھ کر معتبر روایت صحیحہ کوئی علم نہیں ہے، (و اذا اخذ ربک من بنی آدم الخ) سے نہ اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور نہ ہمارے خیال کی تردید بلکہ اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ مخلوق کا حشر و انجام اللہ کے سابق علم کے مطابق ہوگا، ظاہر ہے کہ اس میں اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں ہے، دراصل اختلاف مومنین اور کفار کے ان بچوں کے متعلق ہے جو بچپن ہی میں مرجاتے ہیں، رہا وہ غلام جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا تو بلاشبہ اسکے والدین مومن تھے، اب اگر وہ واقعی بچہ تھا اور اسکے متعلق بعض اہلِ علم کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ وہ تاحیات بالغ تھا تو اسکی نوعیت ایک خاص معاملہ کی ہوگی، اس کی بنیاد پر مومن والدین کے چھوٹے بچوں کے متعلق کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ ان کے قتل کے جائز و مباح نہ ہونے پر تو امت کا اتفاق ہے، اس واقعہ کی تخصیص کے لئے اسی قدر اتفاق کافی ہے کہ جبریہ کے سوا تمام مسلمانوں اور اہلِ سنت کے جملہ فرقوں کا اتفاق ہے کہ مومنین کی اولاد جنت میں داخل کی جائے گی، اس لئے اس واقعہ سے اب کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا،

رہی حضرت عائشہؓ کی حدیث تو وہ ضعیف ہے، اس کو بیان کرنے میں طلحہ بن یحییٰ منفرد ہیں، اور محدثین نے اسی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے،[1]

فطرت کی ایک اور توجیہ | اسحٰق کے قول کے اس دوسرے مفہوم کی اہلِ بصیرت نے نہ معتبر

---

[1] علامہ سیوطی نے بھی اس حدیث کو ضعیف بتایا ہے (جامع صغیر جلد ا ص ۴۲۳) اور طلحہ بن یحییٰ کے متعلق اہلِ فن کے اقوال مختلف ہیں، اکثر نے اس کی تضعیف کی ہے، امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے لیکن بعض علماء سے ان کی توثیق بھی منقول ہے، (تہذیب ج ۵ ص ۲۰) امام مسلم نے ان سے روایت بیان کیا ہے نیز ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے بھی اس کی روایت کی ہے، اسی لئے اکثر علماء نے کہا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے، آگے خود ابن عبد البر نے بھی اس کی تضعیف کی تاویل کیا ہے،

اسی طرح کبھی مومن ہوتا ہے، اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، یہ گویا اللہ کی تقدیر اور بندوں کے لئے اس کا قانونِ فطرت ہے، ان لوگوں کی دلیل حضرت ابو سعید خدریؓ کی وہ حدیث ہے جس میں لوگوں کے مختلف احوال میں پیدا کئے جانے کا ذکر ہے۔

ان لوگوں کا مدعا یہ ہے کہ فطرت سے مراد وہ قضا و قدر ہے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے اول سے آخر تک کے احوال کے لئے مقرر کیا ہے، بندہ کی حالت خواہ یکساں رہے یا مختلف ہوتی رہے سب پر فطرت کا اطلاق ہوگا، قرآن مجید میں ہے:۔

لترکبن طبقاً عن طبق (انشقاق) تم لوگوں کو ضرور چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی،

اصولی حیثیت سے اگرچہ یہ مفہوم صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن لغوی حیثیت سے نہایت ضعیف ہے، واللہ اعلم"

ابھی تک حدیث کے سلسلہ میں ہم نے اہلِ سنت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے مگر اہلِ بدعت[1] کا خیال یہ ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت سے ان کی پیدائش سے پہلے نہ کوئی عہد و میثاق لیا ہے، اور نہ وہ اپنی ماؤں کے بطون کے سوا کبھی اور پیدا کئے گئے ہیں، اسی طرح اس کا بنی آدم سے کوئی مکالمہ بھی نہیں ہوا کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد لازماً یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو تین بار زندگی ملی ہے، حالانکہ قرآن مجید میں ہے،

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین،	(کفار) بولیں گے کہ اے ہمارے خداوند! تو نے ہم کو دوبار موت اور دوبار زندگی عطا کی،
(مومن - ۱۱)	

[1] غالباً اس سے فرق باطلہ مراد ہوں گے،

جس سے وہ واقف ہی نہیں ہیں حالانکہ اس کا ارشاد ہے،

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (زخرف - ۸۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے بنایا ہے تو کہیں گے کہ اللہ نے۔

ان لوگوں کے عام دلائل بھی وہی ہیں، جو پہلے بیان کئے گئے ہیں، البتہ یہ لوگ حضرت ابی ابن کعبؓ کی ایک روایت کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جو (واذ اخذ ربک من بنی آدم) کے سلسلہ میں وارد ہے، اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روز ازل میں بنی آدم سے اپنی ربوبیت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اپنے پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لانے کا عہد بھی لے گا،

حماد بن سلمہ سے کل مولود یولد علی الفطرۃ الخ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک اس سے وہ عہد مراد ہے، جو اللہ نے الست بربکم کہکر لوگوں سے اس وقت لیا تھا، جب وہ اپنے آبا کے اصلاب میں تھے،

یہ قول درحقیقت اس سے پیشتر والے قول ہی کی طرح ہے کہ معرفت واقرار کا تعلق ایمان سے نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کا وہ طبعی وفطری اقرار ہے جس کو اس نے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کر دیا ہے،

چھٹا مفہوم | ایک گروہ کے نزدیک فطرت سے وہ ارادۂ الٰہی اور مشیت ایزدی مراد ہے جس کے مطابق اللہ مخلوق کے قلوب کو پھیرا اور پلیٹ دیا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بندہ کبھی کافر ہوتا ہے، پھر ایمان لاتا ہے، اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، اور کبھی مومن ہوتا ہے، مگر پھر کافر ہو جاتا ہے، اور کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے، اور کبھی وہ کافر ہوتا ہے، اور اسی حال پر برقرار رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آجاتی ہے

کہ (الست بربکم؟) اور انھوں نے اس کے جواب میں (بلی) کہا، پس یہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت و واقعہ، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ (الست بربکم) انبیاء کی زبانی کہا گیا ہے،

ان سب لوگوں کے نزدیک حدیث کی حیثیت ماثور و منقول کی ہے اور اس کا اس آیت کی تاویل سے کوئی تعلق نہیں ہے،

فطرت کے بارہ میں علمائے سلف کے جن آراء و اقوال کا علم ہو سکا ہے، ان کو ہم نے بالتفصیل بیان کر دیا اس ضمن میں ہم نے وہ رائے بھی تحریر کر دی ہے جو روایۃً و درایۃً ہمارے علم و نظر اور فہم و اجتہاد کے مطابق صحیح و صائب تھی، لیکن ہم کو اس کی صحت پر اصرار نہیں ہے، ممکن ہے، دوسرے ارباب علم و نظر کی رسائی وہاں تک ہو جائے، جو ہم سے اوجھل رہ گئی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ حقائق و معارف کو جن علماء کے لئے چاہتا ہے منکشف کر دیتا ہے اور جن کے لئے چاہتا ہے ان پر مخفی و مستور رکھتا ہے، تاکہ مخلوق کا عجز و قصور اور خالق ذوالجلال والاکرام کی قدرت و کمال ظاہر و باہر ہو جائے،

یہ اگرچہ اہلِ دوزخ کا قول ہے لیکن قرآن مجید نے اس کی کوئی تردید نہیں کی بلکہ دوسری جگہ اس کی تصدیق کرتے ہوئے اس نے کہا ہے :۔

وکنتم امواتا (فی حال عدم غیر وجود) فاحیاکم (یعنی بخلقہ ایاکم) ثم یمیتکم ثم یحییکم (بقرہ ۲۸)	تم لوگ مردہ تھے (یعنی حالتِ عدم میں جب کہ تم لوگوں کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا) پھر (اللہ) نے تم لوگوں کو جلایا (پیدا کرکے) پھر تم لوگوں کو مارے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو زندگی اور موت کا مرحلہ دو ہی دفعہ پیش آتا ہے، آخر بے عقل و بے شعور لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی کیا بات چیت ہوئی گی، اور انھوں نے اس کو جواب کیا دیا ہوگا، اور پھر جو عہد و میثاق ان کو یاد تک نہ رہ گیا ہو تو اس سے اُن کے خلاف حجت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے، جب کہ بھول چوک اور سہو و نسیان کا کوئی مواخذہ نہیں ہوتا، اس لئے آیتِ میثاق کی تاویل یہ ہوگی کہ اللہ نے لوگوں کو دنیا میں پیدا کرکے ان پر اس طرح حجت قائم کی ہے کہ ان کے لئے اُس نے ایک ایسی فطرۃ صحیحہ بنا دی ہے جس کے ذریعہ وہ سن رشد و شعور کو پہنچ جانے کے بعد یہ جان سکیں گے کہ اللہ ہی ان کا رب اور خالق ہے،

ان میں سے بعض لوگوں کے نزدیک اللہ نے ذریتِ آدم کو قرناً بعد قرنٍ ظاہر کرکے اُن کے نفوس کے خلاف اس طرح شاہد بنایا ہے کہ ان کی عقل و طبیعت میں وہ صلاحیت ودیعت کر دی ہے جو ان کو اُن کی خواہشات کے علی الرغم اقرارِ ربوبیت کی طرف لے جاتی ہے، اسی فطری و طبعی صلاحیت کے لحاظ سے گویا ان سے کہا گیا ہے

چلپیؒ نے کشف الظنون میں غایۃ التحقیق کا تذکرہ کیا ہے، اُن کی دوسری مشہور کتاب علم صرف میں دستور المبتدی ہے، جسے اپنے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیلؒ کے لئے لکھا تھا شیخ صفی الدین علم و حکمت میں یکتائے زمانہ اور شریعت و طریقت کے جامع تھے، ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۰ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ان کے نانا بقید حیات تھے،

اُن کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل ۸۸۹ھ میں پیدا ہوئے، اس وقت اُن کا خاندان دہلی میں آباد تھا، سید اشرف سمنانیؒ نے اُن کو بچپن ہی میں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا تھا، والد نے اُن کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی، بڑے ذہین و طباع تھے، تقریباً سولہ سال ہی کی عمر میں علوم مروّجہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر کے درس و افادہ میں مشغول ہو گئے، ۹۱۰ھ میں اپنے والد شیخ صفی الدین کے وصال کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور تقریباً چالیس سال تک اپنے فیوض و برکات سے خلق اللہ کو مستفیض کرنے کے بعد ۱۱ ربیع الاول ۹۶۰ھ میں وفات پائی،

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے چار صاحبزادے تھے اور سب کے سب عالم و فاضل اور بزرگ تھے جنہیں زیادہ مشہور حضرت شیخ عبد القدوس بن شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ ہیں، جو حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ کے پوتے شیخ محمد بن شیخ عارفؒ کے مرید اور خلیفہ ہیں، آپ نے شیخ احمد عبد الحق کے ملفوظات و احوال کو انوار العیون فی اسرار المکنون میں جمع کیا ہے، ان کے علاوہ شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے تین صاحبزادے شیخ عبد الصمد، شیخ عزیز اور شیخ حبیب عرف مخدوم مٹھن تھے، یہ سب اپنے والد سے علم و معرفت حاصل کر کے ان کے خلیفہ ہوئے، ان ہر سہ حضرات کا تعلق سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سے تھا، اور شیخ عبد القدوس نے سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے منسلک ہو کر گنگوہ میں سکونت اختیار کی،[۵]

---

[۵] اخبار الاخیار، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر،

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

از

جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۴)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف ماہ جون

شیخ صفی الدین رُدولوی حضرت شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین غزنوی دہلوی رودلوی دہلی میں پیدا ہوئے، اُن کے دو بھائی شیخ رضی الدین اور شیخ فخر الدین تھے یہ تینوں قاضی شہاب الدین کے نواسے اور اُن کے خصوصی تلامذہ میں ہیں، فتنۂ تیموری کے بعد شیخ صفی الدین اور ان کے بھائی اپنے خاندان کے ساتھ دہلی سے جونپور چلے آئے اس خاندان کا قاضی شہاب الدین سے خصوصی رشتہ تھا، اور علم و فضل میں بھی ممتاز تھا اس لئے سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اسے مرحمت خسروانہ سے نوازا، شیخ صفی الدین نے دہلی ہی میں اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی، اُس کے بعد سید اشرف سمنانی رح سے طریقت کی تعلیم حاصل کرکے اُن کے محبوب ترین خلیفہ ہوئے، اُ انھوں نے بھی اپنے نانا کی طرح فراغت کے بعد درس و افتاء اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا کافیہ کی شرح غایۃ التحقیق اُن کی مشہور تصنیف ہے جس میں اپنے نانا کی شرح کافیہ کو شروح کافیہ میں بہترین کتاب بتایا ہے، اور اس کی بڑی تعریف کی ہے،

میں تصریح ہے :-

"وہر یکے بخدمت قاضی شہاب الدین جد مادری خود باکتساب علوم متداولہ دانشمند متبحر شدند"

شیخ فخر الدین کے بارے میں بھی "نزہۃ الخواطر" کی یہ تصریح محلِ نظر ہے،

"قال ولد ونشأ بجونبور"[1]

شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوریؒ | جونپور کے علمائے کبار اور مشائخ عظام میں ظاہری و باطنی کمالات میں جامع شخصیت رکھتے تھے، وطن دہلی تھا، تیموری فتنہ میں حدود سنہ [illegible]ھ میں جونپور آگئے، اس وقت اُن کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی، اسی عمر میں شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، جو اودھ کے رہنے والے تھے، اور دہلی میں درویشوں کی خدمت انجام دے چکے تھے، مگر جونپور آنے کے بعد اس مشغلہ سے کنارہ کش ہو گئے، شیخ فتح اللہ نے اپنے اس کمسن مسترشد کو مشورہ دیا کہ وہ قاضی شہاب الدین کی درسگاہ میں داخل ہو کر علوم شرعیہ کی تکمیل کریں،

نہایت ذہین و ذکی تھے، اس لئے قاضی صاحب نے بھی اُن کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، اور اسی شاگرد عزیز کے لئے اصول بزدوی کی شرح تا بحث امر تحریر فرمائی تھی، قاضی صاحب ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے،

شیخ محمد بن عیسیٰ تکمیل کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوئے مگر بعد میں اس کو ترک کر کے اپنے شیخ و مرشد فتح اللہ اودھیؒ کی صحبت میں رہے، اور علائق دنیا سے علیحدہ ہو گئے، عبادت و ریاضت کی دنیا آباد کی، قاضی شہاب الدین کو اپنے اس شاگرد کی ولایت

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۹ - و نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵،

قاضی رضی الدین ردولویؒ | انھوں نے بھی اپنے نانا قاضی شہاب الدینؒ سے جملہ علوم وفنون حاصل کئے، اور اپنے اسلاف کے طرز پر درس وتدریس کی زندگی بسر کی، سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اُن کو ردولی کا قاضی بنایا تھا، اسی لئے انھوں نے وہیں مستقل بود وباش اختیار کرلی، اس زمانہ میں اُن کے بڑے بھائی شیخ صفی الدین مرشد کامل کی تلاش میں روانہ گئے، وہاں سید اشرف سمنانیؒ سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے ان کو اپنے حلقۂ ارادت وخلافت میں لے لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ رضی الدین سید اشرف سمنانیؒ کی وفات ۸۰۸ھ سے پہلے ہی ردولی کے قاضی بنائے جا چکے تھے، اور اس سے چند سال پہلے اُن کے والد اور نانا دہلی سے جون پور آگئے تھے، اور اُن کی پیدائش اور تعلیم وتربیت کے تمام مراحل دہلی ہی میں گذر چکے تھے، اور یہ تصریح اُن کے بارے میں صحیح نہیں ہے،

ولد ونشاء بجونپور، و	وہ جون پور میں پیدا ہوئے اور
قرء العلم علی جدہ لامہ	وہیں نشو ونما پائی، اور اپنے نانا
الشهاب المذکور و	قاضی شہاب الدین سے تحصیل علم
لازمه مدة من الزمان[۱]	کرکے ایک مدت تک اُن کی خدمت

میں رہے،

واقعہ یہ ہے کہ قاضی رضی الدین کی ولادت، نشو ونما اور نانا سے تحصیل علم کے تمام مراحل قیام دہلی کے زمانہ میں طے ہو چکے تھے،

شیخ فخر الدینؒ | شیخ صفی الدین اور شیخ رضی الدین کے حقیقی بھائی اور قاضی شہاب الدین کے نواسے ہیں، انھوں نے بھی اپنے بھائیوں کی طرح اپنے نانا کی خدمت میں رہ کر علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی، تذکرہ علمائے ہند میں تینوں بھائیوں کے بارے

---

[۱] نزہۃ الخواطر جلد ۳ ص ۱۰۱،

جس میں مشارق الانوار کی حدیثوں کو ترتیب دیا ہے[1]

مولانا عبدالملک عادل جونپوری | جونپور میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قاضی شہاب الدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت پاکر یکتائے زمانہ ہوئے، اور اپنے استاذ کے جانشین بنے، اور اُن کے طریقہ پر درس و افتا، اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ قاضی شہاب الدین کی وفات کے بعد اُن کے مدرسہ کے صدرالمدرسین اور جانشین بنائے گئے، اور پچاس سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۸۹۰ھ میں فوت ہوئے،

مولانا عبدالملک عادل کے تلامذہ میں شیخ الٰہ داد بن عبداللہ جونپوری متوفی ۹۲۳ھ زبردست عالم و فاضل اور با خدا بزرگ تھے، سید راجہ حامد شاہ مانک پوری کے مرید و خلیفہ تھے، انھوں نے بھی اپنے اسلاف و اساتذہ کے طریقہ پر فراغت کے بعد درس، افتا، اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا، اپنے استاذ الاستاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ پر بہترین حواشی لکھ کر اس کی شرح و تعلیق کی، نیز ہدایہ، اصول بزدوی اور تفسیر مدارک التنزیل کے شروح و حواشی لکھے، اُن کی شرح کافیہ کو قبول عام حاصل ہوا، اپنے زمانہ میں جونپور کے مشہور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اُن کے صاحبزادے شیخ بھکاری عہد

. . . .

لودھی کے علمائے فحول میں تھے؛ ایک مرتبہ سلطان وقت نے دہلی میں مناظرہ کی مجلس منعقد کی، جس میں ایک طرف شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز تلنبی تھے، اور دوسری طرف شیخ الہ داد اور اُن کے صاحبزادے شیخ بھکاری تھے، سر دربار مناظرہ کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ الٰہ داد اور شیخ بھکاری علوم و مسائل کی تنقیح میں ماہر ہیں،، اور اُن کے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۵، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵، نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۳،

وکرامت پر بڑا ناز و اعتماد تھا. ایک بار مولانا فقیہ حیرتی سے مناظرہ کے سلسلہ میں اُن کی خصوصی توجہ چاہی تھی،

سلطان ابراہیم شاہ اور اُن کا لڑکا سلطان محمود شاہ اُن کا بیحد معتقد تھا، دونوں بادشاہوں نے بارہا خدمت کرنی چاہی، مگر انھوں نے ہمیشہ استغنا، اور بے نیازی ظاہر کی، دوسرے امرا، وحکام کے ہدایا و تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے، اس سلسلہ میں یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

من دلقِ خود با فسرِ شاہاں نمی دہم ‌ ‌ ‌ من فقرِ خود بملکِ سلیماں نمی دہم

از رنجِ فقر در دلِ گنجے کہ یافتم ‌ ‌ ‌ ایں رنج را براحتِ شاہاں نمی دہم

حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ ۴ ربیع الاول [illegible] میں فوت ہوئے،

اُن کے تلامذہ میں شیخ بہاء الدین عمری جونپوری متوفی سنہ ۹۱۱ھ بڑے مرتبہ کے عالم و بزرگ ہیں، شیخ محمد بن عیسیٰ سے تعلیم حاصل کرکے سید راجہ حامد شاہ مانک پوری سے طریقت کی تعلیم و تربیت پائی، اور نو سال تک اُن کی خدمت میں رہے، اس کے بعد حرمین شریفین میں تیس سال تک زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی زندگی بسر کی، مکہ مکرمہ کے علماء و مشائخ سے حدیث اور طریقت میں کسب فیض کیا، اور کتب احادیث سے خصوصی شغل و شغف رکھا، ارشاد السالکین اُن کی مشہور کتاب ہے،

شیخ محمد بن عیسیٰ کے دوسرے مشہور شاگرد شیخ مبارک ارزانی بنارسی متوفی [illegible] ہیں، جو علم حدیث میں نمایاں شخصیت رکھتے تھے، اُن کو دینی و علمی مرتبہ کے ساتھ دنیاوی جاہ و جلال بھی حاصل تھا، شیر شاہ سوری اور اس کے لڑکے سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے، مدارج الاخبار اُن کی مشہور تصنیف ہے،

قاضی شہاب الدین کے سلسلۂ تلامذہ میں قاضی سماء الدین جونپوری بھی شامل ہیں جنھوں نے قاضی صاحب کے تلامذہ سے تحصیلِ علم کی تھی، اور اپنے زمانہ کے اعلم العلماء اور سلطان حسین شاہ شرقی کے اُستاد تھے، بعد میں سلطان مذکور نے اُن کو اپنا وزیر بناکر قتلغ خاں کا لقب دیا تھا، ۸۸۳ھ میں جب سلطان حسین شاہ اور سلطان بہلول لودھی میں مقابلہ ہوا، تو مولانا سماء الدین سلطان حسین کے ہمراہ تھے، سلطان بہلول لودھی نے ان کو گرفتار کر کے دہلی میں قید کیا، ۹۰۵ھ تک ان کے زندہ رہنے کی تصریح ملتی ہے[1]

تصنیف | قاضی شہاب الدین تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیفی کارناموں میں بھی اپنے اقران و معاصرین میں خاص شہرت رکھتے ہیں، انھوں نے مختلف علوم و فنون میں ایسی معیاری کتابیں لکھیں جو نویں صدی کے اسلامی ہند کی یادگار بن گئیں، ان کے ہر تذکرہ نگار نے اُن کی تصنیفی خدمات کا خاص طور سے ذکر و اعتراف اور اُن کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے، سب سے پہلے قاضی صاحب کے شیخ و مرشد سید اشرف سمنانی نے جو خود بھی زبردست عالم و مصنف تھے اُن کی تصانیف کی داد دی ہے۔ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے ان کی تصانیف کا شاندار الفاظ میں تعارف کرایا ہے، فرشتہ نے لکھا ہے:-

"تصانیف مستحسنہ مفیدہ آن بزرگوار شہرت عام دارد"

اس کے بعد چند خاص کتابوں کے نام درج کئے ہیں (ج ۲ ص ۶۰۳) سبحۃ المرجان میں ہے:-

وألف كتباً سارت بها ركبانا	قاضی صاحب نے وہ کتابیں لکھیں
العرب والعجم (ص ۳۵)	جن کو عرب و عجم کے علمی قافلے اپنے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶ و نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵

تو متقابل دونوں علما تقریر میں آگئے ہیں[۵۱]

مولانا قطب الدین ظفرآبادیؒ ۸۲۰ھ میں ظفرآباد میں پیدا ہوئے، حفظِ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں اپنے والد شیخ نور الدین حسینی واسطیؒ سے پڑھیں، اس زمانہ میں قاضی شہاب الدین کی علمی و تدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور دور دور سے تشنگانِ علم ان کے چشمۂ علم پر آکر سیراب ہو رہے تھے، شیخ قطب الدین نے بھی قاضی صاحب کی خدمت میں اس طرح حاضری دی کہ پھر کسی دوسری درس گاہ کا رُخ نہیں کیا، اور تمام کتبِ درسیہ و علوم متداولہ کی تکمیل چند سال تک اُن ہی کی شاگردی میں رہ کر کی، اس کے بعد اپنے والد سے طریقت حاصل کرکے حج و زیارت سے مشرف ہوئے، نہایت متواضع، خوش اخلاق اور عابد و زاہد عالم و بزرگ تھے، اُن کی ذات سے بہت سے بندگانِ خدا کو فیض ملا، ۲۰ جمادی الاخری ۹۰۰ھ میں ظفرآباد میں فوت ہوئے۔

مولانا علاء الدین جونپوریؒ جونپور کے مشاہیر علماء و اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے، انہوں نے ایک مدت تک قاضی شہاب الدین کی خدمت میں رہ کر مروجہ علوم و فنون حاصل کئے، اسی شاگرد عزیز کے لئے قاضی صاحب نے کافیہ کی شرح لکھی تھی، جسے بعد میں علما و مدرسین اور طلبہ و تلامذہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، شیخ علاء الدین بیس سال کی عمر میں تحصیلِ علم سے فارغ ہوگئے، اور درس و افتا کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا، اُن کی تصانیف میں اپنے استاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ کی شرح بھی ہے۔ استاذ نے اپنے عزیز شاگرد کے لئے جو کتاب لکھی، شاگرد نے اس کی شرح لکھ کر حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش کی، جونپور میں فوت ہوئے[۵۲]

۵۱ اخبار الاخیار ص ۱۹۱، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵، و ص ۲۳، نزہتہ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۱
۵۲ تجلی نور، و نزہتہ الخواطر

(۱۵) ہدایۃ السعداء (۱۶) رسالہ در طہارت زباد (۱۷) رسالہ در افضلیت عالم بر سید، (۱۸) ایک کتاب تفسیر میں، ان کتابوں کا مختصر تعارف یہ ہے،

الارشاد فی النحو علم نحو میں اس نام کی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر قاضی صاحب کی کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ کسی اور الارشاد کے حصہ میں نہیں آئی، ملک اور بیرون ملک میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس کی اہمیت وافادیت کو سب سے پہلے سید اشرف سمنانی[۵۱] نے ان شاندار الفاظ میں ظاہر فرمایا، "نیکو گفتہ سحر از ہندستان راست آمدہ غالباً ایں راست سحر بود"

شاہ عبد الحق صاحب نے لکھا ہے: "وارشاد در نحو کہ در دستے تمثیل در ضمن تعبیر التزام نمودہ وترتیب جدید اختیار فرمودہ است نیز نسخہ است لطیف وبے نظیر و غریب"[۵۲]

"تاریخ فرشتہ میں ہے :- "ومتن ارشاد کہ در نحو کہ بصیح الشان است"[۵۳] "سبحۃ المرجان میں ہے"

والارشاد وهو متن فی النحو	ارشاد علم نحو کا متن ہے، اس میں
التزم فیه التمثیل المسالة	ہر مسئلہ کی تعریف کے ضمن میں اس کی
فی ضمن تعریفها[۵۴]	مثال کا التزام کیا ہے،

کشف الظنون میں ہے :-

الارشاد متن له فی النحو	ارشاد علم نحو میں ایک متن ہے جس
تعمق فی تهذیبه كل التعمق	کی تہذیب وتنقیح میں قاضی صاحب
وتانق فی ترتیبه حق التانق	نے بڑا اہتمام کیا ہے، اور ترتیب
اوله الحمد لله كما یجب د	میں کمال دکھایا ہے، اس کی ابتدا

---

[۵۱] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۶، [۵۲] اخبار الاخیار ص ۱۷۵، [۵۳] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶، [۵۴] سبحۃ المرجان ص ۳۹،

خزینۃ الاصفیا میں ہے "تصانیف و توالیف عالی وارد" (ج ۱ ص ۳۹۰) تذکرہ علمائے ہند میں ان کی تصنیفی خدمات کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے، "قاضی وسادۂ افادہ ودرس بخوبی مزین فرمود، وبہ تصنیف کتب معروف گردید" اور بعض کتابوں کا نام بھی لکھا ہے کسی مصنف کی کتابوں کا قبول عام اس کی زندگی ہی میں حاصل ہونا بڑی سعادت کی بات ہے، اور یہ سعادت قاضی صاحب کو حاصل تھی، چنانچہ اُن کی حیات ہی میں ان کی کتابوں کو ہندا ور بیرونِ ہند کے علماء نے پڑھا، پڑھایا، اُن کی شرحیں لکھیں، ان کے اقتباسات سے اپنی کتابوں کو زینت دی، اور اُن کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا۔

قاضی صاحب کے تدریسی وتصنیفی جوہر قیام جونپور کے بعد ظاہر ہوئے، دہلی کے زمانۂ قیام میں اس کا کوئی نشان نظر نہیں آتا، چنانچہ ان کے تذکرہ نگاروں نے اُن کی تصانیف کو جونپور کے زمانۂ قیام کی خدمات میں شمار کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے بھی قاضی صاحب چند کتابیں لکھ چکے تھے خصوصًا الارشاد، بدیع البیان، جامع الصنائع اور بحرالمواج کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیام دہلی کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں، کیونکہ قاضی صاحب نے دہلی سے جونپور آنے کے چند سال کے بعد ان کتابوں کو سید اشرف سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کی خدمت میں پیش کیا تھا،

مختلف کتابوں سے آپ کی حسب ذیل تصانیف معلوم ہو سکی ہیں:-

(۱) الارشاد فی النحو، (۲) حواشی کافیہ، (۳) بدیع البیان، (۴) جامع الصنائع، (۵) بحرالمواج (۶) شرح اصول بزدوی تا بحث امر، (۷) رسالہ در تقسیم علوم، (۸) مناقب السادات (۹) المصباح، (۱۰) فتاوی ابراہیم شاہی، (۱۱) عقیدۂ شہابیہ، (۱۲) شرح قصیدہ بانت سعاد، (۱۳) شرح قصیدہ بردہ، (۱۴) رسالہ معارضہ

کے مصنف نے ارشاد کا ایک نسخہ مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہریؒ کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔
اس کا ایک قلمی نسخہ لائڈن کی لائبریری میں موجود ہے[51]

بدیع البیان | اس کا نام بعض کتابوں میں بدیع المیزان درج ہے، عربی میں علم بیان اور بلاغت میں نہایت جامع متن ہے، اس زمانہ کے ذوق کے مطابق اس کی عبارت مسجع و مقفی ہے، اُسے بھی قاضی صاحب نے سید اشرف سمنانیؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور آپ نے اُس کو پسند فرمایا تھا[52] شاہ عبدالحق صاحب اُس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"بدیع البیان نیز متنے است در علم بلاغت دریں جا مقید بسجع شدہ است"[53]

صاحب سبحۃ المرجان نے اس کا نام بدیع المیزان بتایا ہے، اور لکھا ہے "بدیع المیزان وھو متن فی فن البلاغۃ لعبارات مسجعۃ"[54]

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اسے اپنے فن میں لاثانی کتاب بتایا ہے، "سیوم بدیع البیان در علم بلاغت لاثانی است"[55]

بحر مواج | فارسی میں کئی جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر ہے، اس کی تہذیب و تنقیح نہیں ہو سکی، اور تسوید کے بعد کسی سبب سے تبییض کی باری نہیں آئی، اس لئے اس میں حشو و زوائد رہ گئے، سید اشرف سمنانی نے اسے دیکھ کر کہا تھا "سخن خالی از اطالت نیست"[56] شاہ صاحب نے اس کے متعلق یہ تفصیل لکھی ہے:۔

"بحر مواج تفسیر قرآن مجید کردہ بعبارت فارسی، در وے بیان ترکیب و معنی فصل و فصل دادہ است، و دریں جا نیز برائے سجع تکلف کردہ است، قابل اختصار

---

[51] المنجد فی العلوم والادب ص ۳۷۱، [52] لطائف اشرفی جلد ۲ ص ۱۰۶، [53] اخبار الاخیار ص ۱۷۵،

[54] سبحۃ المرجان ص ۳۹، [55] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۹۰، [56] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶،

حواشی کافیہ | یہ کتاب شرح کافیہ، شرح ہندی اور حاشیۂ ہندی کے ناموں سے بھی مشہور ہے، علم نحو کے مشہور متن کافیہ ابن حاجب کی عربی میں نہایت مفید شرح ہے، آپ نے قاضی صاحب نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا علاء الدین عمری جونپوری کے لئے تحریر کیا تھا، اور ان کو اس کا درس بھی دیا تھا، قاضی صاحب کو اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا خاص خیال تھا، اور انھوں نے اسے اپنے خواجہ تاش اور معاصر عالم قاضی نصیر الدین کی خدمت میں بھیجا، جو اس زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے، اور یہ خواہش کی کہ اگر آپ اس کتاب کو اپنے یہاں داخل درس کرلیں تو دوسرے علماء بھی اعتنا کریں گے، قاضی نصیر الدین نے قاضی صاحب کی خواہش تو پوری نہیں کی، مگر اس کی داد دی کہ "خوب نوشتہ اند احتیاج درس گفتن نیست"[۵۱] اس کے بعد قاضی صاحب کی تمنا یوں پوری ہوئی، اور ان کی زندگی ہی میں یہ کتاب مقبول ہو کر داخل درس ہوئی، کئی علماء نے اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

"از تصنیفات او یکے حواشی کافیہ است کہ در لطافت و متانت بے مدیل واقع شدہ، وہم در حالت حیات او مشہور عالم گشتہ"۔

(اخبار الاخیار ص ۱۷۵)

صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے بھی اسی کتاب کی تعریف و توصیف میں شاہ صاحب کے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:-[۵۲]

فرشتہ نے لکھا ہے کہ "حاشیہ کافیہ کہ مشہور است بحاشیۂ ہندی"[۵۳] صاحب سبحۃ المرجان نے اسے قاضی صاحب کی مشہور ترین تصنیف قرار دیا ہے، والحواشی علی کافیۃ

---

۵۱ اخبار الاخیار ص ۱۷۶، ۵۲ مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ۱۳۱، ۲۳ ۵۳ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶)

شاہ صاحب کے انداز بیان اور تفصیلی تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن کی نظر سے گذری تھی، صاحب خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے "بحر مواج تفسیر قرآن کہ بعبارت فارسی نہایت مقبول"[۵۱] صاحب اخبار الاصفیاء نے اس کتاب کے بارے میں قاضی صاحب کا ایک جواب نقل کیا ہے کہ زمانۂ تصنیف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو بجیہ پسند فرمایا اور قاضی صاحب کو اس کی جلد از جلد تکمیل کی تاکید فرمائی، اس لئے قاضی صاحب نے تعمیل ارشاد میں بعجلت تمام کتاب مکمل کی،

اس واقعہ کے آخر میں لکھا ہے "اختتام تفسیر ہماں بود، واجزاے حیاتش از شیرازہ بدن پراگندہ شدن ہماں"[۵۲] حالانکہ بحر مواج قاضی صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے انھوں نے اسے ۸۰۰ھ سے پہلے سید اشرف سمنانی کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور اس کے تقریباً چالیس سال بعد فوت ہوئے، اخبار الاصفیاء کے علاوہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نگار نے یہ منامی واقعہ بیان نہیں کیا ہے،

جامع الصنائع | یہ کتاب فارسی میں علم بدائع وصنائع میں ہے، سید اشرف سمنانیؒ نے اُسے دیکھ کر کہا تھا "حضرت قاضی درین فن ہم دست زدہ اند"[۵۳] پھر اپنے متوسل خاص شیخ اوحدی کے بارے میں جو فارسی زبان کے زبردست شاعر تھے، قاضی صاحب سے فرمایا "چوں ہمہ از علوم سر بردہ آید، فارسی را بشیخ گذارید" شاہ صاحب نے اس کے بارہ میں لکھا ہے "و در صنائع نیز رسالہ فارسی دارد" (اخبار الاخیار ص ۱۷۵) اور صاحب خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے "ششم رسالہ در تقسیم صنائع (ج ۱ ص ۳۹۱)

---

۵۱ خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صفحہ ۳۹۱، ۵۲ اخبار الاصفیاء ورق ۶۰

۵۳ لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶،

معلوم ہوتا، کیونکہ حضرت شیخ عبدالرحمن جامی کی وفات ۸۹۷ھ میں ہوئی، اور اُن سے تقریباً چالیس سال پہلے قاضی صاحب کی وفات ہوچکی تھی،

رسالہ در تقسیم علوم | یہ رسالہ فارسی میں تھا، اخبار الاخیار (ص ۱۷۵) خزینۃ الاصفیا، (جلد ۱ ص ۳۰۹) تذکرہ علمائے ہند (ص ۸۸) میں اس کا نام رسالہ در تقسیم علوم" درج ہے، سبحۃ المرجان میں بھی اس کا تذکرہ ہے، نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعریفاتِ سید جرجانی کے طرز پر یہ کوئی کتاب ہوگی جس میں علوم و فنون کی تعریف و تقسیم کا بیان ہوگا،

رسالہ طہارتِ زیاد | قاضی صاحب کی تصانیف کی فہرست میں اس نام کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، البتہ اُن کے اور شیخ ابوالفتح کے درمیان فقہی بحث و مناظرہ کے سلسلہ میں اس کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے شیخ ابوالفتح کے تذکرہ میں قاضی شہاب الدین سے اُن کے مباحثہ کے ذکر میں لکھا ہے،

"و قاضی بطہارت او می رفت، و آنچہ وے در بعضے رسائل کہ دریں مبحث تالیف کردہ نوشتہ است[۱] الخ"

زباد یعنی کچھے نافۂ مشک کو قاضی صاحب پاک اور شیخ ابوالفتح ناپاک مانتے تھے اس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

رسالہ فضلیت عالم بر سید | اس کتاب کا نام بھی قاضی صاحب کی مستقل تصانیف میں نہیں ملتا، صرف مناقب السادات کی تصنیف کے سلسلہ میں اس کا پتہ چلتا ہے، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سید اجل، اور قاضی صاحب کے درمیان دربار میں تقدیم و تاخیر کے معاملہ میں تکرار ہوگئی، قاضی صاحب نے کہا "عالمیت ما متشخص و متیقن است و علویت شما

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۷۰،

النحو، وھی اشھر تصانیفہ،[1]

اس کتاب کی سب سے پہلی شرح قاضی صاحب کے اسی شاگرد رشید نے لکھی، جس کے لئے انھوں نے اسے تحریر فرمایا تھا، چنانچہ مولانا علاء الدین جونپوری نے فراغت کے بعد اس پر مفصل حاشیہ لکھا، اس کے بعد قاضی صاحب کے تلمیذ التلمیذ مولانا الہ داد جونپوری نے اس کا ایک حاشیہ لکھا، بیرون ہند کے شارحین میں مولانا ابوالفضل خطیب گازرونی، شیخ غیاث الدین منصور، اور شیخ توقانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

کشف الظنون میں شروح کافیہ کے بیان میں ہے:۔

وشرحھا شھاب الدین احمد	شہاب الدین احمد بن عمر ہندی
بن عمر الھندی المتوفی ۸۴۹ھ	متوفی ۸۴۹ھ نے کافیہ کی شرح
تسع واربعین وثمانمائۃ	لکھی، جس پر مولانا میاں الہ داد
وعلیہ حاشیۃ لمولانا	جونپوری کا حاشیہ ہے، نیز اس
الفاضل میان اللہ (میاں	شرح ہندی پر توقانی، گازرونی
اللہ داد) الجانبوری) و	اور غیاث الدین منصور کے حواشی
وعلی شرح الھندی حاشیۃ	ہیں،
للتوقانی، وللکازرونی، و	
ولغیاث الدین منصور،[2]	

تجلی نور میں ہے کہ جب شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ نے کافیہ کی شرح لکھی، اور قاضی صاحب نے اسے ملاحظہ کیا، تو فرمایا کہ "ملا جامی خلاصۂ شرح ہندی ما نوشتہ"[3]، یہ بظاہر صحیح نہیں

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۳۹، [2] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۵۰، [3] تجلی نور ج ۱ ص ۳۴،

کہ قاضی تا بحث امر تقریب او نوشتہ است" (ص ۱۰۵) صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی یہی لکھا ہے: (ص ۲۰۵)

شرح قصیدہ بانت سعاد | قصیدہ بانت سعاد وہ مشہور و مبارک قصیدہ جسے حضرت کعب ابن زہیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا تھا، اور آپ نے خوش ہو کر ردائے مبارک عطا فرمائی تھی، اہل دل علماء و ادبا نے مختلف انداز میں اسکی شرحیں لکھی ہیں، قاضی صاحب نے بھی ایک شرح تحریر کی ہے، جو بقول صاحب سبحۃ المرجان شرح بسیط علی قصیدۃ بانت یعنی قصیدہ بانت سعاد کی مفصل شرح ہے، (ص ۳۹)

تذکرہ علمائے ہند میں بھی اس شرح کا ذکر ہے، (ص ۸۸) یہ شرح مدت ہوئی دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے،

شرح قصیدہ بردہ | حضرت شیخ بوصیریؒ کا قصیدہ بردہ نعت و منقبت رسول میں بڑا پُر اثر اور والہانہ قصیدہ ہے، اور عباد و علماء کو اس سے خاص شغف رہا ہے، اس کے بہت سے معاوضے تضمینیں اور شروح و حواشی لکھے گئے، قاضی صاحب نے بھی اُس کی ایک شرح لکھی ہے، نزہۃ الخواطر (ج ۴ ص ۲۰) میں اس کی تصریح موجود ہے،

عقیدۂ شہابیہ | یہ کتاب کلام و عقائد میں ہے، اس کا تذکرہ فرشتہ نے ان الفاظ میں کیا ہے[۱] "و رسالہ عقیدۂ شہابیہ نیز از مولفات اوست" نزہۃ الخواطر میں بھی اس کا ذکر ہے[۲] غالباً فارسی زبان میں کوئی مختصر سا رسالہ ہوگا،

فتاویٰ ابراہیم شاہی | اپنے قدرداں اور محسن علم و فن سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے نام ... میں لکھی تھی جس میں فقہی مسائل و فتاوے درج تھے، تاریخ فرشتہ (جلد ۲

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶
[۲] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص،

مسلوک، پس ما را تقدیم و ترجیح بر شما ثابت باشد و درین باب رسالہ نوشت[۱]"

اس رسالہ کی تصنیف پر قاضی صاحب کے ایک استاد ناراض ہوگئے، اس لئے انھوں نے اپنے قول سے رجوع کرکے مناقب السادات لکھی، صاحب خزینۃ الاصفیا نے اس رسالہ کو کتاب کے نام سے یاد کیا، اور لکھا ہے "ازیں سبب کتابے در ذکر فضیلت علماء بسادات تصنیف کردہ، و دراں کتاب درج کرد کہ فضیلت علما بسبب علم کہ ہست در عالم ظاہر است و فضیلت علویت سادات موہوم کہ اثبات آن بس مشکل" پھر لکھا ہے کہ قاضی صاحب نے بعد میں اس کتاب کو دریا برد کر دیا" و کتابے کہ تصنیف کردہ بود در دریا انداخت و بجائے آن در مناقب سادات رسالہ تالیف کرد[۲]"

شرح اصول بزدوی | فخرالاسلام علی بن محمد بزدوی حنفی متوفی ۴۸۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاصول فی الفقہ اصول فقہ پر نہایت مشہور اور جامع کتاب ہے، مگر الفاظ و عبارات میں اجمال و ابہام کی وجہ سے سخت مشکل ہے، اس لئے بہت سے علماء و فقہا نے اس کے شروح و حواشی لکھے،

آٹھویں صدی میں جو مشکل پسندی کا دورِ شباب ہے، اس کے شروح و حواشی کا زور تھا، اور خود اصول بزدوی ہندوستان میں بہت رواج پذیر تھی، جون پور میں قاضی صاحب کے معاصر مولانا فقیہ حیرتی، اس کے رموز و نکات کے خصوصی ماہر اور مشہور مدرس تھے، اور بیسیوں بار اس کا درس دے چکے تھے، قاضی صاحب نے اپنے تلمیذ عزیز شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کی خاطر اصول بزدوی کی ایک شرح بحث امرتک تحریر فرمائی تھی، صاحب تذکرہ شیخ محمد بن عیسیٰ کے حال میں لکھتے ہیں، :- شرح اصول بزدوی

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۰۰۰ [۲] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۹۱،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کو نہیں دیکھا تھا، غالباً یہ عربی زبان میں علم نحو میں مختصر رسالہ رہا ہوگا

ہدایۃ السعداء | یہ کتاب فارسی میں تھی جس میں غالباً وعظ و نصیحت اور اخلاقیات سے متعلق مضامین تھے، اس کا تذکرہ نزہۃ الخواطر میں ہے،

ایک اور تفسیر | قرآن پاک کی آیت فسحقاً لاصحاب السعیر کی تفسیر میں کوئی کتاب لکھی تھی، اس کا پتہ کشف الظنون کی اس عبارت سے چلتا ہے،

کتاب عرف الوردی فی نصرۃ	عرف اوردی فی نصرۃ الشیخ الہندی
الشیخ الھندی لمحمد بن ابراھیم	نامی کتاب محمد بن ابراہیم حلبی المعروف
الحلبی المعروف بابن الحنبلی	بہ ابن حنبلی متوفی ۹۷۱ھ کی تصنیف
المتوفی سنۃ احدی وسبعین	ہے جس میں عبداللطیف مشہدی کا
تسعمائۃ، وھو رسالۃ فی الرد	رد ہے، مشہدی نے قاضی شہاب الدین
علی عبد اللطیف المشھدی	کی ایک کتاب کا رد لکھا تھا جسے انھوں نے
لما ردّ علی الشیخ شھاب الدین	آیت فسحقا لاصحاب السعیر
احمد الھندی فی تالیفہ علی	کی تفسیر میں لکھا تھا،
قولہ تعالیٰ فسحقاً لاصحاب السعیر [1]	

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں کوئی کتاب لکھی تھی، جس کا رد شیخ عبداللطیف مشہدی نے لکھا، اور مشہدی کے رد اور قاضی صاحب کی تائید میں شیخ محمد بن ابراہیم حلبی نے کتاب لکھی، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف عالم

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱۲،

ص ۶۰۰، تذکرہ علمائے ہند (ص ۸۰۰) میں اس کا نام فتاوی ابراہیم شاہی ہے مگر تجلی نور (جلد ۲ ص ۴۴) میں ہے "اصول ابراہیم شاہی بوی نوشتہ" اس میں نام کے اختلاف کے ساتھ اس کے عربی زبان میں ہونے کی تصریح ہے،

یہ واضح رہے کہ سلطان ابراہیم شاہ کے نام "فتاوی ابراہیم شاہیہ" نامی ایک کتاب قاضی احمد بن محمد جونپوری نے بھی لکھی تھی جس کے بارے میں صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ فتاوی قاضی خاں کے طرز کی کتاب ہے، اور ۱۰۰ کتب فقہیہ سے ماخوذ و مرتب ہے، قاضی احمد بن محمد جونپوری سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں گجرات سے جونپور آئے، سلطان نے اُن کو عنایات شاہانہ سے نوازا، اور عہدہ قضا پیش کیا، قاضی احمد نے اس کے شکرانہ میں سلطان کے نام پر یہ کتاب لکھی، طبقات اکبری نے قاضی شہاب الدین کی کتاب فتاوی ابراہیم شاہی وغیرہ کو عہد ابراہیمی کی زریں یادگار بتایا ہے،" وچند کتب و رسائل بنام او تصنیف شدہ مثل حاشیہ ہندی و بحر المواج و فتاوی ابراہیم شاہی و ارشاد[1]"

ارشاد | اس کتاب کا تذکرہ صرف تاریخ فرشتہ (ج ۲ ص ۳۰۶) میں ہے مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس فن اور کون سی زبان میں ہے،

معانیہ | اس کتاب کا تذکرہ صاحب کشف الظنون نے ان الفاظ میں کیا ہے،

"المعانیہ للشیخ شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الدولت آبادی الہندی ذکرھا فی آخر ارشادہ[2]"

معانیہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ہے، انھوں نے اس کا تذکرہ الارشاد کے آخر میں کیا ہے،

---

[1] طبقات اکبری ج ۳ ص ۰۰ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۰۸

آں محلہ و دروازۂ جنوبی مسجد مالہ مدفن یافت، ہنوز قبرش سنگیں اندر احاطہ

شن اسکول موجود است، بہ سبب وارید زمانہ نشان مکانات و مدرسہ مولانا

بے نشان گشتہ، اولاد ایشاں ہم باقی نماندہ[۱]"

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی ہے،

شہاب الدین چوں رفت از عالم دہر | بجنت گشت روشن آں مہ علم
وصالش کن رقم "تو تیرا سلام" | دگر با "شہاب الدین مہ علم"

"جیسا کہ تجلی نور میں ہے قاضی صاحب کی اولاد کا سلسلہ نہیں چلا، اُن کی صرف ایک

صاحبزادی تھیں، جن کا نکاح دہلی میں شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین غزنوی سے ہوا،

دروہیں اُن کے بطن سے قاضی صاحب کے تین نواسے شیخ صفی الدین، شیخ رضی الدین اور

شیخ فخر الدین پیدا ہوئے، اور سب نے اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی، اور انھی نواسوں نے اپنے

نانا کے علوم و معارف کی میراث پائی، اُن کے علاوہ قاضی صاحب کی علمی و روحانی اولاد اُن کے

تلامذہ تھے،

---

[۱] تجلی نور ج ۲ صفحہ ۳۷،

حیاتِ شبلی طبعِ دوم

یہ نو سو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری ہی

ہی نہیں، بلکہ درحقیقت مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس سالہ علمی، ادبی،

سیاسی تعلیمی، مذہبی، ملی اور قومی تحریکات و واقعات کی ایک مستند تاریخ بن گئی ہے، شروع میں

دیباچہ کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دیارِ مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی خدمت

کی تاریخ کے ساتھ ہر عہد کے مشاہیر علمائے درس و تصنیف کے حالات بھی آگئے ہیں، قیمت عہ

"منیجر"

اسلام میں کس قدر مقبول و متداول تھیں، اور اُن کی بعض کتابوں پر علمائے اسلام میں جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چلتا تھا، اور اس پر مستقل کتابیں لکھی جاتی تھیں،

وفات | قاضی صاحب نے درس و تدریس، افتاء اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ پوری زندگی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی، اور دہلی کالپی اور جونپور ہر جگہ اُن کا فیض جاری رہا مگر جونپور میں اُن کی زندگی کا تقریباً چالیس سالہ دینی و علمی دور حاصل زندگی ہے، اور اُن کے جوہر یہیں آکر کھلے، اُن کے حالات کا بیشتر حصہ اسی دیار سے تعلق رکھتا ہے، قاضی صاحب کی وفات ۲۵ رجب ۸۴۸ھ یا ۸۴۹ھ میں جونپور میں ہوئی، اور اپنے محلہ خواجگی میں دفن کئے گئے، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیا، میں ۸۴۸ھ ہے، اور اخبار الاصفیا، اور سبحۃ المرجان، کشف الظنون، تذکرہ علماے ہند، برکات الاولیاء، اور نزہۃ الخواطر میں ۸۴۹ھ درج ہے، اور اخبار الاصفیا، سبحۃ المرجان، تذکرۂ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر میں ۲۵ رجب کی تصریح ہے، البتہ برکات الاولیا میں ۲۵ رشوال ہے، اس سلسلہ میں فرشتہ کا بیان سب سے جداگانہ ہے، وہ لکھتا ہے کہ سلطان ابراہیم سے قاضی صاحب کو اس قدر محبت تھی کہ سلطان کی وفات کے غم میں اسی کی وفات ۸۴۰ھ میں وہ بھی عالم قدس میں تشریف لے گئے، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطان ابراہیم کی وفات کے دو سال کے بعد ۸۴۲ھ میں ان کا طائر روح روضہ رضوان کی طرف پرواز کر گیا،[۵]

تجلی نور میں وفات اور مدفن کے بارے میں تصریح ہے :-

"مولانا شہاب الدین در جونپور بمحلہ خواجگی قیام پذیر رفت، و بعد مدتے متصل

---

[۵] تاریخ فرشتہ، ج ۲ ص ۳۰۶،

غزل

از جناب اثیم کانپوری

وہ جانِ محبت ہیں، وہ جانانِ محبت　　وابستہ انھیں سے ہیں سب ارمانِ محبت
ہے دل کی تڑپ سلسلہ جنبانِ محبت　　نازک ہے بہت رشتۂ پیمانِ محبت
اتنا بھی نہ ہو کوئی پریشانِ محبت　　مرکز سے ہٹے جاتے ہیں ارمانِ محبت
جنبش میں ہمیشہ رہے دامانِ محبت　　ہر سانس رہے سلسلہ جنبانِ محبت
شرمندہ ہوں میں اک غلط اندازِ نظر کا　　اللہ ری بے ربطیٔ عنوانِ محبت
آنسو ہیں کہ امنڈے چلے آتے ہیں دمادم　　اک قطرۂ خوں دل میں یہ طغیانِ محبت
سوزِ ابدی شمع کی قسمت میں لکھا ہے　　پروانہ نہیں سوختہ سامانِ محبت
بن جائے گا آئینۂ تصویر سراپا　　حیرت کدۂ حسن میں حیرانِ محبت
یہ راہِ حقیقت ہے کوئی کھیل نہیں ہے　　جاتے ہو کہاں بے سروسامانِ محبت
روشن ہے انھیں سے دل تاریک کی دنیا　　جلوے جو چھپے ہیں تہِ دامانِ محبت

کچھ بھی تو اثیم اس کا ادا کر نہ سکے حق
ہم جان بھی دے کر ہیں پشیمانِ محبت

غزل

از جناب جمیل احمد صاحب ناگپوری

کیوں غم کا اثر لیتی دنیا بھی تماشائی　　شبنم کے گرے آنسو غنچوں کو ہنسی آئی
چھیڑا تھا ابھی میں نے افسانہ محبت کا　　دل کانپ اٹھا میرا وہ آنکھ جو بھر آئی

ادبیات

غزل

از جناب ماہر القادری

کس وہم میں اے دل! تو گرفتار ہوا ہے
آنکھوں[1] سے کہیں دوست کا دیدار ہوا ہے

کشتی کبھی قسمت سے جو پہنچی ہے کنارے
کشتی سے اترنا مجھے دشوار ہوا ہے

وہ راہ میں چلتے ہوئے نظروں کا تصادم
پیمانِ محبت سرِ بازار ہوا ہے

جو چاہے سزا دیجئے دل اف نہ کرے گا
دل، جرمِ محبت کا گنہگار ہوا ہے

پرسش ہے، دعا ہے، نہ دوا ہے نہ تسلی
ایسے بھی علاجِ دلِ بیمار ہوا ہے

ہر سمت ہیں سجدوں کے نشاں راہِ وفا میں
تب جا کے کہیں راستہ ہموار ہوا ہے

یہ گرمیٔ احساس مری تشنہ لبی کی
اک شعلہ صراحی سے نمودار ہوا ہے

آتی ہے طبیعت تو پھر آتی ہے اندھا دھند
جب عشق ہوا ہے تو دھواں دھار ہوا ہے

یہ حال ہے سایہ بھی مرے واسطے ماہر
تپتی ہوئی جلتی ہوئی دیوار ہوا ہے

یہ ہجر کی شب ہے کہ شبِ قدر ہے ماہر
غم خانہ مرا جلوہ گہِ یار ہوا ہے

---

[1] لا تدرکہ الابصار

مطبوعات جدیدہ

صبح مولانا ابو الکلام آزاد نمبر - مرتبہ جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی، تقطیع خورد، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰۔ قیمت سے، پتہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، علی منزل، کوچہ پنڈت، دہلی ۶

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی یادگار میں بہت سے رسالوں نے خاص نمبر شائع کیے، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، زیر نظر نمبر میں مولانا کی شخصیت، ادب و صحافت، افکار و نظریات اور بعض دوسرے کمالات سے متعلق سولہ مضامین شامل ہیں، صف اول کے ادیبوں اور اہل قلم میں مولانا عبد الماجد دریابادی، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر سید عابد حسین، مالک رام اور [illegible] احمد سرور کے مضامین قابل ذکر و لائق مطالعہ ہیں، [illegible] "منظر" (عتیق صدیقی) بھی اہم مضمون ہے، اور بڑی محنت و تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ دو مضامین "افکار آزاد اور چند قومی مسائل" (ضیاء الحسن فاروقی) اور "مولانا آزاد اور فلسفۂ اشتراکیت" (نصرت بانو روحی) میں مولانا کے افکار و خیالات کی بعض تعبیریں و تشریحیں محل نظر ہیں، گو اس نمبر کے بعض مضامین پرانے ہیں، تاہم اس سے اس کی قدر و قیمت میں فرق نہیں آتا، اور یہ مولانا پر نکلنے والے اچھے نمبروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، فاضل مرتب نے اس کو سلیقہ سے مرتب کر کے مولانا سے اپنی عقیدت کا حق ادا کیا ہے۔

شاعر ناوک نمبر - مرتبین جناب اعجاز صدیقی، مہندر ناتھ، ڈاکٹر محمد حسن

ہر وقت تصور رہے میں ہوں ترے جلوے میں
نقش نظر آتی ہے صحرا کی بھی تنہائی

معلوم نہیں دنیا کیوں راہ میں حائل ہے
میں ان کا تمنائی وہ میرے تمنائی

ہم نے شب غم اپنی اس طرح گزاری ہے
سینے میں تری یادیں لیتی رہیں انگڑائی

بگڑی ہی ہوئی تقدیر اس در پہ سنورتی ہے
مایوس نہ ہو جانا اے شوق جبیں سائی

جب نام سنا ان کا رکنے نہ رکے آنسو
ہونا ہی پڑا مجھکو شرمندہ رسوائی

اک جام میں کیا ہوگا، لا اور پلا ساقی
وہ دیکھ ہوا سنکی وہ دیکھ گھٹا چھائی

قسمت تو مری دیکھو محفوظ رہا ساحل
سو بار مری کشتی طوفان سے ٹکرائی

طلسم شوق

از جناب وحید الدین خاں ایم اے علیگ

قدم منزل کی جانب خود بخود بڑھنے لگے پیہم
حجابات مظاہر یک بیک اٹھنے لگے پیہم

یہ ہے ادنیٰ کرشمہ ارتقائے شوق پیہم کا
کہ اصنام نگاہ شوق بھی گرنے لگے پیہم

کرن پھوٹی افق سے تیرگی ہونے لگی رخصت
طیور خوش نوا حمد و ثنا کرنے لگے پیہم

ادھر شبنم نے منہ دھو کر نکھارا غنچہ و گل کو
ادھر جھونکے نسیم صبح کے چلنے لگے پیہم

عناصر کی کشاکش نے دکھائے دن یہ دنیا کو
کہ صدہا نقش ہائے زندگی مٹنے لگے پیہم

سمجھ میں آ گیا کیا راز تخلیق دو عالم کا
کہ اجرام عناصر راہ سے ہٹنے لگے پیہم

یہ کون آیا تخیل میں کہ ہر تار نفس مہکا
کہ کلیاں مسکرائیں پھول بھی ہنسنے لگے پیہم

کہیں پھولوں کی نکہت میں کہیں کلیوں کی نزہت میں
ہزاروں پردہ ہائے رنگ و بو اٹھنے لگے پیہم

نظر آنے لگے ہر شے میں جلوے حسن قدرت کے
نقوش ماسوا آئینہ سے مٹنے لگے پیہم

طلسم شوق ٹوٹا مظہر حسن ازل بن کر
ہوس کے جو نشیمن تھے وہی جلنے لگے پیہم

کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس نمبر کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے مرتب نے اعتراف کیا ہے کہ "مخرب اخلاق ہونے کا الزام اب بھی اس (فلم) پر عائد ہے، اور حقیقت پسندانہ اور زندگی کی صحیح و سچی عکاسی کرنے والی فلمیں کم مقبول ہوتی ہیں"۔ اور یہ واقعہ ہے کہ موجودہ فلمی صنعت سے سماجی و اخلاقی اصلاح اور دوسرے فوائد کم حاصل ہوتے ہیں اور نوجوان ان سے اخلاقی جرائم کا سبق سیکھتے ہیں، اور کم سے کم مشرقی آداب و تہذیب سے میل نہیں کھاتا، اداریہ میں ادب اور فلم کا بنیادی مقصد تفریح بتایا گیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ان سے مفید نتائج پوری طرح برآمد نہیں ہوسکتے، اخلاقی اقدار کو اضافی بتانا عجیب ہے، اس نمبر میں فلم سازی خصوصاً ہندوستانی فلموں سے متعلق متنوع معلومات اور مشہور فلمی کلاکاروں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔

فروغ اردو محسن کاکوروی نمبر۔ مرتبہ جناب محمد حسین شمس علوی صاحب، تقطیع کلاں کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت ستےر، پتہ ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک، لکھنؤ۔

فروغ اردو کے خاص نمبر اکثر نکلتے رہتے ہیں، یہ نمبر اردو کے مشہور نعت گو حسان الہند حضرت محسن کاکوروی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے شائع کیا گیا ہے، وہ اگرچہ بڑے پایہ کے شاعر تھے، اور ہر صنف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے، مگر عشق نبوی نے مدح رسول کے سوا ان کی زبان کو اور اصناف سخن سے زیادہ آلودہ نہیں ہونے دیا، نعت گوئی مشکل بھی ہے اور نازک بھی، انھوں نے احتیاط اور ادب و محبت کے حدود میں رہ کر ایسی گلکاریاں کی ہیں جس کی نظیر اردو شاعری میں نہیں ملتی، اس نمبر کے مضامین میں محسن کے نعتیہ کلام کے خصوصیات اور نعت گوئی میں ان کا کمال دکھایا گیا ہے اور

ندا فاضلی صاحبان تقطیع متوسط، کاغذ بہتر، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۴۴ ہ
قیمت ۶/ پتہ مکتبہ قصرالادب، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶ بمبئی ۸ بی۔سی

یہ مشہور ادبی رسالہ شاعر کا ناولٹ نمبر ہے، جو اس حیثیت سے قابل ذکر ہے کہ اس میں موجودہ دور کے سترہ ناول نگاروں کے ناول اور ناولٹ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، کوثر چاند پوری، سہیل عظیم آبادی اور رام لعل وغیرہ مشاہیر ناول نگاروں کے نام اس کی کامیابی کی ضمانت ہیں، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، رام لعل، واجدہ تبسم اور جوگندر پال کے ناول گہرے تجربات و مشاہدات پر مبنی اور تکنک کے اعتبار سے دلکش ہیں، شروع میں ڈاکٹر محمد حسن نے موجودہ اردو ناول نگاری کا سرسری تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس نمبر کی تزئین و آرائش کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے، عنوانات کی فہرست کے ساتھ ہی ناول و ناولٹ نگاروں کے فوٹو اور اندرونی سرورق پر ناولٹوں کے مرکزی خیال کو تصویروں کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے، اس طرح یہ صوری حیثیت سے بھی دیدہ زیب ہے، ہر ناول نگار کے حالات و ادبی کمالات کا مختصر مرقع بھی دیا گیا ہے، شاعر کے گذشتہ خاص نمبروں کی روایت کے مطابق یہ نمبر بھی ضخیم اور بلند پایہ ہے جو اردو ناول میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

آجکل فلم نمبر مرتبہ جناب شہباز حسین صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۴۲ پتہ: پبلیکشنز ڈویزن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱

اس خاص نمبر میں فلم سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت اس کے مختلف پہلوؤں پر مضامین شائع کیے گئے ہیں، اور فلموں کے آغاز و ارتقا کی سرگذشت، ان کے بننے کے طریقے قومی فلمی اداروں، علاقائی زبانوں کی مشہور فلموں اور ان کے سماجی و جمالیاتی پہلوؤں وغیرہ

مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا گیا تھا جس کو کمیٹی کے ایڈیٹوریل بورڈ کے کنوینر اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر جناب امرت لعل عشرت نے ترتیب دیا ہے، مضمون نگاروں میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی احتشام حسین اور خود فاضل مرتب اور شعراء میں آنجہانی تلوک چند محروم، نذیر بنارسی اور نازش پرتاپگڈھی کے نام قابل ذکر ہیں، جگن ناتھ آزاد کا مضمون "غالب اور اقبال" گو پہلے چھپ چکا ہے، مگر خاصے کی چیز ہے، سب سے زیادہ مبسوط مضمون "غالب کا مذہبی عقیدہ" (سید سلیمان عباس رضوی) ہے، اس میں غالب کو شیعی ثابت کیا گیا ہے، ان کی شیعیت صحیح ہو یا غلط، اس مضمون کے انداز تحریر سے دوسرے فرقہ کے لوگوں کی دل آزاری ہو سکتی ہے، مجموعی حیثیت سے غالب پر یہ اچھی پیش کش ہے۔

سیر غالب ۔ مرتبہ جناب حکیم ابوالحسنات بیدل فاروقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۶۔ قیمت للعہ پتہ :۔ مکتبہ دار الحسنات میرکوٹ، سہارن پور۔

یہ کتاب مرزا غالب مرحوم کی مختصر سوانح عمری ہے، اس میں ان کے خاندانی حالات پیدائش سے وفات تک کے واقعات اور اخلاق و عادات کے ساتھ ان کے ادبی کارناموں کا تذکرہ ہے، تصنیفات پر تبصرہ اور شاعری و انشاء پردازی کی خصوصیات وغیرہ بھی بیان کی گئی ہیں، مصنف اگرچہ سن رسیدہ ہیں لیکن غالباً یہ انکی پہلی تصنیف ہے، اس لیے اسکی ترتیب میں ناہمواری، طرز تحریر میں الجھاؤ، الفاظ اور جملوں کے دروبست میں ناپختگی اور زبان و بیان میں خامی پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ اس میں رطب و یابس ہر قسم کا مواد شامل کر لیا گیا ہے، اس کے باوجود مصنف کی محنت قابل ستائش ہے۔

بعض مضامین میں ان کی شخصیت اور حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، آخر میں ان کے نعتیہ کلام کا مختصر انتخاب ہے، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر انوار الحسن کے مضامین اور مولانا عبد الماجد دریابادی کا پیغام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جمعیۃ ٹائمز مسلم یونیورسٹی نمبر - مرتبہ جناب علی محمد صاحب تقطیع کلاں، قیمت عہ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ پتہ:- ۲۱۶ ٹیا محل دہلی ۶

دہلی کے ہفت روزہ جمعیۃ ٹائمز کے علی گڑھ نمبر کا غلغلہ کئی مہینوں سے بلند تھا، اسکی تیاریاں ختم ہو چکی تھیں، کہ مرکزی حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی، اس لیے فسادات سے متعلق حصہ شائع نہیں ہو سکا، اور اس نمبر میں صرف یونیورسٹی سے متعلق مضامین ہیں جس میں یونیورسٹی کی اہمیت، اس کے مقاصد اور گذشتہ و موجودہ حالات کا ذکر اور یونیورسٹی کی خصوصیات کو جس طرح ختم کیا گیا ہے، اس کی تفصیل ہے، اور آیندہ پیش ہونے والے یونیورسٹی بل کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی اور حکومت سے اس کے کردار کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا ہے، بعض مضامین میں لہجہ جذباتی اور سخت ہو گیا ہے، ایک مضمون سرسید کے تعلیمی نظریات پر بھی ہے، اور بعض موثر نظمیں بھی ہیں، اس نمبر کی اشاعت نے وقت کی ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مرزا غالب - مرتبہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت سے روپئے:- (۱) پرشوتم سنگھ سیٹھی، رادھا بھون، رٹیچ روڈ، لکھنو، (۲) ڈاکٹر امرت لعل عشرت، رائے بھون، بھیلو پور، کالونی، بنارس۔

غالب صدی کے موقع پر غالب صدسالہ جشن کمیٹی یو، پی کی جانب سے نظم و نثر کے

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے۔ قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب اور کیا اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں۔ (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے چند ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ۔ قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل۔ مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین۔ قیمت: ؎ ۵ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم۔ قیمت: عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جنان بنا دیا ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی اعظمی ایم اے قیمت: لعہ ۵

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

قادر نامہ غالب ۔ مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب تقطیع خورد

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۲، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۔

پتہ : شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۔

جناب عبد القوی دسنوی صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، غالب پر متعدد تحقیقی مضامین اور کتابچے لکھ چکے ہیں، اب انھوں نے قادر نامۂ غالب کا متن ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، یہ مختصر اور دلچسپ منظوم کتاب مرزا نے اپنے متبنی عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسن علی خاں کے لیے لکھی تھی، گو اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن عبد القوی دسنوی صاحب نے اس کو اس پروگرام کے مطابق شائع کیا ہے جو شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے بچوں کو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ لکھانے کے لیے بنایا ہے اور جس کے ماتحت وہاں سے اس نوع کی اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، شروع میں لائق مرتب کے قلم سے ایک مختصر وجامع پیش لفظ بھی ہے، اس میں قادر نامہ کے غالب کی تصنیف ہونے کے دلائل تحریر کیے گئے ہیں، امید ہے غالب کے قدر دانوں کے حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

نقشہائے رنگ رنگ ۔ مرتبہ جناب عطا کاکوی صاحب، تقطیع خورد

کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۹۶ قیمت ۳ ؎ پتہ : عظیم الشان بکڈپو سلطان گنج، پٹنہ ۔ ۶

یہ غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر انتخاب ہے، جو غزلیات، قطعات، قصائد، رباعی مثنوی اور خمسہ وغیرہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، مرزا کو اپنی فارسی شاعری پر زیادہ ناز تھا، اس حیثیت سے انکے فارسی کلام کی یہ قدر دانی لائق تحسین ہے، مگر اس کی قیمت زیادہ ہے ۔

' ض '

جلد ۱۰۸ نمبر ۵ (۵۲۰) نومبر ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

جلد ۱۰۸ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۱ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

تصحیح گذشتہ مہینہ جمیل احمد صاحب ناگپور کے نام سے جو غزل شائع ہوئی ہے وہ محمد شرف الدین صاحب ساحل کی ہے، غلطی سے جمیل احمد صاحب کے نام سے شائع ہو گئی ہے، مقطع میں محفوظ رہی کے بجائے محفوظ رہے" چھپ گیا ہے، ناظرین تصحیح کر لیں۔ "م"

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت نسل و رنگ نژاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اُسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ مُعینُ الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۔/ے

بڑے اہتمام سے مشاعرہ کرتے تھے، اُن کی موت سے ایک استاد فن شاعر اٹھ گیا، رمضان المبارک میں موت یوں بھی ذریعۂ مغفرت ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مزید رحمتوں سے نوازے،

عارف عباسی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، وہ اس دور کے ممتاز غزل گو اور جگر کے طرز کے کامیاب مقلد تھے انھوں نے اپنی ظاہری وضع قطع بھی انہی کی جیسی بنائی تھی، ان کا مکان اعظم گڈھ سے متصل ضلع بلیا میں تھا اسلئے اعظم گڈھ میں اُن کے پرانے تعلقات تھے اور یہاں برابر اُن کی آمد و رفت رہتی تھی پہلے جب اعظم گڈھ آنا ہوتا تھا تو دار المصنفین ضرور آتے تھے اور اپنے تازہ کلام سے محظوظ کرتے تھے، مگر ادھر کچھ دنوں سے اس وضعداری میں فرق آگیا تھا، عرصہ تک اُن کی غزلیں معارف میں چھپتی رہیں، اُن کے تغزل میں بڑی لطافت و پاکیزگی تھی، ابتدا میں راجہ صاحب بلیا کے لڑکوں کے اتالیق رہے تھے، اسلئے درباری آداب اور علم مجلس کے بڑے ماہر تھے، اُن کی عمر ساٹھ باسٹھ سال کی رہی ہوگی، ادھر کچھ دنوں سے کچھ قلبی شکایت ہوگئی تھی، اسی نے مرض الموت کی شکل اختیار کر لی، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے،

اتر پردیش کی حکومت نے جو اُردو اکیڈمی قائم کی ہے بعض حلقوں میں اس کا بڑا خیر مقدم ہو رہا ہے اور اُس سے اُردو کے بارہ میں بڑی امیدیں قائم کی جارہی ہیں، اکیڈمی کے جو اغراض و مقاصد شائع ہوئے ہیں، ان سے اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اب اُردو سے دشمنی باقی نہیں رہی، اگر ان مقاصد پر عمل ہو، تو اُردو کو پنپنے کا کچھ موقع مل سکتا ہے، پہلے اُردو کے نام سے جو رقم بھی اُردو کتابوں پر انعامات اور اُن کی طبع و اشاعت دار المطالعوں و لائبریریوں میں ان کی خریداری کے لئے جو حقیر رقم ملتی تھی، وہ بھی ہندی کے طفیل میں، مگر اب ان کاموں کے لئے ایک معقول رقم اُردو کے نام سے مخصوص کر دی گئی ہے، باقی اُردو کی بقا و ترقی کے وسائل اور اس سے متعلق شکایتوں کے ازالہ وغیرہ کے بارہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں، اصل سوال اُن پر عمل کا ہے، ورنہ اس قسم کے وعدے تو ہر حکومت

شذرات

افسوس ہے کہ مشہور ماہر تعلیم سید اسد اللہ صاحب کاظمی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند تھے، حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے استاد رہے، پھر صوبہ متحدہ کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوگئے، اور ڈپٹی ڈائرکٹری کے عہدہ تک پہنچے، اسی زمانہ میں ریاست کشمیر کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوگئے، ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد یونسکو کی طرف سے کئی سال تک حکومت بغداد کے مشیر تعلیم رہے، اس طرح ان کی پوری عمر تعلیمی تجربات میں گذری، مسلمانوں میں وہ ماہر تعلیم مانے جاتے تھے، ان کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی، اور ان کی تعلیمی تنظیموں کو اپنے تجربات اور مفید مشوروں سے فائدہ پہنچاتے تھے، علم و ادب کا بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، مذہبی مطالعہ بھی وسیع تھا، وہ راسخ العقیدہ اور پابند مسلمان تھے، کلام مجید کے مطالعہ کا خاص ذوق تھا، بغداد کے قیام کے زمانہ میں کچھ عربی بھی سیکھ لی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا، عالم آخرت کی نعمتوں سے بھی سرفراز فرمائے۔

دوسرا حادثہ اردو کے بزرگ شاعر انقر موہانی کی وفات کا ہے، اپنے معاصرین میں وہ تنہا رہ گئے تھے، ان کی عمر کا اب کوئی شاعر زندہ نہیں ہے، وفات کے وقت ۹۰ سال کی عمر تھی، وہ اساتذۂ قدیم کی طرح زبان کی باریکیوں پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اور شاعری میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، ان کے دامن تربیت میں بہت سے شعراء رہے، ان کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا، صاحب قلم بھی تھے، ایک زمانہ میں ایک رسالہ جام جہاں نما کے نام سے نکالتے تھے، مگر عرصہ سے لکھنا چھوٹ گیا تھا، مگر مشق سخن برابر جاری تھی، کبھی کبھی معارف میں بھی اپنا کلام بھیجتے تھے، حاجی وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، انکی یادگار ہیں بہرحال

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

مسلمانوں کا منصب و مقام

یہ سارا معجزہ اسلام کا تھا، اسی نے اُن میں زندگی کی روح پھونکی تھی۔ اور اسی کے بدولت انھوں نے دنیا میں سربلندی حاصل کی، اس لئے جب سے اس کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا دین کے ساتھ دنیا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور حکومت و اقتدار، علم و فن اور تہذیب و تمدن بھی اُن سے رخصت ہو گئے، اور وہ دنیا میں ایک فلاکت زدہ قوم بن کر رہ گئے۔ اور جن قوموں کی انھوں نے امامت کی تھی۔ خود اُن کے غلام بن گئے، اقبال اور حالی دونوں نے اس زبون حالی کا ماتم کیا ہے۔ لیکن اقبال نے ماتم کے ساتھ مسلمانوں کے امراض اور اُن کے زوال کے اسباب کی تشخیص کر کے اس کا علاج بھی بتایا ہے، اور ان پر زندگی کے اسرار و رموز ظاہر کر کے دوبارہ اُن میں روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، ان کا پورا کلام اس روح سے معمور ہے، وہ مسلمانوں کی زبون حالی پر اُن کو دل شکستہ اور مایوس نہیں کرتے، بلکہ ان کا اصلی منصب و مقام

کرتی چلی آئی ہے، جن پر آج تک عمل نہیں ہوا، اب اکیڈمی کے ذریعہ اس کا تجربہ کرنا ہے،

اُردو کا اصل مسئلہ اس کی تعلیم کا ہے، جب تک ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں اس کا قابل اطمینان انتظام نہیں ہوتا، اس قسم کی اکیڈمیوں کے قیام سے کوئی بڑا فائدہ نہیں، اُردو کے مطالبات سے گورنمنٹ پوری طرح واقف ہے، مرکزی انجمن ترقی اُردو اور دوسری مجالس ان کو بار بار پیش کر چکی ہیں، اگر وہ واقعی حکومت اُردو کے معاملہ میں مخلص ہے تو ان مطالبات کو مان کر اس کا ثبوت دینا چاہئے، ورنہ کم سے کم اُردو کو جو حقوق بھی ملیں اُس کی حیثیت قانونی ہونی چاہئے، محض اُردو اکیڈمی کے قیام سے اُردو زندہ نہیں رہ سکتی،

اگر اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر عمل درآمد ہو تو بھی غنیمت ہے جو بڑی حد تک اُردو کے ساتھ اُس کے ممبروں اور عہدہ داروں کی ہمدردی اور دلچسپی پر موقوف ہے، ممبروں کے نام کا تو ابھی اعلان نہیں ہوا ہے، اس کے صدر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی اور سکریٹری تربھون پرشاد ہوئے ہیں جن کو اُردو سے کوئی تعلق نہیں، اگر اکیڈمی کے ذریعہ واقعی کچھ کرنا ہے تو ان دونوں عہدوں کے لئے ایسے اشخاص کا انتخاب ہونا چاہئے جو اُردو سے پوری طرح واقف ہوں اور جن کو اس سے ہمدردی بھی ہو، سرکاری آدمی کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لحاظ سے صدارت کے لئے سب سے موزوں شخصیت پنڈت آنند نرائن مُلا کی ہے، سکریٹری کے عہدہ کے لئے بھی ایسے اشخاص مل سکتے ہیں، ایک نام تو حیات اللہ صاحب انصاری کا ہے، جن کی حیثیت سرکاری بھی ہے، اور وہ اردو کے مشہور وکیل اور ادیب بھی ہیں

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کے خاطر نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (طلوعِ اسلام)

ایمان و یقین اس منصب و مقام کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ اقبال نے آخری شعر میں اشارہ کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے میں وہ اوصاف پیدا کریں، جنھوں نے اُن کو دنیا میں سربلند کیا تھا، اور جن کی بدولت وہ صدیوں تک تمام دنیا کی قوموں کی امامت کرتے رہے، یہ وصف اسلام سے شیفتگی اور اس کی تعلیمات پر عمل سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نام ہے چند حقائق پر یقین واثق، ایمان کامل، اُن کے مطابق عمل، اور اس کے لئے ایثار و قربانی کا، اس راہ میں جو مشکلات و مصائب بھی پیش آئیں اُن کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے، اگر جان دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو بھی بلا تکلف نثار کر دیا جائے، اور اس کو سب سے بڑی سعادت، اور سب سے بڑی کامیابی سمجھا جائے،

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ شہادت کے موقع پر صحابۂ کرام کی زبان سے بے اختیار "فزت برب الکعبۃ" نکل جاتا تھا،

اسلام تو ایک وسیع نظامِ حیات ہے جس سے زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے، لیکن اس کا اصل الاصول توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے، یہ کہنے کو تو دو لفظ ہیں، لیکن اسلام کی ساری تعلیمات اور نظام کا خلاصہ اس میں آجاتا ہے، توحید ہی وہ منبع ہے جس سے انسانی فوز و فلاح کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں، توحید کے معنی یہ ہیں کہ

بتا کر ان میں زندگی کا جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں :-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں ہے تو

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے (شمع و شاعر)

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں :-

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

سے قوموں کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے جنّت و جہنّم بھی عمل ہی کا نتیجہ ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان بڑے بڑے کارنامے جوشِ عمل ہی کے بدولت انجام دیتا ہے، اسی سے میدان جہاد میں مردِ مومن کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

زندگی کا فلسفہ | ایک نظم میں انھوں نے حضرت خضر کی زبان سے قوموں اور ملتوں کی موت و حیات کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے، جس میں زندگی کے اہم عناصر آگئے ہیں

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

غیر اللہ کا خوف بالکل دل سے نکل جائے توحید انسان میں ایسی قوت پیدا کردیتی ہے کہ پھر وہ دنیا کی کسی طاقت کو نگاہ میں نہیں لاتا، اعلاء کلمۃ اللہ کے معنی ہیں دنیا میں نیکی اور بھلائی کی تبلیغ، اور اس کا عملی نفاذ اور قیام، اس بارِ گراں کی حامل امت اسلامیہ ہے، دنیا کا کوئی نظام، کوئی فلسفہ موجودہ اصطلاح میں کوئی ازم بھی اس پر ایمان ویقین کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ اسلام نام ہی ہے چند ابدی صداقتوں پر یقین واثق کا، اس فلسفہ کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

دین و دنیا کی تمام کامیابیوں کا راز اسی ایمان ویقین پر ہے،

گمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
ولایت، بادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(طلوعِ اسلام)

عمل اور جوشِ کردار | کسی مقصد سے شیفتگی کا لازمی نتیجہ اس کے لئے عملی جد وجہد ہے، اسی

اور نگارنگ پیرایوں میں اس جذبۂ عشق کی عظمت و اہمیت بیان، اور اس کو دوبارہ مسلمانوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے نزدیک عشق کی اصل اس دنیا کے عناصر سے ماوراء، اور اس کی قوت بے پناہ ہے، اس کی نگاہ سے سنگ خارا کا جگر شق ہو جاتا ہے، عشق خود سراپا حق اور اس کی قوت حق کی قوت بن جاتی ہے، اس کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہو جاتا ہے، جب انسان کی خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے، تو اس کی طاقت سارے عالم کی حکمراں اور سارے دنیا کے جھگڑوں میں حکم اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اور حکومتیں اس کی تابع فرمان بن جاتی ہیں،

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
از نگاہِ عشق خارا شق شود — عشقِ حق آخر سراپا حق شود
از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرماں دہِ عالم شود
در خصوماتِ جہاں گردد حکم — تابعِ فرمانِ او دارا و جم

دونوں عالم عشق کے آثار سے معمور ہیں، عشق ہی کی بدولت بنی آدم خلافت ارضی کا مستحق قرار پایا،

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق — ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق
"حرفِ انی جاعل" تقدیرِ او — از زمیں تا آسماں "تفسیرِ او"

(اسرار خودی)

ایک نظم میں عشق کی عظمت ان الفاظ میں بیان کی ہے،

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل و گہر پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کے بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے
(خضرِ راہ)

عشق کی عظمت | اقبال نے عشق کو بڑے وسیع اور مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے ان میں قدرِ مشترک کسی اعلیٰ و برتر مقصد سے والہانہ شیفتگی اور اس کے لئے جان فروشی و جان سپاری ہے، ہر مقصد اور نصب العین کی کامیابی کے لئے خواہ دینی ہو یا دنیاوی والہانہ لگن ضروری ہے، یہی لگن انسان میں وہ جذبہ و قوت پیدا کرتی ہے جس سے وہ اس راہ میں ہر قربانی اور اپنا سارا خانماں لٹانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، مغربی قومیں مادی ترقی کے لئے کیسی کیسی قربانی اور جانفروشی کرتی ہیں دین کا جذبۂ عشق تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے ؛ "الذین آمنوا اشد حباً للہ" اس کی راہ میں موت بھی حیاتِ ابدی ہے "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء عند ربھم" اس عشق کی بدولت انسان ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے جو عام طاقتِ بشری سے باہر ہیں، جب تک مسلمانوں میں اسلام کے ساتھ یہ جذبۂ عشق رہا انھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے۔ اور صدیوں دنیا کے بڑے حصہ پر حکمراں رہے، اور دوسری قوموں کو علم و عرفان اور تہذیب و تمدن کا درس دیتے رہے، جب سے یہ جذبہ سرد پڑا، ان پر زوال طاری ہوگیا، اور وہ خود ان قوموں کے غلام بن گئے۔ اس لئے اقبال نے بڑے موثر

عقل در پیچاک اسباب وعلل　　عشق چوگاں باز میدانِ عمل
عشق صید از زورِ باز و افگند　　عقل مکّار است و دامے می نہد
عقل را سرمایہ از بیم و شک است　　عشق را عزم و یقیں لاینفک است
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں　　عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند　　عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن　　عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل گوید شاد شو آباد شو　　عشق گوید بندہ شو آزاد شو
عشق را آرام جاں حرّیت است　　ناقہ اش را ساربان حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد　　عشق با عقل فسوں پرور چہ کرد

یعنی مومن اور عشق لازم ملزوم ہیں، دونوں کا وجود ایک دوسرے سے وابستہ ہے عشق کے سامنے ناممکن بھی ممکن ہے، عقل اسباب وعلل کے پھیر میں گرفتار رہتی ہے، اور عشق میدانِ عمل کا کھلاڑی ہے، عشق اپنے قوتِ باز سے شکار کرتا ہے اور عقل مکار شکار کو پھنسانے کے لئے جال بچھاتی ہے، عقل کا سارا سرمایہ خوف اور شک وشبہات ہیں، اور عشق کا بہتر عزم ویقین ہے، عقل دنیا میں ہوا کی طرح ارزاں ہے، اور ہر جگہ پائی جاتی ہے لیکن عشق کمیاب اور بڑی قیمتی چیز ہے، عقل کا استحکام چون وچرا سے ہوتا ہے، اور عشق چون وچرا سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے، عقل کہتی ہے کہ اپنے کو دنیا کے سامنے پیش کرو لیکن عشق کہتا ہے کہ پہلے اپنا احتساب کرو، عقل کہتی ہے کہ دنیا میں شاد آباد رہو، عشق کہتا ہے کہ خدا کا بندہ بن کر آزاد رہو، عشق کے لئے حرّیت آرام جان ہے، اس کے ناقہ کا ساربان حریت ہے، تم نے سنا نہیں کہ میدان جنگ میں عشق نے عقلِ فسوں پرور کے ساتھ کیا کیا؟

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ایک نظم میں علم و عشق کا موازنہ کرکے عشق کی عظمت و برتری دکھائی ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن — عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن — عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں — عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں

عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں — عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام — شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام

عشق پہ بجلی حلال عشق کا حاصل حرام — علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

(ضربِ کلیم)

یہ واضح رہے کہ علم سے ان کی مراد دنیاوی علوم ہیں جن کی بنیاد ذہنی قیاسات پر ہوتی ہے، اور ان کا مقصد ہی انسان کی محض ذہنی و دماغی تربیت ہے، ان کو وجدان سے بحث نہیں ہوتی، اس لئے ان سے ذہنی و دماغی تربیت تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن انسان ایمان و یقین کی لذت سے محروم رہتا ہے جس پر انسانی فوز و فلاح دارو مدار ہے۔

ایک دوسری نظم میں عقل کے مقابلہ میں عشق کی عظمت دکھائی ہے، چند اشعار یہ ہیں:

مومن از عشق است و عشق از مومن است — عشق را ناممکن ما ممکن است

خدا تک وصول کا ذریعہ صرف اتباعِ رسول ہے، اس لئے حق کے سرچشمہ سے قوت حاصل کرو، اور ہوس کے لات وعزا کو توڑ ڈالو، عشق کی حکومت سے فوج آراستہ، فاران عشق کی چوٹی پر جلوہ گری کرو، اس وقت خدا تم کو اپنے انعامات سے نوازنے گا، اور استخلاف فی الارض کا وعدہ پورا کرے گا، یہ محض شاعری نہیں خیر القرون کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے، یہ اسلام کے عشق ہی کا کرشمہ تھا کہ ایک اُمی قوم نے اس دور کی تعلیم یافتہ اور متمدن ترین قوموں کا تختہ الٹ دیا،

اقبال کا مرد مومن اور اس کے اوصاف

اقبال کے کلام میں حکیمانہ خیالات کا ایک عالم ہے، اس میں انھوں نے قوموں اور ملتوں کی موت وحیات اور عروج وزوال کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے، مگر ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصلی غرض وغایت مسلمانوں کی تجدید واصلاح اور دینی روح کے ذریعہ اُن میں زندگی کی آب وتاب پیدا کرنا ہے، اس لئے انھوں نے ان کے ایک ایک مرض کی نشان دہی کی ہے، اور اس کا علاج بتایا ہے، ان کا اصلی منصب ومقام واضح کیا ہے، اُن کے عروج واقبال اور نکبت وادبار کی داستان سُنائی ہے، اس کے اسباب واضح کئے ہیں اور دوبارہ اس منصب ومقام اور دنیا میں عروج واقتدار حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی ہیں، اور اُن کو اس تکرار کے ساتھ اور اتنے رنگا رنگ پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ اگر اس کا ایک حصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی،

وہ مسلمانوں میں جو اوصاف اور جو روح پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس کو انھوں نے مردِ حق، مردِ حُر، مردِ مومن اور قلندر کی مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے، اس سے مردِ مومن

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) نظموں کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں،

اس کے بعد واقعہ کربلا سے عقل پر عشق کی فتح دکھائی ہے،

عشق کی تکمیل اور اس میں زور و قوت محبت و اتباعِ رسول سے پیدا ہوتی ہے جو سارے جہان کا مالک بنا دیتی ہے،

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است   آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ است

دل ز عشقِ او توانا می شود   خاک ہمدوشِ ثریا می شود

عاشقانِ او ز خوباں خوب تر   از حسینانِ جہاں محبوب تر

عاشقی محکم کن از تقلیدِ یار   تا کمندِ تو شود یزداں شکار

محکم از حق شو، سوے خود گام زن   لات و عزاے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق   جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خداے کعبہ بنوازد ترا

شرحِ انّی جاعلٌ سازد ترا[1]   (اسرارِ خودی)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مسلمان کا دل ہے، اس کی ساری آبرو اسی پاک نام سے وابستہ ہے، مسلمان کا دل رسول اللہ کی محبت ہی سے توانا ہوتا ہے اور اس سے خاک بھی ثریا کی ہمدوش ہو جاتی ہے، رسول اللہ کے عاشق سارے دنیا کے حسینوں سے زیادہ حسین اور سارے محبوبوں سے زیادہ محبوب ہیں، رسول اللہ کی تقلید و اتباع ہی سے عشق میں استحکام پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے مسلمان کی کمند یزداں شکار بنتی ہے یعنی

---

[1] عشق پر اقبال نے اتنی نظمیں کہی ہیں کہ ان پر ایک مستقل مضمون لکھا جاسکتا ہے، ہم نے صرف بعض

وہ جانوروں کی موت ہے، بلکہ خدا سے وہ موت چاہتا ہے جو اس کی راہ میں جذبۂ سرفروشی کی انتہا اور رزمگاہِ شوق کی آخری تکبیر ہوتی ہے، اگرچہ ہر قسم کی موت مومن کے لئے شیریں ہے لیکن اولادِ مرتضیٰ کی موت چیز ہی دوسری ہے، دنیاوی بادشاہوں کی جنگ تو غارتگری ہے لیکن مومن کی جنگ سنتِ پیغمبری ہے، مومن کی جنگ خدا کی جانب ہجرت، اور اس کے لئے ترکِ ماسوا کا نام ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو اسلام کی رہبانیت فرمایا ہے، اس نکتہ کو شہید کے علاوہ دوسرا نہیں سمجھ سکتا، جو اپنے خون سے اسکو خریدتا ہے

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست ... موت نیرنج و طلسم و سیمیاست
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ ... یک مقام از صد مقام اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام ... مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ ... زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر ... مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست ... مرگ آزاد از زمانے بیش نیست
بگذر از مرگے کہ سازد با لحد ... زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک ... آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق ... آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر ... مرگِ پور مرتضیٰ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری ست ... جنگِ مومن سنتِ پیغمبری ست
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست ... ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت ... جنگ را رہبانیِ اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را ... کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

کا مثالی پیکر اور ملتِ اسلامیہ کے متعلق ان کی شاعری کا لُبِّ لباب نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، اس لئے زیادہ تفصیل میں پڑنے کے بجائے اس کو پیش کردینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے،

موت سے بے خوفی | زندگی خصوصًا اعلیٰ مقاصد میں کامیابی کا راز موت سے بے خوفی میں مضمر ہے، زندہ قومیں موت سے نہیں ڈرتیں، اور اپنے مقصد کی راہ میں بے تکلف جان دے دیتی ہیں، اور مردِ مومن کے لئے تو موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز، اور خدا کی راہ میں موت حیاتِ ابدی ہے۔ اس لئے ایک مومن موت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے،

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

مردِ مومن کی زندگی تسلیم ورضا کی پابند ہوتی ہے، اس کی نگاہ میں موت ایک کھیل ہے۔ بندۂ حق گو یا شیر اور موت ہرن ہے، موت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے، اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، وہ موت پر اس طرح جھپٹتا ہے، جس طرح شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے، غلام کی زندگی موت کے ڈر سے حرام رہتی ہے، اور وہ ہر وقت اس کے خوف سے ڈرتا رہتا ہے لیکن بندۂ آزاد کی شان جدا ہوتی ہے، اس کو موت نئی زندگی عطا کرتی ہے وہ موت اندیش نہیں بلکہ خود اندیش ہے، اس کی موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کے بعد ہی اس کو دوسری زندگی مل جاتی ہے، جو پہلی زندگی سے زیادہ ارفع اور پائدار ہوتی ہے، اس لئے مردِ مومن قبر والی موت نہیں چاہتا

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

ایک نظم میں مردِ مومن کی تصویرکشی اس طرح کی ہے،

ہاتھ اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولی صفات
ہر دو جہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ایک نظم میں مردِ حُر یعنی مردِ مومن کے کمالات بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں یہ نظم ... طویل ہے، لیکن مردِ مومن کے اوصاف کا بڑا مکمل اور موثر مرقع ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے،

مردِ حُر کی ہستی ہر قوت کی بے خوفی سے مستحکم ہوتی ہے، اسی کی قوت سے وہ میدانِ جنگ میں سرکف ہوتا ہے، وہ لا الہ کے نور سے روشن ضمیر ہوتا ہے، کسی سلطان و میر کا غلام نہیں ہوتا، اس کی زندگی موت سے اور پائندہ ہوتی ہے، اس کا نعرۂ تکبیر حروف اور آواز کے حدود سے ماوراء ہوتا ہے، وہ رہ کے بڑے بڑے سنگِ گراں کو شیشہ کے ذروں سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ یہ درویش بے نوا قلندر سلاطین و ملوک سے خراج وصول

مومن اپنی گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہے، وہ صفاتِ الٰہی کا پرتو ہے اس لئے اُس کی صفاتِ قہاری، غفاری، قدوسیت اور جبروت کا مردِ مومن میں ہونا ضروری ہے، اُن کے بغیر مسلمان نہیں بن سکتا، وہ اپنے مقام کی بلندی میں جبرئیل امین کا ہمسایہ ہے، وہ کسی ملک و وطن کا پابند نہیں، ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست، وہ بظاہر قرآن کا صرف قاری ہے، مگر اپنے اعمال میں قرآن کا نمونہ ہے، اس کا ارادہ قدرت کے مقاصد کا معیار ہے، یعنی اس کا ارادہ ہی قدرت کا مقصد بن جاتا ہے، اس کا عمل دنیا میں بھی دوسری قوموں کے اعمال کے پرکھنے کی میزان ہے، اور آخرت میں بھی، یعنی اس کی ذات دین و دنیا دونوں میں مردوں کے لئے نمونہ ہے، وہ صاحبِ لطف و جمال بھی ہے، اور صاحبِ جلال و جبروت بھی،

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ سمرقند
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایک دوسری نظم میں اس کی عظمت اور جمال و جلال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے،

اب اصل نظم ملاحظہ ہو،

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف ‏ ‏ ما بمیدان سر بجیب او سر بکف

مردِ حر از لاالٰہ روشن ضمیر ‏ ‏ می نگردد بندۂ سلطان و میر

جانِ او پاینده تر گردد ز موت ‏ ‏ بانگِ تکبیرش بُرون از حرف و صوت

ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج ‏ ‏ گیرد آن درویش از سلطان خراج

پادشاہاں در قباہائے حریر ‏ ‏ زرد رُو از سہمِ آن عریاں فقیر

سرِ دیں ما را خبر آں را نظر ‏ ‏ او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش ‏ ‏ او ز دستِ مصطفٰے پیمانہ نوش

نے مغاں را بندہ نے ساغر بدست ‏ ‏ ما تہی پیمانہ اُو مستِ الست

چہرۂ گل از نمِ اُو احمر است ‏ ‏ زآتشِ ما دودِ او روشن تر است

دارد اندر سینہ تکبیرِ امم ‏ ‏ در جبینِ اوست تقدیرِ امم

قبلۂ ما را، کلیسا گاہ دیر ‏ ‏ او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ ‏ ‏ او نگنجد در جہانِ رنگ و بو

در جہانِ بے ثبات او را ثبات ‏ ‏ مرگِ او را از مقاماتِ حیات

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن ‏ ‏ او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ما گدایان کوچہ گرد و فاقہ مست ‏ ‏ فقرِ او از لاالٰہ تیغے بدست

ما بپرِ کاہے اسیرِ گرد باد ‏ ‏ ضربتش از کوہِ گراں جوئے کشاد

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ ‏ ‏ پیشِ او کوہِ گراں یک تودۂ ریگ

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن ‏ ‏ ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن

کرتا ہے، بڑے بڑے حریر پوش بادشاہ اس ننگے فقیر کی ہیبت سے سہمے رہتے ہیں، وہ دین کے اسرار کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے، ہم محض سُنی سُنائی باتیں جانتے ہیں، وہ اندرون خانہ کی خبر رکھتا ہے، ہم بیرونِ در رہتے ہیں ہم کلیسا دوست اور مسجد فروش اور وہ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پیمانہ نوش ہے، وہ نہ ساقی کا محتاج ہے نہ ساغر کا، ہمارا پیمانہ خالی اور وہ مست الست رہتا ہے، اس کی نمی سے پھول سُرخ رو رہتے ہیں، اس کا دھواں ہمارے شعلوں سے زیادہ روشن رہتا ہے، اس کے سینوں میں اقوام کی تکبیر اور اس کی پیشانی میں قوموں کی تقدیر تحریر ہوتی ہے، ہمارا قبلہ کبھی کلیسا ہے کبھی دیر۔ مگر وہ دوسرے کے ہاتھ سے رزق حاصل نہیں کرتا، ہم سب فرنگ کے غلام ہیں، اور وہ خدا کا بندہ ہے، اس کی وُسعت و پہنائی کے لئے یہ جہان رنگ و بو تنگ ہے، اس جہانِ فانی میں اسی مردِ حُر کو ثبات ہے، اس کی موت بھی درحقیقت زندگی کا ایک مرحلہ ہے۔ ہمارے سارے کام ظن و تخمین سے وابستہ ہیں، وہ کم سخن مگر سراپا عمل ہے، ہم نادمت اور گو جہ گرد گدا ہیں، اور اس کا فقہ لا الٰہ کی قوت سے تیغ بدست ہے، ہم ایک پرکاہ کی طرح گردباد کے اسیر ہیں، اور اس کی ضرب کوہ گراں سے جوئے رواں نکالتی ہے، اس کا سینہ دیگ کی طرح جوش زن رہتا ہے اور اس کے سامنے کوہ گراں تودۂ ریگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، صلح کی حالت میں وہ انجمن ساز اور انجمن آرا ہوتا ہے، جس طرح چمن میں بادِ بہاری چلتی ہے، اور جنگ کی حالت میں وہ اپنی تقدیر کا محرم خود اپنی تلوار سے اپنی قبر کھودتا ہے،

قوت سے بے خوفی کا نام ہے، ایسا فقر کسی قوت کو دھیان میں نہیں لاتا، اور بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیتا ہے، جس کی تصویر عہدِ صحابہ میں نظر آتی ہے، ایران کی فوج کشی میں جو مسلمان سفرا، یزدگرد سے گفت گو کرنے کے لئے گئے تھے، ان کے گھوڑوں پر زین اور رکاب تک نہ تھی، معمولی نیزے ہاتھوں میں تھے، جسم پر قرینے کا لباس تک نہ تھا، لیکن ان کے دل فقر کی دولت سے غنی اور جوشِ جہاد سے معمور تھے، ایرانیوں نے جن کی نگاہیں ظاہری شکوہ و تجمل دیکھنے کی عادی تھیں، ان سفرا کو بڑی حقارت سے دیکھا اور تحقیر آمیز گفتگو کی لیکن جب انہی بے سروسامان اور بے نوا فقیروں کا مقابلہ ہوا تو انھوں نے ساسانی تاج و تخت کے پرزے اڑا دیئے شام کی فتح کے بعد جب حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے معاہدہ کے لئے بیت المقدس کا سفر کیا، تو سواری میں معمولی گھوڑا تھا جس کے کھر گھسے ہوئے تھے، جسم پر ادنیٰ حیثیت کا لباس تھا، کہ خود مسلمان افسروں کو اس خیال سے شرم آتی تھی کہ عیسائی ہم کو اس ہیئت میں دیکھ کر کیا اثر لیں گے، اس لئے انھوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ لباس پیش کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے بس ہے، مگر انہی حضرت عمرؓ نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا تخت الٹ دیا، اقبال نے اسی فقر کی تعلیم دی ہے، فقر پر ان کی کئی نظمیں ہیں، یہاں ایک نظم کے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل — یک نگاہِ راہ بین، یک زندہ دل

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر — بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم این متاعِ مصطفیٰ است

روزکیں آں محرمِ تقدیرِ خویش | گور خود می کند از شمشیرِ خویش

مردِ حُر کے کمالات بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی تقلید اور اس کی صحبت کی تلقین کرتے ہیں :۔

شکوہ کم کن از سپہر گرد گرد | زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد
صحبت از علمِ کتابی خوشتر است | صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است
مردِ حُر دریاے ژرف و بے کراں | آب گیر از بحر و نے از ناوداں
اے سرت گردم گریز از ما چو تیر | دامن او گیر و بے باکانہ گیر
می نہ روید تخمِ دل از آب و گل | بے نگاہِ از خداوندانِ دل

(مسافر)

یعنی فلک کج رفتار کا شکوہ کم کرو، اس زندہ مرد کی صحبت سے زندگی حاصل کرو، صحبتِ علم کتابی سے زیادہ فائدہ مند ہے، مردانِ حُر کی صحبت انسان ساز ہوتی ہے، مردِ حر ایک دریاے بے کراں ہوتا ہے، اس [illegible] کے بجائے اس بحرِ بیکراں سے پانی حاصل کرو، میں تمہارے قربان مجھ سے تیر کی طرح بھاگو مردِ حُر کا [illegible] پکڑ لو۔ دل کا تخم محض آب و گل سے نہیں، کسی صاحبِ دل مرد خدا کی نگاہِ التفات سے اُگتا ہے،

نقر | مردِ مومن کا ایک بڑا وصف نقر بھی ہے۔ [illegible] فخری رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے، اس سے مراد مفلسی و تنگ دستی نہیں، بلکہ حقیقی نقر یعنی اعلیٰ مقاصد کے لئے ادنیٰ خواہشات کی قربانی۔ دولت دنیا اور دنیاوی عیش و تنعم سے بے نیازی اور اس کی تحقیر، سادگی، سخت کوشی، اولوالعزمی، اور بلند نظری، توکل علی اللہ اور دنیا کی

سخت اور قیمتی بنا دیتا ہے، اس کا سارا ساز و برگ قرآن حکیم سے وابستہ ہے، یہ مرد درویش گلیم میں تخت نہیں سماتا، بے پر و بال میں ذوق پرواز اور مچھر کو شہباز کی قوت عطا کرتا ہے' وہ بڑے بڑے با جبروت سلاطین سے بھڑ جاتا ہے، اس کے بوریہ کے شکوہ سے تاج و تخت لرزتے ہیں، اس کے قلب کو جذب و سلوک سے قوت حاصل ہوتی ہے، وہ سلاطین و ملوک کے سامنے "لاملوک" کا نعرہ لگاتا ہے، اپنے خون سے پوری آبادی میں روح پھونک دیتا ہے، اور مخلوقِ خدا کو ظلم و جور سے نجات دلاتا ہے، وہ اسی صحرا میں رہتا ہے، جہاں شاہین کبوتر سے کتراتے ہوں، جہاں طاقتور کو کمزور کے ستانے کی جرأت نہ ہو، اس کی خاک میں اتنا سوز ہے کہ ہماری آگ اسی سے سوز و تپش حاصل کرتی ہے، اور اس کے خس و خاشاک سے شعلہ لرزتا ہے، جب تک کسی ملت میں ایسے مرد درویش کا وجود باقی ہے، وہ کسی معرکہ میں شکست نہیں کھا سکتی، مسلمانو! اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھو یعنی اپنے میں اس مرد درویش کے اوصاف پیدا کرو، اس وقت تم کو دنیا میں حکومت اور غلبہ حاصل ہوگا، اس قسم کی اور نظمیں بھی ہیں، مگر یہ چند مثالیں مرد مومن، مرد حر، اور مرد حق کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہیں، ان میں بہت سے اوصاف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جس قوم میں بھی ایسے انسان پیدا ہو جائیں وہ دنیا پر حکومت اور قوموں کی امامت کرے گی اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی قومیں انھی اوصاف کی بدولت دنیا پر حکمراں ہیں، (باقی)

فقر بر کرّ و بیان شبخوں زند | بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند
بر مقامِ دیگر اندازد ترا | از زجاج الماس می سازد ترا
برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم | مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم
بے پراں را ذوقِ پروانے دہد | پشہ را تمکینِ شہبازے دہد
با سلاطیں در فتد مردِ فقیر | از شکوہِ بوریا لرزد سریر
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک | پیشِ سلطاں نعرۂ او لا ملوک

از جنوں می افگند ہوے بہ شہر | وا رہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بہ آں صحرا مقام | کاندرو شاہیں گریزد از حمام
آتشِ ما سوزناک از خاکِ او | شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ او
بر نمی تابد سلطے اندر نبرد | تا دو با تیست یک درویش مرد
خویشتن را اندریں آئینہ بیں | تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

حکمتِ دیں دلنوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

یعنی فقر نام ہے فراست اور حالات پر نظر رکھنے اور گرمیٔ قلب کا، فقر نانِ شعیر کی قوت سے خیبر کو فتح کرتا ہے کہ "جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری" بڑے بڑے سلاطین و فرماں روا اس فقر کے فتراک کے نخچیر ہیں، فقر نام ہے راہِ خدا میں ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا، حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس متاع کے امین یہی فقر فرشتوں پر شبخوں مارتا ہے، اور قوانینِ قدرت کو مغلوب کرتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتا اور شیشہ جیسی نازک اور معمولی چیز کو الماس بنا

پہلا زینہ ہے :

پاکستان کے چند جید علما مثلاً مشفقی و مکرمی مولانا عبدالعزیز المیمنی نے میرے کام کے بعض حصوں کو دیکھا ہے، اور اس کے متعلق ازراہ کرم بہت عمدہ اور حوصلہ افزا رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ اس مضمون میں اسی ذخیرہ میں سے چند الفاظ کی بحث کو منتخب کرکے اور اس کی ایک تمہید لکھ کر اس کو ایک مقالہ کی صورت دے دی ہے، اور اسے ہندوستان جنت نشان کے باذوق اہلِ کمال کی خدمت گرامی میں استصواب رائے کے لئے پیش کر رہا ہوں، اور اُن سے التفاتِ خاص کی تمنا رکھتا ہوں،

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

لسانی تحقیق و تدقیق ہمیشہ سے اہلِ اسلام کی علمی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے، اور مسلمانوں میں عربوں نے بالخصوص اپنی زبان کے ساتھ جو اعتنا رکیا ہے اور لسانی تحقیقات میں جو سرگرمی دکھائی ہے، اس کی نظیر دیگر قوموں کی تاریخ میں کم ملتی ہے، اس لسانی کد و کاوش کی ابتدا قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوئی مسلمانوں کو اور خصوصاً عجمیوں کو جب کلام پاک کے فہم و تفہیم کی ضرورت پیش آئی، تو اس سے لسانی مسائل کی تحقیق کو تحریک ملی، زبان کے قواعد منضبط ہوئے، جس سے عربی کا علم صرف و نحو وجود میں آیا، از روئے انصاف اس بات کا اعتراف لازم ہے، کہ ان تحقیقات میں عرب علمار کے ساتھ ساتھ عجم کے فضلاء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، چنانچہ عربی گرامر کی سب سے پہلی جامع کتاب جو لکھی گئی، وہ ایرانی نسل کے ایک عالم سیبویہ کے قلم سے نکلی تھی، اسی طرح ترکستان کی خاک سے علامہ زمخشری جیسا عربی زبان کا عالم متبحر

متعدد معرب الفاظ قرآن مجید میں بھی آئے ہیں۔ مقالۂ ہذا میں اسی قسم کے چند کلمات کی لغوی تشریح مقصود ہے۔ اور یہ تشریح اُن کی Etymology یعنی اُن کے اصول و مآخذ کی تحقیق تک محدود ہے۔[1]

اس لغوی تشریح سے پہلے اس اہم مسئلہ کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیا قرآن مجید میں عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یا وہ "عربی مبین" میں نازل ہونے کی وجہ سے ایسے خارجی عناصر سے پاک ہے۔ اس مسئلہ پر علماے اسلام دو گروہوں میں منقسم ہیں، اور اپنی اپنی راے کے حق میں دلائل رکھتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے کہ قرآن پاک میں عجمی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور انھوں نے متعدد الفاظ مثلاً سجیل، مشکوٰۃ، یم، طور، استبرق اور اباریق کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ الفاظ عجمی ہیں۔ بعض دیگر مفسرین بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ کہ قرآن پاک میں عجمی الفاظ کے وجود کا اعتراف کریں، کیونکہ اُن کی راے میں جو عجمی الفاظ معرب بن جائیں۔ یعنی عربی قالب میں

---

[1] علماے لغت کی اصطلاح میں معرب کسی عجمی زبان کا وہ کلمہ ہے جسے عربی میں لیتے وقت حروف کی تبدیلی یا کمی بیشی سے عربی قالب میں ڈھال لیا جائے۔ اور وزن اور ہیئت کے اعتبار سے اسے عربی شکل و صورت دے دی جائے، اس قسم کے معرب الفاظ ذیل کی کتابوں میں مدون ہیں۔

(۱) کتاب المعرب من الکلام الاعجمی تالیف الشیخ ابی منصور الجوالیقی متوفی ۵۲۹ھ (مطبوعہ لائپزگ تصحیح و تحشیہ ایڈورڈ زخاؤ۔ نیز مطبوعہ قاہرہ)

(۲) شفاء الغلیل فیما فی کلام العرب من الدخیل تالیف شہاب الدین

پیدا ہوا،

عربی گرامر کی تدوین کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ اور محاورات کی جمع و ترتیب بھی شروع ہوئی، ابتداء میں مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے، مثلاً کتاب الابل، کتاب الخیل، کتاب الشجر وغیرہ، پھر اسی مواد کو بڑی بڑی لغتوں کی صورت میں ترتیب دیا گیا، ان کتب لغت کی جامعیت اور وسعت حیرت انگیز ہے، جب لسان العرب شائع ہوئی، تو اس کی سمائی بشکل بیس جلدوں میں ہو سکی، اسی طرح قاموس کی شرح "تاج العروس" دس ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی، عبرانی، یونانی اور لاطینی بھی علمی زبانیں ہیں لیکن ان میں کسی زبان کو ایسے مفصل اور مبسوط لغات نصیب نہیں ہوئے تھے، عربی کتب لغت کی حیرت انگیز جامعیت اور ضخامت کی وجہ عربی زبان کی بے پایاں وسعت ہے، جس پر عبور حاصل کرنا معمولی انسان کا کام نہیں ہے، امام سیوطی نے "الاتقان" میں ایک فقیہ کا قول نقل کیا ہے، کہ کلام العرب لا یحیط بہ الا نبیؐ یعنی عربوں کی زبان اتنی وسیع ہے، کہ اس کا احاطہ نبی جیسا غیر معمولی انسان ہی کر سکتا ہے" اسی مفہوم کو امام شافعیؒ نے قدرے وضاحت کے ساتھ اپنے الرسالہ کی ابتداء میں یوں ادا کیا ہے۔ لسان العرب اوسع الالسنۃ مذھبا و اکثرھا الفاظا ولا نعلمہ انہ یحیط بجمیع علمہ انسان غیر نبیؐ "یعنی عربوں کی زبان تمام زبانوں سے زیادہ وسیع ہے، اور اس کے الفاظ بھی مقابلۃً زیادہ ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ کوئی انسان سوائے ایک نبی جیسے عبقری، کے اس کے تمام علم کا احاطہ کر سکتا ہو"

عربی زبان کا ظرف بہت وسیع ہے، چنانچہ اس نے غیر زبانوں کے سینکڑوں الفاظ کو معرب کر کے یعنی اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، اس قسم کے

دیگر زبانوں کے مقابلہ میں ناکمل ہے[1]

امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کی تفسیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین نے بعض الفاظ کو فارسی اور بعض کو حبشی یا نبطی بتایا ہے، تو درحقیقت یہ الفاظ کا توارد اور توافق ہے یعنی عربوں نے اور حبشیوں نے یکساں الفاظ کو اتفاقاً استعمال کیا ہے۔ لیکن امام موصوف کی یہ توجیہ تسلی بخش نہیں ہے۔ کیونکہ بیسیوں الفاظ کے متعلق متعدد قوموں کا توارد تجربہ اور قیاس کے خلاف ہے خصوصاً جب کہ مختلف قوموں کے باہمی اتصال اور الفاظ کے انتقال کے بارہ میں تاریخی حقائق موجود ہوں،

ابو منصور الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) نے کتاب الجواہر میں اس مسئلہ کو یہ کہکر سلجھانے کی کوشش کی ہے کہ " قرآن مجید مُبین یعنی صاف اور واضح زبان میں نازل ہوا، اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو عربی نہ ہو یا جسے کسی غیر زبان کی مدد کے بغیر سمجھا نہ جا سکے، قدیم عربوں کے شام اور حبشہ کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے، اور وہ ان ملکوں میں سفر کیا کرتے تھے، انھوں نے عجمی کلمات اخذ کئے، مگر ان میں چند تبدیلیاں کر دیں، مثلاً بعض حروف کو گرا دیا، اور بعض الفاظ میں جو ثقالت تھی اسے دور کر دیا، اور ان الفاظ کو اپنی شاعری اور گفتگو میں استعمال کیا، اس طرح وہ الفاظ خالص عربی الفاظ کی مانند بن گئے، اور عربی شاعری کے علاوہ قرآن پاک میں بھی استعمال ہوئے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا القزوینی متوفی ۳۹۵ھ، مؤلف "مقاییس اللغۃ" مطبوعہ قاہرہ ۶۰ اجزاء، بحوالہ الاتقان للسیوطی، مطبوعہ قاہرہ، جلد اول ص ۳۱۵

ڈھل جائیں، اور قریب الفہم بن جائیں، اُن کا استعمال مُخلِ فصاحت نہیں ہو سکتا۔

اس کے مقابلہ میں بہت سے ائمہ مثلاً امام شافعیؒ، امام ابن جریر طبریؒ، ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ، ابن فارس قزوینی اور قاضی ابوبکر باقلانی قرآن مجید میں عجمی کلمات کے منکر ہیں، ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ قرآن حکیم نے بہ تکرار فرمایا ہے، کہ اُس کی زبانؔ عربی مبینؔ" ہے۔ یعنی ایسی واضح زبان میں نازل ہوا ہے جس کو عرب لوگ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس رائے کے حق میں وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، وَلَو جَعلناهُ قرآناً اَعجمیاً لقالوا لولا فُصّلت آیاتهُ أَاَعجمیٌّ وعربیّ

اس کے علاوہ خداوند کریم فرماتا ہے،

وما اَرسَلنا مِن رسُولٍ اِلا بلسانِ قومِهٖ لیُبیّنَ لهُم،

ان کے ہم خیال علمائے یہ دلیل بھی پیش کی ہے، کہ قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کرنے سے عربی زبان پہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ وہ ناقص اور نامکمل اور آسمانی پیغام کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لئے ایسی زبان اختیار کی جو سب زبانوں سے اکمل ہے، اور ادائے مطلب کے لئے نبطی، فارسی اور سُریانی زبانوں کی محتاج نہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ آئے ہیں تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ عربی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) احمد الخفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ، مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۲ھ

(۳) امام جلال الدین سیوطی نے بھی "اتقان" میں غیر عربی الفاظ کو ایک مستقل فصل میں جمع کیا ہے اور اس کے علاوہ اپنی دو دیگر کتابوں یعنی المہذب اور المتوکل میں بھی معربات سے بحث کی ہے۔

لہذا اُن کا استعمال نہ تو قرآن حکیم کی فصاحت میں مخل ہوا، اور نہ اس کی زبان کے مُبین ہونے میں خارج و حائل ہوا،

(۱) **انجیل** ۔ از روے قرآن مجید انجیل وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو عطا فرمائی تھی، انجیل کا لفظ قرآن پاک کی چھ مختلف سورتوں میں بارہ[۱۲] مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۃ المائدہ میں انجیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:-

"وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ	ہم نے اُن (انبیاء) کے قدم بقدم عیسیٰ فرزند مریم کو بھیجا، جس نے پیش نظر تورات کی تصدیق کی، اور ہم نے اُسے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے"

قرآن پاک کے باقی مقامات میں بھی جہاں کہیں انجیل کا ذکر آیا ہے، اُسی طور پر ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے آیا ہے،

لیکن جو انجیل آج کل عیسائیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ایک انجیل نہیں بلکہ چار الگ الگ کتابیں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے، اور اپنے مؤلف کی طرف منسوب ہے، ان اناجیل اربعہ کو متّی، مرقس، لوقا اور یوحنا نے (مغربی علماء کی تحقیق کے مطابق) حضرت عیسیٰؑ کے تقریبًا ایک سو سال بعد تالیف کیا تھا، اُن میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے چند متفرق واقعات اور اُن کے معجزات و کرامات کا ذکر آیا ہے۔ علاوہ اُن کے علاوہ اُن کی تعلیم و تلقین بھی شامل ہے، جو بیشتر امثال اور

یہ الفاظ پہلے عجمی تھے۔ لیکن جب عربوں نے اُن سے کام لیا، اور اُن کو معرب بنا لیا تو وہ الفاظ اس طریق سے عربی بن گئے۔"

امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا ہے، اور اتقان میں اس بحث کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے، کہ میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جس سے دونوں قولوں کی تصدیق ہوتی ہے، یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن جب وہ عربوں کے استعمال میں آئے، اور انھوں نے اُن کو معرّب بنا لیا یعنی ان کو بدل کر اپنے الفاظ کی صورت دے دی تو وہ الفاظ عربی بن گئے، اور جب قرآن نازل ہوا تو یہ الفاظ عربوں کے کلام میں مخلط ہو چکے تھے، اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ الفاظ اپنی موجودہ معرّب، صورت میں عربی ہیں تو وہ بھی سچا ہے، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، وہ بھی سچا ہے"[1]

ابو عبید، ابو منصور الجوالیقی (متوفی ۵۳۹ھ) مؤلف کتاب المعرب اور ابن الجوزی بغدادی (متوفی ۵۹۸ھ) اور دیگر علما کے اقوال بھی اسی قول کے قریب قریب ہیں،

اب ہم ناظرین کرام کی خدمت میں چند ایک ایسے قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق اکثر محققین متفق الرائے ہیں کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن معرّب بننے کے بعد عربی زبان کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ قرآن پاک نے اُن کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین اُن کے مفہوم و معنی سے بخوبی آگاہ تھے۔

[1] الاتقان فی علوم القرآن، حصہ اول ص ۲۳۳ طبع دہلی ۱۳۰۵ ہجری

کا لفظ ہے، اور اس کا لغوی معنی کیا ہے،

لفظ انجیل کے بارے میں مغربی علما، کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ در اصل یونانی کلمہ Euaggelion ہے، جو غالباً آرامی کے توسط سے عربی میں آیا ہے اور جس کے لغوی معنی بشارت ہیں، مروجہ اناجیل کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے پیغام کو آسمانی بشارت کہتے تھے۔ جب انھوں نے گلیل اور فلسطین کے دیگر شہروں اور قریوں میں چل پھر کر سنایا اور اپنے حواریوں سے بھی کہا کہ جاؤ اور لوگوں کو خوشخبری دو کہ آسمانی بادشاہت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ لوقا کی انجیل (باب چہارم) میں ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰؑ شہر ناصرہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ میں گئے، اور اشعیا نبی کی کتاب کھول کر یہ عبارت پڑھی کہ "خدا کی روح مجھ پر غالب ہے کیونکہ اس نے مجھ کو مسح کیا ہے تاکہ میں مسکینوں کو یہ بشارت سناؤں کہ اس نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں دل شکستہ لوگوں کو شفا دوں، اسیروں کی آزادی کی منادی کروں جو اندھے ہیں ان کو بینائی دوں، اور جو مظلوم ہیں، ان کو آزاد کروں" چونکہ حضرت مسیح نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کو بشارت سے تعبیر کیا تھا، اس لئے وہ کتاب بھی جس میں ان کی سیرت اور تعلیم مدوّن ہوئی، انجیل یعنی بشارت کہلائی،

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ہم وطنوں کی زبان آرامی تھی، پھر ان کے پیغام کے لئے ایک یونانی کلمہ کیوں استعمال ہوا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں فلسطین اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد کئی صدیوں سے یونانی علمی زبان کی حیثیت سے رائج چلی آ رہی تھی، اگرچہ قدیم یونانی قوم کی حکومت پر زوال آ چکا تھا لیکن ان کے

وعظ و نصیحت کی صورت میں ہے، اور جس میں بہاری ہی والے

بعض عرب علماء نے لفظ انجیل کو عربی قرار دیا ہے۔
کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کا وزن افعیل بتایا ہے[1]
قول سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں، اور تکلف سے
اور نجل سے مشتق بتایا اور ان کا وزن تفعلہ اور افعیل
ہو سکتا ہے، جب یہ دونوں لفظ عربی ہوں"

ابو منصور جوالیقی اور شہاب الدین احمد خفاجی نے ا
اس لفظ کی نشاندہی نہیں کی جس کی تعریب کی گئی ہے، ابو ا
نے النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر میں لکھا ہے کہ یہ ک
عربی ۔ علامہ زبیدی صاحب تاج العروس نے بھی علما
کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ انجیل کو عبرانی کہتے ہیں، بعض
انھوں نے خود اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی،
راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کسی غیر زبان کا لفظ ہے
وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ کس زبان سے
صورت کیا تھی،

متاخرین میں سے غیاث اللغات کے مؤلف اس
کا معرب ہے لیکن انھوں نے اس بات کی وضاحت نہیں

---

[1] کتاب المعرب للجوالیقی، طبع لائپزگ ص ۱۷،

قوم نے صور و صیدا سے نکل کر افریقہ کے شمالی ساحل پر قرطاجنہ (کارتھیج) کا شہر آباد کیا تھا۔ چنانچہ قرطاجنہ کے کتبوں میں بھی بعل کا لفظ بکثرت ملتا ہے،

بعل کا لفظ، بہ صیغہ مفرد و جمع، تورات میں بھی کئی جگہ آیا ہے، اور اس سے عبرانیوں کے مخالف قبیلوں اور قوموں (مثلاً کنعانیوں) کے معبود مراد ہیں،

بعل کا لفظ [illegible] کے مرکبات کا ایک جزو ہے،

بَعَلبَکّ :۔ شام کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جو اب ویران ہو چکا ہے، اس کے معنی غالباً "بعل کا شہر" ہے۔ یونانیوں نے اُسے Heliopolis (یعنی مدینۃ الشمس) کہا ہے، کیونکہ وہاں سورج دیوتا کی پوجا ہوتی تھی،

ہنی بعل Hanni bal قرطاجنہ والوں کا ایک مشہور سپہ سالار تھا جس نے مدت دراز تک اپنے حریف رومیوں کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور شہرت دوام پائی۔ لفظی معنوں کے لحاظ سے ہنی بعل وہ شخص ہے جس کو بعل نے برکت دی ہو،

عربوں کے ہاں بھی ایک نام [illegible] ہے۔ میرے خیال میں اس کا مفہوم بھی ہنی بعل کے مفہوم سے بہت قریب ہے۔

بعل کے اصلی معنی تو مالک [illegible] ہیں، لیکن عربی میں مجازی طور پر شوہر کو بھی بَعل کہہ دیتے ہیں، قرآن مجید میں بعل کا لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے، سورۂ الصّٰفّٰت میں ہے:۔

علوم کا سکہ ابھی تک جاری تھا۔ اور اُن کی زبان کا علمی تسلط بہت سے ملکوں پر ہنوز قائم تھا، اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے مقلدوں اور مبلغوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لئے اسی عالمگیر علمی زبان سے کام لیا، چنانچہ اناجیل اربعہ یونانی زبان ہی میں قلمبند ہوئیں، اور چونکہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیغام کو بار بار بشارت کہا تھا، اس لئے وہ انجیل کے نام سے موسوم ہوئیں جس کے معنی خوشخبری کے ہیں،

انگریزی زبان میں انجیل کے لئے گاسپل (Gospel) کا جو لفظ مستعمل ہے اس کے معنی بھی بشارت ہیں، گاسپل گویا "انجیل" کا لفظی ترجمہ ہے،

انگریزی لفظ (Evangel) بھی مذکورۂ بالا یونانی کلمہ سے ماخوذ ہے، چنانچہ اناجیل اربعہ کے مؤلفین Four Evangelists کہلاتے ہیں،

(۲) بعل: بعل سامی زبانوں کا ایک عام اور مشترک لفظ ہے جس کے لغوی معنی رب، مالک، خداوند یا آقا کے ہیں،

جلال الدین سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ ملک یمن اور قبیلہ ازد کی زبان میں بعل کے معنی رب کے ہیں، اور جنوبی عرب میں گلازر (Glazer) نے حمیری زبان کے جو کتبات دریافت کئے تھے، اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ ان میں بھی بعل کا لفظ مالک یا حاکم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے،

کنعانی لوگ بالخصوص بعل کے لفظ کو اپنے خداوند کے لئے استعمال کرتے تھے اور یہ وہ قوم ہے جو بلاد عرب سے نکل کر عبرانیوں سے بھی پہلے ملک شام میں آباد ہو چکی تھی، اور جسے یونانیوں نے فنیقی (Phoenician) کہا ہے، اس

کے بعد وجود میں آیا، حالانکہ بعل کا لفظ بلاد عرب کے ایسے کتبات میں پایا گیا ہے جو
حضرت عیسیٰؑ کے عہد سے قدیم ترین، اسی لئے پروفیسر نولدکے اور پروفیسر ولہازن نے
اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جہاں تک بلاد عرب کا تعلق ہے بعل کا لفظ مقامی اور
ملکی ہے یعنی ٹھیٹھ عربی ہے۔

۴- جبریل :- نام عبرانی ہے۔ جو جبر اور ایل سے مرکب ہے۔ جبر بمعنے جبروت
یعنی قوت و طاقت اور ایل بمعنے الٰہ، لہذا جبریل کے معنی ہوئے قدرت اللہ یا
قدرتِ خدا،

جبریل کا لفظ توراۃ (*Pentateuch*) میں نہیں آیا، لیکن
صحیفۂ دانیال میں ہے، دانیال ایک رویا کا ذکر کرتا ہے کہ "ایک غیبی آواز سنی
جو جبریل کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ دانیال کو اس رویا کی تعبیر بتا دے"
(دانیال ۸/۱۶)

متی کی انجیل (باب اول) میں بھی جبریل کا ذکر ہے، جبریل حضرت زکریاؑ
کو یحییٰؑ کی پیدائش اور حضرت مریمؑ کو عیسیٰؑ کی ولادت کی بشارت دیتا ہے
قرآن مجید میں جبریل کا صرف دو تین مرتبہ ذکر ہے، سورۂ بقرہ میں جبریل
کا ذکر یوں آیا ہے :-

"قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ مَنْ
كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ
عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ۝ (بقرہ - ۱۱)

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ،	کیا تم (اپنے دیوتا) بعل کو پکارتے ہو۔ اور بہترین پیدا کرنے والے کو چھوڑ رہے ہو،

سورۂ ہود میں بعل کا لفظ اس کے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ○	اس نے (یعنی ابراہیمؑ کی زوجہ نے) کہا کہ ہائے افسوس! کیا میں جنوں گی، حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہے۔ بیشک یہ ایک عجیب بات ہے،

بعل کی جمع بُعُولَہ ہے جو اسی مجازی معنی میں دیگر تین سورتوں میں چار[4] مرتبہ استعمال ہوئی ہے،

ڈاکٹر ہوروولٹس (Horovitz) نے اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بَعَل کا لفظ عربوں نے شاید حبشی زبان سے اخذ کیا ہو، لیکن اس رائے کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ بعل کا لفظ دیارِ عرب کے اس قدیم دور کے کتبوں میں پایا گیا ہے جب اہلِ حبشہ جنوبی عرب میں وارد بھی نہیں ہوئے تھے۔ یا اُن کتبوں کے علاقوں میں ان کی کبھی رسائی نہیں ہوئی،

اسی طرح پروفیسر جیفری نے لکھا ہے کہ عربوں نے بعل کا لفظ غالباً سُریانی زبان سے لیا ہے، لیکن واقعات سے اس رائے کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ سریانی زبان عربی کے مقابلہ میں حدیث العہد ہے۔ اور اس زبان کا لٹریچر بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش

اسی کے قریب قریب ہے، جوالیقی اور خفاجی نے بھی جزیہ کو معربات میں شمار نہیں کیا، غرض کہ جزیہ اُن کے نزدیک ایک خالص عربی لفظ ہے،

لیکن اس کے برعکس ابوعبداللہ محمد بن احمد خوارزمی (متوفی ۳۸۰ھ) نے اپنی تالیف "مفاتیح العلوم" (مطبوعہ لائڈن ۱۸۹۵ء) میں جزیہ کے متعلق لکھا ہے:

هُوَ مُعَرَّبُ گزِيت وَهُوَ الخَرَاجُ بالفارسية، — یعنی جزیہ اگزیت کا معرب ہے، اور فارسی میں اس کے معنی خراج کے ہیں،

علامہ شبلی نعمانی نے اسی قول کو قبول کیا ہے، اور اس کی تائید میں متعدد فارسی نگاروں کی تصریحات کو بطور سند پیش کیا ہے مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو ممدوح کا رسالہ "الجزیہ" جو "رسائل شبلی" کے علاوہ اُن کے مجموعۂ مقالات میں بھی دوبارہ چھپ چکا ہے،

۵۔ جُناح جناح کا لفظ قرآن مجید میں گناہ کے معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور مختلف سورتوں میں پچیس مرتبہ آیا ہے، اور لا جناح علی کی ترکیب بہت عام ہے

عربی لغت نویسوں نے جناح کو ٹھیٹھ عربی لفظ قرار دیا ہے؛ اس لئے اس کے اصل ماخذ کے متعلق بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی، بعض نے صرف اس بات پر اکتفا کی ہے، جُناح جُنوح سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں،

عربی لفظ "جناح" اور فارسی گناہ کے درمیان جو واضح اور حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے، اس کی بناپر یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کا باہمی تعلق اور اُن کی مشابہت کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ مشابہت محض اتفاقی ہے یا فی الواقع اس لفظ کو ایک زبان نے دوسری زبان سے مستعار لیا ہے، اگر مستعار لیا ہے

پھر سورۃ التحریم میں ہے:-

"اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ۝" (تحریم - ۱)

(۴) جزیہ :- جزیہ وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت ذمیوں یعنی اپنی غیر مسلم رعایا پر اُن کے جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں عائد کرتی تھی۔

جزیہ کا لفظ قرآن مجید (سورۃ براءت) میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے:-

"قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" (توبہ - ۴)	اُن لوگوں سے جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ یوم آخرت پر، اور نہ اُس چیز کو حرام سمجھتے ہیں جس کو اللہ اور اُس کے رسُول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ وہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ مطیع ہو کر جزیہ دیں۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات فی غریب القرآن میں جزیہ کو جزی سے مشتق بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ اسے جزیہ اس لئے کہتے تھے کہ وہ ذمیوں پر اُن کے مال و جان کی حفاظت کے "بدلے" میں عاید کیا جاتا تھا۔ لسان العرب کا بیان ہے

سیاست میں اسلام

افغانستان

مترجمہ حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دار المصنفین

انگریزی کے مشہور سہ ماہی رسالہ "دی مسلم ورلڈ" نے چند سال قبل "سیاست میں اسلام" [illegible] ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا، اور اس پر مختلف ماہرین سے مضمون لکھوائے گئے تھے جو بعد میں [illegible] کو رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع کر دیا، ان سے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے، اسلئے معارف میں ان کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

افغانستان کی مجموعی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے جس میں کئی قومیں مختلف رنگ کے طبعی حالات اور متعدد زبانیں پائی جاتی ہیں، وہاں کا سب سے زیادہ نمایاں [illegible] پختونوں کا ہے، اور سرکاری زبان پشتو ہے، مسلمان ۹۹ فی صد ہیں، جن میں ۸۰ فی صد حنفی المسلک ہیں، باقی میں قابلِ ذکر اسماعیلیوں کا ایک چھوٹا سا فرقہ اور اثنا عشری امامیوں کا فرقہ ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ افغانستان کے دیہاتوں، جرگوں اور اکثر شہری علاقوں میں اسلام جس شکل و صورت میں موجود ہے۔ اس کی شناخت ایک مسلمان عالم کے لئے نہایت مشکل ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح افغانستان میں بھی اسلام کی دو شکلیں نظر آتی ہیں، ایک تو وہ جو خواندہ اور مہذب طبقہ میں رائج ہے، اور دوسری وہ جس پر ناخواندہ لوگ عمل کرتے ہیں، افغانی سوسائٹی میں کئی عقائد ایسے ہیں جو اسلامی تعلیمات کی ضد قرار دیئے جا سکتے ہیں مثلاً "پختون ولی" یا پہاڑی علاقوں کا روایتی اصول "خون کا بدلہ خون" وغیرہ،

تو کیا یہ لفظ عربی سے فارسی میں آیا ہے۔ یا فارسی سے عربی میں دخیل ہوا ہے،
اس سوال کے جواب میں جرمن مستشرق ہبس مَن Hubschmann
نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جُناح دراصل فارسی لفظ ہے جسے معرّب کرلیا
گیا ہے[1] اس قول کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کے متعدد الفاظ
ہیں مثلاً ابریق، سجّیل، زمہریر اور فردوس جو قطعی طور پر فارسی الاصل ہیں فارسی الفاظ کی تعریب عربوں
کا معمول رہا ہے، اس لئے اگر جُناح کی اصل فارسی ہے تو یہ کوئی خلاف معمول یا بعید از
قیاس امر نہیں ہے۔ (باقی)

---

[1] Hubschmann, Persische Studien P.162, 1895 A.D.

کو کافی حد تک سیکولر بنانے کی کوشش کی، پردہ کا رواج ختم کیا، مخلوط تعلیم کے سیکولر اسکول قائم کئے، کابل کے لوگوں کو مغربی لباس پہننے کا پابند بنایا، سب سے بڑھ کر یہ کہ روس کی ٹیکنیکی امداد قبول کر لی، عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ افغانستان کو روسی امداد سنہ ۱۹۵۵ء کے بعد ملنا شروع ہوئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۵ء کے بعد وہ دوبارہ جاری ہوئی تھی،

بہرحال افغانستان کا مذہبی طبقہ اور قدامت پرست گروہ اپنی آزادروی پر ان غاصبانہ کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا، جس سے بالآخر افغانستان میں بغاوت ہوگئی، اس بغاوت کے پس پشت نہ تو فوج تھی، اور نہ عوام کی اکثریت صرف وہ قبیلے تھے جن کو قدامت پرست مذہبی رہنماؤں اور انگریزوں کے تربیت یافتہ دیوبندی علماء نے بھڑکایا تھا۔ اس لئے امان اللہ خاں اپنی ترقی پسندی کا آپ شکار ہوگئے، افغانی علماء کے خیال میں امان اللہ خاں کی پالیسی غیر اسلامی تھی، اس لئے خدا نے اپنی پشت پناہی ان سے چھین لی جس کی بل پر وہ حکومت کر رہے تھے،

اس کے بعد ۹ مہینے تک ایک تاجک ہیرو، بچہ سقہ جو اپنے کو حبیب اللہ غازی کہتا تھا۔ افغانستان پر حکومت کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کے ایک دور کے چچازاد بھائی جنرل محمد نادر خاں (جن کو امان اللہ خان کی ترقی پسندی کی مخالفت کے باعث ملک بدر کر دیا گیا تھا) نے اس غیر مختونی غاصب کو تخت سے اتار دیا اور ۲۹ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک خود شاہ محمد نادر شاہ کے نام سے حکومت کرتے رہے، ۱۹۳۳ء میں وہ قتل کر دیئے گئے۔

قتل سے پہلے سنہ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ایک دستور جاری کیا تھا، جو ترکی،

افغانستان کے دیہاتوں میں پیروں، جادو، ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ بہت رائج ہیں، ہر مشکل اور مصیبت کے موقع پر ان سے مدد لیجاتی ہے، یہاں کے ناخواندہ اسلام کو ایک آزاد اصول زندگی کی حیثیت سے نہیں مانتے، بلکہ اسے ایک نادیدہ شئے قسمت کے ہاتھوں بےبسی، اور بے چون وچرا تسلیم برضائے الٰہی کا نمونہ سمجھتے ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان نظریات کا سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، خاص کر ایک ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت ناخواندہ ہے، افغانستان میں زیادہ تر دیہاتی ملا جاہل کسان ہیں، جو ملاگیری کے ذریعہ اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں

موجودہ تاریخی تبدیلیاں افغانستان میں قومیت کا جنم ۱۸۸۰ء میں ہوا، جب عبدالرحمٰن خان امیر کابل ہوئے، انھوں نے تمام اوقاف پر قبضہ کر کے ان کے متولیوں کا حکومت کی جانب سے وثیقہ جاری کر دیا، یہ بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن خان آج ظالم سوسائٹی کے جابرترین فرد تھے۔ وہ مذہبی قائدین کی مخالفت قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اُن کے بعد اُن کے ولی عہد بیٹے امیر حبیب اللہ کے دور حکومت (۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۹ء) میں مذہبی رہنماؤں کو پھر فروغ حاصل ہوا اور امیر حبیب اللہ نے اوقاف اُن کے متولیوں کو بحال کر دیئے۔ امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد اُن کے تیسرے بیٹے امان اللہ خان تخت و تاج کے وارث ہوئے، انھوں نے دس سال (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۹ء) تک افغانستان کو بڑے خلفشار میں مبتلا رکھا، امان اللہ خان افغانستان کو جدید رنگ دینا چاہتے تھے کہ [illegible] بدقسمتی سے نہ تو عوام پر اُن کو مکمل قابو حاصل تھا، اور نہ فوج زیادہ مضبوط تھی، اور اپنی ترقی پسندانہ اسکیموں کو چلانے کے لئے انھوں نے فوج میں تخفیف بھی کر دی تھی، انھوں نے اپنے آئین اور فرامین کے ذریعہ افغانی زندگی

وزیر اعظم داؤد نے اپنے دس سالہ دورِ حکومت میں بڑے بڑے مذہبی ملاؤں سے کئی بار ٹکر لی، اور ہر بار کامیاب رہا، کیونکہ اس کا زیادہ تر انحصار فوجی طاقت پر تھا، قدامت پرست علماء ہر موڑ پر اس کی مخالفت کرتے رہے، انھوں نے نظامِ تعلیم کو سیکولر بنانے اور بہت سی قانونی و سیاسی اصلاحات کی شدید مخالفت کی ۱۹۵۹ء میں پردہ کا رواج ختم کر دینے پر دینی رہنما نہایت برہم ہوئے لیکن داؤد نے اپنے مخالف نظریئے بجائے اس سرغنہ لوگوں کو جو اس اقدام کو غیر اسلامی تصور کرتے تھے، بلا تامل جیل میں ڈال دیا۔ ان ملاؤں پر غداری اور کفر کا الزام لگایا گیا، افغانستان کے نوجوان دانشور، جامعۃ الازھر اور کولمبیا اسکول کے فارغین نے بھی حکومت کے موقف کو حق بجانب ثابت کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ "پردہ بازنطین اور ساسانی دور کا ایک شہری رواج تھا، جو مسلمان فاتحین نے اختیار کر لیا تھا" ان توضیحات اور بحثوں نے ملاؤں کو پردہ کی تنسیخ قبول کرنے پر مجبور کر دیا، مگر اکثر دبیشتر دل سے اس کے لئے رضامند نہیں ہو سکے ہیں ناخواندہ لوگوں کے مذہبی عقائد کو دلائل سے بدلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے،

داؤد نے ۱۹۵۹ء میں جدیدیت کی مخالفت کی تحریک کو فوجی طاقت سے کچلنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا، اور مالگذاری نہ دینے والوں اور قندھار کے مذہبی فسادات میں حصہ لینے والوں کی بھی سرکوبی کی، اس سے قدامت پرست طبقہ بے اثر ہو کر رہ گیا،

وزیر اعظم داؤد کا زوال پختونستان کی تحریک کی حمایت کی وجہ سے ہوا، اس مسئلہ کی وجہ سے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک افغانستان پاکستان سرحد بند رہی، اور وہ دوبارہ اسی وقت کھل سکی، جب محمد ظاہر شاہ نے داؤد کو آزاد پختونستان کی حمایت کے باعث استعفا دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد شاہ نے ایک عارضی وزارت کی تشکیل کی، جس کے سربراہ

ایران، اور فرانس کے دستوروں کا مرکب تھا، مگر افغانیوں نے اس کو کبھی مکمل طور سے نافذ نہ ہونے دیا۔ اور مذہبی رہنما اپنی قدامت پسندی کے باعث سیکولر نظریات کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے

ان کی وفات کے بعد ان کے تین پسماندہ بھائیوں (محمد ہاشم، شاہ محمود اور شاہ ولی) نے انیس سالہ ولی عہد شہزادے کی پشت پناہی کی، جو افغانی تاریخ میں نیا واقعہ تھا، کیونکہ افغانستان اور مشرق وسطیٰ کے دیگر مسلم ممالک میں حکمراں کی موت کے بعد اس کے بھائیوں اور بیٹوں وغیرہ میں ہمیشہ تخت کے لئے جنگ ہوتی آئی ہے، محمد ہاشم ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء تک اور شاہ محمود ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک اس وقت تک شاہزادے کے سرپرست رہے، جب تک پختہ کار نہ ہوگیا، مسلم معاشرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ باپ کی موت کے بعد چچا ولی، اور نگراں ہوتا ہے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۲ء تک افغانستان میں پارلیمانی طرز حکومت کے لئے ہلکی پھلکی کوششیں ہوتی رہیں، لیکن افغانستان اپنی قدامت پرستی پر قائم رہا۔ ترقی کی رفتار بہت سست رہی، اور مذہبی رہنماؤں کی طاقت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

جدیدیت کی طرف نئے قدم ۱۹۵۳ء میں افغانستان کے حالات نے ایک نئی کروٹ لی، جنرل محمد داؤد خاں نے جو بادشاہ اور وزیر دفاع کا چچا زاد بھائی تھا، اپنے چچا شاہ محمود سے خون خرابہ کئے بغیر اقتدار چھین لیا، اور وزیر اعظم کی حیثیت سے مشرقی اور مغربی ممالک سے بیش از بیش امداد حاصل کرنا شروع کر دی، اور ۱۹۶۳ء میں جب وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہوا، تو افغانستان کو ایسے معاشی، اقتصادی اور سماجی خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں صحیح آئینی حکومت کا قیام عمل میں آیا،

اس کے لئے ضروری ہے، کہ وہ قوماً افغان، مذہباً مسلمان اور مسلکاً حنفی ہو۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی بقا کے لئے شاہی خاندان میں ہی حکومت کا سلسلہ چلتا رہے آئین کی دفعہ (۲۴) شاہی خاندان کے افراد کو سیاسی پارٹیوں کا ممبر بننے، وزارتی یا عدالتی عہدہ سنبھالنے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے سے باز رکھتی ہے، یہ چیز اگرچہ افغانی حکومت کو سیکولر بناتی ہے لیکن اس سے ملک کا اصل اقتدار بادشاہ کے ہی ہاتھوں میں رہتا ہے، جیسا کہ آئین کی دفعہ (۴۳) میں بصراحت مذکور ہے کہ:-

"بادشاہ اپنے حکم خاص کے ذریعہ پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کو ختم بھی بھی کر سکتا ہے"

آئین کے چند دوسرے اہم نکات یہ ہیں، سماجی انصاف، قانون کی نظر میں مساوات، شخصی آزادی، ذاتی جائداد کا تحفظ، عقیدہ و تقریر کی آزادی، تعلیم کا حق صحت کے لئے سہولتیں فراہم ہونا اور سیاسی پارٹیاں بنانے کے حقوق۔ یہ تمام چیزیں اسلام کی روح کے عین مطابق ہیں،

آئین کی سب سے اہم دفعات (۶۹) اور (۱۰۲) ہیں، دفعہ (۶۹) کے مطابق اس آئین میں درج تفصیلات کے علاوہ وہ تجاویز بھی قانون کا درجہ رکھتی ہیں، جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے پاس کیا ہو، اور جسے شاہ کی منظوری حاصل ہو، ان خطوں میں جہاں اس طرح کا کوئی قانون نافذ نہ ہوا ہو، حنفی اصولوں ہی کو قانون تسلیم کیا جائے گا۔" دفعہ (۱۰۲) کی تفصیل یہ ہے کہ

"عدالتیں اپنے زیر سماعت مقدمات میں آئین اور حکومت کے قوانین کا استعمال کریں گی لیکن اگر زیر سماعت مقدمہ آئین یا قانون کے حدود میں نہ آتا ہو تو حنفی قانون

ڈاکٹر محمد یوسف سابق وزیر معدنیات و صنعت تھے، نئے وزیر اعظم کو شاہ نے ایک ایسا آئین تیار کرنے کی ہدایت کی جو آئینی بادشاہت کے لئے فضا ہموار کر سکے، اس طرح کا آئین شاہ محمود اور داؤد خاں کے زیر غور بھی تھا، اور اب وہ وقت آچکا تھا جب شاہ کو اپنے اختیارات کا کچھ حصہ عوام کو منتقل کرنا ضروری ہو گیا تھا، نیا آئین یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کو نافذ کیا گیا، اس میں اسلام کو جدیدیت کے لئے ایک حربہ اور آلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا،

اس آئین کے بانی وہ نوجوان تھے جنھوں نے افغانستان کی بہترین مذہبی درسگاہوں یا الازہر اور مغربی لا اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی، لویا جرگا" (قومی آئین ساز اسمبلی) کے قدامت پرست لوگوں کے ہر اعتراض کو ان تربیت یافتہ افغانی وکلا و علماء نے بے اثر بنا دیا، اور متشدد قسم کے قدامت پسندوں کو شاہ نے خود بہلانے کی کوشش کی کچھ لوگ مخالفت سے باز بھی آگئے، پھر بھی بڑا طبقہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

ذیل میں ہم اس آئین کے بعض ان حصوں کا جائزہ لیتے ہیں، جن کا اسلام سے براہ راست تعلق ہے، آئین کی دفعہ (۱) و (۲) بتلاتی ہے کہ افغانستان ایک آئینی بادشاہت ہے، ایک آزاد اور غیر منقسم ملک ہے اور اسلام حکومت کا سرکاری مذہب ہے ۱۹۳۱ء کا آئین حنفی اصولوں کو ملک کا مذہب بنانے پر مبنی تھا، اس میں شیعوں اور غیر حنفی سنیوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی لیکن ۱۹۶۴ء کا آئین صرف حنفی مذہب کی روشنی میں حکومت کو عمل درآمد کرنے کا پابند بناتا ہے، اس میں غیر مسلموں کو بھی اس حد تک مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے جس سے امن عامہ یا حکومت کا قانون متاثر نہ ہو دفعہ (۷) اور (۸) بادشاہ کو اسلام کے مقدس اصولوں کا محافظ مقرر کرتی ہے

کے ہاتھ میں ہے، ایوانِ زیریں کے تمام ممبر عوام کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ .... ایوانِ بالا (مشرانو جرگہ) کے ایک تہائی ممبر منتخب کئے جاتے ہیں، ایک تہائی صوبائی کونسلوں کے منتخب کردہ ہوتے ہیں، .... اور ایک تہائی بادشاہ نامزد کرتا ہے لیکن قانون سازی کا اصل اختیار ایوانِ زیریں کے ہاتھ ہے، ان دونوں ایوانوں میں علماء بھی بیٹھتے ہیں، ایوانِ زیریں کا سکرٹری ایک ممتاز مذہبی لیکن جدید نظریات کا حامل شخص ہوتا ہے، موجودہ افغانی پارلیمنٹ سیاسی میدان کی وسعت کا بہترین نمونہ ہے، روایت پسند، ترقی پسند علماء، سیکولر نظریات رکھنے والے دائیں اور بازو کے ممبران سب بحث میں حصہ لیتے ہیں، اگرچہ پاس شدہ تجاویز پر جدیدیت (Modernism) کا رنگ غالب رہتا ہے، لیکن روایت پسندوں کی طاقت بھی کچھ کم نہیں، اور پارلیمنٹری نظام کے تحت اُن کی تنظیم اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئی ہے، اور یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ سیکولر نظریات کی ابتداء نے مذہبی طبقہ کو سیاسی طور پر منظم ہونے کا موقع فراہم کیا ہے جیسا کہ کئی حالیہ واقعات سے ظاہر ہے، مثلاً مئی ۶۶ء میں ایوانِ زیریں نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے طالبات کو قومی لباس پہننا ضروری اور برقع ممنوع قرار دیا گیا تھا، لیکن سر پر رومال باندھنا لازمی تھا، ایوان کی خاتون ممبران کو اس کے خلاف بولنے کی جرأت تو نہ ہو سکی لیکن اُن میں سے ایک رونے لگی،

۷ار جولائی ۶۵ء کا پریس قانون اب بھی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، جدیدیت کے علمبردار اس کو زیادہ نرم بنانے کے حامی ہیں، اور قدامت پرست اور سخت کرنا چاہتے ہیں، اس قانون کی رو سے عوام کو اخبارات نکالنے کی مکمل آزادی ہے، بائیں بازو کا ایک نیا

کی رو سے آئین کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے گا، تاکہ زیادہ سے انصاف مل سکے۔"

یہ دونوں دفعات افغانستان کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ سیکولر قومیت کا رنگ دیتی ہے، دفعہ (۶۹) کا تعلق مقننہ سے ہے، اور دفعہ (۱۰۲) کا عدلیہ سے ہے، یہاں سیکولر قوانین کو مذہبی اصولوں پہ فوقیت حاصل ہو جاتی ہے، اور اب تو افغانی پارلیمنٹ ۲۳۲ ایسے قوانین بنا رہی ہے، جو سیکولر عدالتوں میں مذہبی اصولوں کی جگہ لے لیں گے، ان قوانین کا تعلق انتخابات، پریس، سیاسی جماعتوں، سرمایہ کاری، آمدنی اور ٹیکس، تعلیم، صوبائی و میونسپل حکومت، ولسی جرگہ (ایوان زیریں) کے اندرونی نظام، تعزیری اقدامات اور شادی و وراثت سے ہے،

ان کی تکمیل تو مستقبل میں ہوگی لیکن آئین افغانستان نے قومیت کا ایک تصور ضرور قائم کر دیا۔ پھر بھی یہ تلخ حقیقت ہمیں کسی وقت فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ بے حد ناخواندگی اور قدامت پرست قبائل کے کسان عوام مستقبل قریب میں ان کوششوں کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے،

انتخابات، فسادات اور اخبارات افغانستان کا پہلا آزادانہ انتخاب اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوا، اس میں تعلیم کی کوئی قید نہ تھی، انتخابات کے لئے خفیہ ووٹ کا طریقہ اختیار کیا گیا، لیکن ووٹ دینے والوں کی فیصد تعداد بہت کم رہی تھی، اگرچہ عورتوں کو بھی الکشن میں کھڑے ہونے کا حق حاصل تھا لیکن کسی خاتون امیدوار نے گاؤں سے اپنے نامزدگی داخل نہیں کیا، البتہ کابل سے تین عورتیں ایوان زیریں کے لئے منتخب ہوئیں، اس وقت افغانستان کی وزارت میں وزارت صحت عامہ ایک عورت

کیا ہے کہ وہاں ۲۷ ہزار مقدمات سماعت کے لئے پڑے ہوئے ہیں:

آئین کی دفعات (۱۰۵)، (۱۰۶)، (۱۰۷)، اور (۱۲۷) شاہ کو ایک سپریم کورٹ قائم کرنے کا اختیار دیتی ہیں، گورنمنٹ اٹارنی جنرل کا دفتر قائم ہو چکا ہے، جو مقدمات کی تفتیش اور ضروری قانونی کارروائی کرے گا لیکن وزارت انصاف اور وزارت داخلہ کے مابین قانونی اقتدار کی تقسیم پر سمجھوتہ نہ ہونے کے سبب سے یہ دفتر ابھی تک اپنا کام باقاعدہ شروع نہیں کر سکا ہے،

بہرحال سیکولر نظریات کی شاہراہ اور قومی حکومت کا چلانا آسان چیزیں نہیں ہیں پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ افغانستان سیکولر نظریات کی راہ پر گامزن ہے ترقی کی یہ رفتار تھوڑی دیر کے لئے آہستہ کیجا سکتی ہے، اور اس کی طاقت کو مختلف سمتوں میں منتشر کیا جا سکتا ہے لیکن اُسے مکمل طور سے روکا جانا ممکن نہیں، جب تک فوجی انقلاب نہ ہو جائے، افغانستان کا اصل مسئلہ مذہبی علماء کو سیاست سے الگ رکھنے کا نہیں، بلکہ سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کا ہے کسی زمانہ میں افغانستان عالم اسلام کا سب سے پسماندہ اور قدامت پرست ملک شمار ہوتا تھا، لیکن اگر اُس کی ترقی کی موجودہ رفتار قائم رہتی ہے تو وہ ان اسلامی ممالک کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوگا، جو اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے سیکولر نظریات اپنانے کے خواہش مند ہیں،

(ڈاکٹر لوئس ڈوپری نمائندہ امریکن یونیورسٹی، کابل)

ہماری بادشاہی

یعنی آغاز اسلام سے لیکر عرب و ایران و ترکستان و افغانستان و ہندوستان در وم و اندلس کی اسلامی سلطنتوں کی مختصر تاریخ۔ (مولفہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی) "منیجر"
قیمت: للعہ

ہفت روزہ اخبار "خلق" ایرانی کمیونسٹ پارٹی (جواب غیر قانونی قرار دی جا چکی ہے) "تودہ" کی حمایت کرتا ہے، مئی ۱۹۷۰ء میں ایوان بالا کے بعض قدامت پرست اور مذہبی رہنماؤں نے اخبار مذکور کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کیا، ایوان زیریں نے بھی ۲۲ مئی کو اسی قسم کی ایک تجویز منظور کی، پریس قانون واضح طور سے بتلاتا ہے "کہ اخبارات کو اسلام کے اصولوں آئینی شہنشاہیت اور آئین کے دوسرے پہلوؤں کا تحفظ کرنا چاہیئے" "خلق" کے اڈیٹر اور پبلشر نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا کہ "یہ اخبار اسلام کا مخالف نہیں ہے، اور موجودہ حالات کے تحت وہ آئینی شہنشاہیت کی تائید کرتا ہے"۔

اس بیان نے قدامت پرستوں کو برافروختہ کر دیا، انھوں نے اخبار مذکور سے اور زیادہ اسلام موافق بیان دینے کا مطالبہ کیا۔ ترقی پسندوں نے کہا کہ اتنا کافی ہے کہ "خلق" "اسلام مخالف ہونے سے انکار کرتا ہے" حالانکہ اخبار خلق نے نجی ملکیت ختم کئے جانے کا مطالبہ کیا تھا جو اسلامی اصول اور ملکی آئین کے صریح خلاف ہے، یہ ہنگامہ ۲۴ مئی کو اس وقت فرو ہو سکا جب اٹارنی جنرل نے پریس قوانین کے خلاف ورزی کے جرم میں "خلق" پر پابندی عائد کر دی۔

افغانستان میں طلبہ کے ذریعہ پہلا فساد اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ہوا جب نئی پارلیمنٹ کا آغاز ہوا تھا، اس کے نتیجہ میں وزیر اعظم یوسف کو اپنے عہدہ سے ہٹنا پڑا، ان فسادات میں بائیں بازو کا ہاتھ ہونے کا شبہہ تھا، اس سے مذہبی طبقہ کو اس وقت بہت تقویت حاصل ہوئی، آئین اگرچہ سیکولر انصاف مہیا کرنے کا مدعی ہے لیکن قاضی زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرتے ہیں، اس لئے ابھی اقتدار کو صحیح معنوں میں سیکولرسٹوں کے ہاتھوں میں آنے کے لئے کافی عرصہ درکار ہے، حال میں افغان گورنمنٹ نے خود اعتراف

گذشتہ ۵۰ سال سے اُن کے تعلقات اس ادارہ سے تھے، اس لئے میں، اور شاہ صاحب دونوں ۲۱ر جولائی کو اُن کی عیادت کے لئے دہلی پہونچے، وہاں تین روز قیام رہا لیکن وہ ہوش میں نہیں آئے، اُن سے کوئی بات نہ ہوسکی اور نہ ان کو معلوم ہوسکا کہ ہم لوگ اُن کی محبت وشفقت کا حق ادا کرنے آئے ہیں، تین روز کے بعد ہم لوگ بڑی افسردگی کے ساتھ ان کے اعزہ سے رخصت ہوکر واپس ہو گئے، خطوط کے ذریعہ اُن کی حالت معلوم ہوتی رہی کبھی امید زیست ہو جاتی لیکن ۲۰ر ستمبر کی صبح کے ریڈیو سے یکایک خبر ملی، کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، آنکھیں اشک بار ہوئیں، دل رو دیا، رواں رواں رویا، رونے کے کے اسباب تھے: ادھر گذشتہ دس بارہ سال سے انھوں نے دارالمصنفین کو اپنی توجہ اور محبت کا خاص مرکز بنایا تھا، اور بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کے سرمایہ محفوظہ کے لئے کئی لاکھ روپیہ اپنی مساعی جمیلہ سے جمع کرکے رہیں گے، اسی کوشش کے سلسلہ میں سعودی عرب کے سفر کے ذریعہ سے پچاس ہزار روپیے دارالمصنفین کو دلوائے، پھر اسی اکتوبر میں مجھ کو اپنے ساتھ لیکر کویت تشریف لے جانے والے تھے، اس سفر کے لئے تیاری بھی شروع کر دی تھی لیکن خداوند تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیاوی سفر کرنے کے بجائے سفر آخرت کریں، انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی، کہ اب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین چلے آئیں گے جہاں رہکر وہ اپنے علمی کاموں کی تکمیل کریں گے لیکن یہ ارمان انکے دل ہی دل میں رہ گیا اور وہ سپرد خاک ہوگئے، ان کی وفات سے دارالمصنفین والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا ایک بڑا سہارا ہی نہیں اٹھ گیا، بلکہ بے سہارا ہو گیا۔ جنازے میں ہم لوگوں کی شرکت ممکن نہ تھی، ریڈیو سے خبر ملی کہ شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، جنازے میں کافی لوگ تھے، وزرا بھی، سفرا بھی، صدر جمہوریہ ہند کی بھی

وفیات

ڈاکٹر سید محمود

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

جناب ڈاکٹر سید محمود.......کو.......مرحوم.........لکھتے وقت قلم تھرتھرا رہا ہے، ہاتھ کانپ رہا ہے، دل رو رہا ہے، اُن کی وفات غیر متوقع نہیں ہوئی، انھوں نے کافی عمر پائی، ریڈیو اور اخباروں میں تو اُن کی عمر ۸۲ سال بتائی گئی ہے، مگر وہ غالباً اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے، لمبی عمر پائی، مگر وہ خود بھی دنیا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، اور نہ ہم لوگ ان سے اتنا جلد جدا ہونا چاہتے تھے، وہ مئی کے آخر میں اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی پوتی سے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے، کہ اٹھے اٹھنے میں پوتی سے ٹکرا کر قالین پر گر پڑے تو اُن کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسپتال لے جائے گئے، لیکن یہی موت کا بہانہ بن گیا، ٹوٹی ہوئی ہڈی علاج سے تو درست ہو گئی۔ مگر اور دوسرے امراض پیدا ہوتے گئے، پیشاب بند ہو گیا، آپریشن ہوا، ربر کی نلکی سے پیشاب جاری کیا گیا، بیہوش رہنے لگے، نلکی کے ذریعہ غذا پہنچائی جانے لگی، ہوش آجاتا، تو پہلے کی طرح باتیں کرنے لگتے، صحت کی امید بندھنے لگتی، اُن کے تمام اعزہ و اقربا، اُن کی عیادت کو جمع ہو گئے، اُن کی ایک صاحبزادی پاکستان میں ہیں، وہ آگئیں، اُن کے ایک صاحبزادے سید احمد جرمنی میں ہیں، وہ بھی آگئے، وہ دارالمصنفین کے بہت بڑے سرپرست اور مربی رہے

وہ مجھ سے برابر کہتے رہے، کہ جب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین میں قیام کریں گے تو مجھ کو اپنی سوانح عمری اور ٹوبیا گرافی کے انداز میں ڈکٹیٹ کراویں گے لیکن یہ نہ ہو سکا جس کا افسوس ہے، اُن کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور خیالات قلم بند ہو جاتے، تو اُن کے دور کی سیاسی اور تی زندگی کی بہت ہی قیمتی دستاویز ہو جاتی، راقم زیادہ تر ہم مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرے گا، گذشتہ بارہ تیرہ سال سے وہ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے تھے، دارالمصنفین آتے تو بارہ ایک بجے رات تک اپنے پاس بٹھائے رکھتے، اور ہر قسم کی باتیں کرتے رہتے، کبھی اپنے خاندانی حالات کا ذکر کرتے، کبھی اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے، کبھی اپنے معاصروں کا ذکر چھیڑ دیتے، کبھی ہندوستان کے گذشتہ سیاسی واقعات پر تبصرہ کرنے لگتے، کبھی اپنی خاص خاص تحریروں کے حوالے دیتے، کبھی جن جن تحریروں میں ان کا ذکر آیا ہے، اُن کی نشاندہی کرتے، ان ہی تمام باتوں کی روشنی میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں،

ان کی ولادت غازی پور کے ایک مردم خیز گاؤں سید پور بھتری میں ہوئی، ان کے خاندان میں دولت کے ساتھ علم اور مذہب بھی برابر رہا، مشائخ بھی گذرے، اکبر بہار اور بنگال کی فتح کے لئے آگرہ سے چلا تو سید پور بھتری سے گذرا، اُس وقت اس خاندان میں دو مشہور بزرگ بندگی شاہ جمال اور بندگی شاہ محمود تھے، اکبر نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، تو انھوں نے ملنے سے انکار کیا، مگر چند عدد بیریں بھیج دیں، اکبر اس تحفہ کو فال نیک سمجھا، وہ واپسی میں پھر سید پور بھتری سے گذرا، تو اس خاندان کے لئے ایک جائداد وقف کی، جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، ڈاکٹر صاحب کے دادا جناب قاضی فرزند علی نے اپنی وفات کے وقت ڈھائی لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد چھوڑی تھی، وہ رئیس ہونے کے ساتھ بڑے مذہبی بھی تھے، مکہ معظمہ حج کے لئے گئے تو وہاں سے حضرت علیؓ

نمایندگی تھی، وزیر اعظم اندرا گاندھی روس میں تھیں لیکن وہیں سے ان کا پیام تعزیت شائع ہوا، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی، بہت اونچا سنتے تھے، نیل پا کی وجہ سے زیادہ دور تک پیدل نہیں چل سکتے تھے، لیکن سفر اور کام کرنے میں جوانوں کو مات کرتے، سفر میں گرمی، سردی، دن، اور رات کا مطلق خیال نہ کرتے، ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کا سفر بے تکلف کر لیتے، مسز اندرا گاندھی سے اپنی بیٹی ہی کی طرح محبت کرتے، گذشتہ انتخاب میں اُن کی خاطر اپنی آخری علالت سے گویا تین مہینے پہلے یو۔ پی اور بہار کا سفر ایک طوفانی پروگرام کے ساتھ کیا، دہلی سے لکھنو، رائے بریلی، فیض آباد، جونپور، غازی پور، پٹنہ، مظفر پور، چھپرہ کا دورہ چند روز میں ختم کر لیا، اُن کے ساتھی تو تھک کر اُن کو چھوڑتے گئے، لیکن وہ تازہ دم دہلی واپس ہوئے، پھر فوراً اپنے نجی کاموں کے لئے دیوریا، غازی پور، اعظم گڈھ۔ اور جونپور آئے، یہاں سے واپس ہوئے، تو جیسا کہ ذکر آیا ڈرائنگ روم میں اتفاقاً گر پڑے، اور گرے تو پھر نہ اُٹھے، وہ تقریباً پانچ مہینے ولنگڈن اسپتال میں رہے اتنی طویل علالت میں لوگوں نے اُن کو نظر انداز نہیں کیا، اُن کی عیادت کے لئے صدر وی۔ وی۔ گری۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی، اور شہر کے اکابر، علماء، اور صلحا، برابر آتے رہے، سعودی عرب کے سفیر اُن کی عیادت کے لئے آتے، تو اُن کے اعزہ سے فرمایا کہ دنیا میں اگر کوئی بیش قیمت دوا ایسی ملتی ہو جس سے اُن کی صحت ہو جائے، تو وہ منگوالی جائے اس کے اخراجات وہ برداشت کر لیں گے، لیکن کارکنانِ قضا و قدر کی طرف سے پیام اجل چل چکا تھا، اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی، اور وہ اپنے عزیزوں اور عقیدت مندوں کو اپنا غم منانے اور اپنی خوبیاں یاد کرنے کیلئے چھوڑ گئے،

اس مضمون میں ان کی سوانح عمری یا ان کے سیاسی حالات لکھنے کا ارادہ نہیں ہے،

سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور سے بیعت کی، ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد بزرگوار سے مذہبی
حمیت اور ایمانی غیرت وراثت میں ملی صوم وصلوٰۃ کے پابند رہے، آخر زمانہ میں تو اوراد و وظائف
کا بھی شغل رکھنے لگے تھے فیل پاکی وجہ سے اُن کو اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی، مگر چوکی پر
بیٹھ کر بیٹھے بیٹھے نمازیں پڑھتے، سجدے کرنے میں ان کے پاؤں میں تکلیف ہوتی تھی، تکلیف
گوارا کرلیتے، دارالمصنفین آتے، یا میں خود اُن کے یہاں کبھی مہمان ہوتا، تو رات کو بھی اُٹھ کر
اُن کو نمازیں پڑھتے دیکھتا، اُن کے پاس دعاؤں کا ایک مجموعہ تھا جس میں قرآنی آیتیں تھیں
اُن کو وہ روزانہ پڑھا کرتے، کچھ تو اُن کو زبانی یاد تھیں، اور کچھ دیکھ کر پڑھتے۔ ایک روز فرمانے
لگے، کہ ان دعاؤں کو پڑھتے وقت خیال آیا کہ معلوم نہیں صحیح بھی پڑھتا ہوں یا نہیں، بارگاہ
ایزدی تک پہونچتی بھی ہیں یا نہیں، ایک رات یاس و حسرت کے انہی جذبات کے ساتھ سو گئے،
تو خواب میں دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوں، اور آپ فرما رہے
ہیں کہ جو دعائیں پڑھتے ہو اُن کو جاری رکھو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آنکھیں کھلیں تو اپنے
کو پسینے میں سرا بور پایا، انھوں نے کئی اور مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں
دیکھا، وہ ملک میں شیعہ سُنی کے فسادات سے بہت آزردہ خاطر رہتے، اسی آزردگی میں ایک
رات جو آنکھ لگی تو دیکھا کہ ایک مختصر مجمع ہے، فرش و فروش لگے ہوئے ہیں، حضور سرور دو عالم
تشریف فرما ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے ہیں، مجمع سے دو آدمی اُٹھے،
انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے حضرت علیؓ کی کچھ شکایت کرنے کی کوشش
کی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا وہاں
لائی گئیں، وہ ایک سفید چادر میں ملبوس تھیں، حضرت سیدہؓ کا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ
میں دیا گیا، دونوں کا نکاح پڑھا یا گیا، لیکن یکایک دیکھنے میں آیا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا

کے پیراہن کھڑاؤں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور ہرن کی سینگ پر
خط کوفی میں لکھا ہوا کلام پاک کا ایک نسخہ ساتھ لائے، ان تبرکات کی نمایش گاؤں میں
برابر ہوتی رہی، مولانا وارث علی شاہ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی کے استاد تھے، ایک
بار وہ اس گاؤں میں آئے، تو ان تبرکات کو دیکھا تو ان پر جذب کا عالم طاری ہو گیا،
ایک چیخ مار کر بولے واللہ یہی چیز ہے، یہی چیز ہے، حفاظت کرو، حفاظت کرو، اسی کے بعد
انھوں نے بیعت وارادت کا سلسلہ شروع کیا، ڈاکٹر صاحب کے دادا حضرت سید احمد شہید
بریلوی کی تحریک سے بھی متاثر تھے، انھوں نے اپنے ایک لڑکے یعنی ڈاکٹر صاحب کے بڑے
چچا کو جہاد کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سپرد کر دیا، ایک موقع پر انھوں نے اُن کی
خدمت میں ایک لاکھ کی رقم بھی پیش کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کو بھی اُن سے بڑی محبت
تھی، جب وہ حج سے واپس ہوئے، تو غازی پور کے ایک گاؤں میں پہونچے، یہاں
پہونچتے ہی فرمایا" بوے دوست می آید، بوئے دوست می آید" یہ کہکر یوسف پور کی
سمت پا پیادہ چل کھڑے ہوئے، جہاں اُس وقت ڈاکٹر صاحب کے دادا علیل تھے
اس علالت کے باوجود انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کا خیر مقدم بڑے جوش و
خروش سے کیا، ان کو غازی پور لے گئے، اُن کے پورے قافلے کی خاطر و مدارات میں کوئی
کسر اٹھا نہ رکھی، بہت سے تحفے تحائف ساتھ کئے، اس سے متاثر ہو کر سید صاحب نے اپنے
ساتھیوں سے فرمایا، تم نے میرے دوست کو دیکھا،

ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد ملا سید محمد عمر صاحب نے خالص دینی تعلیم پائی تھی، اسی لئے
ان کے نام کا جز ملا ہو گیا تھا، وہ مولانا عبد العلیم آسی غازی پوری کے تلامذہ میں تھے، ا
سلوک پر بھی گامزن ہوئے، اور حضرت قطب الہند شاہ غلام معین الدین عرف شاہ

جیسی شخصیتیں نہیں پیدا ہوئیں، جو قرآن پاک کی آیات کی روشن تعبیر کرتیں اور اس دور کے مسائل کی گرہیں کھولتیں، قرآن مجید کی آخری تفسیر و تشریح کبھی نہیں ہو سکتی، یہ بڑا معنی خیز، جامع العلوم اور عظیم المرتبت کلام ہے، ہر دور میں یہ سائنٹفک حقائق سے ہم آہنگ رہا ہے، ہر دور کے محقق اور سائنس دان نے اس کے اندر وہ صداقتیں دیکھی ہیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کریں"۔ اپنی وفات سے چار مہینے پہلے اپنے ایک مضمون میں یہ تحریر فرمایا:-

"کلام پاک کو اس سائنٹفک دور میں سائنٹفک طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک یوروپین سائنسداں نے لکھا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں۔ سائنس کے علوم کو بھی جاننا لازمی ہے، موجودہ دور کے سائنس دانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ اوپر کے سیاروں تک پہونچنے میں دور حاضرہ کی بجلی کام نہیں دے سکتی، اس لئے وہ اور طاقت و بجلی کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں، اگر ہمارے رسول صلعم کی معراج جسمانی تسلیم کر لی جائے، تو کیا عجب ہے کہ اُن کا براق در اصل وہی برق ہو جس کے انکشاف کی کوشش آج کل کے سائنسدان کر رہے ہیں، اسی طرح کے اور بہت سے قرآنی اشارے ہیں، جو سائنس کے نہ جاننے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے، قرآن کے الفاظ سخر الشمس والقمر کی تائید سائنس کے موجودہ انکشافات سے ہو رہی ہے، اسی لئے قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے سائنس کے علوم کی واقفیت ناگزیر ہو گئی ہے، یاد آتا ہے کہ سر شاہ سلیمان نے اپنی سائنسی تحقیقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ سائنس کے انکشافات جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے، اتنا ہی ذات باری کا یقین بڑھتا جائے گا" تہذیب

بکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر رکھا ہوا تھا، اس میں کسی نے آگ لگا دی، اس میں سے چھوٹی چھوٹی پتلیاں نکل کر ناچنے اور آپس میں لڑنے لگیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار ہوا، وہاں سے آپ اٹھ کر دور جا کر تشریف فرما ہوئے،

ڈاکٹر صاحب نے اس خواب کا ذکر کرکے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے آپ کا کیا تعلق ہے، پتلیوں کے جھگڑنے سے مراد شیعہ سنیوں کے باہمی جھگڑے ہیں، اور آپ کا وہاں سے اٹھ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے جھگڑے سے اسلام کی جو تضحیک و تذلیل ہو رہی ہے اس سے آپ کو سخت تکلیف ہو رہی ہے اور آپ ناراض ہیں، اس خواب کا ذکر انھوں نے اس پمفلٹ میں بھی کیا ہے جو انھوں نے شیعہ سُنّی کے اتحاد کے سلسلہ میں سُنّی مسلمانوں سے ایک دردمندانہ اپیل کے عنوان سے ہندوستان کے مشاہیر کے دستخطوں کیساتھ شائع کرایا تھا، لیکن اس میں اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا،

ان کو اپنی مذہبیت کی بنا پر کلام پاک سے بڑا شغف رہا، جب تک اُن کی بینائی کام کرتی رہی، اس کی تلاوت بھی کرتے رہے، اس کی تفسیر بھی پڑھتے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے سے متعلق اُن کے جو خیالات تھے، اس کا اظہار دارالمصنفین کی مجلسوں میں برابر کرتے رہتے، کہتے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے، وہ اسلام کو قرآن پاک کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنے ماضی قریب کی روایات ہی کو اسلام سمجھتے ہیں، قرآن پاک کا مخاطب ساری انسانیت ہے لیکن ہم نے غیر شعوری طور پر اس کو صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھ رکھا ہے، اسی لئے ہمارے علماء نے اللہ تعالیٰ کو رب المسلمین بنا دیا ہے، وہ رب العالمین بنا کر پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں، فیض آباد کے رسالہ داعم کے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ افسوس ہے کہ ہندوستان میں شیخ عبدہ اور شبلی جیسے

نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے حالات شروع سے آخر تک پڑھوا کر سنے، اور جب میں نے ختم کر کے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے،

اُن کو اپنے والد بزرگوار کے استاد شاہ عبدالعلیم آسی سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہتے تھے اُن سے بیعت تو نہیں ہوا لیکن اُن کا صحبت یافتہ ہوں، مگر اپنی بعض تحریروں میں اُن کے نام کے ساتھ پیر و مرشد بھی لکھا ہے، ان کے کلام کے مجموعہ کو سفر میں برابر ساتھ رکھتے، اس مجموعہ کے بہت سے اشعار اُن کو زبانی یاد تھے، جو سنایا کرتے، پھر بھی تشفی نہ ہوتی، تو مجموعہ سے اشعار پڑھوا کر سنتے، دارالمصنفین کے قیام کے زمانے میں ایک رات اپنی اٹیچی سے کلامِ آسی نکال کر مجھ کو دیا، اور کہا کہ اس کو پڑھ کر سناؤ۔ میں نے یہ مجموعہ کھولا، تو یہ غزل پڑھنے لگا۔

کبھی میری بھی تجھے چاہ تھی، ترے دل میں میری بھی راہ تھی
کبھی اس طرف بھی نگاہ تھی کہ یہ سب خیال ہے خواب ہے
دلِ مبتلا ہے ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر
کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے
یونہیں اپنے کوچہ میں رہنے دے نہ عبث اٹھا کے ستا مجھے
جو اٹھے تو درد جگر اٹھے کہیں مجھ میں اٹھنے کی تاب ہے
اگر آنکھ کھولو تو کچھ نہیں اثر وجود بجز فنا،
ہے سواد ہستی بے بقا کہ بیاضِ چشم حباب ہے

ہر شعر پر وجد کرتے کبھی تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے، کبھی اٹھ بیٹھتے، ہر شعر کو سمجھاتے بھی جاتے، کہتے کہ اشعار میں تغزل، موسیقی، جذبہ سب کچھ ہے، پھر کہا کہ اسی قافیہ اور ردیف میں کیفِ عشق کے عنوان سے بھی اُن کے اشعار ہیں، وہ بھی پڑھو،

خدا کے وجود کے متعلق شکوک اس لئے ہیں کہ ابھی سائنس کی تحقیقات مکمل نہیں ہو سکی ہیں،......... قرآن پاک میں ذوالقرنین کے متعلق جیسی باتیں لکھی ہوئی ہیں، وہ موجودہ تحقیقات سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں، قرآن پاک کا یہ دعویٰ کہ اس کی تعلیم ہر زمانہ کے لئے ہے مزید تحقیقات سے اور بھی مستحکم ہو جائے گا،"

اُن کو اس کی بھی لگن رہی کہ قرآن پاک کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ عام کی جائیں، حیدرآباد کے ڈاکٹر عبد اللطیف نے جب مولانا ابو الکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا، اور ایک سوسائٹی کی تشکیل کر کے قرآنی تعلیمات کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ ترویج دینے کی اسکیم بنائی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی کوششوں سے ان کے لئے ایک گرانقدر رقم فراہم کرائی،

اُن کو اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے صوفیائے کرام سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہا کرتے کہ مجھکو بچپن میں حضرت قطب الہند مولانا غلام معین الدین عرف شاہ امید علیؒ کی گود میں کھیلنے کا فخر حاصل ہوا، جونپور جاتے تو ان کی خانقاہ میں ضرور حاضری دیتے، اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے، ان کی خواہش یہی رہی کہ وہ اپنی وفات کے بعد جونپور ہی میں سپرد خاک ہوں، اس سلسلہ کے بزرگوں کے قبرستان میں اپنی جگہ بھی متعین کر دی تھی، مگر مشیت ایزدی کچھ اور تھی، ایک بار میں ان کے ساتھ جونپور میں تھا، تو اس قبرستان میں اُن کے ساتھ گیا، یہیں ان کے والد بزرگوار اور والدہ بھی مدفون ہیں، اپنے والدین کی قبروں کے علاوہ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر علٰحدہ علٰحدہ جا کر غایت عقیدت و احترام سے فاتحہ پڑھتے رہے، دار المصنفین آتے تو صوفیائے کرام کے واقعات شوق سے سنتے، اور خود بھی بیان کرتے، ایک روز میری کتاب بزم صوفیہ سے حضرت

بصیرت، فکر اور نظر کے بہت قائل تھے، سیرۃ النبی اور الفاروق کی بہت تعریف کرتے، البتہ مضامین عالمگیر کی بعض باتوں سے اختلاف کرتے، کہتے کہ یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے اور زیب کے خلاف جو زہر پھیلایا گیا ہے، اس کا یہ تریاق ہے، مگر مولانا نے اورنگزیب کو سراہنے میں کہیں کہیں شاہجہان اور جہانگیر وغیرہ کو جو مجروح کیا، وہ نہ کرتے، تو اچھا تھا،

مولانا شبلی کو بھی اُن سے لگاؤ رہا، دونوں میں برابر خط وکتابت رہی، مولانا شبلی اُن سے علمی خط وکتابت بھی کرتے، اپنے خط میں ان کو محبّی لکھتے، اور جب آخر میں مجلسِ تالیف سیرت قائم کی تو ان کا نام بھی اس میں رکھنا چاہا، مولانا شبلی کا ایک خط ان کے نام سے یہ ہے،

محبّی! سلام شوق!

آپ سے تو میں نے امیدوں کا بڑا سلسلہ قائم کیا تھا، جو بیچ میں ذرا منقطع ہوگیا تھا،

یہ سچ ہے کہ جرمن پر نظر ڈالنی چاہئے لیکن نظر کہاں سے آئے ہیں بالکل تیار ہوں، آپ جب بانکی پور جائیں تو مجھ کو لکھیں، میں دو ایک مہینہ کے بعد ضرور آجاؤں گا، مرگولوس، نولدکی وغیرہ سے بہت کچھ نقل کرتا ہے لیکن وہ سب مضحکہ انگیز ہوتے ہیں، آج جو مقام زیر قلم تھا، وہ یہ کہ نولدکی نے آنحضرتؐ کا ذلیل النسب ہونا ثابت کیا ہے، دلائل سخت حیرت انگیز ہیں، قرآن مجید میں ایک آیت ہے

وقالوا لولا نزل هذا القرآن یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن دو

علی رجل من القریتین عظیم شہروں میں کسی رئیس پر کیوں اترا

عظیم کا لفظ رئیس اور صاحب دولت واقتدار کے لئے آتا ہے، اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور ریاست حاصل نہ تھی اس سے بدنسبی

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں بہ کیفِ شراب ہے
لبِ یار چوسے تھے خواب میں وہی جوشِ مستیٔ خواب ہے
وہی پیشِ چشم ہیں ہر نظر مگر اب بھی شوقِ نقاب ہے
وہی میری ہر رگ و پے میں ہیں مگر اب بھی مجھ سے حجاب ہے
انھیں کبر حسن کی نخوتیں مجھے فیض عشق کی حیرتیں
نہ کلام ہے نہ پیام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

ان کو مولانا آسی کے مجموعۂ کلام کے تمام عنوانات یاد تھے، کبھی کبھی اُس کے صفحے بھی بتا دیتے، کہتے کہ مولانا آسی کے بہت سے اشعار میں کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث کی طرف اشارہ ہے پھر وحدت الوجود پر ان کے اشعار سناتے رہتے، اس شعر کو بار بار پڑھتے

بجز تمھارے کسی کا وجود ہو یہ محال مگر تمھیں نظر آنے ہو ماسوا ہو کر

مولانا آسی کے یہ اشعار بھی انہی کی زبان سے سُنے :۔

بلندی اُس کی اسی کی پستی ہر ایک شے میں اسی کی ہستی
عروج اُسی کا رسول ہو کر، نزول اسی کا کتاب ہو کر

ان کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی، پھر اپنے بہنوئی سید محمد عمر صاحب کے ساتھ بنارس چلے گئے، یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے اُن کے والد کی مرضی کے خلاف انگریزی تعلیم دلائی شروع کی، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان کو مولانا شبلی کی تصانیف سے دلچسپی ہوئی پھر یہ دلچسپی عقیدت میں ایسی تبدیل ہوگئی کہ ان کے شاگردوں سے بھی گہرے تعلقات پیدا کیے، اور پھر دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے تو اس سے ہر طرح کی محبت کا اظہار کرتے رہے، وہ مولانا شبلی کو بہت بڑا عالم، ادیب، مورخ، شاعر سمجھتے تھے، ان کی

اس کم سنی میں بھی ان مضامین سے دُکھ ہوا تھا، مولوی بشیر الدین کے یہاں روزانہ شام کو "جہل مرکب" کے نام سے ایک اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ڈاکٹر صاحب بھی اس اجتماع میں شریک ہونے لگے، انھوں نے اس میں ان مضامین پر سخت نکتہ چینی کی، ان کا خیال تھا کہ قومی تحریک کے لئے ایسے مضامین مضر ہوں گے اس ملک میں رہ کر ہندوؤں کو اپنے سے دور کرنے کے بجائے اُن کو اپنے سے قریب تر کرنا ضروری ہے اگر ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے شکوک ہیں، تو اُن کو دور کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرتے رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اور بھی جو دلائل پیش کئے، ان سے مولوی بشیر الدین صاحب خوش ہوئے، اور وہ روزانہ اپنے ساتھ ان کو ٹہلنے کے لئے لے جاتے، ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جو کچھ کہا تھا وہی اُن کے ذہن کا خمیر بنا رہا،

وہ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے جہاں ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ تک رہے، اس مادرِ درسگاہ کی محبت ان کے دل میں ایسی سرایت کیے ہوئی تھی، کہ آخر وقت تک اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہ کرتے، سر سید سے تو اُن کو ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن وہ اُن کو مسلمانوں کا بہت بڑا محسن سمجھتے، ان کے متعلق ان کے جو خیالات رہے، وہ ان کی اس تحریر کے ٹکڑے سے ظاہر ہونگے جو انھوں نے اپنی وفات سے پانچ مہینے پہلے لکھی، وہ لکھتے ہیں :-

"سر سید سند یافتہ عالم تو نہ تھے لیکن ان کے جو کارنامے ہیں ان کی وجہ سے کینٹول اسمتھ نے اُن کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، شبلی، حالی، نذیر احمد اور آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ عطا کی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اُردو کے یہ عناصر اربعہ سر سید کے خیالات و تحریکات سے متاثر نہیں ہوئے، شبلی کا سلسلۂ ناموران اسلام

کہاں ثابت ہوتی ہے؟ یہ نولدیک کا استدلال ہے،

میں نے بعض فرنچ کتابیں پڑھی ہیں، رینان کا ایک رسالہ سبقاً پڑھا، عجیب حماقانہ باتیں پاتا ہوں، رینان نے ثابت کیا کہ علم اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے، پورا رسالہ اسی بحث پر ہے

ذالک مبلغھم من العلم..... مجھ کو تو اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں

آپ کا خاص جی چاہتا ہے الہلال وغیرہ میں شائع کر دوں کلاً یا جزاً

یہ میں چاہتا ہوں کہ مجلس تالیف سیرت میں آپ کا نام شامل کروں"

شبلی ۔ لکھنؤ،

۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

۱۸۹۹ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے اٹاوہ بھیجے گئے جہاں مولوی بشیرالدین صاحب نے اپنا مشہور اسکول کھول رکھا تھا، انھوں نے کئی بار اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ جب انھوں نے پہلی دفعہ مولوی بشیرالدین کو دیکھا تو ان کو مسلمانوں کا اتنا بڑا محسن سمجھنے کے بجائے اسکول کا کوئی ادنیٰ ملازم سمجھا، وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے بے نیاز رہتے، خود سادہ رہ کر مسلمان طلبہ کو سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ ان سے ملے تو وہ دوڑ کر ایک ٹوکری میں چنے لائے، اور کہا کہ یہ ناشتہ تمھیں کرنا ہوگا، وہ اٹاوہ میں دو تین مہینے سے زیادہ نہ رہے، وہاں سے علی گڈھ چلے گئے، مگر مولوی بشیرالدین سے بہت متاثر رہے، کہتے کہ ان کے اخبار البشیر کی حیثیت اس زمانہ میں ٹائمس آف لندن کی تھی، وہ انگریزوں اور خصوصاً یو۔پی کے گورنر کے خلاف برابر مضامین لکھا کرتے، ان کے اخبار میں کوئی اور صاحب ہندؤں کے خلاف بھی مضامین لکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو اپنی

کے مفاد کی خاطر اس کوشش کو بہت زیادہ بار آور نہ کر سکے، وہ کافر تو ضرور بنائے گئے، لیکن انہی کے یہ اشعار بھی ہیں،

خدا دارم دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےؐ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
ز جبریلِ امیں قرآن بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اپنے سینے میں اسلام کی آتش فروزاں رکھنے والا ہی یہ اشعار کہہ سکتا ہے،"

ان کی وطنی محبت کا جذبہ علی گڈھ میں اتنا اُبھرا کہ وہ وہاں قوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اپنی ایک تحریر میں اپنے زمانہ کے کالج کے ساتھیوں کو یاد کرکے لکھتے ہیں:-

"مہندر دیو تاب، تصدق احمد، حیات، جواہر لال (جواہر لال نہرو نہیں) مجید احمد، شیو پرشاد، باقی محسن، شمشاد، مسعود، یہ سب طلبہ علی گڈھ کے مشہور کالج میں انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے، یہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے، لیکن ایک دوسرے کے ہمدرد، غمخوار اور آپس میں سب دوست تھے، روزانہ شام کو ماریسن کورٹ (جہاں ان میں سے اکثر رہتے تھے) کے کمرہ نمبر ۴ میں جمع ہوتے تھے، اور دیر تک ہنستے بولتے اور آپس میں گپ شپ کرتے رہتے۔ مہندر دیو تاب، جواہر، شیو پرشاد ایک علٰحدہ بنگلہ میں رہتے تھے، جو بورڈنگ ہاؤس میں خاص کر ہندو طلبہ کے لئے متعین کر دیا گیا تھا، شام کو یہ سب دوست مل کر کبھی کبھی پرانے قلعہ کی طرف سیر و تفریح کے لئے چلے جاتے، اونچے درجے کے طلبہ میں بھی (مثلاً حبیب الرحمٰن (بجنوری) عزیز الرحمٰن، اور بدر الدین) ان کے

سرسید ہی کی صحبت کی وجہ سے شروع ہوا، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور لکچروں میں سرسید کے خیالات کی پوری عکاسی ہے اور آج یہ بحث جاری ہے کہ اُن کے ناول ابن الوقت کا ہیرو دراصل سرسید ہی کا کیرکیٹر ہے۔ ابن الوقت انگریزوں کے تمدن میں ضرور رنگ گیا ہے، لیکن اس کی خودداری اور غیرت کی جو تصویر کشی کی گئی ہو وہ ضرور قابلِ قدر ہے، حالی نے گلِ گشتِ رندانہ اور نغمہ مستانہ الاپنے کے بعد جب سرسید کو اپنا رہبر تسلیم کر لیا، تو پھر ان کا ملی درد، مذہبی جوش اور ایمانی ولولہ مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا، اور یہ وہ کتاب ہے، جس نے مسلمانوں میں غیر معمولی معاشرتی، تعلیمی، دینی اور مذہبی انقلاب پیدا کیا، اس کے مفید اثرات اس وقت تک باقی رہیں گے، جب تک مسلمان ہندوستان میں اردو پڑھتے رہیں گے یہ مسدس دراصل سرسید ہی کے جذبات کی صحیح تصویر ہے اور یہ ان ہی کا کارنامہ ہے، ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اندر مسدس حالی جیسی کوئی اور کتاب گذشتہ تین صدیوں کے اندر ....

...... نہیں لکھی گئی جس سے مسلمان اتنا زیادہ متاثر ہوئے ہوں اور انھیں ہر شعبۂ زندگی میں اتنے فوائد پہونچے ہوں، خود مولانا ابوالکلام آزاد سرسید کے کارناموں سے متاثر رہے، یہ اور بات ہے کہ اُن کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے، میں تو اقبال کو بھی سرسید ہی کی تحریکات کا علمبردار سمجھتا ہوں سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اس سائنٹفک اور اٹیمک دور سے پہلے کلام پاک کو سائنٹفک طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کی بنا ڈالی، لیکن اُن پر کفر کے اتنے فتوے صادر ہوئے کہ اپنے کالج

رہنے والے تھے، کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے، انھوں نے چھ جلدوں میں میرا پہلا گناہ کے نام سے ایک کتاب لکھی، اُن کا بعد میں قتل ہو گیا،

ان کے ہم جماعت سرسید کے پوتے سر راس مسعود اور قاضی تلمذ حسین مصنف مرأۃ المثنوی بھی تھے، سر راس مسعود کو سیاست سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں رہی، اس کے باوجود دونوں کے تعلقات برابر خوشگوار رہے، البتہ قاضی تلمذ حسین اُن کی سیاسی سرگرمیوں کے ناقد رہے، اُن کے خلاف کچھ مضامین بھی لکھے،

علی گڈھ میں رفتہ رفتہ اُن کے ساتھیوں کا ایک ایسا گروپ بن گیا، جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف رہا، اس گروپ نے طلبہ پر انگریزوں کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کو وطنی محبت کے جذبے میں دور کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، ان کے ہم خیال طلبہ نے ایک خفیہ سوسائٹی اخوان الصفا کے نام سے قائم کی، اس میں جو بحث مباحثے ہوتے، اس کا اندازہ ان کی کتاب "آج سے قبل کا ہندوستان" سے ہوگا، اس میں انھوں نے اپنے زمانہ کے علی گڈھ کے طلبہ کی گفتگوؤں کے حوالے سے اُن کی ذہنیت کو بھی پیش کیا ہے، اس کتاب کا ذکر آگے آئے گا،

اس زمانہ میں ام۔ او۔ کالج میں انگریز اساتذہ میں مارسین، کارنا، اور براؤن تھے، اُن کے خلاف طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، تو انھوں نے اور مطالبات کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا کہ بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال انگریز اساتذہ کے سپرد نہ کئے جائیں، اور اگر وہ اساتذہ کی حیثیت سے نااہل ثابت ہوں تو رو رعایت کے بغیر برطرف کر دیئے جائیں، یہ بے چینی ۱۹۰۷ء میں ایک اسٹرائک میں منتقل ہو گئی، ڈاکٹر سید محمود نے اس میں نمایاں حصہ لیا، دوسرے طلبہ کے ساتھ کالج سے نکالے گئے، مگر اس سے اسٹرائک کرنے والوں کی اور بھی زیادہ

کچھ دوست تھے، عبدالرحمٰن ایم۔ اے میں پڑھتے تھے، اور عزیزالرحمٰن اور بدرالدین
ایف اے میں، کبھی کبھی یہ دونوں بھی اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف
مضامین پر گفتگو کیا کرتے تھے، مہندر پرتاپ اپنے درجہ میں محنتی لڑکوں میں
شمار ہوتے تھے، لیکن ان کو تاریخ نہیں یاد ہوتی تھی، اور نہ دل اپنا اس مضمون
میں لگاتے تھے، جواہر اور احمد کو اپنے درجہ میں تاریخ سب سے اچھی یاد تھی، حیات
اور نصیر احمد کو ہندو اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، لیکن انگریزوں
کے زمانہ کی تاریخ کو وہ شوق سے یاد کرتے تھے، تمام وائسرائوں کے شاندار نام
ان دونوں کو ازبر یاد تھے، ہمارے میر ولایت حسین صاحب جن کا انتقال
۱۸ر جولائی ۱۹۴۹ء کو ہوگیا، تاریخ کے استاد تھے، ہر چند کوشش کرتے کہ
مہندر پرتاپ کو کسی طرح تاریخ یاد ہوجائے، تاکہ وہ امتحان میں کامیاب
ہوجائیں لیکن ان کی ساری کوششیں رائگاں جاتیں ۔"

مہندر پرتاپ سے مراد راجہ مہندر پرتاپ ہیں، جو ابھی تک زندہ ہیں، اور
انقلابی ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک جلاوطن
رہے، تصدق سے مراد تصدق احمد شروانی ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور کانگریسی لیڈر اور
یو۔ پی میں وزیر بھی رہے، عبدالرحمٰن سے مراد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہیں، جو غالبؔ
پر اپنے ایک مضمون کی وجہ سے اردو ادب میں ایک مستقل جگہ بنا گئے ہیں، مجید سے مراد عبدالمجید
خواجہ ہیں، جو بعد میں مشہور کانگریسی لیڈر اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بھی ہوئے، حیات
بعد میں لارڈ حیات کے نام سے مشہور ہوئے، وہ نواب بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری بنے
عزیزالرحمٰن جمعیۃ العلماء کے مشہور رہنما مولانا حفظ الرحمٰن کے بڑے بھائی تھے، بدرالدین اناؤ کے

کے بکثرت اشعار یاد تھے، اور اپنے بڑھاپے میں بھی اُن کا کلام سُناتے تو سُناتے ہی چلے جاتے، سنہ ۱۹۲۰ء میں غالباً آپ نے ایک مضمون لکھ کر اُن کے اشعار سے سیاسی نتائج نکالے جس سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہوگئی، اس کا ذکر آگے آئیگا، تصدق احمد شروانی کے صاحبزادہ جناب مصطفےٰ رشید شیروانی میں جو الٰہ آباد جیمپ کمپنی کے مالک ہیں، اُن سے ڈاکٹر صاحب کے بہت ہی عزیزانہ تعلقات رہے، خواجہ عبد المجید صاحب کے گھر والوں سے بھی آخر وقت تک اُن کا گہرا لگاؤ رہا،

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ان سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا نام بھی وائس چانسلری کے لئے اخباروں میں آیا، اسی زمانہ میں جب وہ علی گڈھ گئے، تو طلبہ ان کو ایک بہت ہی شاندار جلوس میں اسٹیشن سے یونیورسٹی لے گئے، انھوں نے اس موقع پر علی گڈھ سے اپنی محبت کا پورا اظہار کیا لیکن وائس چانسلری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا،

وہ علی گڈھ کے کسی اولڈ بوائے کی تعریف سنتے تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی، ایک بار دار المصنفین میں ان کا قیام تھا، رات زیادہ گذر چکی تھی، میں اُن کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا، اثنائے گفتگو میں منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند جناب عنایت اللہ صاحب بی اے علیگ (سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد) کا ذکر آگیا، میں اُنکے ساتھ حیدرآباد میں کچھ دنوں رہ چکا تھا، اُن کی شرافت، اخلاق، وضعداری، نیت، مروت اور محبت کے کچھ واقعات سُنائے، تو وہ سن کر بہت ہی خوش اور شگفتہ ہو گئے، جھومنے اور کہتے اُن کے جیسا [illegible] بستر سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ ان واقعات کو سُنا کر تم نے میری آج کی رات کو کیسی [illegible] دی ہے، پھر یکایک دیکھا کہ اُن کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے، اور وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، جب پڑھ چکے تو کہا میں عنایت اللہ صاحب پر فاتحہ پڑھ رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگیں،

ان کی وفات کے بعد ان پر اخباروں میں اب تک مضامین آرہے ہیں، ۹ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کے مدینہ بجنور

بے چینی بڑھی، حکیم اجمل خاں بیچ میں پڑے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب چند طلبہ کے ساتھ اُ
ادب کے مشہور مصنف ڈپٹی نذیر احمد سے بھی جا کر ملے، ڈپٹی نذیر احمد اپنے خاص انداز میں گفت
کرنے کے عادی تھے، انھوں نے طلبہ ... کا اظہار تو ضرور کیا، مگر اور باتوں کے سا
یہ عجیب باتیں بھی کہیں،

"تم جانتے نہیں انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا، پیشاب
لگے یا نہیں، ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا،

"بدمعاشو، سودیشی سوجھی ہے، سودیشی سوت کہاں سے آئے گا، کیا تمھاری
خالائیں سوت کاتیں گی، انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہو"

اسٹرائک ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پھر کالج میں داخل کر لئے گئے، اور اس کے یونین پر
انہی کا قبضہ رہا، جس سے انگریز اساتذہ ان سے بدظن رہے،

وہ اپنے کالج کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، تصدق احمد شروانی اور خواجہ عبد
سے زیادہ متاثر تھے، کئی بار مجھ سے کہا کہ فرصت ہوگی تو دارالمصنفین میں آکر ان دوستوں پر ایک مستقل کتاب
لکھواؤں گا، میں بولتا جاؤں گا تم لکھتے جانا" ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی علمی اور ادبی صلاحیت کے
معترف رہے، اپنے ایک مضمون میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں،

"اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی
عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی، اور جو کلام غالب کو ایسے حسنِ معانی کیساتھ ملک کے سامنے پیش
کرنے والا تھا جس سے فلسفی، صوفی، شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے، آہ عبدالرحمن! عمر نے
تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک و قوم کی عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا"

میرا خیال ہے کہ ان ہی کی صحبت میں ڈاکٹر صاحب کو غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان کو

وہ انگریزوں کو ہر طرح پسند کرتے تھے، اُن کی قومی اور معاشرتی خوبیوں کے معترف رہے
انگلستان میں اپنے دو انگریز استاد پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور ولفرڈ بلنٹ سے
زیادہ متاثر ہوئے، پروفیسر براؤن کو ایرانی ادب اور تہذیب سے بڑا شغف رہا، انھوں
نے اپنی تصانیف (A history of persian Literature The-
press and poetry of Modern persia,
The wit and humour of the persian کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ کیلئے
ایک مستقل جگہ بنالی ہے، وہ ایرانی تہذیب کی دلدادگی میں کبھی کبھی ایرانی لباس پہنے اور ایرانی
حقہ بھی پیتے دکھائی دیتے، مسٹر بلنٹ نہ صرف ممتاز اہل علم بلکہ سیاسیات اور خصوصاً مسلم
ممالک کی سیاسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اپنی تصانیف -India under
اور -Ripon' Future of Islam
The secret History of the English-
Occupation of Egypt کے لئے ہندوستان
اور اسلامی ممالک میں بہت مشہور رہے، ان کی شادی انگریزی زبان کے مشہور شاعر
لارڈ بائرن کی نواسی سے ہوئی تھی، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن کے سمدھی
بھی تھے، ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے، کلام پاک برابر مطالعہ میں رکھتے، کہتے
کہ اسلام قبول کرنے کا دل چاہتا ہے، مگر مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو دیکھ کر
مسلمان ہونے سے باز آجاتا ہوں، عرابی پاشا کو جب پھانسی کی سزا دی گئی تو ان
ہی کی کوشش سے وہ پھانسی کے تختے سے اترے، ان کو سیلون جلا وطن کردیا

میں ان پر ایک مضمون "ڈاکٹر سید محمود کی کچھ یادیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں ہے:

"مسلم یونیورسٹی سے انھیں عشق تھا، اور ہر وقت وہ اس غم میں گھلا کرتے تھے، کہ یہ تعلیم گاہ کسی طرح سرکاری دست برد سے بچے، جس زمانے میں مسٹر چھاگلا وزیر تعلیم تھے، انھوں نے لوک سبھا میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک انتہائی زہریلی تقریر کی، جس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ترقی پسندانہ اور سیکولر جذبات رکھتے ہیں، اسی لئے مسلمان ان کے مخالف ہیں، ڈاکٹر سید محمود راجیہ سبھا کے ممبر تھے، لیکن اس تقریر کو سننے کے لئے وہ لوک سبھا کی گیلری میں بیٹھے تھے، چھاگلا صاحب کی تقریر کو سن کر وہ گیلری میں زور زور سے غصے میں اپنا بید فرش پر مارتے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ جھوٹ ہے، بدمعاشی ہے شرارت ہے، یہ بات لوک سبھا کے آداب کے خلاف تھی، لیکن کسی کو ان سے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی"

۱۹۰۷ء کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے، انگلستان میں ان کا قیام تین سال تک رہا، کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی گئے، وہاں ان کو تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی، عام طور سے مشہور رہا کہ انھوں نے مولانا شبلی کی کتاب مضامین عالمگیر کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کر لی تھی، مگر یہ شہرت ان کے حریفوں نے دی، ورنہ مجھ سے خود انھوں نے بیان کیا کہ انھوں نے "مغلوں کے سیاسی نظام سلطنت" پر مقالہ لکھا تھا۔

وہ انگلستان اپنی وطنیت کے جذبہ میں سرشار ہو کر انگریزوں کے خلاف ایک زہریلا ذہن لے کر گئے تھے، مگر وہاں کے قیام میں انگریزوں کی شرافت و اخلاق سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور یہ اثر ان کی زندگی کے آخری وقت تک رہا۔ مگر انھوں نے اپنے ذہن کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، سیاسی طور پر تو انگریزوں کے مخالف رہے، لیکن اس سے ہٹ کر

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

بخشی یہ قدرت نے ہر چیز کو زیبائی　　پھولوں کو ملی نکہت تاروں نے چمک پائی

اس حسنِ مجسم کی اللہ رے رعنائی　　بن جائے تماشا خود ہر ایک تماشائی

کچھ ایسی خبر گلشن میں بادِ سحر لائی　　شبنم کے بہے آنسو پھولوں کو ہنسی آئی

کی لاکھ جگر کاوی کی لاکھ جبیں سائی　　تدبیر نہ ماتھے کی تحریر مٹا پائی

جب تک تھی سکونِ دل ہی دل کو تمنا تھی　　جلتے ہوئے انگاروں پر بھی ہمیں نیند آئی

ہر پھول کو گلشن میں ہے دعویٰ رعنائی　　حیراں ہے کہ دیکھے کیا کیا چشمِ تماشائی

تا عمر نہ مٹ پایا جو درد ملا ہم کو　　جو پھانس چبھی دل میں وہ پھر نہ نکل پائی

ہے فیضِ تبسم سے کس کی یہ فضا رنگیں　　بستر سے یہ کون اٹھا لیتا ہوا انگڑائی

یہ دورِ زبوں حالی اور شوقِ غزل خوانی　　بیٹھے ہو ولی لیکر بے وقت کی شہنائی

غزل

از جناب ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

خوش بخت وہی ہے وہی قسمت کا دھنی ہو　　دولت جسے سوزِ غمِ الفت کی ملی ہے

بے تابیٔ پیہم سے ہے سرگرمیٔ ہستی　　سرمایۂ جاں تاب و تب زندہ دلی ہے

گیا تو مسٹر بلنٹ وہاں جاکر اُن سے ملے۔ مگر اُن کو وہاں مصریوں میں آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑا دُکھ ہوا، انھوں نے پانچ سال عرب میں بدوؤں کے ساتھ بھی گذارے تھے، عربی گھوڑوں کو پسند کرتے تھے۔ اُن کی برائی سننا پسند نہیں کرتے، ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے اُن کے سامنے کہدیا کہ انگریزی گھوڑے زیادہ تیز ہوتے ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا کہ مگر عربی گھوڑے زیادہ شریف ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مسٹر بلنٹ کی خوبیوں کا ذکر برابر کرتے رہتے، انھوں نے اس کا بار بار اعادہ کیا کہ مسٹر بلنٹ ہی نے سیاسیات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا، اُن کی یہ تلقین کچھ ایسی موثر رہی کہ وہ سیاسیات میں ایمانداری کا ثبوت آخر آخر وقت تک دیتے رہے جس سے اور دوسرے [illegible] کی طرح وہ زیادہ کامیاب سیاست داں نہ ہو سکے۔ کہتے کہ کسی انگ[illegible] نے کہا ہے کہ Consistency in politics is the virtue of an ass مگر وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خوش تھے، کہ سیاسی دیانت داری اور وضعداری کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی حال میں نہیں چھوٹا، گو لوگوں کو اُن سے بہت کچھ اختلاف ہوتا رہا۔ ان کا بیان ہے کہ مسٹر بلنٹ اون سے برابر کہتے رہتے کہ

"ہندوستان کی قومی تحریکوں میں مسلمان برابر شریک ہوتے رہیں، ورنہ اُن کی حیثیت باعزت نہیں رہ سکے گی"

یہ نصیحت اُن کے ذہن پہ برابر چھائی رہی، (باقی)

مطبوعات جدیدہ

فی ملکوت اللہ، تالیف علامہ عبدالحمید الفراہیؒ تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات ۴۰، قیمت ۵ روپے۔ پتہ: مکتبہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ۔

یہ رسالہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا دیباچہ اور ملکوت اللہ کی تشریح و وضاحت پر مشتمل ہے، اس میں ملکوت اللہ کی دین میں اہمیت، نفوس کی تربیت اعمال کی اصلاح اور دینی و دنیاوی امور کے فہم میں اس کے فوائد اور عقلی، نقلی، اور تاریخی حیثیت سے اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، مصنف کے نزدیک خدا کی حاکمیت کے اعتقاد اور ملکوت اللہ کی معرفت کا اہم فائدہ حکومت الٰہیہ کے موافق ان قوانین کی تشکیل ہے، جن سے دنیا امن و خیر کا گہوارہ بن جاتی ہے، خلافت کی بحث اور خلیفہ کے اوصاف کے ذکر میں بتایا گیا ہے کہ کب اور کیوں خدا اس نعمت سے کسی قوم کو سرفراز کرتا ہے، اور کیوں کسی قوم سے اس کو سلب کر لیتا ہے، حواشی میں جا بجا ان مباحث سے متعلق نوٹ بھی ہیں، اگرچہ یہ رسالہ اصل تصنیف کا خاکہ اور اس سے متعلق منتشر یادداشتوں اور اشارات کا مجموعہ ہے، تاہم حقائق و معارف کا خزانہ اور مولانا کے تدبر فی القرآن کا نچوڑ ہے، اُن کی دوسری تصنیفات کی طرح اس کو بھی طلبۂ قرآن کے مطالعہ میں ضرور رہنا چاہئے، اس کی اشاعت ایک مفید علمی و قرآنی خدمت ہے۔

رویت ہلال کا مسئلہ:- مرتبہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت

راضی برضا رہنا ہے معراجِ محبت　　مرنا رہِ الفت میں حیاتِ ابدی ہے
ہر دم یہ رہے دھیان کہ اک ہستیٔ مطلق　　ہر حال میں ہر وقت ہمیں دیکھ رہی ہے
ملتی ہے ہمیں اس سے بڑی دولتِ تسکین　　کیا فیض رساں اپنا یہ دامانِ تہی ہے
بن بن کے جو بگڑے وہ ہے تقدیر ہماری　　جو لاکھ بگڑ کر بھی بنے زلف تری ہے
ہرگز نہ تھی محفل میں لبِ گویا کے بس کی　　وہ بات جو خاموش نگاہی نے کہی ہے
جینے کو بہرحال جیے جاتے ہیں لیکن　　دورِ حیات ہم کو بہت تنگی پڑی ہے
ہم ... بہاراں کے ہیں ہم تو بتاؤ　　کیوں آبِ رخِ لالہ و نسریں سے اُڑی ہے
کچھ دل کو جلا کر ہی اُجالا کرو یارو　　اک تیرگی سی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے
مستقبلِ دوراں کے ہیں نقش روح معاً　　گرمیٔ عمل جن کے رگ و پے میں بسی ہے

غزل

از جناب بدرالزماں صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ

ایک لغزش باعثِ تکوینِ عالم بن گئی　　نیکیاں کچھ اس طرح بدلیں کہ عصیاں ہو گئیں
... فریبِ زیست ہے　　ساری امیدیں سمٹ کر نذرِ حرماں ہو گئیں
حسن کی روداد دنیا تھی حریمِ عشق میں　　اک تڑپ تھی دل کی سب شمعیں فروزاں ہو گئیں
کون سمجھائے انھیں اس قلبِ مضطر کی زباں　　اُن کے اک ہلکے تبسم سے شگفتہ دل کی کلیاں ہو گئیں
الفتِ آدم کی راہیں خلد میں مستور تھیں　　ایک لغزش نے نقاب الٹی تو عریاں ہو گئیں
طور اور موسیٰ کا قصہ رازدارِ عشق تھا　　لن ترانی سے امنگیں صرفِ نسیاں ہو گئیں

کون کہتا کس سے کہتا قیس کی رودادِ عشق
چاک کی سب دھجیاں تارِ گریباں ہو گئیں

اچھی، صفحات ۱۲۴۔ قیمت: ۳ر، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۔ لکھنؤ۔

رویت ہلال کا مسئلہ دور حاضر کے ان اہم اور پیچیدہ مسائل میں ہے، جو مسلمانوں میں بڑے نزاع و انتشار کا باعث بنا ہوا ہے، اس پر ہندو پاک کے اصحاب علم اپنا مخالف و موافق میں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور ابھی تک اس موضوع پر اس قدر مبسوط اور جامع تحریر نہیں لکھی گئی، اس میں پہلے رویت کے مسئلہ میں شریعت کی اصل روح بیان کی گئی ہے، پھر تمام فقہی کتابوں میں ٹیلیفون، تار، اور وائرلیس کے نظائر تلاش کر کے ان کی روشنی میں ان جدید وسائل کے ذریعہ چاند کی خبروں کے ثبوت و عدم ثبوت پر محققانہ بحث کی گئی ہے، آخر میں مطالع کے متعلق فقہا و مجتہدین کے بیانات اختلافات بتا کر کے اس عہد کے اعتبار سے اس کی حد بندی کی گئی ہے، ہر بحث میں قدیم علماء و فقہاء کے علاوہ جدید مفتیوں اور عالموں کے اقوال بھی تحریر کئے گئے ہیں، گو مصنف کے بعض قیاسات اور رایوں سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن یہ کتاب ان کی تلاش و تحقیق اور فقہی بالغ نظری کا پورا ثبوت ہے، انھوں نے اس میں بڑے گوناگوں معلومات جمع کر دیئے ہیں، رویت ہلال کا مسئلہ عوام و خواص دونوں اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے، لیکن یہ خالص فقہی و فنی بحث ہے، اور کتاب فقہی حوالوں سے اس قدر گرانبار ہے کہ اس سے علماء ہی پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں، آخر میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء منعقدہ مئی ۱۹۶۷ء کی رویت ہلال کے بارہ میں منظور کردہ تجویز بھی درج ہے،

"ض"

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) دسمبر ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

....

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

جلد ۱۰۸ - ماہ شوال المکرم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۱ء - عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اُسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے جزء و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے   قیمت: ۔/۶

بکثرت مضامین لکھے، ان کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ اپنی وفات سے پہلے انھوں نے قرآنی ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اس کو اپنی تمام تصانیف کا حق اشاعت اور بیس ہزار روپئے نقد دیئے، ایسے اہل علم مسلمانوں میں اب مشکل سے ملیں گے، اللہ تعالیٰ علم دین کے اس خادم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

غلام رسول مہر صاحب کی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، وہ ایک زمانہ تک اخبار زمیندار کے عملہ ادارت میں رہے، پھر مولانا ظفر علی خاں سے اختلاف کی بنا پر عبدالمجید سالک سے مل کر انقلاب کے نام سے اپنا مستقل اخبار نکالا، جو اپنے دور کا مشہور اخبار تھا، اس میں اور زمیندار میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی، انقلاب کے فکاہات جو سالک صاحب کے قلم سے ہوتے تھے، خاص چیز تھے، اس کو لوگ بڑے ذوق سے پڑھتے تھے، مہر صاحب تنہا صحافی ہی نہیں تھے، ان کا علمی و تحقیقی ذوق بھی بلند تھا، انھوں نے حضرت سید احمد شہید بریلوی اور غالب پر بڑی مبسوط اور محققانہ کتابیں لکھیں، ان کے علاوہ بھی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں، دارالمصنفین سے ان کو خاص تعلق تھا، ان سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی تھی، ان کی موت سے ایک نامور اہل قلم اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اس سے پہلے بھی ہم ناظرین کو دارالمصنفین کی طرف توجہ دلا چکے ہیں، کہ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کتابوں کی تجارت تھی، اور ہندوستان اور پاکستان کی آمدنی کو ملا کر کام چلتا تھا، ادھر کئی سال سے پاکستان کی تجارت کی بندش کی وجہ سے تنہا ہندوستان کی آمدنی پر

شذرات

ہماری بزم علمی کی پرانی یادگاریں روز بروز اٹھتی جاتی ہیں اور ہر مہینہ کسی نہ کسی کا ماتم کرنا پڑتا ہے، گزشتہ مہینہ دو نامور اہل علم نے وفات پائی، ہندوستان میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اور پاکستان میں غلام رسول مہر نے، ڈاکٹر صاحب اس دور کے نامور فاضل اور انگریزی کے مشہور اہل قلم تھے، ان کی پوری زندگی علمی و تعلیمی مشاغل میں گذری، وہ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی یا فلسفہ کے پروفیسر تھے، اس سے رٹائر ہونے کے بعد ان کا سارا وقت تالیف و تصنیف میں گذرتا تھا، وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد تھا، اسلامیات پر بھی ان کی نظر وسیع تھی، کلام مجید سے خاص شغف تھا، انکی بیشتر تصانیف اور مضامین کلام مجید اور اسلامی تعلیمات اور تہذیب و ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو پر ہیں انھوں نے کلام مجید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی ترجمہ کیا، یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، انگریزی تصانیف میں The mind Al-Quran Builds زیادہ مشہور ہے، اس کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے، ایک کتاب اردو میں "اساس تہذیب" کے نام سے لکھی اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے عالمگیر انسانی تہذیب کے عناصر دکھائے گئے ہیں، ان کو شعر و ادب سے بھی ذوق تھا، انھوں نے غالب پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی، اس میں ان کی زندگی کے وہ پہلو بھی دکھائے گئے ہیں، جن سے ان کے سوانح نگار اغماض برتتے ہیں، ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۳)

مغربی تہذیب اور مغربی علوم مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب دوسری قوموں کی اندھی تقلید ہے، ایک زمانہ تک وہ خود دنیا کی قوموں کے معلّم اور ان کو علم و عرفان اور تہذیب و تمدن کا درس دیتے رہے، اس زمانہ میں دوسری قومیں ان کی تہذیب کو فخریہ اختیار کرتی تھیں، انھوں نے دوسری تہذیبوں کے اچھے عناصر کو اپنایا بھی، مگر اس کو اسلامی قالب میں ڈھال لیا، ابتدا میں انھوں نے ایرانی تمدن کو اختیار کیا، لیکن ایرانیوں کو اسلام کی دولت دے کر ان کے تمدن پر اسلام کی ایسی چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تمدن کہلانے لگا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے نقصان پہنچا، یہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی جب مسلمانوں پر زوال طاری ہو چکا تھا، ان کی قوت ختم ہو چکی تھی اور ان کی خصوصیات مٹ چکی تھیں، اس کے مقابلہ میں مغربی تہذیب بالکل تازہ دم، جدید علوم اور سائنس کی قوتوں سے مسلح اور ظاہری حیثیت سے بڑی دلکش و دلفریب تھی، اس لیے مسلمانوں نے اس کے مقابلہ میں سپر ڈال دی، اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں میں امتیاز

دارومدار رہ گیا ہے، جو اس کے مصارف کے لیے بالکل ناکافی ہے، اور روزافزوں گرانی کی وجہ سے اخراجات برابر بڑھتے جاتے ہیں، ابتک کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا لیکن اگر مستقبل قریب میں آمدنی میں اضافہ کی کوئی شکل نہ نکلی تو اس کے چلنے کی کوئی صورت نہیں ہے، معارف بھی کئی سال سے خسارہ سے چل رہا ہے، اگر وہ دارالمصنفین کا رسالہ نہ ہوتا تو ابتک بند ہوگیا ہوتا۔

دارالمصنفین نے آجتک کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اس نے آمدنی میں اضافہ کی لائف ممبری اور عام ممبری کی شکل نکالی تھی، لائف ممبری کی فیس ایک ہزار تھی اور عام ممبری کی پانسو، لائف ممبروں کو دارالمصنفین کی تمام گذشتہ اور آیندہ شائع ہونے والی مطبوعات اور عام ممبروں کو ممبری کے وقت سے شائع ہونے والی مطبوعات پیش کیجاتی ہیں، اس سے دارالمصنفین کی مدد بھی ہو جاتی تھی اور ممبروں کو انکی رقم کا قریب قریب پورا معاوضہ مل جاتا تھا، ابتدا میں تو کچھ ممبر بنے مگر اسکا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، دارالمصنفین کی خدمات ملک کے سامنے ہیں، اگر اسکی ضرورت ہے تو اس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی قوم پر عائد ہوتی ہے۔

کچھ تنہا دارالمصنفین پر موقوف نہیں مسلمانوں کے سارے اداروں کا یہی حال ہے، یہ نہیں کہ مسلمان بالکل تہی مایہ ہیں، انکے ایک طبقہ کے پاس اب بھی اتنی دولت ہے کہ وہ تفریحی بلکہ مضر مشغلوں میں اتنا روپیہ برباد کرتا ہے کہ اس سے بہت سے ادارے چل سکتے ہیں، مگر اس کی توفیق نہیں ہوتی۔ جن لوگوں میں لائف ممبری کی استطاعت نہیں ہے، وہ پچاس روپیہ سالانہ کے ممبر بن سکتے ہیں، ان کو رسالہ معارف اور سال بھر کی نئی مطبوعات دیجائیں گی، اگر وہ پچاس سے کم ہونگی تو اس کے بدلہ میں دوسری کتابیں لے سکتے ہیں

میں قوت و اقتدار کی مسابقت برپا ہے جس نے دنیا کا امن و امان خطرہ میں ڈال دیا ہے، جس سے خود یورپ کے مفکرین مضطرب اور اخلاق و روحانیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں، لیکن مغربی قوموں کے سائنسی کارنامے اتنے حیرت انگیز ہیں اور ان کی تہذیب اتنی نظر فریب ہے اور اس میں نفس کے مطالبات کی آسودگی کا اتنا سامان ہے کہ اس کی خرابیوں اور ان کے نتائج پر بہت کم نظر جاتی ہے، اور ایک دنیا اس کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے، اقبال اس تہذیب کے بڑے نباض تھے، اس کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر انکی گہری نظر تھی، اس لیے انھوں نے اس کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کی خرابیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے، اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے، مغربی علوم اور اہل مغرب کی عقل و دانش، ایجادات و اختراعات، تدبیر و سیاست اور جمہوری نظام کا بڑا شہرہ ہے، لیکن اخلاق و روحانیت اور نور بصیرت سے محرومی کی بنا پر یہ سارے کمالات انسانیت کے لیے خطرہ بن گئے ہیں، اقبال نے علم کی عظمت و شرف، اس کے کمالات اور غرض و غایت کو گوناگوں پیرایوں میں بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور دکھایا ہے کہ علم جیسے اعلیٰ و اشرف عطیۂ الٰہی کو جس کا مقصد انسانیت کی تکمیل، اس کی دنیاوی و اخروی فوز و فلاح اور اخلاقی فضائل سے آراستگی ہے، مغرب نے اس کو مادیات میں محدود کر کے اس قدر پست کر دیا ہے کہ وہ انسانی فلاح و سعادت کے بجائے اس کے فساد اور بگاڑ کا ذریعہ بن گئے، دنیا کی ساری خرابیوں کی بنیاد مادی نقطۂ نظر ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ ان علوم کو مسلمان بنا لیا جائے۔

گفت حکمت را خدا "خیر کثیر" ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

علم حرف و صوت را شہ پر دہد پاکیٔ گوہر بہ ناگوہر دہد

کیے بغیر آنکھ [illegible] کو قبول کرلیا، بلکہ اس کی خرابیاں زیادہ اختیار کیں جس سے ان کی ملی حیثیت کو بڑا نقصان پہنچا، اس کی کمزوریوں پر اقبال کی بڑی گہری نگاہ تھی، اور وہ اس کو عالم انسانیت کے لیے مہلک سمجھتے تھے، انھوں نے اس کی خرابیوں کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے،

مغر[illegible] اور مغربی قوموں کی بعض خوبیوں سے انکار نہیں، ان کا جوش عمل، علم و فن کی خدمت [illegible] [illegible]یقات میں ان کی جانکاہ محنت، قوم و ملک کی راہ میں ایثار و قربانی ان سب [illegible] [illegible]سی اکتشافات و ایجادات اور اس قبیل کے دوسرے کارنامے مسلم اور قابلِ تقلید ہیں، بلکہ انکے بغیر آج کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دنیا کا سارا اخلاقی بگاڑ اسی خدا فراموش تہذیب کا نتیجہ ہے،

اس کی سب سے بڑی خرابی اس کا مادی تصور حیات ہے، اس نے انسانی زندگی کی غرض و غایت کو مادیات تک محدود کردیا ہے، اور قومی شکوہ و عظمت اور دنیاوی عیش و تنعم اس کا نصب العین بن گیا ہے، اس تصور نے مغربی قوموں کو اخلاقی قیود سے آزاد، مادی تعیشات میں غرق، اور انسانی شرف و عظمت سے محروم کردیا ہے، جس تصورِ حیات کی بنیاد خالص مادیت پر ہوگی، اور وہ خدا کے تصور اور اخلاق و روحانیت سے خالی ہوگا، اس سے کبھی انسانیت کی فلاح نہیں ہوسکتی، اس سے انکار نہیں کہ اس نے انسانوں کے لیے راحت اور تعیش کے اتنے سامان فراہم کردیے ہیں اور ایسے ایسے حیرت انگیز ایجادات کیے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اور مادی حیثیت سے انسانیت کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس کے مادی تصورِ حیات کی بنا پر [illegible]خلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی، ہر قوم عیش و تنعم میں غرق ہے، سائنس کی ترقی جو انسانیت کے لیے سراسر خیر ہوسکتی تھی، اس کی تباہی کے سامان فراہم کررہی ہے، بڑی قومون

اور نور بھی اس کی صحبت سے نار بنجاتا ہے، مگر یہ ابلیس دل کی گہرائی میں سرایت کئے ہوئے ہے، اس لیے اس کو مارنا تو مشکل ہے، اس کی صورت یہی ہے کہ اس کو مسلمان بنا کر قرآن کا تابع بنا لیا جائے، یعنی مغربی علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ لیا جائے اور ان اندھے علوم میں قوت دید ار پیدا کر کے بولہب کو حیدر کرار بنا دیا جائے،

ایک نظم میں علم کے خیر و شر کے پہلوؤں کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

علم اشیا خاک ما را کیمیاست　　آہ در افرنگ تاثیرش جداست
عقل و فکرش بے عیار خوب و زشت　　چشم او بے نم دلِ او سنگ و خشت
علم از و رسواست اندر شہر و دشت　　جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانشِ افرنگیاں تیغ بدوش　　در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش
گرگے اندر پوستینِ برہ　　ہر زماں اندر کمینِ برہ
آہ از افرنگ و از آئینِ او　　آہ از اندیشۂ لا دینِ او
حق را ساحری آموختند　　ساحری نے کافری آموختند
مشکلات حضرت انساں ازوست　　آدمیت را غم پنہاں ازوست
ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر　　تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر
ایکہ جاں را باز می دانی ز تن　　سحر ایں تہذیب لا دینی شکن

یعنی علم جو ہماری خاک کے لیے کیمیا کا کام کرتا ہے، افرنگ میں اس کی تاثیر جدا ہے، اس کی عقل و دانش میں اچھے برے کا کوئی معیار نہیں، اس کی آنکھیں گداز قلب کی نمی سے محروم اور اس کا دل سنگ وخشت کی طرح سخت ہے، علم کو اس نے ساری دنیا میں رسوا کر ڈالا ہے، علم کا جبریل اس کی صحبت میں ابلیس بن گیا ہے، فرنگیوں کی عقل و دانش تیغ بدوش نوع

علم را بر اوجِ افلاک است رہ — تا زچشمِ مہر برکند نگاہ
نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل — بستۂ تدبیرِ او تقدیرِ کل
دل اگر بندد بحق پیغمبری است — ور ز حق بیگانہ گردد کافری است
علم را بے سوزِ دل خوانی شر است — نورِ او تاریکیِ بحر و بر است
سینۂ افرنگ را نارے از وست — لذتِ شب خون و یلغارے از وست
قوتِ ابلیس را یارے بود — نور نار از صحبتش نارے بود
کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی
کور را بینندہ از دیدار کن — بولہب را حیدرِ کرار کن

یعنی علم اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے، اس نے علم و حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے، جہاں بھی یہ خیر ملے اس کو حاصل کرنا چاہیے۔ علم حرف اور آواز کو پر پرواز دیتا ہے۔ اور بد گہر اور نا اہل کو بھی اپنے فیض سے گوہر بنا دیتا ہے، علم کی راہ آسمانوں کی بلندیوں پر ہے۔ وہ مہر و ماہ کی نگاہ کو چھین لیتا ہے، وہ پوری کائنات کی تفسیر ہے، اور اس کی تدبیر سے کائنات کی تقدیر وابستہ ہے۔ دل اگر حق سے وابستہ ہے تو پیغمبری ہے، اور اگر اس سے بیگانہ ہو تو کافری ہے، اسی طرح علم اگر بغیر سوزِ دروں کے حاصل کیا جائے تو سراسر شر ہے، اور اس کی روشنی بحر و بر کے لیے تاریکی بن جاتی ہے، بقول مولانا روم

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود

ایسے ہی علم سے افرنگ کا سینہ آگ کی بھٹی بن گیا ہے، اور اس کو قوموں پر یلغار اور ان کے کشت و خون میں لطف آنے لگا ہے، اس کی قوت ابلیس کی یار و مددگار ہے

وہ جذب وشوق کے مقام پر پہنچ کر جبریل کی طرح خود الگ ہوجاتا ہے (یعنی جس طرح جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام شوق میں پہنچا کر خود الگ ہوگئے تھے،

اگر یک سرموئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

اسی طرح علم انسان کو مقام شوق میں پہنچا کر الگ ہوجاتا ہے. کیونکہ عشق بڑا غیور ہے، وہ اپنی آنکھ سے بھی غیرت کرتا ہے، کسی دوسرے کو بزم خلوت میں کس طرح پسند کرسکتا ہے، اس موقع پر حضرت بوعلی قلندر کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا،

غیرت از چشم برم روے تو دیدن نہ دہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

انھوں نے علم وحکمت [illegible] مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی لیکن مغربی [illegible] تہذیب کی مضرتوں سے بچنے کی تلقین کی ہے

برگ وساز ما کتاب وحکمت است　　　ایں دو قوت اعتبار ملت است

آں فتوحاتِ جہان ذوق وشوق　　　ایں فتوحاتِ جہانِ تحت وفوق

ہر دو انعام خدائے لایزال　　　مومناں را آں جمال است ایں جلال

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست　　　اصل او جز لذت ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلماں زادہ است　　　ایں گہر از دست ما افتادہ است

چوں عرب اندر اروپا پر کشاد　　　علم وحکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آں صحرانشیناں کاشتند　　　حاصلش افرنگیاں برداشتند

ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست　　　باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست

لیکن از تہذیب لادینی گریز　　　زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز

انسانی کی ہلاکت کے درپے ہے، یہ کہ کی آستین میں بھیڑ اچھپا ہوا ہے، جو ہر وقت دوسرے برہ کی تاک میں لگا رہتا ہے، افرنگ، اس کا آئین اور اس کی لادینی کس قدر افسوسناک ہے، اس نے علم حق کو ساحری اور ساحری کو کافری سکھائی، انسانیت کی ساری مشکلات اور آدمیت کے سارے غم پنہاں کا سبب یہی ہے، اس نے سیکڑوں فتنے بپا کر رکھے ہیں، اے مرد مومن! بڑھکر رہزن کے ہاتھ سے تلوار چھین لے اور اس لادینی تہذیب کا سحر توڑ دے۔

ایک نظم میں علم کی حقیقت اور اس کا مقصد [illegible] بیان کیا ہے،

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است — پیش چشم ما حجاب اکبر است
علم را مقصود اگر باشد نظر — می شود ہم جادہ و ہم راہ بر
می نہد پیش تو از قشر وجود — تا تو پرسی چیست این راز وجود
جادہ را ہموار سازد این چنین — شوق را بیدار سازد این چنین
درد و داغ تاب و تب بخشد ترا — گریہ ہائے نیم شب بخشد ترا
علم تفسیر جہانِ رنگ و بو — دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
بر مقام جذب و شوق آرد ترا — باز چوں جبریل بگذارد ترا
عشق کس را کے بخلوت می برد — او ز چشم خویش غیرت می برد

یعنی جس علم کا مقصد صحیح نہ ہو، وہ انسان کے لیے حجاب اکبر ہے، اور جس کا مقصد صحیح نظر پیدا کرنا ہو، وہ راہ بھی ہے، اور رہنما بھی، وہ انسان کے سامنے وجود کی حقیقت کھول کر رکھدیتا ہے، انسان کے لیے راہ کو ہموار اور اس کا شوق بیدار کرتا ہے، اسکے دل میں درد و داغ اور تب و تاب پیدا کرتا اور گریۂ نیم شب کی دولت بخشتا ہے، ایسا علم اس جہانِ رنگ و بو کی تفسیر ہے، اور اس سے دیدہ و دل کی تربیت ہوتی ہے،

حکمتے از بندِ دیں آزادۂ — از مقامِ شوق دور افتادۂ
مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام — تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام
شیخِ ملت با حدیثِ دلنشیں — بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں[1]
وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر — کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر — از وجودِ خود نہ گردد باخبر
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
دخترانِ اُو بزلفِ خود اسیر — شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
ساعدِ سیمیں شاں عیشِ نظر — سینۂ ماہی بموج اندر نگر
ملتے خاکسترِ او بے شرر — صبحِ او از شامِ او تاریک تر
ہر زماں اندر تلاشِ سازو برگ — کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ
قوتِ فرمانروا معبودِ او — در زیانِ دین و ایماں سودِ او
دینِ او عہد و فا بستن بغیر — یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ غیر

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مُرد و مرگِ خویش نشناختہ (مسافر)

یہ حکمت دین کی قید سے آزاد اور مقامِ ذوق و شوق سے دور ہے اور وہ تعلیم کا

---

[1] اس خیال کو انھوں نے اردو کے ایک قطعہ میں بھی ظاہر کیا ہے:

حلقۂ شوق میں وہ جراُتِ اندیشہ کہاں — آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

فتنہ ہا این فتنہ پرداز آورد لات و عزیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر روح از بے آبیٔ او تشنہ میر
لذتِ بیتابی از دل می برد بلکہ دل زین پیکرِ گل می برد

یعنی ہمارا برگ وساز کتاب اللہ اور دنیاوی علم وحکمت دونوں ہیں، انہی کی قوت سے ملت کا اعتبار قائم ہے، کتاب اللہ سے جہان ذوق وشوق کی فتوحات حاصل ہوتی ہیں، اور حکمت سے اس مادی دنیا کی، دونوں خدائے لایزال کا انعام ہیں، ان میں سے ایک مومن کا جمال ہے، دوسرا جلال علم وحکمت فرنگیوں کی میراث نہیں، وہ تو لذت ایجاد کا نام ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کو پیدا کیا ہے اور وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے گرا ہوا گوہر ہے جس کو دوسروں نے اٹھا لیا ہے، جب عرب یورپ پہنچے تو انھوں نے علم وحکمت کی نئی بنیاد رکھی، دانہ تو ان صحرانشینوں نے بویا، اور اس کی پیداوار فرنگیوں کے ہاتھ آئی، علم وحکمت ہمارے اسلاف کے شیشے اور ہمارے کوہ قاف کی پری ہے، اس لیے اس کو دوبارہ اپنے قبضہ میں کرنا چاہیے، لیکن اس لادینی تہذیب سے بچو، وہ اہل حق کے ساتھ برسرِ پیکار رہتی ہے، یہ فتنہ پرداز بڑے بڑے فتنے بپا کرتی ہے، وہ حرم سے نکالے ہوئے لات وعزیٰ کو پھر حرم میں واپس لاتی ہے، اس کے افسوں سے دل کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے، اور روح اس کی بے آبی سے پیاسی تڑپتی ہے، وہ دل کی بیتابی کی لذت چھین لیتی بلکہ دل ہی کو جسم سے نکال لیتی ہے،

ایک نظم میں بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ مغربی علم وحکمت قوموں کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے اس علم وحکمت کا نام انھوں نے حکمت فرعونی رکھا ہے، اس کی خصوصیات اور کارنامے یہ گنائے:

قوموں میں سہل پسندی کی بنا پر ان کمالات کو حاصل کرنے کی تو ہمت نہیں ہوتی محض مغربی تہذیب کی خرابیوں اور اس کی ظاہری چمک دمک کی تقلید میں مبتلا ہیں،

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب ۔ باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب ۔ نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست ۔ نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است ۔ نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است ۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست ۔ مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ ۔ مغز می باید نہ ملبوس فرنگ
اندریں رہ جز طلب مطلوب نیست ۔ ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکر چالا کے اگر داری بس است ۔ طبعِ درّا کے اگر داری بس است
گر کسے شبہا خورد دودِ چراغ ۔ گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
ملکِ معنی کس حدِ او را نبست ۔ بے جہادِ پیہمے نآید بدست
بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود ۔ می برد از غربیاں رقص و سرود
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو ۔ علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را ۔ فطرتِ او در پذیرد سہل را
سہل جستن در دریں دیرِ کہن ۔ ایں دلیلِ آنکہ جاں رفت از بدن

یعنی مشرق کو مغرب کی تقلید نے از خود رفتہ کر دیا ہے، اس کا کام تو اس کی تنقید تھا نہ کہ اندھی تقلید، مغرب کی قوت چنگ و رباب اور بے حجاب لڑکیوں کے رقص و سرود

نظام اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے، تاکہ غلام آقا کے مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھے، شیخ ملت بھی دلنشین انداز میں اس کے مفاد کے مطابق دین کی تجدید کرتا ہے، اس قوم کی حالت قابل افسوس ہے، جو دوسروں کی تدبیر کی کشتہ ہے، اور اس کا کام اپنی تخریب اور دوسروں کی تعمیر ہے، اس علم سے اگرچہ علم و فن میں صاحب نظر ہو جاتی ہے لیکن اپنے وجود اور اپنی انفرادیت سے بے خبر رہتی ہے، اس کے بوڑھے حیا و شرم سے بیگانہ اور عورتوں کی طرح اپنے جسم کی آرایش میں مشغول رہتے ہیں، ان کی لڑکیاں اپنی کنگھی چوٹی میں گرفتار رہتی ہیں، شوخ چشم، خود نما اور خوردہ گیر ہوتی ہیں، ان کے ساعد سیمیں دوسروں کے ذوق نظر کا سامان فراہم کرتے ہیں، اور موجوں کے اندر سینۂ ماہی کا منظر پیش کرتے ہیں، ایسی ملت کی خاکستر میں زندگی کا کوئی شرر نہیں ہوتا اس کی صبح اس کی شام سے زیادہ تاریک ہوتی ہے، وہ ہر وقت دنیاوی ساز و سامان کی تلاش میں رہتی ہے اس کا کام صرف فکر معاش اور موت کا خوف ہے، فرمانروا کی قوت اس کی معبود ہوتی ہے، اور دین و ایمان کے نقصان میں اس کو فائدہ نظر آتا ہے، اس کا مذہب دوسروں کی وفاداری یعنی حرم کی اینٹ سے دیر کی تعمیر ہے، اس قوم کی حالت کس قدر عبرتناک ہے، جس نے حق سے دل موڑ لیا ہے، وہ مر چکی ہے لیکن اپنی موت کو نہیں پہچانتی،

یہ محکوم اور غلام قوموں کی کیسی مکمل تصویر ہے، گو یہ تصویر انگریزوں کے دور کی ہے لیکن آج کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں ہیں،

مغربی قوموں کی ترقی کا حقیقی سبب مغربی تہذیب کا سب سے بڑا سحر اس کی مادی ترقی اور سائنس کی ایجادات و اکتشافات ہیں، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں، لیکن مغربی قوموں کی ترقی کا سبب ان کے عیوب نہیں، بلکہ ان کی خوبیاں، انکے کمالات اور علم و فن میں ان کی جانکاہ محنت ہے، مشرقی

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کیلیے

وہ دینی روح کو ختم کر دیتی ہے

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اس کا نتیجہ الحاد و بے دینی ہے،

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ　　ناداں ہیں جنکو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی　　اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام　　ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور　　مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است　　ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

یہ تعلیم عقل کو تو آزاد کر دیتی ہے لیکن خیالات کو بے لگام چھوڑ دیتی ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر　　چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

اگر انسان میں صحیح فکر و تدبر کا سلیقہ نہیں ہے تو آزادی افکار اس کی تباہی کا

سامان... اور اس کو حیوان بنانے کا طریقہ ہے'

آزادی افکار سے ہے انکی تباہی　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

قوموں سے زندگی کی روح ختم کر دیتی ہے،

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی　　کہ از وے روح یک قومے تواں کشت

اس کی خصوصیات چھین کر اس کو بے جان کر دیتی ہے،

نوا از سینۂ مرغ چمن برد　　ز خون لالہ آں سوزِ کہن برد

لالہ رو دوشیزاؤں کی ساحری، ان کی عریانی اور فیشن پرستی اور ان کا استحکام لادینی
اور ان کی ترقی لاطینی حروف کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان کی قوت کا راز ان کا علم
وفن ہے، اسی کی آگ سے ان کا چراغ روشن ہے، علم کسی خاص لباس کا پابند نہیں اور
عمامہ حصول علم میں مانع نہیں ہے، اصل مقصود علوم اور ان کی طلب ہے، لباس کوئی بھی ہو
اس کے لیے فکر چالاک اور طبع رسا کی ضرورت ہے، علم جانکاہ محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا،
ملک معنی میں علوم کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے، اور وہ مسلسل جد وجہد کے بغیر ہاتھ نہیں آتے
مگر فرنگیوں کے غلاموں نے نمود ونمایش کے لیے ان کے صرف رقص وسرود کی نقل وتقلید
کی، علم بڑی کٹھن چیز ہے، وہ جانکاہی چاہتا ہے، اور خون پسینہ ایک کیے بغیر حاصل نہیں
ہوتا، ہماری تن آسانی اور سہل پسند فطرت نے مشکل کے مقابلہ میں صرف آسان چیز کر لیا
حالانکہ دنیا میں آسانی کی تلاش کے معنی یہ ہیں کہ جسم میں جان باقی نہیں رہی۔

مغربی تعلیم | علم وفن کے بارے میں مغربی قوموں کے نقطۂ نظر اور اس کی غرض وغایت میں
جو خرابیاں ہیں، وہی ان کے نظام تعلیم میں بھی ہیں، کیونکہ دونوں لازم ملزوم ہیں، بلکہ
اصل بنیاد جس سے انسان کے ذہن ودماغ کی تربیت ہوتی ہے، اور اس کے خیالات
بنتے اور بگڑتے ہیں تعلیم ہی ہے، اس لیے انھوں نے مغربی علوم پر جو تنقید کی ہے، وہی
نظام تعلیم پر بھی ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے،

ان کے نزدیک اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی اس کا مادی نقطۂ نظر ہے،
جو مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے ملی مزاج اور اُن کی ضروریات سے مطابقت
نہیں کرتا، اور اس سے ن کی خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں، یہ تعلیم نہ صرف دینی روح
سے خالی ہے بلکہ مذہب واخلاق کے بھی سراسر خلاف ہے،

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا پیالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یعنی جو کام فوجی قوت انجام نہیں دے سکتی وہ تعلیم انجام دیتی ہے، توپ اور تلوار جسم کو تو فتح کر لیتے ہیں، لیکن ذہن و دماغ کو فتح نہیں کر سکتے، اس کام کو تعلیم انجام دیتی ہے۔

اس موقع پر اکبر الہ آبادی کا ایک ظریفانہ مگر حکیمانہ شعر یاد آگیا،

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے　　جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

نوجوانوں کو تعیشات میں پھنسا کر ناکارہ بنا دیتی ہے، اقبال کس درد سے کہتے ہیں

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی　　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

ان خرابیوں کے باوجود وہ مغربی علوم کی طرح تعلیم جدید کے بھی مخالف نہیں، بلکہ اسکے مادی نقطۂ نظر کے خلاف ہیں، اور اس کی اصلاح کا ذریعہ ان کے نزدیک مذہب ہے، اگر دل میں دین کی حرارت موجود ہے، تو جدید تعلیم کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، لیکن اگر اس سے خالی ہے تو ایک مسلمان کے لیے پیام موت ہے،

جو ہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ

کھلے ہیں سب کے لیے مغربیوں کے میخانے　　علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری　　ترے بدن میں اگر سوز لا الہ نہیں

وہ جس قسم کی تعلیم چاہتے ہیں اس کا خلاصہ انھوں نے ایک قطعہ میں بیان کر دیا ہے،

بہ پور خویش دین و دانش آموز　　کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش

بدست اُو اگر وادی ہنر را　　ید بیضا ست اندر آستینش

یعنی مسلمان نوجوانوں کی صحیح تعلیم و ترقی کے لیے دین اور علم و ہنر تینوں کی تعلیم ضروری ہے

بہ ایں مکتب بہ ایں دانش چہ نازی   کہ نان در کف ندادو جان زتن برد

زندگی کی ضروریات اور تقاضوں سے مطابقت نہیں کرتی ہے اس لیے اس سے زندگی کا چراغ روشن نہیں ہوتا۔

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے   زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ

اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر   کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں   کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

یہ اخلاقی فضائل اور انسانی کمالات سے محروم کر دیتی ہے،

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا   جو یہ کہتی ہے خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا   جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو   خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اس تعلیم کا طالب علم اگرچہ دیکھنے میں زندہ نظر آتا ہے لیکن حقیقۃً وہ مردہ ہے، اس کی سانس تک فرنگ سے مستعار ہے، اس کی صحیح تربیت مرد مومن کی نگاہ ہی کر سکتی ہے،

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے   مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

پرورش دل کی اگر مدنظر ہے تجھ کو   مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

اس کا مقصد قوموں کی خصوصیات کو مٹا کر ان کے دل و دماغ کو مفتوح کرنا اور اس کو فرنگی تہذیب کے قالب میں ڈھالنا ہے، اس راز کو ایک فرنگی مفکر کی زبان سے افشا کرتے ہیں،

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر   کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو   ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

فاش باید گفت سرِ دلبراں	ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ	من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

ایک نظم میں اس کی تاجرانہ سیاست کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

وانئی از افرنگ و از کارِ فرنگ	تا کجا در قیدِ زنّارِ فرنگ
زخم از و نشتر از و سوزن از و	ما و جوئے خون و امیدِ رفو
خود بدانی پادشاہی قاہری ست	قاہری در عصرِ ما سوداگری ست
تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج	از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر ست	بر زبانش خیر و اندر دل شر است
وقت سودا خند خند و کم خروش	ما چو طفلانیم او شکر فروش
محرم از قلب و نگاہ مشتری ست	یارب ایں سحر است یا سوداگری ست
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود	ما خریداراں ہمہ کور و کبود
اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر	چرب دستیہائے یورپ را نگر

یعنی کیا فرنگ کے کاروبار سے تم واقف نہیں، آخر اس کے سحر میں کب تک گرفتار رہو گے، ہمارے سارے مصائب و مشکلات کا سبب اس کی تاجرانہ سیاست ہے، اور ہم اس سے چارہ گری کی امید رکھتے ہیں، اس زمانہ میں حکومت بھی تجارت بن گئی ہے، اور دکان داری بھی تاج و تخت میں شریک ہے، اس لیے وہ محکوم سے خراج حاصل کرتا ہے اور تجارتی نفع بھی، جو حکمراں تاجر ہو، اس کی زبان پر تو خیر ہوتا ہے لیکن اسکا باطن شر سے معمور رہوتا ہے، وہ تجارت کے وقت ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، اسکی حیثیت شکر فروش کی اور ہماری بچوں کی ہے، وہ خریدار کے مذاق اور طبیعت کے

اسی سے وہ ماہ و انجم بن کر چمک سکتے ہیں،

فرنگی سیاست[1] اوپر مغربی علوم کے سلسلہ میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان سے بھی مغربی سیاست کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، اس پر اقبال نے مستقل نظمیں بھی لکھی ہیں، ان کے نزدیک مغربی سیاست سراسر ابلیسی ہے،

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ | مگر ہیں اسکے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے | بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

اس کا مقصد محض کمزور قوموں کو غلام بنانا اور ان سے تجارتی فوائد حاصل کرنا ہے، یورپ کی جمہوریت سے جس کا غلغلہ اتنا بلند ہے، مردہ قومیں اور زیادہ مردہ ہو جاتی ہیں، یورپ کے ڈپلومیٹوں اور مدبروں نے دنیا کی قوموں کو اپنی بساط سیاست کا مہرہ بنا رکھا ہے، اور ہر وقت ایک دوسرے کی گھات میں لگے رہتے ہیں، کسی کے حصہ میں مال و زر آتا ہے، کسی کے حصہ میں رنج و نامرادی، حقیقت یہ ہے کہ ہم سب مال تجارت ہیں، اور وہ اس کے سوداگر، اگرچہ افرنگیوں کے شیوے رنگا رنگ ہیں، لیکن ان سے عبرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا،

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ | مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
حقہ بازاں "سپہر گرد گرد | از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد
شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر | ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

[1] یہ واضح رہے کہ یورپ کی سیاست کی نظمیں آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی ہیں، جبکہ بیشتر ایشیائی ملک یورپ کے غلام تھے، اب قریب قریب سب آزاد ہو چکے ہیں، اس لیے ان نظموں کو اس وقت کے حالات کی روشنی میں پڑھنا چاہیے، گو اب سیاست کی شکل بدل گئی ہو لیکن اس کی روح اب بھی وہی ہے۔

الحذر از گرمی گفتار او | الحذر از حرف پہلودار او
چشمہا از سرمہ اش بے نورتر | بندۂ مجبور از و مجبورتر
از خودی غافل نہ گردد مرد حر | حفظ خود کن حب افیونش مخور

یعنی مغربی سیاست کے فریب سے جس چیز کو نادان آزادی سمجھتے ہیں، وہ غلامی کو اور زیادہ سخت کر دیتی ہے، اس کی جمہوریت کا شور ملوکیت کے چہرہ کی نقاب ہے، انھوں نے اپنی حکومت اور سیاست کو جمعیۃ الاقوام کا لباس پہنا کر اپنا کام اور پختہ کر لیا ہے، اس کی فضاؤں میں پرپرواز کھولنا ممکن نہیں ہے، اس کی کنجی سے کوئی دروازہ بھی نہیں کھل سکتا۔ اس کی گرمی گفتار اور پہلودار باتوں سے بچنے کی ضرورت ہے، اس کے سرمہ سے آنکھیں اور بے نور ہو جاتی ہیں، اور مجبور غلام اور بھی مجبور ہو جاتا ہے، لیکن مرد حر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا، اس لیے اپنی حفاظت کا سامان کرنا اور اس کی افیون کے نشہ سے بچتے رہنا چاہیے،

پرانی مجلس اقوام کی حقیقت[1] اقبال نے جس طرح چار مصرعوں میں ظاہر کر دی ہے، وہ سیکڑوں اشعار پر بھاری ہے،

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن | دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند | بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ کی سیاست دین کی روح سے خالی اور ایک دیو بے زنجیر ہے،

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں | کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد | فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

---

[1] موجودہ جمعیۃ الاقوام بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

رجحان سے خوب واقف ہوتا ہے، اس لیے اس کی سوداگری ساحری بن گئی ہے، ہم اندھے بہرے خریدار ہیں، اس لیے رنگ و بو کے یہ تاجر ہم کو خوب لوٹتے ہیں، عصر حاضر کے کاروبار سے بے خبر اور یورپ کی چرب زبانی اور چابک دستی سے ہوشیار رہنا چاہیے،

اس سیاست اور تجارت کے لیے انھوں نے بڑے خوش رنگ پھندے بنائے ہیں ان میں جمہوریت بھی ہے، مگر ان کی جمہوریت درحقیقت استبداد کے چہرے کی نقاب ہے، جس کی آڑ میں دیو استبداد چھپا ہوا ہے، اور اس کی سیاست کے سارے روپ رنگ و بو کا سراب ہیں، جس کو نادان گلستان سمجھ رہے ہیں،

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام	جس کے پردہ میں نہیں جز از نوائے قیصری
دیو استبداد ہے جمہوری قبا میں پائے کوب	تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق	طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو	آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ایک دوسری نظم میں ایک دوسرے دام جمعیۃ الاقوام کا پردہ فاش کرتے ہیں،

می کند بند غلاماں سخت تر	حریت می خواند آں رابے بصر
گرمیِ ہنگامۂ جمہور دید	پردہ بر روے ملوکیت کشید
سلطنت را جامع اقوام گفت	کار خود را پختہ کرد و خام گفت
در فضائیش بال و پر نتواں کشود	با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغ قفس، اے دردمند	آشیاں در خانۂ صیاد بہ
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ	او نباشد ایمن از شاہین و چرغ
از فسونش مرغ زیرک دانہ مست	نالہا اندر گلوئے او شکست

ان ساری خرابیوں کی بنیاد دین وسیاست کی علحدگی ہے، اور اس کا علاج یہ ہے کہ دونوں کو ملا دیا جائے۔ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے، جس کا نمونہ اسلام پیش کر چکا ہے،

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی فقیری
دوئی ملک و دیں کیلئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(باقی)

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ وشاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے، اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، سوانح حیات کے بعد پہلے انکی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور انکے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت)، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ (طبع دوم)

(مرتبہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم)   قیمت:۔ عشر

جو قوت دین سے خالی ہوگی وہ زہر ہلاہل اور دنیا کے لیے ہلاکت و تباہی کا پیام ہے،
یہی قوت جب دین کے حصار میں آجاتی ہے تو تریاق بنجاتی ہے،

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بڑھکر
ہو دیں کی حفاظت تو ہر زہر ہی تریاک

جو قوم خدائی نور سے محروم اور اکل حلال کے نکتہ سے ناواقف ہوگی وہ دوسروں کا جینا وبال کر دیگی، فرنگی اس سے محروم ہیں، اس لیےان میں حلال و حرام کی تمیز نہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو چرتی ہے، ایک دانہ بوتی ہے، دوسری اس کی پیداوار پر قبضہ کرتی ہے، اس کے نزدیک کمزوروں کی روٹی چھیننا اور انکے جسم سے جان نکال لینا ہی حکمت ہے، اس تہذیب کا شیوہ آدم دری ہے، اور اسکا پردہ تجارت ہے،

تا نداند نکتۂ اکلِ حلال — بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست — چشم او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است و کارش ناتمام
اُمتے بر امتے دیگر چرد — دانہ ایں می کارد و آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تن شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری است — پردۂ آدم دری سوداگری است

لیکن عربوں کے ہاں پہلوی کے واسطے سے ایران سے آیا ہے۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد یونان اور ایران کے درمیان اختلاط بڑھ گیا تھا، اور اس کے ایک سپہ لار سلوکس نے ایران میں ایک مستقل خاندان کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ان حالات میں گمان غالب یہی ہے کہ درہم پہلے ایران میں یونانی حکومت کے اثر سے رائج ہوا، پھر وہاں سے عراق اور دیار عرب میں پہنچا۔ قدیم سکوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ درہم کو اختیار کرتے وقت ایرانیوں نے اس کے نقوش میں اپنے معاشرے کی مناسبت سے قدرے تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ ساسانی عہد میں جو درہم مضروب ہوئے، اُن میں ایک طرف شاہ وقت کی شبیہ ہے اور دوسری طرف ایک آتشکدہ کا نقش ہے، جس کے دونوں طرف دو پہرہ دار کھڑے ہیں۔

درہم کا رواج ایران کی فتح کے بعد اسلامی عہد میں کئی صدیوں تک جاری رہا اور خلیفہ عبد الملک اموی نے درہم و دینار پر عربی کلمات نقش کرائے، اگرچہ مشرقی ملکوں میں درہم ایک مدت سے متروک ہو چکا ہے، لیکن اپنے اصلی ملک یعنی یونان میں قومی سکہ کی حیثیت سے آج تک بدستور مروج ہے، جو اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ درہم کی اصل یونانی ہے۔

تنبیہ:۔ شیخ غلام احمد پرویز اپنی "لغات القرآن" (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء) میں درہم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ رومی لفظ Drawburg کا معرب ہے"۔ معلوم نہیں کہ پرویز صاحب نے یہ بے سروپا بات کہاں سے اخذ کی ہے۔

یہ یونانی کلمہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بعض مغربی زبانوں میں بھی دخیل ہو چکا ہے، چنانچہ انگریزی میں Dram کی صورت میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ ذیل کے

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تحقیق

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی، ایچ، ڈی (لنڈن) سابق پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

(۲)

۶- درہم۔ درہم چاندی کا ایک چھوٹا سکہ تھا، جو ظہور اسلام کے وقت ایرانی سلطنت میں رائج تھا، اور عراق (مثلاً حیرہ وغیرہ) میں بھی مروج تھا، جو اس زمانے میں کسریٰ کے زیر نگیں تھا، درہم کا لفظ قدیم عربی شاعروں کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اور گمان غالب ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب اس سکہ سے ایرانیوں ہی کے واسطہ سے واقف ہوئے تھے، کیونکہ ان کے اپنے ملک میں نہ کوئی دارالضرب تھا اور نہ کوئی اپنے مخصوص سکے تھے، ہمسایہ ملکوں میں جو درہم و دینار چلتے تھے انہی سے کام چلاتے تھے،

درہم کا لفظ بصیغۂ جمع (یعنی بصورت دراہم) قرآن مجید میں صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے، سورۂ یوسف میں ہے

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ	اور انھوں نے اس کو (یعنی یوسفؑ کو)
مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ	چند درہموں کے بدلے میں سستے داموں
الزَّاهِدِينَ ۔	بیچ ڈالا اور انھوں نے اسکی کچھ قدر نہ پہچانی ،

علماے لغت میں سے کسی نے درہم کو یونانی اور کسی نے پہلوی بتایا ہے، یہ دونوں قول اپنی اپنی جگہ درست ہیں، کیونکہ درہم اگرچہ دراصل یونانی کلمہ Drachme ہے

علمائے لغت اس سے آگاہ تھے کہ دینار عجمی لفظ ہے، اور بعض نے اس کے ساتھ یہ ادّعا بھی کیا ہے کہ فارسی زبان سے لیا گیا ہے، ابو منصور جوالیقی نے کتاب المعرب میں لکھا ہے کہ "قیراط اور دیباج کی طرح دینار کی اصل عجمی ہے، لیکن عرب قدیم زمانے سے ان الفاظ کو بولتے آئے ہیں، اس لیے وہ عربی بن گئے ہیں"۔ راغب اصفہانی 'مفردات القرآن' میں لکھتے ہیں کہ دینار اصل میں دنّار تھا، اور اس بارے میں انھوں نے ایک اور قول بھی نقل کیا ہے کہ دینار فارسی "دین آر" کا معرب ہے، یعنی وہ چیز جسے شریعت لائی ہو، لیکن اس قول کا مہمل اور لایعنی ہونا عیاں ہے۔

اس مسئلہ کو سلجھانے کی شکل یہ ہے کہ اس معاملہ پر تاریخی لحاظ سے نگاہ ڈالیے اور یہ دریافت کیا جائے کہ یہ سکہ سب سے پہلے کس ملک میں یا کس قوم کے ہاں جاری ہوا تھا، مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ دینار لاطینی لفظ "Denarius" سے ماخوذ ہے، اور یہ لفظ رومیوں کے ہاں ایک طلائی سکے کے لیے مستعمل تھا، مورخین نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے دو سو برس پہلے دینار دارالسلطنت روما میں مضروب ہوا، اور بعد میں اس کا استعمال رومیوں کے ہاں بدستور جاری رہا، جب رومی سلطنت مشرق کی طرف پھیلی تو ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ دینار کا رواج بھی مشرقی ملکوں میں پھیلتا گیا، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں شام اور فلسطین میں (جو اُس وقت رومیوں کے زیرنگیں تھے) دینار کا عام رواج تھا، جو بعد کے زمانے میں بھی بدستور قائم رہا، ظہور اسلام سے بیشتر شام کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے، لہذا تجارت کے ذریعہ اُن کا دینار سے آشنا ہونا طبعی اور یقینی امر ہے، اور قرآن پاک میں دینار کا لفظ جس بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظہور اسلام

نقشہ سے ظاہر ہے،

Greek : Drakhme (دراخمہ)

Latin : drachma
Med Latin : drama
Old French : drame
English : dram

Pahlavi : درہم
Arabic : درہم

۷۔ دینار۔ دینار ایک طلائی سکہ تھا، جو ظہور اسلام کے وقت رومی سلطنت میں رائج تھا، ظہور اسلام سے پہلے عرب رومی مقبوضات یعنی شام اور فلسطین کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے، اس لیے دینار سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ دینار کا ذکر قرآن مجید (سورۂ آل عمران) میں یوں آیا ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ
بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَمَنْ
اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا

اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک قنطار امانت رکھ دو تو وہ اسے واپس ادا کر دینگے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی بطور امانت رکھو تو جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو، تمھیں کبھی واپس نہ دیں گے۔

جیسا کہ علامہ زبیدی نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ دینار کے بارے میں اختلاف

قول کو قبول کر لیا ہے، اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کے ماخذ کے لیے پہلوی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جو موجودہ فارسی کی قدیم صورت تھی، پہلوی میں ادرک کو سنگبیر کہا گیا ہے جس کا زنجبیل کی شکل میں تبدیل ہو جانا بعید از فہم نہیں۔

زنجبیل کا استعمال نہایت قدیم ہے، یونانی اور رومی اسے بحر احمر (یعنی بحر قلزم) کے راستے سے حاصل کرتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ زنجبیل جنوبی عرب کی پیداوار ہے، حالانکہ اس کا حقیقی وطن ہندوستان تھا، اور عرب اُسے فلفل (یعنی سیاہ مرچ) کے ساتھ ہندوستان کے مغربی ساحل یعنی مالابار سے برآمد کرتے تھے، چونکہ زنجبیل ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، اس لیے عہد حاضر کے محققین کی یہ رائے ہے کہ اس لفظ کی اصل ہندوستان کی سرزمین میں تلاش کرنی چاہیے، ان کی رائے میں زنجبیل کے یونانی اور لاطینی نام یعنی Zingiber اور Ziggiber دونوں ہندوستان کی کلاسیکی زبان یعنی سنسکرت سے ماخوذ ہیں، زنجبیل کو سنسکرت میں شرنگ ویرا اور پالی زبان میں (جو بلحاظ زمانہ اس سے متاخر ہے) سنگ ویرا کہتے ہیں، اس کا پہلوی نام یعنی سنگبیر اس کے پالی نام سے بہت مشابہت رکھتا ہے، اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ پہلوی نام پالی سے ماخوذ ہو

غیاث اللغات کے مؤلف نے رسالہ "معربات" اور "سروری" (عربی شرح گلستاں) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ زنجبیل زنگوبیرا کا معرب ہے، لیکن اس نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ زنگوبیرا پالی زبان کا لفظ ہے،

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، عربوں کے تجارتی تعلقات براہ راست جنوبی ہند کے ساتھ قائم تھے، اس لیے اس کا بھی قوی

کے وقت دینار عربوں کے ہاں ایک معروف چیز تھی۔

جب عرب فاتحین نے رومیوں کو شام اور مصر سے نکال دیا، اُس وقت بھی ان ملکوں میں دینار کا رواج بدستور جاری رہا، مگر ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ خلفائے اسلام نے آخر میں اپنے ہاں دار الضرب قائم کیے، اور خلیفہ عبد الملک اموی نے مروجہ سکوں پر عربی کلمات نقش کرائے، دینار کا استعمال رفتہ رفتہ تمام اسلامی سلطنت میں پھیل گیا، اور درہم و دینار کئی صدیوں تک اسلامی ملکوں میں ساتھ ساتھ رائج رہے۔

۸۔ زنجبیل۔ زنجبیل ادرک کا عربی نام ہے۔ ادرک جب خشک ہو جائے تو ہندی میں اُسے سونٹھ کہتے ہیں، ادرک ایک پودے کی خوشبودار گٹھلی جڑ ہے، جو مسالے کے طور پر کام آتی ہے، دواؤں میں بھی ڈالی جاتی ہے، اور اس کا مربا بھی بناتے ہیں، اگر ادرک کی گانٹھ کو غور سے دیکھا جائے تو اس پر سینگ کی طرح چھوٹے چھوٹے سے ابھار دکھائی دیتے ہیں، غالباً اسی وجہ سے ادرک کو سنسکرت میں شرنگ ویرا (Shrngvera) کہتے ہیں یعنی ایسا جسم جو سینگوں پر مشتمل ہے۔

زنجبیل کا لفظ قرآن مجید (کی سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے بیان میں ایک مرتبہ آیا ہے:

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ	یعنی وہاں ان کو ایسا جام پلایا جائیگا
مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا	جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔

اکثر لغت نویس اس بات پر متفق ہیں کہ زنجبیل کا لفظ فارسی زبان سے آیا ہے، چنانچہ ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں اور جوالیقی نے کتاب المعرب میں اس کو اُن فارسی الفاظ میں شمار کیا ہے، جن کو معرب کر لیا گیا ہے، اور امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی اس

امام راغب اصفہانی "مفردات" میں لکھتے ہیں کہ

السِّکِّیْنُ سُمِّیَ لِإِزَالَتِہٖ — یعنی چھری کو سکین اسلیے کہا گیا ہو کہ وہ مذبوح

حرکۃ المذبوح۔ — کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے"۔

میری رائے میں امام ممدوح نے سکین کی جو توجیہ فرمائی ہے۔ وہ ان کا ذاتی قیاس ہے جس کی تائید کسی دوسری روایت یا شہادت سے نہیں ہوتی۔

ابو منصور جوالیقی، امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی سکین کو معرّبات میں شمار نہیں کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی یہ لفظ خالص عربی ہے۔

لیکن مغربی علماء کا خیال ہے کہ سکین کا لفظ آرامی ہے، جو عربی میں باہر سے آکر دخیل ہوا ہے، اس کی تائید دیگر قرائن کے علاوہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جن ایام میں ہادیٔ انام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک دن آپ نے انصار سے فرمایا کہ إِئْتِنِي السِّكِّيْنَةَ یعنی" مجھے سکین دو"۔ لیکن حاضرین میں سے کسی نے رسول مقبولؐ کی بات نہ سمجھی۔ آخر کار جب آپ نے اپنا مطلب سمجھایا، تو انصار بولے کہ اچھا، آپ کو "مُدْیَۃ" درکار ہے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سکین کا لفظ مدینہ میں معروف نہ تھا۔ بلکہ وہاں کے لوگ چھری کے لیے مُدْیَہ کا لفظ استعمال کرتے تھے، عہد نبوی میں فلسطین اور شام میں آرامی عوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی، اس لیے یہ بات عین ممکن ہے کہ قریش کے تجارتی روابط سے سکین کا لفظ مکہ میں بھی رائج ہو گیا ہو، اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس طرح یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے، اسی طرح راوی حدیث کے قول کے مطابق یہ لفظ صرف اسی ایک حدیث میں پایا گیا ہے۔

احتمال ہے کہ انھوں نے زنجبیل کا نام جنوبی ہند کی اہم زبان یعنی تامل سے لیا ہو، تامل میں اسے Inchevar کہتے ہیں۔

زنجبیل کو لاطینی میں Zengeber اور فرانسیسی میں Gingembra کہتے ہیں، انگریزی لفظ Ginger ان ہی سے ماخوذ ہے[5]۔

زنجبیل کے لیے مختلف زبانوں میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں، ان کے اشتقاق اور باہمی تعلقات کی وضاحت کے لیے ذیل کا شجرہ ملاحظہ ہو:-

Sanskrit : Shrangvera
|
Pali Singivera
|
Pahlavi Singaber
|
Latin : Zingiber | Arabic : Zanjabil
|
Old French : Gengiber
|
English : Ginger

۹۔ سکّین: سکین کا لفظ قرآن پاک میں چھری کے معنے میں آیا ہے اور صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۂ یوسف میں ہے کہ

وَ آتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا — اس نے (یعنی یوسفؑ کی مالکہ نے) ان (مہمان) عورتوں میں سے ہر ایک کو ایک (چھری دی)

[5] پروفیسر ڈاکٹر Allan Ross آجکل برمنگھم یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے صدر ہیں، انھوں نے Ginger کی لسانی تحقیق میں ایسا کمال پیدا کیا ہے اور اس میں اس استیعاب اور استقصا سے کام لیا ہے کہ انکے احباب نے انکو ازراہِ ظرافت Ginger Ross کا nick-name دے رکھا ہے۔

۱۱۔ **فرعون** ۔ فرعون مصر قدیم کے حکمرانوں کا لقب ہے۔ جو بنی اسرائیل کے ذکر میں تورات اور قرآن دونوں کتابوں میں بکثرت آیا ہے۔ اور قرآن پاک میں چوہتر مرتبہ مذکور ہوا ہے۔

امام طبری اور قاضی بیضاوی سورہ بقرہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جس طرح ایرانیوں اور رومیوں کے حکمرانوں کا لقب کسریٰ اور قیصر تھا، اسی طرح عمالقہ کے فرمانروا فرعون کے لقب سے پکارے جاتے تھے، سیبویہ اور جوالیقی بھی فرعون کو عجمی کلمہ تسلیم کرتے ہیں، اور خفاجی نے بھی اسے معرب بتایا ہے، اسی طرح راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ فرعون عجمی نام ہے۔ لیکن ان فضلاء میں سے کسی نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ اس لفظ کے لغوی معنے کیا ہیں اور اس کی اصلی صورت کیا تھی۔

مغربی فضلاء کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم مصری اپنے حکمرانوں کو "پرعو" (Per-o) کے لقب سے پکارتے تھے، پرعو کے لفظی معنے "دودانِ عالی" ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس لفظ نے ایک اصطلاحی صورت اختیار کر لی اور یہ لفظ مصری حکمرانوں کا مخصوص لقب بن گیا، فرعون کا لفظ اسی مصری کلمہ "پرعو" کی عبرانی صورت ہے، جو عبرانی کے توسط سے عربی میں بھی مروج ہوئی، تاریخی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں مصر سے نکلے تو اس لفظ کو اپنے ساتھ لائے جو بعد میں فرعون کی صورت میں تورات میں مستعمل ہوا، اور اس کے بعد عربی میں منتقل ہوا۔

عربوں نے اپنے قواعد لسانی کے مطابق فرعون کی جمع فراعنہ بنا لی، اور اس سے کچھ مشتقات بھی بنائے ہیں، مثلاً تَفَرْعُن بمعنے تکبّر و تمرّد۔

انگریزی میں فرعون کو Pharoah لکھتے ہیں۔

۱۰۔ صراط۔ صراط کا لفظ قرآن مجید میں تقریباً ۴۵ مرتبہ آیا ہے، صراط کے لغوی معنے راستہ کے ہیں لیکن قرآن پاک میں یہ لفظ ایک خاص مذہبی رنگ میں استعمال ہوا ہے، یعنی صراط مستقیم صحیح مذہبی روش کے لیے آیا ہے، جیسا کہ سورہ فاتحہ میں ہے:

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

اگرچہ جوالیقی اور خفاجی نے صراط کو معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا ہے، لیکن امام سیوطی نے اتقان میں النقاش اور ابن الجوزی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صراط رومی زبان میں راستہ کو کہتے ہیں، اور ان سے پہلے ابو حاتم احمد بن حمدان الرازی (متوفی ۳۲۲ھ) بھی اپنی کتاب الزینہ میں اس کو رومی الفاظ میں شمار کر چکا تھا[1]۔ عہد حاضر کے مغربی محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ صراط دراصل لاطینی (یعنی رومی) لفظ Strata ہے، جو پہلے شام میں مروج ہوا، اور پھر سریانی کے واسطے سے عربی میں داخل ہوا۔

صراط کا لفظ جاہلی شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ خاصے قدیم زمانے ہی سے عربی میں منتقل ہو چکا تھا، اور قرآن مجید میں جس کثرت اور بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت صراط عربی کا ایک عام فہم لفظ بن چکا تھا۔

---

[1] کتاب الزینہ، تصحیح و تحشیہ ڈاکٹر حسین بن فیض اللہ ہمدانی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۷ء، جزو اول، ص ۱۳۶

ان علماء میں سے کسی نے فردوس کے ایرانی الاصل ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

اقوالِ بالا کے برخلاف عصرِ حاضر کے محققین کی رائے ہے کہ اگرچہ فردوس کا لفظ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے لیکن اس کی اصل قدیم ایران سے ہے۔ زرتشتیوں کی قدیم ترین مذہبی کتاب اوستا میں یہ لفظ "پیری دائزہ" کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور اس کے معنی حدیقہ کے ہیں، یونانی مورخ زینوفون (Xenophon) نے (جس کا سنہ پیدائش ۴۳۰ء قبل مسیح ہے، اور جس نے ایران کی جنگوں میں حصہ لیا تھا) اس لفظ کو شاہانِ ایران کے باغات کے لیے استعمال کر کے یونانی میں رائج کیا، اس کے بعد یہ لفظ تورات کے یونانی ترجمہ میں بھی مستعمل ہوا، جو تیسری صدی قبل مسیح میں مصر کے یونانی فرمانروا بطلیموس (Ptolemy) کے ایما پر اسکندریہ میں تیار ہوا تھا۔ پھر اس لفظ نے یونانی کے توسط سے مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں میں رواج پایا، اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ عربی میں آرامی کے ذریعہ سے آیا ہے۔

یونانی میں اس لفظ کا املا Pradeisos کرتے ہیں اور لاطینی میں Paradisus۔ انگریزی لفظ Paradise اسی لاطینی کلمہ سے ماخوذ ہے یورپ کی مختلف زبانوں میں فردوس کے لیے جتنے الفاظ آئے ہیں وہ سب کے سب یونانی اور لاطینی کلمات پر مبنی ہیں، ان الفاظ کے باہمی تعلقات ذیل کے اندراج سے ظاہر ہوں گے۔

Avestic : Peri-daesa (= حدیقہ)

Greek : Paradeisos — Pahlavi

Latin : Paradisus — Aramaic

Arabic : فردوس

French : Paradis — Engl : Paradise — German: Paradies
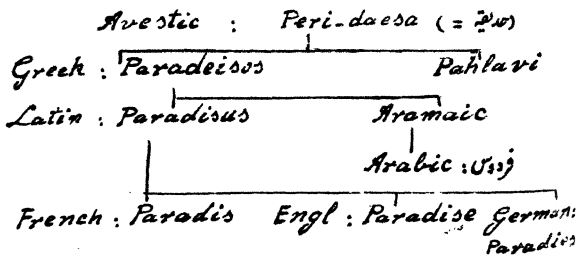
۱۲۔ **فردوس** ۔ فردوس کے لغوی معنی باغ ہیں، لیکن اصطلاحاً طور پر اس سے جنت یا بہشتِ بریں مراد لیتے ہیں۔

عربوں نے فردوس کی جمع فرادیس بنالی ہے، اور اہلِ شام اپنے بستانوں اور انگور کے باغات کو فرادیس کہتے ہیں،

فردوس کا لفظ قرآن مجید میں دو مرتبہ آیا ہے، سورۃ الکہف میں ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	یعنی بیشک جو لوگ ایمان لائے اور
الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ	انھوں نے نیک کام کیے، انکی مہمانی کیلیے
الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا	فردوس کے باغات ہیں۔

پھر سورۃ المومنون میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ	یعنی جو لوگ فردوس کے وارث ہونگے
هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ	وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

علماے لغت میں جوہری، مجدالدین فیروز آبادی اور ابن منظور وغیرہ تمام فضلاء اس بات پر متفق ہیں کہ فردوس کے لغوی معنے بستان یعنی باغ کے ہیں لیکن اس کے اصل ماخذ کے بارے میں ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، فیروز آبادی اور خفاجی کا قول ہے کہ فردوس عربی لفظ ہے۔ اس کے برعکس اکثر علماے لغت کی رائے ہے کہ عجمی ہے، لیکن اس سوال کے جواب میں کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے، مختلف اقوال ہیں، عکرمہ نے اسے حبشی بتایا ہے۔ اور مجاہد سے منقول ہے کہ فردوس رومی کلمہ ہے، ان کے برعکس متعدد علما، مثلاً ثعالبی (فقہ اللغۃ) اور جوالیقی (کتاب المعرب) اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لفظ یونانی ہے، اور امام سیوطی نے اتقان اور مُزہر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے تعجب ہے کہ

مثلاً قُلامہ وہ تراشہ ہے جو قلم تراشتے وقت نکلتا ہے، اور "مَقْلَمَۃ" قلمدان کو کہتے ہیں۔

قلم کے اصلی لغوی معنٰی 'نے' یا نیزہ ہے، جسے پنجابی میں کانا اور انگریزی میں Reed کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ القلم الیَرَاعَۃُ یعنی قلم کے معنٰی نیزہ ہے، دوسرے معنی بعد میں پیدا ہوئے۔

قلم کا لفظ بعض اوقات رسم الخط کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ابن الندیم بغدادی نے اپنی فہرست کے ابتدائی باب میں جہاں مختلف قوموں کے خطوط (Scripts) کا ذکر کیا ہے، وہاں قلم کا لفظ رسم الخط کے لیے استعمال کیا ہے، مثلاً حمیر کے خط کو "القلم الحمیریٰ" لکھا ہے، اور سریانی رسم الخط کو "القلم السریانی" کہا ہے۔

قلم کا لفظ عربی کے علاوہ دیگر سامی زبانوں مثلاً آرامی، سریانی اور حبشی میں بھی موجود ہے،

فارسی، ترکی اور اردو زبانوں میں بھی اسی معنی میں مروج ہے اور غالباً عربی سے ماخوذ ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قلم کا لفظ یونانی اور لاطینی زبانوں میں بھی موجود ہے، چنانچہ یونانی میں اُسے Kalamos اور لاطینی میں Calamus لکھتے ہیں، یونانی کلمہ کے آخر میں جو os ہے وہ اس کے مرفوع ہونے کی علامت ہے، قیاس چاہتا ہے کہ یہ لفظ لاطینی میں یونانی سے آیا ہے۔ کیونکہ رومیوں نے اپنے اکثر علوم یونانیوں سے حاصل کیے تھے، یونانی اُن سے بلحاظ زمانہ قدیم تھے، اور علمی لحاظ سے بھی اُن پر فوقیت رکھتے تھے،

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ قلم کا لفظ سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے،

۱۳۔ **قمیص** ۔ بمعنے کرتا یا پیراہن، خصوصاً وہ زیر جامہ جو کتان یا سوت سے تیار کیا جائے۔

قمیص کا لفظ غلاف کے معنی میں بھی مستعمل ہے، مثلاً قمیص الکعبہ اور قمیص القلب۔

علمائے لغت نے قمیص کو عربی قرار دیا ہے، چنانچہ جوالیقی، سیوطی اور خفاجی میں سے کسی نے بھی اسے معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا، گویا یہ لفظ ان کے نزدیک خالص عربی ہے۔

قمیص کا لفظ قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ صرف حضرت یوسفؑ کے قصہ کے سلسلہ میں مستعمل ہوا ہے۔

مغربی محققین کی رائے ہے کہ قمیص لاطینی کلمہ Camisia سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سوتی کرتا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب رومی تاجر پانچویں صدی میں شام میں آئے تو ان کے ذریعے یہ لفظ شام میں رائج ہوا، پھر عربوں کے استعمال میں آیا، فرانسیسی لفظ شمیز (Chemise) بھی اسی لاطینی کلمہ سے مشتق ہے، شمیز وہ ہلکا سا سوتی زیر جامہ ہے، جو خواتین اپنے لباس کے نیچے پہنتی ہیں، قمیص اور شمیز کی اصل ایک ہے، لیکن وہ ہمارے ہاں دو مختلف راستوں سے آئے ہیں، اس لیے ان کے مفہوم میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے:

Late Latin : Camisia

French : Chemise — Arabic قمیص

Urdu : شمیز — Urdu قمیص

۱۴۔ **قلم** ۔ قلم لکھنے کا وہ آلہ ہے جسے نے یا نیزے کو تراش کر تحریر کے لیے کام میں لایا جاتا ہے، جمع اس کی اقلام آتی ہے، قلم سے چند اور الفاظ بھی مشتق ہوئے ہیں۔

قسم کھائی گئی ہے،

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ	نون اور قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو
مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ	وہ لکھتے ہیں، اپنے پروردگار کی مہربانی
	سے تو دیوانہ نہیں ہے۔

سورہ لقمان میں قلم کا لفظ بصورت جمع بھی آیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ	اور اگر جس قدر زمین میں درخت ہیں،
شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ	قلمیں بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی
مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ	اور اس کے بعد سات سمندر اس میں اور
كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ	ملا دیے جائیں، تب بھی خدا کی باتیں
حَكِيْمٌ	ختم نہ ہوں گی۔

قلم کی تعریف و توصیف میں ادیبوں اور شاعروں نے بہت کچھ کہا ہے۔ ناظرین کی خدمت میں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:-

اذا افتخر الابطال یوماً بسیفھم	وعدّوہ مما یکسب المجد والکرم
کفی قلم الکتّاب فخراً و رفعةً	مدی الدھر ان اللہ اقسم بالقلم
یا ناظر الصنع انظر صنع کاتبہ	لقد ابان یواقیتاً من القلم
حسناء کحلاء لا تحصی محاسنھا	نفسی فداھا لحسن الخط والرقم

۱۵۔ کافور۔ کافور سفید رنگ کا ایک شفاف اور خوشبودار مادہ ہے، جو تاثیر میں سرد اور مسکّن ہے، دوسرے خواص کے علاوہ کرم کش بھی ہے۔ اسلیے بطور antiseptic بھی استعمال ہوتا ہے، اور دواؤں میں بھی ڈالا جاتا ہے۔

جس کا املا بصورت Calamas کر سکتے ہیں، اور سنسکرت میں اس لفظ کے معنی بھی وہی ہیں جو عربی اور دیگر زبانوں میں ہیں، یعنی

(۱) نے یا نیزہ (Reed)

(۲) لکھنے کا آلہ جو نے سے بنایا جاتا ہے۔

بیان بالا سے ظاہر ہے کہ قلم کا لفظ بہت سی سامی اور آریائی زبانوں کا مشترکہ کلمہ ہے، اتنی کثیر اور اہم علمی زبانوں میں اس لفظ کا وجود ایک قابلِ غور امر ہے، جو محض توارد اور توافق نہیں ہو سکتا، اسی کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے کس قوم یا ملک کی زبان میں شروع ہوا اور باقی قوموں یا زبانوں میں کب اور کیسے پھیلا، مغربی علماء کا قول ہے کہ اس کی اصل یونانی ہے، لیکن یہ قول مزید تحقیق اور تصدیق کا محتاج ہے۔

ہر حال قلم کے لیے یہ شرف کیا کم ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلی وحی میں استعمال ہوا ہے، جو رسول اکرم (صلعم) پر غار حرا میں نازل ہوئی تھی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔	(اے نبی) پڑھ ساتھ نام اس پروردگار کے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا اور انسان کو خونِ بستہ سے بنایا، پڑھ اور جان لے کہ تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی ایک سورت کا نام ہی "سورۃ القلم" ہے، جس میں قلم کی

ملک کی زبان سے لیں، جو در اصل مشرق بعید کی پیداوار ہے، اور جس کے ساتھ انکے براہ راست تجارتی تعلقات قائم تھے،

معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت ایران یا کم از کم دربار ایران میں کافور کی بہت کھپت تھی، عربی مورخوں نے لکھا ہے کہ جب عربوں نے ایران کے دارالسلطنت مدائن کو فتح کیا تو انھیں وہاں کے شاہی محل میں کافور کی بہت بڑی مقدار ملی، اور اسلامی لشکر کے بعض بدویوں نے اسے نمک سمجھ کر اپنی ہنڈیوں میں ڈال لیا۔

۱۶۔ مسک۔ مسک کا لفظ فارسی مُشک کا معرب ہے۔

مُشک ایک خوشبودار مادہ ہے، جو ایک خاص قسم کے ہرن کے نافہ سے حاصل ہوتا ہے، یہ ہرن عرب میں نہیں پایا جاتا، اس لیے عرب لوگ مشک باہر کے ملکوں سے حاصل کرتے تھے،

مسک کا لفظ قدیم جاہلی شعراء کے کلام میں پایا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی جنت کی نعمتوں کے بیان میں ایک مرتبہ آیا ہے، سورۃ التطفیف میں ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ	ان کو شراب خالص سربمہر پلائی جائیگی
خِتَامُهُ مِسْكٌ	جن کی مُہر مُشک کی ہوگی۔

ثعالبی، جوالیقی، سیوطی، خفاجی اور ابن منظور (صاحب لسان العرب) سبھوں نے اس لفظ کو معرب بتایا ہے جس کی اصل فارسی ہے، پہلوی میں اسکی صورت مشک ہے، اور سنسکرت میں مُشکا، اور غالباً یہی مشکا پہلوی مشک کی اصل ہے،

بہرحال عرب لغت نویسوں کے بیان کے مطابق یہ لفظ فارسی (یعنی پہلوی) سے آیا ہے۔

مشک کا لفظ کم وبیش تبدیلی کے ساتھ یونانی، لاطینی اور یورپ کی دیگر

کافور ایک درخت کی لکڑی سے حاصل ہوتا ہے، جو مشرقی ملکوں کی خاص پیداوار ہے، اور چین اور جاپان کے علاوہ جزائر فارموسا اور بورنیو میں بھی پایا جاتا ہے، عرب قرون وسطیٰ میں جن چیزوں کی تجارت کرتے تھے، اُن میں کافور بھی شامل تھا،

کافور کا ذکر قرآن مجید (سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں یوں آیا ہے:-

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ	یعنی نیک لوگ بیشک ایسے جام میں سے
كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا	پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی،

اگرچہ لسان العرب میں کافور کو خالص عربی لفظ بتایا گیا ہے لیکن ثعالبی، جوالیقی، سیوطی اور خفاجی سب نے لکھا ہے کہ کافور فارسی سے ماخوذ ہے، پہلوی میں اس لفظ کی صورت کاپور تھی، اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کافور پہلوی کاپور کا معرب ہو۔

دوسری مشرقی زبانوں میں کافور کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس بحث میں ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، مثلاً سنسکرت میں کرپور، ہندی میں کپور اور ملایا اور جاوا کی زبانوں میں کاپور ہے، اور چونکہ کافور مشرق بعید کی پیداوار ہے، اور عرب مصنفین کے بیان کے مطابق عرب تاجر کافور جاوا اور سماٹرا سے حاصل کرتے تھے، اس لیے اغلب یہ ہے کہ عربوں نے جہاں کافور ان ملکوں سے حاصل کیا، اس کا نام بھی انہی ملکوں کی زبان سے براہ راست اخذ کیا ہو،

پروفیسر جفری لکھتے ہیں کہ عربوں نے کافور کا لفظ غالباً سریانی سے لیا ہے۔ (جو سوریہ یعنی شام والوں کی زبان تھی) کافور کا لفظ سریانی میں بھی موجود ہوگا۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عرب ایک ایسی چیز کا نام ایک شمالی

سیاست میں اسلام

(۳)

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

جنوب مشرقی ایشیا

جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی شکل مشرق وسطی سے کافی حد تک مختلف ہے،

یہاں مسلمان ایک بہت وسیع و عریض خطے میں پھیلے ہوئے ہیں جس میں انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، فلپائن اور اس کے گرد و نواح کے علاقے اور جمہوریہ سنگاپور شامل ہیں، اس خطہ کی مسلم آبادی کا اندازہ ۹ کروڑ سے زائد لگایا جاتا ہے[1]، یہ علاقہ درمیان میں سمندروں کے حائل ہونے کے باعث مسلمانوں کے خاص مرکزوں سے الگ تھلگ رہا ہے، دنیاے اسلام میں اس کا اضافہ تقریباً چودھویں صدی میں ہوا، جب مسلم تہذیب اپنے عروج پہ پہنچ چکی تھی، یہاں اسلام کی آمد بہت سست رفتاری کے ساتھ ہوئی لیکن اس کی اشاعت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، کچھ علاقے تو ایسے ہیں جہاں کے باشندے ابھی حال ہی میں مشرف باسلام ہوئے ہیں، اور اب

---

[1] مترجم۔ فاضل مقالہ نگار نے جنوب مشرقی ایشیا میں صرف پانچ ہی ملکوں کا ذکر کیا ہے، حالانکہ ایشیا کا یہ خطہ اٹھارہ (۱۸) ممالک پر مشتمل ہے، اور اسکی مسلم آبادی مجموعی طور پر بیس کروڑ سے بھی زائد ہے، جن ملکوں کو مقالہ نگار نے نظر انداز کر دیا ہے ان میں ویٹ نام (مسلمان ۲۶ لاکھ) لاؤس (ایک لاکھ تیس ہزار) کمبوڈیا (چار لاکھ) برما (اٹھارہ لاکھ پچاس ہزار) شمالی بورنیو (۲ لاکھ ۷۰ ہزار) پرتگالی تیمار (ایک لاکھ پچاس ہزار) سراورک (۴ لاکھ ۳۰ ہزار) برونی (۸۴ ہزار) بھارت (۹ کروڑ) نیوگنی (۵ لاکھ) پرتگالی ہند (۲ لاکھ ۵۰ ہزار) سیلون (۷ لاکھ) اور پاکستان (۹ کروڑ) شامل ہیں، ان تمام ممالک کے مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات کا جائزہ لیے بغیر جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں کی پوزیشن مکمل طور پر واضح نہیں ہوگی۔ "ن"

متعدد زبانوں میں موجود ہے، اور غالباً پہلوی سے ماخوذ ہے،

مشک کو فرانسیسی میں musc لکھتے ہیں، اور انگریزی میں musk اور ہرن کی جس قسم سے مشک حاصل ہوتا ہے اسے musk-deer کہتے ہیں۔

۱۷۔ آدم۔ عربی کلمہ ہے بمعنی ابو البشر۔ تورات اور قرآن پاک کی رو سے آدم پہلا بشر ہے جسے خداوند کریم نے پیدا کیا تھا،

آدم کا لفظ عربی کے علاوہ کنعانی (یعنی فنیقی) عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی موجود ہے،

آدم کا لفظ سب سے پہلے تورات کی سفر التکوین (یعنی کتاب پیدائش) میں استعمال ہوا، اور بعد ازاں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں کم از کم پچیس[۲۵] مرتبہ آیا ہے،

ابو منصور جوالیقی نے اپنی کتاب المعرب میں آدم کے لفظ کو عربی بتایا ہے لیکن علامہ زمخشری (اور قاضی بیضاوی) نے اسے عجمی کلمہ قرار دیا ہے، امام راغب اصفہانی نے لفظ آدم کے اشتقاق کے بارے میں متعدد اقوال روایت کیے ہیں، اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ آدم اُدمۃ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگت کے ہیں، اور اس قول کو قبول کر لیا جائے تو آدم کا وزن (اسود اور احمر کی طرح) اَفْعَل قرار پائے گا۔

عربی میں آدم کا لفظ صرف اسم علم کے طور پر استعمال ہوا ہے، لیکن عبرانی اور کنعانی زبانوں میں عام انسانوں کے لیے بھی آیا ہے۔

آدم کا لفظ مغربی قوموں نے بھی اسم علم کے طور پر اختیار کیا ہے، اور ان کے ہاں ذیل کی مختلف صورتوں میں پایا جاتا ہے:۔

English, German, French & Danish	Adam
Italian	Adamo
Spanish	Adan
Portuguese	Adão

تے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس خطہ کی تین اہم حکومتوں یعنی انڈونیشیا متحدہ جمہوریہ ملیشیا اور سنگاپور کی معاشیات پر ان چینیوں کا زبردست قبضہ ہے، جو وہاں کی ایک بڑی اقلیت شمار ہوتی ہے جسکی تعداد اس خطہ میں ۳۵٪ ہے، بہت سے اہم تجارتی مرکزوں میں تو وہ اکثریت میں ہیں، کوالالمپور، جزائر مالوکا اور پنانگ میں خاص طور سے ان کی اکثریت ہے۔ خاص شہر سنگاپور میں وہ ۷۵ فیصدی ہیں۔ اور ایشیا میں صنعتی ترقی کے اعتبار سے جاپان کے بعد سنگاپور کا دوسرا نمبر ہے، اور ملائشیا اور انڈونیشیا بھی اس کے تعاون اور صنعتی اشتراک کے ضرورت مند رہتے ہیں،

اس خطہ کے سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، ملیشیا، انڈونیشیا اور سنگاپور کی حکومتیں سیاسی طور پر چینیوں کی تعداد اور طاقت سے کافی حد تک متاثر ہوتی رہتی ہیں، ان چینیوں نے اندرون ملک ملایائی اور انڈونیشی عناصر سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے، وہ خصوصاً انتہائی اور تخریب پسند واقع ہوئے ہیں، اور ان کو سمندر پار سرخ چین کی مدد پر بھی بھروسہ ہے، ملایا اور انڈونیشیا کی ثقافت کو ان چینیوں سے جو خطرہ لاحق ہے اس کے تدارک کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ قطعی ناکافی ہیں، اس سے ملیشیا کے اہم علاقوں میں چینی اکثریت نے شہریت اور حقوق رہائش کے قوانین کو کافی متاثر کیا، چینیوں کی اس اکثریت نے دینی امور سے متعلق مرکزی وزارت کے قیام کی راہ میں بھی رکاوٹیں پیدا کی ہیں،

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان ملیشیا اور سنگاپور کا جو فیڈریشن وجود میں آیا تھا اس کا مقصد سیاسی، مذہبی اور قومی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، بعد میں شمالی بورنیو کے برطانوی علاقے سراوک اور صباح بھی اس فیڈریشن میں شامل کر لیے گئے، تاکہ چینی اکثریت والے علاقے سنگاپور میں ملایائی باشندے اقلیت میں نہ آجائیں، لیکن اگست ۱۹۶۵ء میں سنگاپور نے اس فیڈریشن سے اپنی علیحدگی اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا جس سے ان دونوں ٹکڑوں میں ہم آہنگی قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔

آہستہ آہستہ انڈونیشیا کے سب سے بڑے جزیرہ بورنیو، مغربی آئرین اور کالیمنتان کے علاقوں میں بسنے والی غیر مسلم اقلیت بھی اسلام سے متاثر ہو رہی ہے۔

اس خطہ کو دنیائے اسلام کا سرحدی علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ دور دراز کے اسلامی ممالک خصوصاً مصر و پاکستان کے اسلامی خیالات نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس خطہ میں ایک طرف تو وہ طبقہ دکھائی دیتا ہے جو اسلام کی پیروی میں نہایت متشدد ہے دوسری طرف وہ طبقہ ہے جس نے بعض اسلامی تعلیمات کو ناقابلِ عمل تصور کر کے ان میں ترمیم کر لی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اسلامی اصولوں کے ساتھ مقامی رسم و رواج کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، یہ رسم و رواج مسلم تہذیب کے اثرات سے پہلے ہند و سوسائٹی یا بے دین فرقوں کی دین ہیں اس لیے اس خطہ کے مختلف علاقوں میں اسلام کی شکل مختلف ہے، لیکن تمام مسلم فرقوں کے درمیان سیاسی اور سماجی ہم آہنگی پورے خطہ پر پائی جاتی ہے، اس کا اہم سبب یہ ہے کہ یہاں ان کا واسطہ تقریباً ایک کروڑ چینیوں سے برابر پڑتا رہتا ہے، جو ایک طاقتور اقلیت کی شکل میں گذشتہ ایک صدی سے ہر حیثیت سے ترقی کر رہے ہیں، اور اس علاقہ کی معاشیات پر ان کا پورا قبضہ ہے ان چینیوں کی وجہ سے اسلام کو اس خطہ میں ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے، یہاں کے مسلمانوں نے اس چیلنج کا احساس تو ضرور کیا ہے لیکن اس خطرہ کی شدت کو انھوں نے پوری طرح محسوس نہیں کیا ہے،

جنوب مشرقی ایشیا میں مسلمانوں کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو تعلیمی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے ان سے برتر ہے، یہ لوگ اپنے سیکولر اور مادہ پرستانہ نظریات کے سبب سے دوسرے اہلِ مذاہب سے معاشی امور کے علاوہ کسی اور شعبۂ حیات میں کسی طرح کا واسطہ نہیں رکھتے۔ حالانکہ وہاں کنفیوشس کے نظریات پر لکچر ہوتے اور قمری تیوہار منائے جاتے رہتے ہیں، چینی اپنے خاندان کی مادی ترقی کے علاوہ مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ملایا اور انڈونیشیا کے مسلمان چینیوں کے ان خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ خیالات سے بہت دور ہیں، لیکن ان کو بادلِ ناخواستہ ان بے دین چینیوں سے تعلقات قائم رکھنے

چینی باشندے معاشی طور پر کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، تعداد میں وہ مجموعی آبادی کا محض پانچ فیصدی حصہ ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ انڈونیشیا، جہاں بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۱۳ء میں اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کے فروغ اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے ایک نئی جماعت "شرکت اسلام"[۵] کا قیام عمل میں آیا تھا، وہ سوکارنو اور حتا کے دور میں کافی حد تک سیکولر ہو گیا، آزادی کے بعد انڈونیشیا میں اسلامی اور بے دین طاقتوں کے درمیان برابر تصادم ہوتا رہا، دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر انڈونیشیا نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا، اور نظام حکومت کے لیے "پنچ شیلا" (اصول پنجگانہ) کو اپنایا جس میں ... پر ایمان کو اہمیت دی گئی ہے، کوئی ایسی بات جس کا اسلام سے تعلق ہو اس میں ... نہیں تھی،

آج ملیشیا میں ایک قومی زبان کی تحریک جس زور و شور کے ساتھ چل رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں دونوں قوموں کی شیرازہ بندی کی کوششوں اور اسلام کو دینی حفاظت کا قلعہ بنانے کے تجربے دونوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن انڈونیشیا میں مختلف النوع سوسائٹیوں کے باوجود ایک مشترک قومیت کا جذبہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے، ملیشیائی

---

[۵] مترجم۔ جماعت "شرکت اسلام" کا قیام حاجی عمر سعید کے زیر صدارت ۱۹۱۲ء میں اس وقت عمل میں آیا تھا جب ولندیزیوں نے "شرکت کانگ اسلام" کو غیر قانونی جماعت قرار دیدیا تھا، شرکت اسلام کے بنیادی مقاصد تھے: (۱) مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف کرانا (۲) غیر اسلامی طرز معاشرت اور فرسودہ رسم و رواج کو مٹانا (۳) اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کو فروغ دینا (۴) اہل ملک کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کیلیے کام کرنا (۵) صنعت و تجارت کو فروغ دینا (۶) عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا۔

شرکت اسلام کے قیام سے انڈونیشیا میں قومی بیداری کے اہم ترین باب کا آغاز ہوا، اور اسکی کوششوں سے ولندیزی سامراج کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور صرف ۳۵ سال کے مختصر عرصہ میں انڈونیشیا نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ ن۔

اس دوران میں انڈونیشیا جو ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا تھا، مختلف قسم کے سیاسی اور معاشی مسائل سے دوچار رہا، اس کی مذہبی و ثقافتی حالت ملیشیا یا سنگاپور سے بہت مختلف تھی، ان دونوں ملکوں میں ملایائی ہونے کا مطلب مسلمان ہونا تھا، اور اس رشتہ سے ان کے لیے تمام قانونی پابندیوں کا احترام لازمی تھا، اس فیڈریشن کا سرکاری مذہب اسلام تھا، اور گو آئین کی بعض دفعات میں مذہبی آزادی کی صریح ضمانت دی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ "حکومت مسلمانوں کو کسی اور مذہب کی طرف راغب کرنے والی تحریکوں پر قانونی پابندی عائد کرسکتی ہے"، ملایائی مسلمانوں کی کمزور معاشی حالت کا اندازہ ان تحفظات سے ہوسکتا ہے جو ملازمتوں اور محفوظ زمینوں کے بارے میں ان کو "خاص حقوق" کے طور پر دیے گئے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ فیڈریشن سے علیحدہ ہو جانے والے سنگاپور میں بھی پندرہ فیصد ملایائی اقلیتوں کے لیے یہ "حقوق خاص" اب تک قائم ہیں، لیکن انڈونیشیا میں صورت حال اس سے مختلف ہے، وہاں تاریخی حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ انڈونیشی اور مسلمان دونوں مترادف سمجھے جاتے ہیں، مثلاً جاوا کے باشندے ہندو اور بودھ تہذیب اور اس کی روایات کے پیرو اور سری وجایا، سلینڈرا اور مجاپہت[1] کے ماننے والے ہیں، جزیرہ بالی ہندو تہذیب کا ایک جدید نمونہ ہے، کچھ علاقوں میں تھوڑے سے عیسائی بھی ہیں، یہاں

---

[1] مترجم۔ سری وجایا، سلینڈرا اور مجاپہت انڈونیشیا کی قدیم بودھ سلطنتوں کے نام ہیں، جن کا زمانہ اندازاً ساتویں اور آٹھویں صدی بتایا جاتا ہے، ۹۰۴ء میں سلینڈرا نے سری وجایا کی سلطنت کو ختم کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا، یہ وسطی جاوا میں پھیلی ہوئی تھی، اسی طرح مجاپہت بھی انڈونیشیا کی اہم ترین سلطنت تھی جس کا بانی راون وجایا بیان کیا جاتا ہے، اس سلطنت کا زمانہ ۱۲۹۳-۱۴۲۸ء ہے، یہ انڈونیشیا میں ہندوؤں کی سب سے بڑی سلطنت تھی، اور اس کی شکست کے بعد ہندو دور حکومت ختم ہوگیا اور مسلمان سلطنتوں کے قیام سے انڈونیشیا کی تاریخ میں دور عظیم کا آغاز ہوا۔ ن

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم معاشرہ کا ایک نمایاں جزو چینی باشندے ہیں، اور یہی چیز انڈونیشیا میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مسائل کا سبب بنی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ دونوں ملکوں (انڈونیشیا اور ملیشیا) میں مختلف تھا۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک ڈاکٹر سوکارنو نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کئی ناکام کوششیں کیں، اور اسی کے سہارے انھوں نے ملک کے عوام کو ملکی مسائل کی سنگینی کا احساس نہ ہونے دیا، لیکن ان دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان جو نیم مسلح کشمکش چل رہی تھی، وہ اب کم ہوتی نظر آتی ہے۔

اب توقع ہے کہ کچھ عرصہ میں ایک متحدہ ملایائی، انڈونیشیائی ثقافت وجود میں آئے گی۔ اس سلسلہ میں امید کی ایک شعاع اس سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ حال میں ان دونوں ملکوں اور فلپائن کو ملا کر "مے فی انڈو (ملیشیا، فلپائن اور انڈونیشیا کا فیڈریشن) قائم کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے، اور وہ پرانا جذبہ جس کے ذریعہ ہند چینی کے درمیانی علاقوں کو ایک مشترک حکومت "نوسنترا" مانا جاتا تھا، پھر سے عود کر آیا ہے، اس کا ثبوت اس پرجوش استقبال سے ملتا ہے۔ جو ملیشیائی لیڈروں نے ان انڈونیشی فوجی افسروں کا کیا ہے۔ جو حال ہی میں سیاسی ناکہ بندی کا خاتمہ کرنے کی غرض سے کوالالمپور پہنچے تھے،

لیکن سوال یہ ہے کہ اس اتحاد کی بنیاد کیا ہوگی؟ اور ان ملکوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوں گے؟ اس میں شبہہ نہیں کہ حالیہ چند برسوں میں انڈونیشیا کے جذبۂ دشمنی نے ملایا کو اچھی نظر سے دیکھنے کا جذبہ ختم کر دیا ہے، خاص طور سے انڈونیشیا اپنے سیکولر نظریات اور مشترکہ کلچر کے ذریعہ دنیا میں اپنا جو مقام بنا رہا تھا

ارباب اقتدار کی بہ نسبت انڈونیشی حکمراں دینی امور میں اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں، چنانچہ انڈونیشیا میں آزادی کے بعد سے مذہب سے زیادہ سیاست کو اہمیت دی گئی ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہاں مذہبی احساس سرد یا ختم ہو چکا ہے، ۱۹۴۸ء میں جماعت دار الاسلام[1] کی گوریلا سرگرمیاں، ماشومی[2] (مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا) کی تحریک اور اکتوبر ۱۹۶۵ء کے خونی انقلاب کے بعد کمیونسٹوں کے خلاف انڈونیشی مسلمانوں کے اقدامات وہاں کی اسلامی زندگی اور اس کی آب و تاب کا بین ثبوت ہیں، بلاشبہ ماشومی ایک سیاسی تحریک ہے، جو دوسرے مسلم ممالک کی طرح اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی ہے، مگر اسلام کا یہ مصرف انڈونیشیا کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

---

[1] مترجم۔ "دار الاسلام" انڈونیشیا کی اسلامی جماعتوں میں سب سے زیادہ کٹر، انتہا پسند اور جنگ جو جماعت شمار ہوتی ہے، اس کا نصب العین اسلامی مملکت کا قیام ہے، ماشومی کے برخلاف یہ جماعت دہشت پسندی، جنگ اور خونریزی کی قائل تھی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اس قسم کے تمام وسائل سے کام لینا جائز تصور کرتی ہے، دار الاسلام کے رہنما کارتو سوویریو (Kartosuwirjo) تھے لیکن بعد میں وہ اس سے بے تعلق ہو گئے۔ "ن"

[2] مترجم۔ ۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر محمد سوکیمان نے مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا Madjelis Sjuro Muslimin Indonesia کے نام سے ایک نئی اسلامی تنظیم قائم کی جس کا مختصر نام ماشومی (Masjumi) ہے اور وہ اسی نام سے مشہور ہے، سوکیمان اور حامی اسلام دوسرے رہنماؤں نے اس تنظیم سے پورا فائدہ اٹھایا، اور مسلمانوں کو منظم کر کے آزادی اور اسلامی حکومت کی راہ ہموار کرنے لگے، اس تنظیم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتیں اور غیر سیاسی مسلم ادارے اس تنظیم میں شامل ہو گئے، اور چند مہینوں کے اندر یہ انڈونیشیا کی سب سے بڑی اور پورے ملک کی نمائندہ جماعت بن گئی، اس تنظیم میں جن جماعتوں نے انضمام کر لیا تھا، ان کے نام یہ ہیں، پارٹی اسلام انڈونیشیا، شرکت اسلام انڈونیشیا، پے سنتدا پارلیسان تحریکت اسلام کیدوآ۔ جمعیۃ المحمدیہ اور نہضتہ "ن"

پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ارباب اقتدار اس سیاسی مسئلہ کا کوئی عام پسند حل نکال سکتے ہیں یا یہ فرقہ وارانہ کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی؟ ممکن ہے کہ دونوں ملکوں میں دبا ہوا مذہبی جذبہ شدت اختیار کر جائے، یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اگرچہ نیوگنی (بورنیو) کے ملیشائی علاقوں میں انڈونیشی سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں، مگر کئی ہزار کمیونسٹ گوریلے اور ان کے چینی بہی خواہ اب بھی جنگلوں میں روپوش ہیں، اگرچہ دونوں بازوؤں سے علیحدہ ہو جانے کے باعث ان کی حالت نازک ہے۔ ملیشائی حکومت نے ان سے کہا ہے کہ وہ ہتھیار ڈال کر از سر نو زندگی کے میدان میں قدم رکھیں اور اگر وہ ملیشیا سے باہر جانے کے خواہشمند ہوں تو اس کا بھی معقول انتظام کر دیا جائے گا، لیکن اگر خود سنگاپور کو ملک بدر ہونا پڑا تو وہ کہاں جائیں گے؟

سنگاپور یا چین؟

اس نازک مسئلہ کا حل حکومت سنگاپور کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ باہر سے آنے والوں کے لیے سنگاپور ہی ایک مرکزی پناہ گاہ ہے۔ آج سراوک اور صباح میں باغیوں کے لیے جو اشتہارات گرائے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر وزیر اعظم لی کوان یو کا یہ بیان قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ

"سمندر پار چینیوں کی بہترین پناہ گاہ سنگاپور ہے"۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اس کا قوی امکان ہے کہ سنگاپور کی وسیع النظر پالیسی اور مختلف اقوام پر مشتمل وہاں کی مشترکہ سوسائٹی ان دونوں پڑوسی ملکوں پر بھی اثر انداز ہوگی، اور ان میں جذبۂ رواداری پیدا کرے گی، سنگاپور کو چینی اقلیت کی پناہ گاہ سمجھنا بالکل ویسا ہی ہے، جیسے دسیفورا کے یہودیوں کے لیے اسرائیل ہے، ان چینیوں کا مسئلہ شمالی افریقہ کے ان یورپین باشندوں سے بہت مشابہ ہے جن کو ضرورت کے وقت اپنے ملک بھاگ جانے کی سہولت حاصل ہے، پھر بھی وہ بھاگتے نہیں، بلکہ ایک غیر ملک میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے

اس کی بنا پر اس نے ملائشیا کی مسلم پرستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا، ملائشیا کو انڈونیشیا کے وسیع ثقافتی اور لسانی خزانے سے بہت کچھ لینے کی ضرورت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دونوں ملکوں میں تمدنی اثرات کی مکمل طور پر لین دین ہو تو ان میں بہت خوشگوار تعلقات پیدا ہونے کی امید ہے، لیکن ایک ملک میں مذہبی جذبہ کی شدت اور دوسرے میں سیکولر نظریات کی تائید (گو زبانی ہی سہی) ایک ایسا ٹکراؤ ہے جو دونوں ملکوں کے تعلقات میں ہمیشہ حائل رہے گا۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے خونی انقلاب کے بعد انڈونیشیا میں قومیت کا جذبہ انتہائی شدت سے ابھر آیا ہے، جس کا نشانہ عام طور پر چینی اقلیت اور خصوصاً سرخ چین بنا، اس جذبہ کے ملیشیا میں بھی پھیل جانے کا قوی امکان ہے، جہاں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کمیونسٹ تنظیموں کی بغاوت میں مقامی چینیوں نے نمایاں حصہ لیا تھا، سیاسی ناکہ بندی سے پہلے ان دونوں ملکوں (انڈونیشیا اور ملیشیا) میں انتہا پسند مذہبی اور سیکولر تنظیموں میں مصالحت کی کوششیں کی گئی تھیں، اور اب ان چینیوں کے خلاف ایک نئے قسم کی ناکہ بندی اور ایک نیا جہاد شروع کرنے کے لیے عوام کو اپنی طرف مائل کر لینا کچھ دشوار کام نہیں ہے، انڈونیشیا میں تو چینی اقلیت کے خلاف تشدد کے ایسے واقعات ہوئے کہ پیکنگ حکومت کو اس کے خلاف کئی بار احتجاج کرنا پڑا، انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں میں چینیوں کے خلاف جذبۂ مخاصمت پیدا ہونے کے کئی اسباب ہیں، وہ غیر ملکی ہیں، وہ نہ تو ان ملکوں کی سوسائٹی میں جذب ہو سکتے ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں، معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال ہیں، یا خود انتہا پسند کمیونسٹ ہیں یا ان کے معاون ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدا

وفیات

ڈاکٹر سید محمود

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

انگلستان کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے وطنی اور ملی دونوں جذبات بیدار ہوتے رہے، ۱۹۰۹ء میں ایران کی تقسیم کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا، انگریزوں نے وہاں بلوچیک فوج اتار دی، مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن دونوں نے اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لی، ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحبت میں برابر رہا کرتے تھے اس لئے وہ انہی کے ذریعہ سے ایران کے مشہور رہنماؤں میں مرزا یحییٰ اور آقا نقی وغیرہ سے ملتے رہے، پھر ایرانیوں کی حمایت میں ایک جلسہ کرایا، پروفیسر براؤن نے اس جلسہ میں منظور کرانے کے لئے ایک تجویز مرتب کی، جسکو ڈاکٹر صاحب نے لیجا کر مسٹر بلنٹ کو دکھایا، انھوں نے دیکھ کر کہا یہ تجویز بے جان ہے، انگریزوں کی سخت مذمت کرو، ان کو گالیاں دو، تب ہی ان پر اثر ہوتا ہے، پھر انھوں نے خود ہی ایک بہت ہی سخت تجویز مرتب کی، جلسہ میں جب یہ تجویز ڈاکٹر صاحب نے پیش کی تو پاس نہ ہو سکی لیکن ایک دوسری تجویز میں سلطان ٹرکی اور امیر افغانستان سے ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی، اس تجویز سے بھی انگلستان کے سیاسی حلقہ میں ایک ہلچل مچ گئی،

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب کی اسلامی حمیت بھڑک اٹھی اور انھوں نے ترکوں کی مدد میں ایک جلسہ کرایا، جسمیں انکی دعوت پر مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن بھی شریک ہوئے، اس میں مسٹر بلنٹ نے انگریزوں کے خلاف ایسی سخت تقریر میں کہا کہ یہ بڑے سازشی ہیں، اٹلی کے ساتھ سازش میں شریک ہیں، اگر یہ چاہیں تو طرابلس سے اٹلی کی فوجیں واپس جا سکتی ہیں، جنگ بلقان کے موقع پر بھی ڈاکٹر صاحب کی اسلامی غیرت ابھری، اس سلسلہ میں مسٹر بلنٹ نے

جمے رہتے ہیں، بلا شبہ چینیوں کا بھی اپنا ایک وطن ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی آبائی وطن واپس جانا پسند نہیں کرتا، اسرائیل کی تقلید میں ان چینیوں نے بھی اس علاقے میں اپنے لیے ایک علیحدہ ٹکڑا منتخب کر لیا ہے، جو اقوام متحدہ (U. N. O) کا ممبر اور بین الاقوامی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک جزیرے کی حیثیت سے سنگاپور زیادہ دنوں تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کے قدرتی وسائل بہت محدود ہیں، دشمن ملکوں کے سمندر اسکا احاطہ کیے ہوئے ہیں لیکن اس موقع پر اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے جس نے سخت ترین دشواریوں کے باوجود اپنی معاشی طاقت کو کتنا مضبوط بنا لیا ہے، سنگاپور بھی اسی کے نقش قدم پر چل سکتا ہے، اور چینی ملیا نگ کی سرمایہ کاری اور ذہنی صلاحیتوں سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے،

اس امکان کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سرخ چین ایمرجنسی کے وقت سنگاپور کو پوری پوری مدد دے سکتا ہے، چین ملیشیا کو نوآبادیاتی نظام کا طرفدار اور انڈونیشیا کو ترقی پسندی کا مخالف شمار کرتا ہے، اگر چینی حکمراں اپنی طاقت کے بل پر شرارت کرنا چاہیں، جیسا کہ انڈونیشیا میں ہو چکا ہے، تو اس کا انجام نہایت تباہ کن ہوگا، اگر ملیشیا اور انڈونیشیا کے متحدہ وفاق کو کبھی چین دشمنی کا سامنا کرنا پڑا تو اس کا بھیانک انجام یہ ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کا عظیم مسلم معاشرہ ختم ہو کر رہ جائے، اس لیے جنوب مشرق ایشیا کے مسلمانوں کو اپنی بقا و تحفظ کے لیے اسلامی ڈھانچہ کو مضبوط تر بنانے اور مسلم فرقہ کو زیادہ طاقتور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر چارلس ایف گیلاغر، مراکش)

سر علی امام نے مشترکہ انتخاب کی تحریک پیش کی تو انھوں نے اس کی تائید کی، اور پھر اس کے لئے مختلف جلسے بھی کرائے، یہ بات جسٹس امیر علی اور سر آغا خاں کو پسند نہ آئی، ان سے ڈاکٹر صاحب کا اختلاف بڑھا تو وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ وہ اپنی گفتگو میں کہتے کہ مجھکو اس وقت جداگانہ اور مشترکہ انتخاب کی بحث بالکل فضول معلوم ہوتی، وہ ہر وام پر انگریزوں کی غلامی کا طوق ہندوستانیوں کی گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے اس لئے وہ کوئی ایسا جھگڑا پسند نہیں کرتے جس سے ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جاتا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں کو جلد سے جلد اسلئے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کہ انکا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار ختم ہونے کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں بھی ان کا تسلط خود بخود ختم ہو جائے گا، وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:-

"طالب علمی ہی کے زمانہ میں اسلامی جذبے کے ماتحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہوا اور اپنے دوستوں تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے ساتھ اس میدان میں اترا، اس وقت تمام اسلامی ممالک انگریزوں کے مظالم سے تباہ ہو رہے تھے، میرا عقیدہ تھا کہ جب تک انگریز ہندوستان پر مسلط رہیں گے اسلامی ممالک ان کے مظالم سے نجات نہیں پا سکتے یہی اسلامی جذبہ طالب علمی کے زمانے میں چھایا رہا، جو خلافت کی مذہبی تحریک کے زمانے میں انتہا کو پہونچ گیا جس سے مجھ کو ہر طرح کے مالی و جانی نقصانات اٹھانے پڑے"

وہ انگریزوں کی مخالفت ضرور کرتے رہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دو انگریزوں کے حوالے اپنی گفتگو میں برابر دیتے۔ دونوں کے نام مجھ کو اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں، مگر انھوں نے ان کا ذکر اپنے اس مقدمہ میں کیا ہے جو انھوں نے مشاہیر کے خطوط کے اس مجموعہ کے لئے لکھا تھا جو ان کے نام سے ہیں، ایک انگریز نے جو برسوں ہندوستان میں رہ چکا تھا، ان سے

اُن کو ایک طویل خط لکھا جس کو انھوں نے مولانا محمد علی کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ میں شائع کر دیا۔ وہ اپنے استاد کا بہت احترام کرتے۔ مگر بلقان کی جنگ کے سلسلہ میں ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ اسی طرح مسٹر بلنٹ کا خیال تھا کہ اگر خلافت ترکی کے بجائے عربوں کے کسی ملک میں منتقل ہو جاتی تو زیادہ مفید ہوتی۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کے اس خیال کو سیاسی غلطیوں پر مبنی سمجھتے۔

ڈاکٹر صاحب نے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں بیان کیا کہ مسٹر بلنٹ ہندوستان کی سیاحت کے لئے بھی آئے تھے۔ وہ علی گڑھ پہونچے تو سرسید نے ان کی دعوت کی جس میں ایک انگریز کلکٹر اور ایک انگریز جج کو اپنے دونوں طرف بٹھایا۔ مسٹر بلنٹ کو یہ انگریز نوازی ناگوار گزری اور اپنی ڈائری میں ان انگریزوں کا ذکر نامی کی حیثیت سے کر کے سرسید کے متعلق لکھا کہ یہ غیر مخلص شخص (Insincere fellow) ہے۔ ڈاکٹر صاحب سرسید کے متعلق یہ رائے پسند نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ خوش تھے کہ مسٹر بلنٹ نے آخر میں یہ رائے بدل دی اور وہ سرسید کو مخلص سمجھنے لگے تھے۔ اس رائے کی تبدیلی میں یقیناً ڈاکٹر صاحب کا بھی حصہ رہا ہوگا۔ مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن کے بہت سے خطوط ڈاکٹر صاحب کے پاس آخر وقت تک محفوظ رہے۔ انھوں نے ان کو اپنے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے، جو انھوں نے مشاہیر کے خطوط ان کے نام کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس سے ان کی سیاسی سرگرمیوں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں کی اور زیادہ تفصیلات معلوم ہوتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قیام انگلستان ہی کے زمانہ میں رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ قائم کی تو ان کو اس کا جوائنٹ سکریٹری بنایا۔ اس کے ایک جلسہ میں

ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز بیرسٹروں میں تھا وہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی ایکزیکیٹیو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سیاسی خیالات میں قوم پرورانہ رجحانات رکھتے تھے، ان ہی کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ ہی میں بیرسٹری شروع کی، اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے لگے مگر ہندوستان کی آزادی کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہوئی تھی، وہ جلتی رہی، اسی لئے سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے اس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق بھی جو بعد میں اپنی داڑھی اور مذہب کی وجہ سے مولانا مظہر الحق کہلانے لگے تھے ہندوستان کے چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے، اُن کی نظر ڈاکٹر صاحب کی طرف اٹھی، اور اپنی صاحبزادی سے اُن کی شادی ۱۹۱۵ء میں کر دی، مسٹر مظہر الحق کانگرس کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں بھی ڈاکٹر صاحب کی وطنیت کی کیمیا کو ضرور آنچ ملی۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا کانگرس کے ممبر بنے، اور اس وقت سے زندگی کے آخری لمحہ تک مخلص کھدر پوش کانگرسی رہے،

اُن کو شعر و شاعری، اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رہا، مگر ان پر سیاست کچھ ایسی حاوی رہی کہ وہ ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرتے، تو ان میں بھی اپنے ملی اور وطنی جذبات کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتے، مثلاً اُن کو غالب کے کلام سے بڑی دلچسپی رہی، انھوں نے غالب پر ایک مقالہ ۱۹۱۹ء میں لکھا اس میں انھوں نے غالب کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندیٔ خیال، ذکاوت، تعمق خیال، وسعت نظر، عالمگیر ہمدردی، غم خواری، انسان اور اس کے فضائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی طرفگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے، اور اُن کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تعبیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا، ان کا کلام شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے

۱۹۱۱ء میں کہا کہ آپ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑیں گے، تو ہندوستان مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا، ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس انگریز کی پیشین گوئی کا ذکر برابر کرتے۔ اور کہتے کہ سیلون، برما، پاکستان، اور اب چھوٹا ملک بھی آخر واقعی علٰحدہ ہو کر رہے۔ اپنے ایک دوسرے انگریز کی یہ بات بھی دہراتے کہ اس نے اُن سے کہا کہ ہم لوگ جب ہندوستان چھوڑیں گے تو سارے ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر کٹ مریں گے۔ ہندوستان میں جو لسانی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ان پر ڈاکٹر صاحب تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس انگریز کی انجام بینی کی داد دیتے،

کیمبرج کی تعلیم کے زمانے ہی میں ڈاکٹر صاحب اور پنڈت جواہر لال نہرو سے تعلقات پیدا ہوئے۔ جو آخر وقت تک استوار رہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے

> "میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔ م۔ سین۔ گپتا، میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔ میرے زمانہ میں پڑھتے تھے۔ میرے اور ہم عصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے۔"

انگلستان کے قیام ہی کے زمانے میں اُن کو ۱۹۰۹ء میں گاندھی جی سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ وہاں جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے تھے، اُن کی ملاقات کچھ ایسی نیک اور مبارک ثابت ہوئی کہ آئندہ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوتے گئے،

وہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے، اس وقت پٹنہ میں سر علی امام کا طوطی بولتا تھا،

والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رلواتا ہے، اس کی مثال اس قطعہ کے اشعار میں پیش کی، جو حسب ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے　　　　اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اس لئے فرماتے ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　　　لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے شیر آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق　　　　میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اسی قسم کے اور بہت سے خیالات کا اظہار کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین اس طرح کرتے ہیں :۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالب کے پانچویں اڈیشن میں بھی شامل ہے۔ اس پر آسی مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبد اللطیف، شیخ اکرام وغیرہ نے بڑی سخت تنقیدیں کیں، اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ مگر وہ غالب کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے، میں نے اپنی ہیچ تالیف کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالب کی وطنیت کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے، لیکن اُن کے

کی عمیق النظری شلر کی بلند خیالی ٹامسن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے، یہ تعریف غالبؔ اپنے کانوں سے سنتے تو اپنی ناقدری کی شکایت نہ کرتے، مگر اسی کے ساتھ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھ گئے کہ غالبؔ کی غزلوں کے اشعار میں اُن کے زمانہ کے خونچکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے مثلاً ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہوچکا تھا، سیاست دانوں کی طرح غالبؔ نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:-

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دہلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفاء کے مکان ویران اور برباد کردیئے گئے، پورا شہر صحرا ہوگیا تو غالبؔ اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:-

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، اُن کو دیکھ کر غالبؔ نے کہا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

پھر انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب کو جس طرح مٹایا اس کا اثر غالبؔ کے دل پر بھی ہوا، انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا، جو حقیقۃً دل کو ہلا دینے

کی دیانت و امانت پر زور و شور سے حملہ آور ہوا، دفاع میں سید محمود بھی میدان میں اترے دلائل و اعداد کی توپوں سے اس مورچہ کو سر کر لیا،

خلافت کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے حسب ذیل خط سے بھی ہوگا،

۴۶ ۔ رپن لین کلکتہ

جی فی اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ، تار اور پھر خط پہنچا، آپ کا خط رمضان سے چند یوم پیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا، منتظر تھا کہ اس کا جواب آپ کی جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں، بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط کا جواب بھی روانہ کر رہا ہوں، بہار کیلئے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی، بشرطیکہ کم سے کم آپ پوری طرح مستعد رہیں، گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں، اس لئے غالباً میں عید کی شام ہی کو بمبے کے لئے روانہ ہو جاؤں اور پھر واپسی میں بانکی پور ٹھہروں آپ بہار کے لئے ایک منظم اور طے شدہ پروگرام طیار کر رکھیں، اور میرے لئے ایک ایک دن صرف ان جگہوں میں ٹھہرائیں، جہاں واقعی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بمبئی اور امرکزی خلافت کی ضروریات اور باہر کے عاجزکن تقاضوں کے خود بنگال کا تمام کام ویسا ہی دھرا ہے، اور شوال میں اس کیلئے کافی وقت نکالنا نہایت ضروری ہے، ۱۴ر جون سے ۲۵ تک بنگال کے لئے قرار دے چکا تھا، اور بعض مقامات کو مطلع بھی کر چکا تھا، لیکن آپ کے خط کی وجہ سے بہار کو ترجیح دی، اور بنگال کی تاریخیں پیچھے ڈالدیں، پس اس کا لحاظ رہے کہ کم سے کم وقت وہاں صرف ہو، اور صرف ناگزیر اور واقعی ضروری مقامات سردست منتخب کر لئے جائیں، پھر جولائی میں انشاء اللہ بقیہ مقامات کا بھی دورہ ہو رہے گا،

مجموعۂ کلام میں بنارس، پٹنہ، کلکتہ کی جو مداحی ہے، یا اُن کے خطوط میں دہلی سے جو محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے، یا اُن کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو خونچکاں تفصیلات ہیں، یا پھر اُن کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی، اور موقع بموقع اپنی رواداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق اُن کی وطنیت، جذباتی ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار کر کے مجھ سے سُنا اور سُن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہلے نہیں گئی تھی، تم نے منتقل کرا دی، میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح نہ ہوں لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا، وہ صحیح تھا، خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالب کے پرستار غالب کے کلام اور تصانیف کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں،

ان کا ادبی اور علمی ذوق اُن کے سیاسی ذوق کی وجہ سے دبتا چلا گیا، ۲۱-۱۹۲۰ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں دونوں ساتھ چلیں، تو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی پریکٹس چھوڑ دی، اسی سال مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنا دیئے گئے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھ بمبئی میں رہنے لگے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات پر جو پُر اثر مضمون لکھا ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام بڑے جوش، خود فراموشی، اخلاص، کامل دیانت کے ساتھ کیا، جب ۱۹۲۱ء میں علی برادران قید ہو گئے تو اُن کی والدہ بی اماں مرحومہ کے دوروں کا انتظام کرایا، ان ہی دنوں انھوں نے ایک انگریزی کتاب "خلافت اینڈ انگلینڈ" لکھی، اور بھی بہت کچھ لکھا لکھایا، اسٹیٹسمین اس وقت طاقتور اخبار تھا وہ خلافت والوں

کی گذشتہ تاریخ کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ بظاہر کوئی تحقیقی کتاب نہیں لیکن اس میں جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔ وہ تاریخ ہند کے محققوں کیلئے سبق آموز اور مشعل راہ بھی ہیں۔ سارے تاریخی واقعات عبد الرحمٰن (بجنوری) کے ذریعہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ عبد الرحمٰن دراصل خود ڈاکٹر صاحب ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے تھے۔ عبد الرحمٰن کی زبانی کہہ گئے ہیں۔ اپنا نام کہیں آنے نہیں دیا ہے۔ جو اُن کی کسر نفسی کی دلیل ہے، اُن کا آخر آخر وقت تک خیال رہا کہ ہندو مسلمانوں میں اختلاف، پھوٹ اور کدورت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندوستان کی تاریخ کیا پڑھتے ہیں بلکہ اس کے ذریعہ بس ملے دودھ پیتے رہتے ہیں۔ ان ہی کو پی کر جوان ہوتے ہیں اپنی اس کتاب میں اسی بس کو دور کرنے کی کوشش کی،

انھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ اگر وہ ہندوؤں کے مذہب ان کے مقدس رشیوں اور بزرگوں کے طریق علم و عمل کا مطالعہ کریں، تو اُن کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کے یہاں بھی خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی سچی تصویر نظر آئے گی، ہندو بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے اس کی ابتدا اور انتہا نہیں، ہر جگہ موجود ہے، پاک ہے، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، قادر مطلق ہے، دانائے کل ہے، زندگی بخشتا ہے، حکومت کرتا ہے، سب کی حفاظت کرتا ہے، اپنی بادشاہی میں نرالا ہے، وغیرہ وغیرہ، وہ اس کے ضرور قائل ہیں، کہ خدا انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے، اسی کو اوتار کہتے ہیں، مگر وہ اوتار کو خدا نہیں تسلیم کرتے، وہ بت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں، لیکن وہ دراصل اس کی پرستش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو اپنی دلجمعی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، تاکہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو) وہ اپنی مدد خدا ہی سے ڈھونڈھتے ہیں اور اسی کی پاکی کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، اُن کی

امید ہے کہ آپ کی آمادگیاں جس کا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا، قائم ہوں گی بلکہ مزید محکم واستوار۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کچھ دنوں معیت رہے۔ اور آپ کی خواہش کے مطابق سفر وحضر میں یکجائی ہو، علی الخصوص سفر میں، خدا نے چاہا تو موجب نتائج وثمرات ہوگا۔

امید ہے کہ مسٹر مظہر الحق (جن کو اب بقاعدۂ عام مولانا مظہر الحق کہنا چاہئے اگرچہ وہ اس سے خوش نہ ہوں گے) بدستور مشغول ومنہمک ہوں گے۔ اب ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے ایثار واخلاص کو مزید قبولیت وثمرات عطا فرمائے،

(فقیر ابو الکلام احمد کان اللہ لہ)

۱۹۲۲ء میں جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں بڑے شد ومد کے ساتھ بڑھیں تو ہزاروں محبان وطن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بکسر شاہ آباد (بہار) کے برطانوی جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہونا پڑا، اس وقت ہندو مسلمان کے اتحاد کا بڑا ہی شاندار منظر دیکھنے میں آتا تھا، گاندھی جی، موتی لال نہرو، سی۔آر۔داس، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی محمد علی، ابو الکلام آزاد، حکیم اجمل خان وغیرہ شمع اتحاد کے پروانے بنے ہوئے تھے ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا بھی یہ جذبہ اپنی انتہا تک پہونچ گیا تھا، بکسر جیل ہی میں انھوں نے ایک تحریر لکھنی شروع کی، جو پہلے تو روزنامہ خلافت بمبئی میں کئی مہینوں تک باقاعدہ شائع ہوتی رہی۔ پھر نظامی بک ایجنسی بدایوں سے ۱۹۵۵ء میں کتابی شکل میں آج سے قبل کا ہندوستان کے نام سے شائع ہوئی،

اس کتاب میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے علی گڈھ کے ہندو مسلمان طلبہ کی مجلسی گفتگو کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ذہنی موافقت اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کی خاطر ان

اس نے متھرا کے مندروں کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ نہایت خوبصورت بنے ہوئے تھے، شہاب الدین غوری بڑا خدا ترس حکمران تھا، اس کو اپنی رعایا کی بہبودی کا بہت خیال رہا، التمش کی عدل پروری کی شہرت دور دور تک تھی، رضیہ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی اچھے سے اچھے حکمراں میں ہو سکتی ہیں، نصیر الدین محمود دنیا کی تاریخ میں بڑا عادل نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ سمجھے جانے کا مستحق ہے، بلبن کی حکومت انصاف و عدل کے لئے ہمیشہ ہندوستان میں یاد کی جائے گی، جلال الدین خلجی کی نیک چلنی، رحم دلی، اور دشمنوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے سب ہی مداح تھے، علاء الدین خلجی کے زمانے میں غلے کی ایسی ارزانی تھی کہ پھر کبھی ہندوستان کو ایسی نصیب نہ ہوئی، اس کے عہد میں ایک شخص بنگالہ سے کابل اور مالابار سے کشمیر تک بلا خوف و خطر قیمتی سامان کے ساتھ سفر کرتا تھا، اُس نے ملک کے دفاع کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ مغل برابر پسپا ہو کر واپس جاتے رہے، محمد تغلق نے تمام ملک میں شفا خانے بنوائے، صرف دہلی میں ستر شفا خانے تھے، بارہ سو اطبا ملازم تھے، غربا و مساکین کے لئے خیرات خانے تھے، جن میں غریب ہندو مسلمان کو خیرات ملتی تھی، ملک میں تعلیم کا خاص انتظام تھا، صرف صوبہ دہلی میں ایک ہزار کالج تھے، فیروز شاہ تغلق نے بڑے بڑے شہر آباد کئے، نہریں جاری کیں، بے شمار میووں کے باغات لگائے گئے، صرف شہر دہلی میں بارہ سو باغات تھے، رعایا خوشحال رہی اُن کے پاس دولت، مال، زیور، سونا اور چاندی کی کثرت رہی، خضر خاں اپنے امرا اور رعایا میں ہر دلعزیز رہا، سیدوں کے زمانہ میں ہندوؤں کو سلطنت کے امور میں بڑا دخل تھا، سدا نند اور سدا پال دربار کے بڑے معزز امرا تھے، وہ امروہہ، بیانہ، جونپور اور گھرام کے گورنر مقرر ہوئے، سکندر لودی جفاکش رحم دل، منکسر، نیک طینت، اور

مقدس کتاب رگ وید کا بڑا حصہ عبادت اور خدا کی تعریف سے بھرا ہوا ہے، اُن کی اور مذہبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور نیکی کرنے کا ذوق رہا، ان میں بھی سخاوت، مروت، شجاعت اور شرافت، نیکی، نیک خیالی، ہمدردی، رواداری، سیرچشمی، وضعداری، اور سعادت مندی کی تعلیمات ہیں، اُن کی تہذیب، تمدن، علم، شاعری، فلسفہ، اخلاقیات، ریاضیات، نجوم، منطق، موسیقی، فن تعمیرات، زراعت، پارچہ بافی، رنگ سازی وغیرہ کی بھی ترقی ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو ان ساری باتوں کے روادارانہ طور پر مطالعہ کرنے کی تلقین کی،

پھر انھوں نے ہندوؤں کو یہ سمجھایا کہ وہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو اتنا برا نہ تصور کریں جیسا کہ وہ کرتے ہیں، پھر ہر مسلمان حکمراں کی کچھ نہ کچھ خوبیاں بتائیں، مثلاً انھوں نے بتایا کہ محمد بن قاسم اتنا روادار تھا کہ جب وہ سوا تین برس حکومت کر کے خلیفہ کے حکم سے واپس بلایا گیا تو تمام ہندو اس کے لئے زار زار روتے تھے کیمبرج میں اس کا بت بنا کر ایک عرصہ تک پوجتے رہے، محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر میں کسی ایک ہندو کو بھی بزور مسلمان نہیں بنایا، راجہ تلک اس کا میر منشی اور پھر سپہ سالار مقرر ہوا، اس کو دربار کے تمام امراء پر فوقیت حاصل تھی، ایک دوسرا ہندو شیوندرائے نامی بھی اس کی فوج کا سپہ سالار تھا، ناتھو نامی ایک اور ہندو محمود کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھا، ایک اور فوجی کمانڈر بیجے رائے نامی تو محمود کا خاص دوست سمجھا جاتا تھا، اس کا دربار شاہی میں بڑا رتبہ تھا، محمود گجرات، پنجاب، قنوج میں پھرتا رہا لیکن وہاں کے مندر نہیں ڈھائے، عربوں کے زمانہ میں ملتان کے ایک مندر کو گرا کر اس جگہ مسجد بنائی گئی تھی، اُس نے ملتان فتح کیا تو اس مسجد کو نماز کے لئے بند کر دی کہ وہ غصب سے حاصل ہوئی تھی، اس نے سومنات کا مندر ضرور گرایا، لیکن

کا گورنر راے بسنت رام آگرہ کا گورنر اور راجہ خوشحال رائے اس کا سکریٹری تھا، اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی سلطنت کا دراصل مالک راجہ بینی بہادر تھا۔ نواب صفدر جنگ کے وقت میں فوج کا کمانڈر انچیف مہاراجہ نول رائے تھا، آصف الدولہ کے زمانہ میں راجہ سورت سنگھ بریلی کا گورنر تھا، اور خوشحال رائے بخشی الممالک، پھر بعد میں وہ الہ آباد کا گورنر ہوا۔ بنگال میں مہاراجہ موہن لال سراج الدولہ کا دیوان اور اس کی سلطنت کا مختار کل تھا، اسی کے زمانہ میں راجہ رام نرائن بہار کا گورنر رہا، بحوالہ

ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے مثالیں گو بہت زیادہ پیش کردی گئی ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وطنی جذبے کی بنا پر اگر ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ کو برا کہنے کے روادار نہ تھے، تو پھر اپنے ملی جذبات کی بنا پر نہ صرف اسلام، بلکہ مسلمان حکمرانوں کے بارہ میں بھی اُن کی بُرائیاں سننا پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کو اچھا سمجھنے کی تلقین کرتے۔ ان ہی وطنی اور ملی جذبات کی ملی جلی شکل کا نام ڈاکٹر سید محمود تھا، اگر ان پر کبھی ضرورت سے زیادہ وطنی جذبہ غالب ہو جاتا، تو کبھی ملی جذبات سے بھی وہ مغلوب ہو جاتے، ان کے ان دونوں مشترک جذبات کی قدر کرنے والے زیادہ نہ تھے، مگر جنھوں نے قدر کی، اُن کی نظروں میں وہ باوقار رہے،

وہ ۱۹۲۳ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اسی کے بعد وہ نہرو خاندان سے ایسے وابستہ ہوتے گئے، کہ وہ اس خاندان کے رکن معلوم ہونے لگے، کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں میں اُن کا برابر کا حصہ رہا، مگر ۱۹۲۳ء کے بعد ملک میں ہندو مسلم یکجہتی کا وہ خوشگوار منظر دیکھنے میں نہیں آیا، جو ۱۹۲۰-۲۱ء کے عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے زمانہ میں آیا تھا، دو تین سال کے اند

نیک طبع بادشاہ تھا مغلوں کی حکومت کی تعریف تو غیر بھی کرتے ہیں، ان کے دورِ حکومت میں ہندوستان عروس البلاد بن گیا تھا، اس دور میں شیرشاہ کے ساتھ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ یں ضرور بدنام ہے لیکن اگر وہ چند الزامات سے اپنے کو بری رکھتا، اور اس کی طبیعت دو ایک برائیوں سے صاف ہوتی، تو شاید وہ دنیا کے چند مشہور بادشاہوں کے ساتھ شمار کیا جاتا، شجاعت، ہمت، اولوالعزمی، استقلال، محنت، تہذیب، علم، بردباری، عقل و فراست میں اورنگ زیب اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اس پر مندروں کے منہدم کرنے کا الزام رکھا جاتا ہے اگرچہ اورنگ زیب ایک موقع پر بنارس کے گورنر کو لکھتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ بنارس کے برہمنوں اور ہندوؤں کو اُن زمینوں پر جو ہندوؤں کی ہیں، اور قدیم زمانے سے انہی کے قبضہ میں ہیں، بُت خانے بنانے سے روکتے ہیں، اس وجہ سے وہاں کے ہندو پریشان اور متردد ہیں، تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن کو بُت خانہ اپنی زمین پر بنانے سے کوئی شخص نہ روکنے پائے، اور نہ ان کی عبادت میں کوئی مزاحم ہو، تاکید جانو"

پھر اسی اورنگ زیب نے ہندو مندروں کے لئے جاگیریں دیں، پجاریوں کے لئے وظیفے مقرر کئے، بہت سے مندروں کے پجاریوں کے پاس امداد کے سلسلہ میں اس کے شاہی فرامین موجود ہیں، مغلوں کے آخر زمانے میں ہندو امراء دربار پر چھائے رہے، رتن چند اور راجہ اجیت سنگھ تو سید عبداللہ اور سید حسین کے ساتھ سلطنت کے کاموں میں برابر کے شریک دار تھے۔ رتن چند کے اختیارات تو اتنے وسیع تھے کہ ساری سلطنت میں قاضیوں کی موقوفی اور بحالی اسی کے ہاتھ میں تھی، محمد شاہ کے عہد میں چھبیلا رام ناگر،

یہی الیہ رہا، اُن کی زندگی کا ایک ہی رُخ پریس میں آیا، دوسرے رُخ پر پردہ پڑا رہا، اس سے ملک کو بھی نقصان پہونچا، مسلمان کانگریسی رہنما مسلمانوں کے لئے جو ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے، وہ بھی پریس میں آتے رہتے، تو اُن کی قیادت بھی ضرور موثر اور مفید ہوتی رہتی، ڈاکٹر صاحب ہی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردی میں بہت کچھ کیا،

مثلاً ملابار میں موپلاؤں پر بڑے مظالم ڈھائے گئے، اُن کو ٹرین کے ڈبوں میں جانوروں کی طرح بھر بھر کر جلاوطن کیا گیا، ان کے گھر برباد کر دیئے گئے، اُن کو اپنی املاک سے محروم کر دیا گیا، ان مظالم کی تحقیقات کے لئے پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی، پھر سرحد کے پٹھانوں کے ساتھ بھی جو مظالم ہوئے اُن کی تحقیقات کی تحریک بھی ان ہی کی کوشش سے ہوئی، لیکن یہ سب کچھ پریس میں نہیں آیا، اور عام مسلمان یہی سمجھتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب وہی سب کچھ کرتے ہیں جو کانگریس کرنے کو کہتی ہے،

۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صاحب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اس فرض کو وہ ۱۹۳۰ء تک انجام دیتے رہے، اس دور کی کانگریس کی تاریخ میں اُن کا نام بھی نمایاں طور پر لکھے جانے کا مستحق ہے، اُن کی اس زمانہ کی پوری سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اس مقالہ کا مقصد نہیں،

۱۹۳۰ء میں وہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں پھر جیل گئے، اُن کے جیل جانے سے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ تو انھوں نے خفیہ سنجر سسٹم کا طریقہ اختیار کیا، جس سے کانگریس کو اس کے کاموں میں بڑی مدد

ہی ہندو مسلمان کے تعلقات بگڑنے لگے کشیدگی بڑھی، فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے، عدم تعاون اور خلافت دونوں کی تحریکیں بے جان سی ہوتی چلی گئیں، ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء میں پھر اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنی چاہی، مگر اُن پر گاندھی جی، موتی لال نہرو، اور جواہر لال نہرو کا ایسا دباؤ پڑا کہ سیاسی کاموں سے الگ نہ رہ سکے، ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ ان کو دیا گیا لیکن انھوں نے انکار کیا،

میں نے ان کو پہلی دفعہ مظفر پور (صوبہ بہار) میں ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، وہاں مولانا شوکت علی تشریف لانے والے تھے، ریلوے اسٹیشن پر بہت سے مسلمان اُن کے استقبال کے لئے پہونچے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، جاڑے کا موسم تھا، گاڑی صبح کے وقت پہونچی تھی، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھولا گیا، مولانا شوکت علی ڈبے کے پھاٹک پر نمودار ہوئے، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سید محمود بھی دکھائی دیئے، اس زمانہ میں کانگریس سے مسلمانوں کی بدگمانی شروع ہوگئی تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب سے مسلمانوں نے کوئی خاص گرمجوشی نہیں دکھائی، ایک صاحب میری بغل میں کھڑے تھے، انھوں نے کہا کہ "یہ ہندوؤں کے خاص آدمی ہوگئے ہیں" میں خاموش رہا، ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں رہنے کے بعد یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے، وہ اپنے وطنی جذبے میں جو کچھ کرتے رہے، اس میں ان کا صرف اخلاص تھا، یہ اور بات ہے کہ ان کے مخلصانہ جذبات کو مسلمان مشکوک نگاہوں سے دیکھتے رہے، دیکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے وطنی جذبات کو تو ہندو پریس میں خوب اچھالا جاتا، لیکن وہ مسلمانوں کی ہمدردی میں جو کچھ کہتے یا کرتے، وہ پریس میں بلیک آؤٹ ہوتا رہتا، ڈاکٹر صاحب کی طرح دوسرے کانگریسی اور نیشلسٹ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا بھی

"اس وقت سوائے اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے کہ دوا سے تھک کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں، ورمسلمانوں اور ہندوستان والوں کو خدا کے سپرد کر دیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب کہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا مزا چکھ کر پھر ہمارے پاس آئیں گے اور التجا کریں گے، چلو ہمیں انگریزوں اور اُن کے ہندو اور مسلمان غلاموں سے نجات دلا دو، خدا وہ وقت جلد لائے یا مجھ کو جلد اس دنیا سے اٹھائے، آمین، بہن اور بچیوں کو پیار،

"تمہارا بھائی محمد علی"

مولانا عبد الماجد دریابادی مولانا محمد علی کے بڑے پرستاروں میں ہیں، اُن سے گہرے ذاتی تعلقات بھی رہے، ڈاکٹر صاحب سے بھی ان کے مراسم تھے، اُن کے اور علی برادران کے تعلقات پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے، ۔

"سید محمود بڑی خوبیوں کے مالک تھے خصوصاً مشرقی قسم کی اخلاقی خوبیوں کے درد مندی، انکساری، مہمان نوازی، اور سب سے بڑھ کر مروت کے، شروع میں علی برادران سے خوب نبھ گئی، لیکن آگے چل کر کہنا چاہئے، ۲۹-۱۹۲۸ء میں جب گاندھی جی اور علی برادران میں اختلاف ہوا، تو بے چارے کی پوزیشن عجب نازک سی ہوگئی، ادھر گاندھی جی کا اعتماد انھیں پورا حاصل تھا، اُدھر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بات علی برادران کی ضائع ہو، چھوٹی کمیٹیوں میں ووٹ دیتے وقت عجب کشمکش میں پڑ جاتے۔ اور کوشش اپنی والی یہی کرتے کہ مروت کی عدالت سے ڈگری کسی کے خلاف بھی نہ صادر ہونے پائے، بے تکلف دوستوں پر یہ راز کھل گیا تھا، وہ شرافت کے اس منظر سے لطف لیتے،"

ڈاکٹر صاحب کے سامنے مولانا محمد علی صاحب کا تذکرہ آجاتا تو وہ بھی اُن کا ذکر بڑی محبت اور عزت سے کرتے۔ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا جو مرثیہ مولانا محمد علی پر ہے

ٹا، پھر انہی کی مساعیِ جمیلہ سے ہندوستان کی کپڑوں کے ملوں پر کانگریس کا اقتدار حاصل ہو
کانگریس میں مسلمانوں کی آواز کو موثر بنانے کے لئے ۱۹۳۰ء میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی
کے قیام کو عمل میں لائے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب
کرنے کے لئے ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز پیش کی، جو الٰہ آباد میں بلائی، اس میں ہندو
کے تمام سربرآوردہ رہنما شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے نتیجہ سے خوش
تھے، کہ اس میں مسلمانوں کے تحفظات اور مطالبات کے تمام بنیادی اصول مان لئے
گئے تھے، جو بعد میں برطانوی حکومت کے ۱۹۳۵ء کے کمیونل اوارڈ کی شکل میں
نمودار ہوئے،

ان کی سیاسی سلامت روی اور دیانت داری کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد علی
کبھی اُن سے بدظن نہیں ہوئے، مولانا محمد علی کو کانگریس سے اختلاف ہوا تو وہ اس سے دور
ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب برابر کانگریس سے وابستہ رہے، اس کے باوجود مولانا محمد علی کو
ان کی ذات پر پورا اعتماد رہا، ان کو آخر وقت تک عزیز رکھا، اُن کو خط لکھتے تو "پیارے
محمود" سے مخاطب کرتے، اور کھل کر اپنے دل کی باتیں لکھتے، ۴ رمئی ۱۹۲۹ء یعنی اپنی وفات
سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ڈاکٹر صاحب کو ایک مکتوب لکھا اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:۔

"پیارے بھائی، بظاہر یہ دو سال ہمارے Character کے امتحان کا زمانہ ہے،
سب کا پر کھا ہو رہا ہے، ہم لوگ دشمنانِ ملک اور رہزنانِ ملت ہیں، آج .....
زر طلب ملک پرور ملت دوست ہے،..... جن کو ساری عمر ہم نے گالیاں دیں اور کو سایہ
ہم کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں، سو جس طرح ہم مالوی اور مونجے کے یا نہرو اور چنتامنی کے آلۂ کار
نہیں بن سکتے، اسی طرح شفیع اور عبدالرحیم کے بھی آلۂ کار نہیں بن سکتے،

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

انقلاباتِ شب و روز کے حامل ہم ہیں
ہم ہیں اُن کی نگہِ ناز کے قابل ہم ہیں

ذرہ ذرہ تری دنیا کا فسردہ ہوتا
باعثِ گرمیٔ ہنگامۂ محفل ہم ہیں

سعیِ پیہم پہ بھی جس کو نہ فرشتے سمجھے
روزِ اول [illegible] مشکل ہم ہیں

جو حقیقت میں ہیں گردِ رہِ منزل اب تک
وہ سمجھتے ہیں [illegible] منزل ہم ہیں

وقت اپنا کے کبھی ہم سے کوئی کام تو لے
شورشِ سیل [illegible] لبِ ساحل ہم ہیں

ہاں حقیقت کی حقیقت سے خبردار ہیں ہم
کوئی حق ہیں ہو مگر عارفِ باطل ہم ہیں

ہمیں کونین نہیں، حاصلِ کونین ملے
جن کی ٹھوکر پہ ہیں کونین وہ سائل ہم ہیں

قوتِ سیلِ حوادث کا انھیں علم نہیں
جن کو یہ ناز ہے پروردۂ ساحل ہم ہیں

شرط انصاف نہیں اوروں پہ تہمت رکھنا
اپنی تابندہ روایات کے قاتل ہم ہیں

چاہے ہر خواب رہے تشنۂ تعبیر عروج
جو کبھی ہاتھ نہ پھیلائیں وہ سائل ہم ہیں

اس کا یہ مصرع پڑھ کر اُن کو یاد کرتے،

ع عجب مستے عجب دیوانہ بودے

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بعد جب کانگریس نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجلسوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب بھی ترہت (صوبۂ بہار) کے دو حلقوں سے کھڑے ہوئے، اور کامیاب رہے، ان کو اپنے انتخابی حلقہ میں ایسی مقبولیت رہی کہ مسلم لیگ بھی اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں ان کو شکست نہ دے سکی، جداگانہ اور مخلوط انتخاب دونوں میں وہ ۱۹۶۵ء تک وہاں سے برابر منتخب ہوتے رہے،

۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد جب بہار میں وزارت بنی تو وہ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ اُن کے عقیدت مندوں کا تو خیال تھا کہ وہ اپنی خدمات اور آل انڈیا حیثیت کی بنا پر بہار کے وزیر اعلیٰ بنائے جائیں گے، لیکن ان کی جگہ پر سری کرشن سنہا اس عہدہ جلیلہ پر فائز کئے گئے، اس ناانصافی پر ڈاکٹر صاحب کو اندرونی شکایت تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی، لیکن ان کی طبیعت میں جارحیت، جھگڑا، فساد، بالکل نہیں تھا وہ مکدر ضرور ہوتے۔ لیکن اپنے تکدر کا بوجھ خود برداشت کر لیتے، انھوں نے اپنی خانگی زندگی میں بھی غصے اور اشتعال کا اظہار شاید ہی کیا ہو گھر میں کسی سے اُن کو رنج پہونچا، تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہ کر پھر خوش ہو جاتے، انھوں نے سری کرشن سنہا کے ساتھ پورا تعاون کیا، اور ان کو اپنا بھائی ہی سمجھتے رہے، اور جب اُن سے اس ناانصافی کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے کہ وہ خود اس عہدہ سے سری کرشن کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے، اس طرح نکتہ چینوں کا منھ بند کر دیتے،

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

علی گڈھ ماضی وحال ۔ از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی تقطیع بڑی صفحات ۹۴ کاغذ نفیس، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ملیگی۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا تنہا تعلیمی ادارہ نہیں، بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت کی تربیت گاہ اور ان کی ملی حیات کا سرچشمہ بھی ہے، مسلمانوں کی فلاح و ترقی میں اس کا بڑا حصہ رہا ہے، ان کی بڑی بڑی شخصیتیں اسی نے پیدا کیں جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی قابلیت کا ثبوت دیا اور ملک و ملت دونوں کی خدمت اور رہنمائی کا فرض انجام دیا اور آیندہ بھی مسلمانوں کی بہت سی توقعات اسی سے وابستہ ہیں، اس لیے وہ ہندوستان میں ان کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے، اور اس سے ان کو بڑا ذہنی لگاؤ ہے، پروفیسر رشید احمد صاحب کی پوری زندگی علی گڈھ میں گذری، وہ اس کی تاریخ اور روایات کے اس دور میں بہت بڑے امین ہیں اور اس سے ان کو ایسی والہانہ شیفتگی ہے کہ اسکی علامت بن گئے ہیں، اسلیے اسکی ترجمانی کا سب سے زیادہ حق انھی کو ہے، جس کو وہ برابر ادا کرتے رہتے ہیں اور علی گڈھ ان کا خاص موضوع بن گیا ہے، یونیورسٹی پر بہتوں نے لکھا ہے، لیکن جو خلوص و دلسوزی اور یونیورسٹی کی روایات کا جو جاندار اور شاندار مرقع ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے اس سے دوسرے مضامین خالی ہیں، گذشتہ سال انھوں نے "سرسید میموریل لکچرز" کے سلسلہ میں "علی گڈھ کے ماضی وحال" پر ایک خطبہ دیا تھا جس کو کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے، اس میں علی گڈھ کی تحریک، اس کی جامعیت اور سرسید کے کارناموں کی مختصر

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

امانِ عشق آج بھی دستِ ہوس میں ہے
یہ طائرِ حسین ابھی تک قفس میں ہے

ہر چند ہوں فقیر، ہما دسترس میں ہے
گو تشنہ لب ہوں آبِ بقا ہر نفس میں ہے

زد پہ ہے آندھیوں کے ہر اک شمع آجکل
جو گل ہے زرغۂ ستم خار و خس میں ہے

صحرا نوردِ بادیۂ راز کے لیے
اک تازہ انکشاف صدائے جرس میں ہے

مدت سے ہے تلاش مگر کچھ پتہ نہیں
شاید ہما بھی آج کسی کے قفس میں ہے

نازک سی شے ہے دل اسے جو چاہے توڑ دے
ٹوٹے دلوں کو جوڑ سکے، کس کے بس میں ہے

واماندگانِ راہِ غمِ زندگی سنو
اک مژدۂ سکون بھی شورِ جرس میں ہے

اے خوشنوا چلن ہے زمانے کا اب یہی
تیری جگہ چمن میں نہیں ہے قفس میں ہے

دل کو ولی کے لذتِ دنیا کی ہے تلاش
یہ شاہبازِ فکر شکارِ مگس میں ہے

غزل

از جناب اسلم صاحب سندیلوی

لب ہیں مجبورِ تبسم اشک افشانی کے ساتھ
مجھکو جینا ہے بہر صورت گرانجانی کے ساتھ

طنز تھا یہ بھی خرد کی کوشش ناکام پر
قہقہہ دیوانگی کا چاک دامانی کے ساتھ

گلستاں میں بارشِ شبنم، گلوں کا ابتسام
سیم پاشی کے مناظر ہیں زر افشانی کے ساتھ

زیست کی دشواریوں کا بس یہی انعام ہے
منزلِ آخر جو طے ہو جائے آسانی کے ساتھ

آج پھوٹا ہے میرے دل کا تپکتا آبلہ
اشک میں کچھ خون کی سرخی بھی ہے پانی کے ساتھ

دستِ گلچیں سے مگر اس کو اماں ممکن نہیں
پھول گو رہتا ہے کانٹوں کی نگہبانی کے ساتھ

کہہ رہی ہے، مٹ نہیں سکتا مقدر کا لکھا
اشکِ شبنم پر ہنسی گل کی پشیمانی کے ساتھ

یوسفستانِ محبت سے یہ آتی ہے صدا
چاک دامانی ہے لیکن پاک دامانی کے ساتھ

اس جہاں میں کون ہے اسلم کسی کا غمگسار
اب بھی آتی ہیں بہاریں جلوہ سامانی کے ساتھ

سر سید اور ان کے رفقاء کے بعد مسلم یونیورسٹی کی سب سے زیادہ خدمت ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے کی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی۔ اور بڑے نازک موقعوں پر اس کو سنبھالا اور مختلف حیثیتوں سے ترقی دی۔ انجینیرنگ کالج انہی کا کارنامہ ہے۔ میڈیکل کالج کی بنیاد بھی انھی نے ڈالی تھی، ان میں مسلمانوں کی تعلیم کی اتنی لگن تھی کہ اس راہ میں کسی رکاوٹ کی پروا نہ کی۔ اس کے لیے بدنامی بھی مول لی غریب طلبہ کی تعلیم کے لیے انھوں نے جس قدر آسانیاں فراہم کیں اور جتنے نوجوانوں کو کام سے لگایا۔ اس کی دوسری مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ان میں بعض خامیاں بھی تھیں، اور ان سے کون انسان خالی ہے، لیکن ان کی بیشتر خامیاں بھی درحقیقت یونیورسٹی اور طلبہ کے فائدہ ہی کے لیے تھیں، حکومت پرستی سے کوئی دور بھی خالی نہیں رہا ہے، لیکن پرانے حکومت پرستوں نے اس سے اپنی قوم و ملت کو فائدہ پہنچایا، اور موجودہ دور کے حکومت پرستوں کا مقصد صرف ذاتی منفعت ہے، اور اس کے لیے ان کو ملت فروشی میں بھی باک نہیں ہوتا۔

'م'

لاہور کا جو ذکر کیا - از جناب گوپال متل صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۵ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۶ روپے، پتہ: مکتبۂ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۶

یہ مشہور صحافی و ادیب جناب گوپال متل کی ۳۲ء تا ۱۹۴۷ء کی دلچسپ یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی ادبی زندگی کی بسم اللہ اردو صحافت سے ہوئی تھی، اور یہ زمانہ انھوں نے اس کے مرکز لاہور کے مختلف اخبارون اور رسالوں کے شعبۂ ادارت میں بسر کیا تھا،

سرگذشت اور مسلم یونیورسٹی کی روایات وخصوصیات کو اس خوبی واختصار سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یونیورسٹی کے مستقبل کا ہے جس سے مسلمانوں میں بےچینی ہے، رشید صاحب ان حالات سے مایوس اور شکستہ دل نہیں بلکہ یہ مژدہ سنایا ہے

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

اور موجودہ حالات کا تجزیہ کرکے حکومت، یونیورسٹی اور مسلمانوں کو بڑے مفید مشورے دیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ جمہوریت اور سیکولرزم کے فروغ اور ملک کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ اور اس کی ناگزیر ضرورت ہے، یونیورسٹی کے نوجوانوں کو آزاد ہندوستان کی تعمیر میں پورا حصہ لینا ہے، ان کے بغیر اس کی تصویر میں رنگ نہیں بھر سکتا، اس سلسلہ میں مسلمانوں کے بعض دوسرے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، رشید صاحب ان لوگوں میں ہیں جو ماضی سے رشتہ منقطع کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ پرانی بنیادوں پر حال و مستقبل کی تعمیر چاہتے ہیں، اس رسالہ میں بھی یہ چیز نمایاں ہے، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، پتہ: دفتر رسالہ فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ملے گا۔

یہ رسالہ بھی رشید صاحب کے قلم سے ہے، انھوں نے رسالہ فکر و نظر میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پر ایک مضمون لکھا تھا، جس کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے، اس میں مسلم یونیورسٹی سے متعلق ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ

اس لیے ان کے تعلقات اس دور کے اکثر اہل قلم صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں سے تھے، جن میں بعض ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی سرگذشت کے ضمن میں ان لوگوں کے واقعات بھی تحریر کیے ہیں، اس لیے یہ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہے اور اس میں اس زمانہ کے لاہور کی ادبی انجمنوں، اخباری سرگرمیوں اور مختلف سیاسی و نیم سیاسی سماجی، مذہبی اور علاقائی تحریکوں خصوصاً احرار، کانگریس اور مسلم لیگ کا اچھا خاصا ذکر ہے، لیگ اور کانگریس کی بعض معرکہ آرائیوں کی روداد بھی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب اس عہد کے حالات کی تاریخ بھی ہے، اور اتنی دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔

نیم باز - از جناب عنوان چشتی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت للعمر، پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جناب افتخار الحسن عنوان چشتی لکچرار اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے، "نیم باز" ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے، جو غزلوں نظموں رباعیوں اور قطعات پر مشتمل ہے، عنوان صاحب نے "اپنی شاعری کو اپنی زندگی، زمانے اور ماحول کی لطافتوں اور کثافتوں کا عکس بنایا ہے"، اس مجموعہ سے بڑی حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے

واقعات النبیؐ - مرتبہ مولانا عبد الباطن صاحب جونپوری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۰ قیمت عمر پتہ: کتب خانہ کرامتیہ، محلہ ملا ٹولہ، جونپور

اس کتاب میں رسول اللہ صلعم کے معجزات، اوصاف و محامد، پاکیزہ سیرت اور ستودہ کردار سے متعلق تقریباً دو سو موثر و سبق آموز واقعات جمع کیے گئے ہیں، زبان عام فہم اور پیرایۂ بیان آسان ہے اس لیے ہر مسلمان کے لیے مفید و کارآمد ہے۔

"ض"